جامعہ رشیدیہ ساہیوال
کا
دینی و تبلیغی مجلہ
ماہنامہ
الرشید
دارالعلوم دیوبند
مدنی و اقبال نمبر ۱۳۹۸

پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کا علمی و عملی خادم و مسلکی ادارہ۔

جامعہ رشیدیہ ساہیوال

۱ ـــ مؤسس اول حضرت مولانا حافظ الحاج محمد صالح صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت گنگوہی۔
۲ ـــ مہتمم اول حضرت مولانا فضل احمد صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ متوسل حضرت گنگوہیؒ
۳ ـــ مفتی اعظم حضرت مولانا حافظ فقیر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تلمیذ رشید حضرت شیخ الہندؒ
۴ ـــ مبلغ اعظم شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا حافظ قاری لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تلمیذ ارشد حضرت علامہ عثمانیؒ
۵ ـــ سرپرست موجودہ و مربی حالیہ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائپوری مدظلہ خلیفہ حضرت رائپوری رہ
۶ ـــ شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ الحاج محمد عبداللہ صاحب مدظلہ متوسل حضرت تھانویؒ خلیفہ حضرت رائپوریؒ
۷ ـــ صدرالمدرسین حضرت مولانا حافظ الحاج علامہ غلام رسول صاحب جالندھری مدظلہ (فاضل علوم عربیہ اسلامیہ)
۸ ـــ بانی نشاۃ ثانیہ پاکستان فاضل حبیب اللہ رشیدی القاسمی خادم و تلمیذ حضرت مدنی رہ
۹ ـــ ماہر علوم و میراث حضرت مولانا حافظ الحاج مختار احمد صاحب نظامی جالندھری۔
۱۰ ـــ صدر معلم القرآن الحاج حافظ سید نذر محمد شاہ صاحب اقوی لدھیانوی مدظلہ

○

۶ ـــ ۱۹۰۱ء میں رائپوری حضرات نے رائپور جالندھر میں مدرسہ قائم فرمایا۔ اور حضرت رائپوریؒ نے سرپرستی فرمائی۔
۶ ـــ ۱۹۴۸ء میں رائپوری حضرات کے حکم سے منٹگمری، ساہیوال میں احیاء ہوا۔
۶ ـــ حضرت علامہ عثمانیؒ، حضرت مولانا خیر محمد رہ، حضرت مفتی فقیر اللہ رہ کے ایماء سے جاری و ساری ہوا۔
۶ ـــ حضرت شیخ سید مدنی رہ نے ادعیہ کلمات سے نوازا۔ حضرت شیخ التفسیر لاہوری رہ نے آغاز و افتتاح فرمایا۔
۶ ـــ اور مندرجہ ذیل اکابر نے سنگ بنیاد میں حصہ لیا۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رہ۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ۔ حضرت علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ۔
حضرت درخواستی مدظلہ۔ حضرت سید بنوری رہ۔ حضرت ڈھیوری رہ نے قدوم میمنت سے مشرف فرمایا۔
بحمداللہ تعالیٰ حضرات اکابر دارالعلوم دیوبند کی طرز پر مسلک حقہ کی حفاظت مدرسہ ہذا کر رہا ہے۔ تقبل اللہ منا۔

اے خدا ایں جامعہ را قائم بدار
فیض ایں جاری بود لیل و نہار

ترجمانِ جامعہ رشیدیہ ساہیوال

ماہنامہ

الرشید

مدنی و اقبال نمبر

جلد ۶ — شمارہ ۱۰ — ۱۱ — شوال و ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ — ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء

مجلسِ ادارہ　　(قیمت ۲ روپے)　　شعبۂ کتابت

مدیر و سرپرست: فاضل حبیب اللہ فاضل دیوبند
مدیر مسئول: چوہدری عبدالرشید ارشد
مدیرانِ معاون
شریف حسن اسعد طاہر
نصیر الدین شوق
ملیح اللہ سلطانی

بسرپرستی: السید الخطاطین حضرت سید نفیس رقم مدظلہ
قاری سیف اللہ خالد
محمد حزب اللہ خالد

ناشر: شعبہ تبلیغ۔ ادارہ جامعہ رشیدیہ
مقام اشاعت: مکتبہ رشیدیہ۔ لاہور
پرنٹر: قاضی محمد اسماعیل۔ مطبع: اکمل آرٹ پریس لاہور

باہتمام — فاضل حبیب اللہ رشیدی

ناظم و صدر مہتمم جامعہ رشیدیہ ساہیوال (پاکستان)

ادارہ "الرشید"

تو نے بکھرے موتیوں کو آج یکجا کر دیا　　　سچ تو یہ ہے بند اک کوزے میں دریا کر دیا

ناز جتنا بھی کریں تجھ پر وہ کم ہے الرشید　　　تو نے ذروں کو ستاروں سے شناسا کر دیا

تو نے ہر دل میں سجایا نقش دار العلوم

ہر نظر میں تو نے اس کا نقش پیدا کر دیا

(شریف شیوہ)

رشید

خاک گنگوہ را نوید رشید　　　گنجینہ خضر را کلید رشید

امداد اللہ مہاجر مکی را　　　اللہ اللہ عجب مرید رشید

(مولانا گرامیؒ)

انتساب

حضراتِ اکابرِ رشیدیہ و بزرگانِ رائے پور کے نام

- حضرت مولانا حافظ الحاج محمد صالح رائے پوری خلیفہ حضرت گنگوہی (مؤسسِ اوّل جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا فضل احمد رائے پوری خلیفہ حضرت رائے پوری (مہتمم اوّل جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا حافظ مفتی فقیر اللہ رائے پوری تلمیذ حضرت شیخ الہند (صدر المدرسین و مفتی جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا حافظ احمد الدین رائے پوری خلیفہ حضرت رائے پوری (واعظ جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا منشی رحمت علی بہڑوی خلیفہ حضرت رائے پوری (رکن دار العلوم دیوبند و سرپرست جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی خیر المدارس (رکن دار العلوم دیوبند و سرپرست جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا رشید احمد سلفی رشیدی (بانی جامعہ سلفیہ مدینہ منورہ)
- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (فضلاء جامعہ رشیدیہ)
- حضرت مولانا محمد علی جالندھری (بانی مجلس تحفظ ختم نبوۃ) فضلاء جامعہ رشیدیہ
- حضرت مولانا محمد انوری جالندھری (تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب)
- حضرت مولانا عبد الجبار ابوہری (تلمیذ خاص حضرت مفتی فقیر اللہ صاحب) مبلغ دار العلوم دیوبند
- حضرت مولانا محمد ابراہیم سلیم پوری (میاں چنوں) سرپرست جامعہ رشیدیہ
- شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا حافظ قاری لطف اللہ (مدرس و مبلغ اعظم جامعہ رشیدیہ)
- استاذ العلماء حضرت مولانا الحاج عبد العزیز [illegible] پوری جالندھری مدظلہ (خلیفہ حضرت رائے پوری سرپرست جامعہ ہذا)
- حضرت پیر جی الحاج حافظ عبد اللطیف رائے پوری (ہیڈ مٹی) خلیفہ حضرت رائے پوری سرپرست جامعہ ہذا

فاضل مضمون نگار،
مدیر الناصر

اکابر دارالعلوم دیوبند اور جامعہ رشیدیہ ساہیوال

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو ○ ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

دارالعلوم دیوبند کے بعد سب سے قدیم مدرسہ رشیدیہ رائے پور تحصیل نکودر ضلع جالندھر پنجاب ہے۔ جو دیوبند کی ہی طرز پر قائم کیا گیا۔ اس کے بانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا الحاج الحافظ محمد صالح رائے پوری تھے۔ جامعہ کے بانی مرحوم کا ذکر صاحب تذکرۃ الرشید میں موجود ہے۔ ○ مدرسہ رشیدیہ کے مہتمم اول حضرت مولانا فضل احمد رائے پوری نے بھی حضرت گنگوہی سے بیعت، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری سے فیضیاب اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے مجاز تھے۔ آپ رائے پور تشریف لانے سے قبل انبالہ کے مدرسہ میں تدریس پر مامور تھے جہاں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے آپ سے تعلیم حاصل کی تھی ○ مدرسہ رشیدیہ رائے پور کے داماد حضرت مولانا احمد دین رائے پوری، حضرت مولانا عبدالقادر کے خلیفہ اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے پہلو میں مدفون ہیں۔

جامعہ رشیدیہ کے صدر مدرس اور مفتی اعظم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ فقیر اللہ جالندھری (والد محترم مولانا حبیب اللہ اور قاری لطف اللہ خادمان جامعہ رشیدیہ) دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی شاگرد رہے، مرحوم علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہم درس تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی سے فن افتاء میں تربیت حاصل کی۔ آپ نے رائے پور سے ساہیوال تک اکابر دارالعلوم و حضرات تھانہ بھون سے رابطہ قائم رکھا۔ آپ کا تفقہ فی الدین، تصلب، تقویٰ زبان زد خاص و عام ہے۔ آپ کی وفات کے ۲۲/۲۴ ماہ بعد آپ کی قبر کی مٹی سے خوشبو کے عینی گواہ موجود ہیں ○ آپ کے خصوصی تلامذہ میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا محمد انوری جالندھری، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا عبدالجبار ابوہری، مولانا محمد ابراہیم میر پوری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا رشید احمد ملتانی (مہاجر مدینہ منورہ) مشہور حضرات ہیں — ○ استاذ العلماء حضرت مولانا خیر محمد جالندھری بانی مدرسہ خیر المدارس جالندھر و ملتان، جامعہ رشیدیہ کے سرپرست اور ہمارے خصوصی شفیق مربی اور محسن استاذ تھے۔ آپ حضرت تھانوی قدس سرہ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ مدرسہ رشیدیہ رائے پور کے سرپرست حضرت مولانا مفتی رحمت علی بڑی مشہور بزرگ ہیں، حضرت گنگوہی کے فیض یافتہ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے خلیفہ مجاز اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے رفیق خاص تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن رکین تھے ○ جامعہ رشیدیہ کی نشاۃ ثانیہ (ساہیوال) کے مؤسس اور مبلغ اعظم مولانا حافظ قاری لطف اللہ رشیدی فی سبیل اللہ، حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی، مولانا سید بدر عالم مدنی اور علامہ سید محمد یوسف بنوری کے خصوصی شاگردوں میں تھے۔ علامہ عثمانی نے قاری صاحب اور راقم کو جمعیۃ علماء اسلام پنجاب میں کام کرنے کا حکم دیا تھا جس کی تعمیل میں راقم ناظم اور قاری صاحب خادم جمعیۃ علماء اسلام بنے۔ خلاصۃ الکلام دارالعلوم دیوبند اور جامعہ رشیدیہ کا تعلق قدیم ہے، بلکہ مدت سے دونوں ہم رشتہ چلے آ رہے ہیں اور انشاء اللہ یہ تعلق قائم دائم رہے گا۔ اسی تعلق کی بنا پر الرشید کا خصوصی شمارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خصوصی اشاعت کا مقصد جذبہ ہی ہے جو دارالعلوم کا مقصد ہے۔ تقبل اللہ منا ومنہم

آئینہ مضامین

خوابگہِ قطب الارشادؒ

سہارنپور ۲۹ ذیقعد ۱۳۹۰ھ
۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء

سیّد نفیس الحسینی

ختم المحدثین شیخ الاسلام والمسلمین سیّد الاولیاء سند العلماء حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ

ہے یہ کس کی خوابگہِ حسیں، یہ نفیس کس کا مزار ہے
کہ نفس نفس کو جو ہے سکوں تو نظر نظر کو قرار ہے

یہاں اک نگار ہے خیمہ زن، یہ حریمِ حُسنِ نگار ہے
یہاں محوِ جلوۂ سرمدی، وہ ہزار رشکِ بہار ہے

یہ فرود گاہِ رشیدؒ ہے، یہ مقامِ فردِ فرید ہے
یہ مکان خُلد نشان ہے، یہ مکین عرش وقار ہے

جو ابُو حنیفہؒ وقت تھا، جو کبھی بُخاریؒ عصر تھا
جو جُنیدؒ و شبلیؒ دہر تھا، یہ اُسی کی خاکِ مزار ہے

یہ مزار بُقعۂ نُور ہے، یہ جہانِ عشق کا طُور ہے
یہاں آفتابِ جمال ہے، یہ تجلّیوں کا دیار ہے

یہاں قُدسیوں کا نُزول ہے، یہ دلیلِ حُسنِ قبُول ہے
یہاں سو رہا ہے وُہ نازنیں، جو نبیؐ کا عاشقِ زار ہے

جو کلامِ دوست کا نُور ہے، تو حدیثِ یار کا فیض ہے
اِسی فیض سے، اِسی نُور سے، یہ مزار قُمقُمہ زار ہے

یہ جنوں کا محملِ شوق ہے، یہ نظر کی منزلِ شوق ہے
مرا عشق حاصلِ شوق ہے، مرا عشق اس پہ نثار ہے

وہ کہ تھا مجاہدِ شاملی، صفیں جس نے اُلٹیں فرنگ کی
اُسی صف شکن کی یہ گھات ہے، اُسی شیر کا یہ کچھار ہے

کبھی جام پینے پہ آگئے، تو سمندروں کو چڑھا گئے
یہ جو آج تک نہیں ہوش ہے، مے عشق ہی کا خمار ہے

یہ عنایتیں، یہ نوازشیں، ابھی آپ مجھ سے نہ پوچھیے
مری آنکھ محوِ جمال ہے، مرے سامنے رُخِ یار ہے

میں نگاہِ شوق کا کیا کروں، دلِ ناصبور سے کیا کہوں
ابھی حشر میں بڑی دیر ہے، ابھی دُور روزِ شمار ہے

کوئی نکتہ چیں ہو، ہُوا کرے مگر اے نگاہِ کمال بیں
ذرا کرکے دیکھ مشاہدہ، یہاں نُور ہے، وہاں نار ہے

کسی خشک طبع سے کیا غرض، کسی تنگ ظرف سے کام کیا
مری اہلِ دل سے ہے دوستی، مجھے اہلِ درد سے پیار ہے

یہی میرا ناز و نیاز ہے کہ اسیرِ زُلفِ رشید ہُوں
اسی سلسلے کا مُرید ہُوں، مرا اس پہ دار و مدار ہے

میں غبارِ کوئے رسولؐ ہُوں، میں نبیؐ کے پاؤں کی دھول ہوں
مرا دل خُدا کے حضور میں، یہ نیاز سجدہ گزار ہے
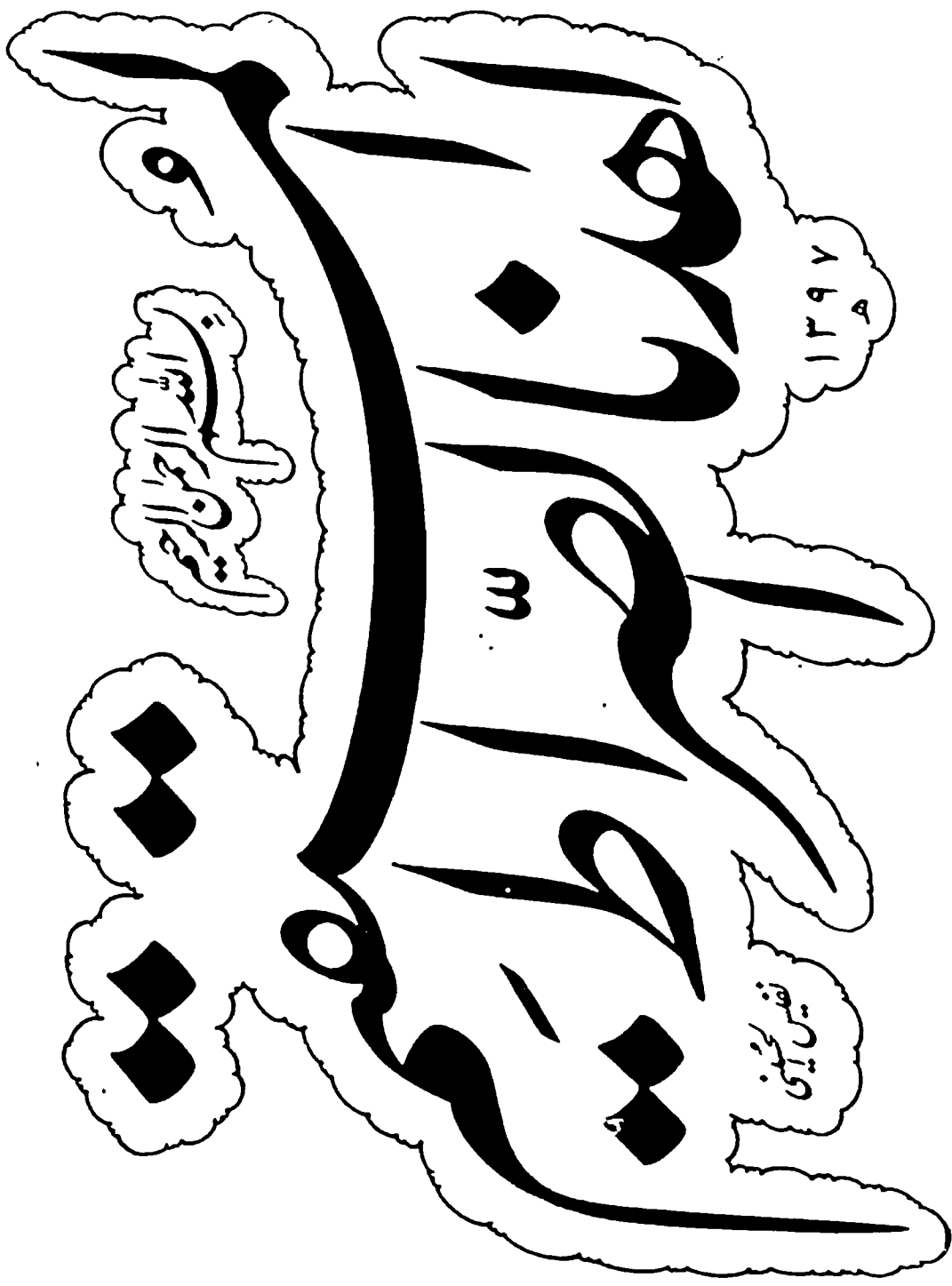
نعتِ عقیدت بحضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند

الٰہی کس سے بیاں ہو سکے ثنا اس کی — کہ جس پہ ایسا تری ذات خاص کا ہو پیار

جو تو اسے نہ بناتا تو سارے عالم کو — نصیب ہوتی نہ دولت وجود کی زنہار

تو فخرِ کون و مکان ، زبدہ زمین و زماں — امیرِ لشکر پیغمبراں شہِ ابرار

تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی — تو نورِ شمس ہے اگر اور نبی ہیں شمس نہار

حیات جاں ہے تو ہیں اگر وہ جانِ جہاں — تو نور دیدہ ہے اگر وہ نور دیدۂ بیدار

جہاں کے سارے کمالات اک تجھ میں ہیں — ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو[2] چار

امیدیں لاکھوں ہیں مگر بڑی امید ہے یہ — کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا شمار

جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں — مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغ و مار

جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب میرے — کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کے تیرے قطار

اڑا کے باد مری مشتِ خاک کو پسِ مرگ — کرے حضورؐ کے روضے کے آس پاس نثار

تمہارے عشق میں رو رو کے ہوں نحیف اتنا — کہ آنکھیں چشمۂ آبی درونِ غبار

وہ لے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاک قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار

خطباتِ رشید

ادارہ

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ ولا رسالۃ بعدہ وھو آخر الانبیاء وخاتم النبیین وعلی خلفاء الراشدین المہدیین وعلی الہ وصحبہ اجمعین الی یوم الدین۔

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست　　　محمد چشم بر راہ ثنا نیست!
محمد از تو مے خواہیم خدا را　　　خدایا از تو حبِّ مصطفیٰ را

ہماری مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند، اور اس کے اکابر علمائے دیوبند نے ہم لوگوں اور ملتِ اسلامیہ پر جو احسان کئے، ان کا بدلہ دینے سے ہم کیا پوری قوم عاجز ہے۔ دارالعلوم نے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کا صلہ اللہ کریم ورحیم دیں گے۔

ہم خدامِ رشیدیہ، دارالعلوم دیوبند نمبر کی اشاعت کر کے حقِ نمک بھی ادا نہیں کر سکے صرف خریدارانِ یوسف میں نام لکھوا سکے۔

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمے کنی　　　منت شناس ازو کہ بخدمت داشتت

تاہم اکابر کی حوصلہ افزائی سے ہمت بڑھی اور ادارہ نے "نقشِ ثانی" کی تعمیر شروع کر دی۔ اور ان شاء اللہ فیضانِ دیوبند سے آئندہ بھی مستفیض کیا جائے گا۔ السعی منا والاتمام من اللہ۔

ربِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہماری دعا صرف یہ ہے۔

ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔ وتب علينا انك انت التواب الرحيم
ربنا لا تؤاخذ نا ان نسينا او اخطأنا ۔ ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا
فی امرنا وثبت اقدامنا۔ ربنا عليك توكلنا واليك انبنا واليك
المصير۔ ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين ۔ فاطر السمٰوٰت والارض
انت ولينا فی الدنيا والاخرة ۔ توفنا مسلما والحقنا بالصالحين
اللّٰهم اليك اشكوا ضعف قوتی وقلة حيلتی وهوانی علی الناس
يا ارحم الراحمين ۔ يا مظهر العجائب بالخير ۔ يا بديع ۔

○

"ادارہ الرشید" نے "دارالعلوم دیوبند نمبر" میں اکابر علماء کی صد سالہ تاریخ اور دارالعلوم کی تعلیمی خدمات کو پیش کیا ۔ دارالعلوم کی خصوصیات پر تبصرہ ہوا ۔ اکابر دارالعلوم کی ملکی و ملی جہاد کے واقعات کو لکھا ۔ اس ضمن میں اکابر سے حضرت نانوتوی رح بانی دارالعلوم ۔ اور حضرت گنگوہی رح سرپرست دارالعلوم کا تذکرہ آیا اور حضرت تھانوی رح کا ذکر بھی ہوا سیدالطائفہ حضرت شیخ الہند رح اور حضرت شیخ مدنی رح کا ذکر مجملا ضرور آیا مگر تشنۂ تکمیل رہا ۔

○

سال گزشتہ کو یار لوگوں نے سال اقبال رح قرار دیا ۔ چشم ماروشن دل ماشاد ۔ لیکن بقول آغا شورش کاشمیری مرحوم " اقبالی مجرموں " نے " اقبال " کے تذکرے کے ساتھ حضرات اکابر ملا ئے حقہ ، خصوصا حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر نہ صرف تنقید بلکہ تنقیص ، اور بددین عناصر نے تکفیربازی کو روا رکھا ۔
بلکہ ہر سال اقبال کے نام سے ، رسوائے اشعار ایک "ثلاثی" یا "رباعی" کو اچھالا جاتا ہے ۔ اور حضرت مدنی کو گالیاں دی جاتی ہیں اور اپنے خبث باطن کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ یہ بحث فرسودہ ہو کر مر چکی اور دم توڑ چکی ہے جب کہ " ڈاکٹر اقبال مرحوم نے الفاظ واپس لیتے ہوئے رجوع کر لیا ۔ اور بات رفت گزشت ہو گئی ۔

○

راقم السطور پوری ذمہ داری سے لکھنے پر مجبور ہے کہ حضرت سید مدنی رح اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے درمیان مصالحت کرانیوالے حکم محکم اور واسطہ علامہ طالوت مرحوم و مغفور تھے (اور راقم ناقل) راقم خادم ، ناظم انہی ایام ، حضرت علامہ طالوت مرحوم کیساتھ اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں تعلیمی کام کر رہا تھا ۔ یہ خط و کتابت اور مراسلات کا کام راقم آثم کے سپرد تھا ۔ حضرت علامہ طالوت مرحوم قلم برداشتہ خط لکھتے ہوئے میرے سپرد کر دیتے ۔ راقم ان کی نقول کرتے ہوئے "دیوبند" و "لاہور" کے درمیان رسل و رسائل کا کام کرتا تھا ۔

مکاتیب مدنی رہ واقبال رہ کی جملہ نقول بندہ کے پاس موجود چلی آرہی تھیں کہ تقسیم ملک کے وقت راقم وطن مالوف رلسے پور (جالندھر) تعطیلات گزارنے چلا گیا۔ اور نقول ومکتوبات فاضلکا "اسلامیہ ہائی سکول" میں تقسیم کی نذر ہوگئیں۔ آہ

○

تقسیم ملک کے بعد ملتان میں حضرت علامہ طالوت مرحوم گورنمنٹ ہائی سکول میں تعینات تھے۔ ملتان حاضری کے وقت راقم نے مکرر نقول حاصل کرلیں۔ جو بعض احباب نے اشاعت کے لئے مجھ سے وصول کرکے شائع بھی کروائیں۔

راقم چونکہ صاحب البیت ادرٰی بما فیہ اور صاحب معاملہ ہے۔ اس لئے حق رکھتا ہے کہ اس پر قلم برداشتہ کچھ لکھوں۔

"مدنی واقبال نمبر" میں حضرت مدنی رہ کے استاد ومرشد شیخ الہندرہ کے تذکرۂ محمود کا بحیثیت بنیادی متن تعارف ضروری سمجھتے ہوئے، اولاً حضرت شیخ الہندرہ ثانیاً حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اجمالی نقوش کا خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔ "پھر جب علمائے دیوبند" کی بات شروع ہوتی ہے تو ایک تاریخ بن کر سامنے آتی ہے۔ اور واقعات کا تسلسل عجیب طوالت بھی اختیار کرجاتا ہے ؎

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں　　زباں میری ہے بات ان کی!
انہی کی محفل سنوارتا ہوں　　چراغ میرا ہے رات ان کی!

○

بددین جماعتوں اوران کے مفکرین نے جو متحدہ قومیت کے نام کا فتنہ کھڑا کیا۔ اس کا جواب حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رہ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند، رفیق المصنفین کا مضمون ایک اتمام حجت ہے اور مسئلہ سمجھنے کے لئے کافی و وافی۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس سے علمی استفادہ فرماسکیں گے۔

○

حصۂ دوم میں ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم ومغفور پر ان کے اصلی وصحیح مشن کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو خود "دیوبند" نے متاثر کیا تھا۔ اور حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری نے نبوت کاذبہ مرزائیہ کے فتنہ سے آگاہ کیا۔ اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم "دیوبند" سے یہ سبق حاصل نہ کرتے تو شاید ان کا انجام کیا ہوتا لیکن الحمدللہ! اللہ کریم ورحیم نے ڈاکٹر اقبال رہ کو ہدایت دی۔ اور انہوں نے "غلام احمد اول" اور "غلام احمد پرویز

دوم) دونوں کے نظریات و معتقدات پر شدید تردید اور سخت تنقید کی۔ اور بالآخر مرزائیت کی زبردست تکفیر کی۔

○

من خوب مے شناسم پیران پارسا را

اس ساری سیاسی چکر بازی اور کرتبا بجتی میں "نوائے وقت" تو محض "ابن الوقت" ہے اس کے پس منظر میں فتنۂ غلام احمد اول" اور غلام احمد ثانی" پرویز دوم" اور بعض بد دین طبقے قلم کاری کرتے رہتے ہیں۔
کیا ان کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے مرزائیت اور منکرین ختم نبوت و جہاد کے خلاف کیا کچھ لکھ ہے؛ اور کتنا لکھا ہے؛ اور کس قدر جہاد کیا؛ اور کیوں کر لکھا: کیا وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہیں؛ سال اقبال یوم اقبال، ایام اقبال میں ان کو کیوں نہیں پیش کیا جاتا؟

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ان نادان دوستوں نے مظلوم اقبال کو سمجھا ہی نہیں۔ بلکہ اقبال کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ اقبال کی کوئی خدمت نہیں کی۔

○

آخر میں ایک بات لکھنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہوئے "اقبالی مجرموں" غلام پرویز"۔ اور بد دین جماعتوں" کو کہنا اور بتانا اور جتانا چاہتے ہیں کہ سید مدنی رح کے "خدام" اور جانباز" مجاہد رضا کار" زندہ ہیں۔ تم صرف پاکستان کو روتے ہو، حضرت مدنی رح کے تلامذہ اور نام لیوا پورے عالم اسلام، عرب و عجم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو شریف تو ہیں مگر بے حمیت نہیں۔ دلائل سے بات کرو تو ہم اختلاف رائے کا خیر مقدم کریں گے۔ ورنہ بقول اقبال رح

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم　　سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اور بقول ظفر الملة والدین

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن　　پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اندکے با تو گفتم و بدل ترسیدم　　کہ آزردہ خاطر شوی ورنہ سخن بسیار است

فقط ههنا تم منا الکلام
علی مصطفنا الوف السلام

◎

فاضل رشیدی

عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

الٰہی عاقبت محمود گرداں — بلائے بود را نابود گرداں

تذکرۂ محمود

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ اسرارہم

اسیرِ مالٹا

محدث دار العلوم دیوبند

۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۰ء — ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء

ترتیب

مولانا الحاج الحافظ عبدالرشید ارشد

در مدح حضرتِ شیخ الہند قدس سرہٗ

از جناب گرامی مرحوم

زمین فقر کوسم دیو ایں جا در کمند آمد — نگاہِ حضرتِ محمود اینک دیوبند آمد

قیامت را بقیامت نسبتے دادم غلط کردم — قیامت ہا بلاگردانِ آں بالا بلند آمد

ادب ناآشنا قدرِ سخنہائش چہ میداند — کہ در درگاہ حضرت ہر کہ آمد ارجمند آمد

چہ خوانم از تمنائش چہ گویم از تماشائش — تمنا خود فروش آمد تماشا خود پسند آمد

بہ پیشِ روئے لیلیٰ مہر و مہ را بر نمے سنجد — نگاہِ حضرتِ مجنوں چہا مشکل پسند آمد

زانفاسِ گرامی خاکِ پنجاب آبرو دارد !
گرامی از مریدانش عظامی سربلند آمد

سالارِ قافلۂ حریت

حضرت شیخ الہندؒ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے تک ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا وہ علماء اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا ۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ سکول قائم ہوتا ہے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا) اس وقت سے جدید و قدیم کا فرق ہونے لگتا ہے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس حقیقت کو پہلے دن سے سمجھ لیا تھا کہ ہندی مسلمانوں کی خیر نہیں ہے ۔ اور اب ذہنی و دماغی ، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے رجحانات میں ایسا فرق ہو جائے گا کہ اگر بر وقت علی گڑھ سکول کے قیام کی تحریک میں اصلاحات نہ کی گئیں تو آئندہ چل کر دیوبند اور علی گڑھ کی وہ چپقلش پیدا ہوگی جو کبھی ختم نہ ہوگی اور اس خلیج کو پاٹنا مشکل ہو گا ۔ مولانا نانوتویؒ کی فراست ایمانی اور نگاہ مردمومن کے سامنے ہندوستان کی پچاس سال قبل اور پچاس سال بعد کی سیاست تھی ۔ اس لئے آپ نے سرسید مرحوم سے خط و کتابت شروع کی اور چاہا کہ جدید قدیم تعلیم کے فرق کو بیچ سے نکال کر صحیح اسلامی فکر کو اصول تعلیم کر کے میدان کو جیت لیا جائے کیونکہ دین کی بنیاد صحیح علم و عمل پر ہے اور علم نام ہے خود شناشی اور خدا شناشی کا ۔ بعض امور پر اتفاق کے باوجود کچھ حالات ایسے پیش آگئے جن کی وجہ سے ان دونوں کے اشتراک سے جامع منصوبہ تیار نہ ہو سکا اور دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں ۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ایسی کمائی تھے کہ جو علوم و فنون ، افکار و خیالات میں اپنے استاد کے حقیقی جانشین اور چھوڑے ہوئے کاموں کے پورا کرنے والے تھے ۔ یہ شیخ الہندؒ تھے کون ؟ ایک عالم ربانی و عارف یزدانی تھا جو اپنے کام و دھن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم ۔ اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ روسو اور نہ مانٹسکو کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا ، وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعہ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن اسپر کے افکار و نظریات سے ۔ اس نے نہ کسی دل کشی کا خط اٹھایا تھا اور نہ عشرت کدہ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی ۔ ان سب چیزوں کے برعکس

اس کا شیرازۂ حیات قال اللہ وقال الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنت نبویہ تھا۔ اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکام الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا۔ سینہ میں صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا۔ بظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہو گئی تھیں۔ نیشنل کانگریس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی، لیکن شیخ الہند یہاں اس حکومت کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے۔

(مدینہ بجنور)

ہم کو تسلیم ہے کہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کے زبان و قلم نے غفلت کدۂ ہند کے خس و خاشاک میں آگ لگا رکھی تھی لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت کا قدم بھی حقوق طلبی کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا۔ مگر علماء حق آنے والی جنگ آزادی کے لئے خاموشی سے بہادر سپاہی تیار کرنے کی مہم میں مصروف تھے۔ ان کا نصب العین نہ تو دین و دنیا ہم آمیز تھا اور نہ ان کا مطمح نظر "درمع الدہر کیف دار" تھا۔ بلکہ ان کا طرۂ امتیاز "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز" پر تھا۔ ان کے نزدیک دین کا مفہوم ایک مکمل نظام زندگی تھا جس کی پہنائی و وسعت کا ایک گوشہ زمین و آسمان ہے۔

وطن، خاندان، تولد اور ابتدائی حالات

دیوبند کے چند مبارک اور ذی علم خاندانوں میں سے ایک خاندان شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ حضرت کے جد امجد شیخ فتح علی صاحب تھے۔ جن میں سے مولانا ذوالفقار علی صاحب ایک نہایت ہی صاحب اقبال اور دینی و دنیاوی حیثیتوں سے صاحب وجاہت و عزت عالم تھے۔ باوجود کرم، اخلاق کے صورت سے سیادت اور رعب عیاں تھا۔ حق تعالےٰ نے اموال و اولاد، صحت و حیات سے بہرۂ وافی عطا فرمایا تھا اور مولانا اپنے شہر میں نہایت خوش قسمت اور بلند اقبال شمار ہوتے تھے۔ پچاسی سال کی عمر میں ۱۳۲۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ساٹھ افراد اولاد ذکور و اناث چھوڑے۔ دہلی کے مشہور عربی کالج میں آپ نے استاذ العلماء والمشائخ مولانا محمد مملوک علی صاحب سے تعلیم پائی تھی۔ آپ کی تمام عمر علمی خدمات میں بسر ہوئی۔ علوم ادبیہ عربیہ سے خاص مناسبت تھی۔ اور آپ کی نظم و نثر عرب العرباء کی یاد دلاتی تھی۔ دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کی مفید شروح "تسہیل الدراستہ" اور "تسہیل البیان" آپ کی بہترین علمی یادگار ہیں اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ بانت سعاد کی شرح میں عطر الوردہ اور الارشاد جس ذوق و شوق سے تحریر فرمایا ہے وہ حب نبویؐ کی علامت اور بہترین ذخیرۂ آخرت اور کمال ایمان کی دلیل ہے۔ اسی طرز پر عرب کے مشہور سبعہ معلقات کی شرح التعلیقات علی السبع المعلقات تحریر فرما کر طالبان ادب پر احسان فرمایا ہے۔ اور فن معانی و بیان کو نہایت خوبی سے اردو زبان میں لکھ کر تذکرۃ البلاغت نام رکھا ہے اور قواعد و ضوابط معانی

کی مثالیں اساتذۂ اردو کے کلام سے دکھلا کر کمال کیا ہے۔ بلکہ زبان اردو میں سب سے پہلے ممدوح نے اس فن کو جاری کرکے دکھلایا ہے، ایسے باکمال حضرات اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

جناب موصوف کے دو صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے تھے۔

اول : فخر آباؤ اجداد حضرت مولانا محمود حسنؒ۔

دوم : مولوی حامد حسنؒ جن کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گزرا۔

سوم : مولانا حافظ حکیم محمد حسن صاحبؒ مدرس وطبیب دارالعلوم دیوبند۔ آپ نے حدیث شریف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے اور دیگر علوم دارالعلوم دیوبند میں، اور اپنے بھائی حضرت شیخ الہندؒ سے اور طب دہلی میں حکیم عبدالمجید خان صاحب مرحوم ومغفور سے حاصل فرمائی۔

چہارم : مولوی حافظ محمد محسن صاحبؒ۔ اکثر عمر مشغلہ ملازمت رہا۔ اپنے بڑے بھائی شیخ الہندؒ سے والہانہ محبت والفت تھی۔ ان کے ایام اسیری مالٹا میں یاد کرکے زار وقطار رویا کرتے تھے۔

حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں بمقام بریلی (جب کہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل وعیال وہاں مقیم تھے) عالم ظہور میں تشریف لائے۔ والد ماجد نے بطرز شائستہ اظہار مسرت کیا اور محمود حسن نام رکھا اور بعض ظریف حضرات نے ولد ذوالفقار علی بنلایا۔ چھ سال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن مجید کا اکثر حصہ میاں جی منگلوری سے پڑھا۔ بقیہ قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں جی مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب عربی اپنے معزز چچا اور مشہور استاد مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔ مولانا بچپن میں کھیل کود سے مجتنب ومتنفر تھے۔ البتہ سیر وشکار سے ایک مناسبت اور دلی شوق تھا۔

مولانا شیخ الہند کی عمر پندرہ سال کی تھی اور آپ قدوری، تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ خدا تعالیٰ کے مقبول اور سراپا اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ ہجری کو دیوبند میں ایک عربی مدرسہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تجویز سے پہلے مدرس مولانا ملا محمود صاحب بشاہرہ پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئے اور دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں تعلیم عربی شروع ہوئی۔

سبحان اللہ! کیا مبارک ساعت اور کیسے مخلص اور سعید حضرات تھے کہ ان کی معمولی آواز پر پہلے ہی سال بنارس پنجاب اور کابل تک کے طلباء جمع ہو گئے، اکیس طالب علموں کی جمعیت پر مدرسہ کا اجراء ہوا تھا، اور اخیر سال اور وقت امتحان تک اٹھتر طلباء کا اجتماع ہو گیا۔ اور اب وہی مدرسہ عربی دارالعلوم دیوبند کی شکل میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا غیر سرکاری دارالعلوم ہے کہ جہاں سے کتاب وسنت اور علوم سلامیہ کے چشمے جاری وساری ہیں۔ طلباء کی کثرت ہوئی تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ابن استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب دیوبند تشریف لے آئے۔ آپ اجمیر شریف

میں سو روپیہ مشاہرہ پر ملازم رہ چکے تھے پھر بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے ارشاد پر اس خدمت کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ میں بیس روپے ماہوار کے قلیل مشاہرہ پر کام کرنے لگ گئے۔

پہلا استاد و شاگرد

مولانا شیخ الہندؒ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ گویا پہلا استاد بھی محمود اور پہلا شاگرد بھی محمود۔ ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز، میبذی، مختصر معانی کا امتحان دیا۔ آئندہ سال مشکوٰۃ، ہدایہ، مقامات پڑھیں۔ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پڑھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے اس دوران میں میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں تصحیح کا کام بھی کیا، اور اسی طرح کبھی دہلی میں۔ اور دیوبند بھی تشریف لا کر دارالعلوم کی دیکھ بھال کرتے۔ مولانا شیخ الہندؒ نے ان سب مقامات میں حضرت نانوتویؒ کے ساتھ رہ کر سفر حضر میں سلسلہ درس جاری رکھا۔

مولانا نانوتویؒ کی خدمت میں سبق پڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھہرنا گویا گناہِ کبیرہ تھا۔ اس قسم کے امور اور بے موقع سوال سے مولانا مکدر ہو جایا کرتے تھے اور سبق کا لطف ہی جاتا رہتا۔ جو شخص ذہین اور مستعد ہوتا اور سبق کو مطالعہ میں خوب ذہن نشین کر کے جاتا وہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی امید کر سکتا تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سنتے رہیں، عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا۔ لوگ خوشی سے قبول کرتے اور حاضر ہوتے۔ بہت عالی دماغ اور ذکی لوگ ہی مطالعہ پڑھتے اور سوال کرنے کی جرأت کرتے تھے۔

مولانا کا طرز ہی جدا تھا۔ حدیث ہو یا منطق، کلام ہو یا معانی، ہر فن کے متعلق عجیب و غریب تحقیقات بیان فرماتے جس سے ہر مسئلہ کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہدہ طور پر ہو جاتی تھی، اور اس قسم کے عالی مضامین بیان فرماتے کہ کسی کے خیال میں آئے تھے نہ سننے میں۔ مولانا کی جو دو چار تصنیفات ہیں وہ بھی اسی شان کی ہیں۔

مولانا شیخ الہندؒ کا مدت سے ان کے ساتھ رہ کر ان سے استفادہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ان کے استعداد و صلاحیت دماغی کے معترف تھے، لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ یہ ذہین طالب علم مجھ سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہے کر لے۔ مولانا شیخ الہندؒ قدرتی طور پر طبع سلیم، ذہن رسا اور قوی حافظہ کے مالک تھے، یہ سب وجوہ مزید شفقت کا باعث تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا نانوتویؒ اپنی بصیرت اور نورِ فراست سے سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص اپنے زمانہ کا مجاہد اکبر اور ملت اسلامیہ کا مایۂ ناز فرزند ہوگا، لہٰذا اس کی جتنی بہتر سے بہتر تربیت ہو سکے کی جائے۔

مدرس دارالعلوم

مولانا شیخ الہندؒ ۱۲۸۹ھ میں صحاح ستہ اور دیگر علوم و فنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرما کر بطور معین مدرس دارالعلوم میں پڑھانے لگے۔ ۱۹، ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ کے جلسۂ دستار بندی اور اہل اسلام کے مجمع عام میں اس وقت کے اکابر شیوخ و علماء کی موجودگی میں مولانا شیخ الہندؒ

کی دستار بندی ہوئی۔ اگرچہ مولانا اپنی تعلیم کے آخری سالوں ہی میں بطور معین مدرس کام کرنے لگ گئے تھے اور فراغ وتحصیل تعلیم کے بعد باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں شمار ہونے لگے تھے، تاہم ۱۲۹۲ھ میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ایک مدرس چہارم جو تنخواہ دار ہو، کی ضرورت محسوس فرمائی۔ دوسرے کئی ایک ذہین وفطین دارالعلوم کے فارغ حضرات بھی موجود تھے اور اپنی تعلیم کے زمانہ میں وہ بعض حیثیتوں سے مولانا سے فائق نظر آتے تھے۔ لیکن اس زمانہ کے مقدس مہتمم اور سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کی فراست صادقہ سے نظر انتخاب مولانا شیخ الہند پر پڑی۔ اور مولانا کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب سے ذکر کیا۔ آپ کے والد ماجد کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اموال عطا فرمائی تھی اور یوں بھی نہایت غیور وشریف تھے اس لئے ان کو گوارا نہ ہوا کہ ان کا لڑکا مدرسہ سے معاوضہ لے کر کام کرے۔ لیکن دوسرے بزرگان مدرسہ کو اپنے بہت سے مصالح پیش نظر تھے لہذا ان سب بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھ کر خاموش رہے اور مولانا شیخ الہند ۱۲۹۲ھ میں بشاہرہ پندرہ روپے ماہوار مدرس چہارم مقرر ہوئے۔

مولانا اگرچہ درجہ چہارم کے مدرس تھے اور خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ "ابتداء میں قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بھی غنیمت سمجھتا تھا" لیکن طلبہ پہلے ہی سے آپ سے بڑی کتابیں پڑھ رہے تھے اور اب رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور خداداد ذہانت ظاہر ہونے لگی اور اوپر کی کتابیں بھی حسب موقعہ آپ کے زیر درس آنے لگیں ۱۲۹۳ھ ہی میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف، مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ وغیرہ جیسی نو کتابوں کے اسباق روزانہ بے تکلف پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں تو صحاح ستہ کی دوسری کتب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی۔

حج بیت اللہ ۱۲۹۴ھ میں بزرگان ہندوستان نے بیت اللہ کا قصد کیا۔ اور اس قافلے میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم دارالعلوم۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اور دیگر بہت سے منتخب روزگار صلحاء وعلماء شامل تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ بھی زیارت حرمین شریفین نیز ان اکابر علماء کی معیت میں بڑی سعادت سمجھتے ہوئے ساتھ شامل ہوگئے۔ ہندوستان سے ایسے نیک اور بلند پایہ علماء کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوا ہو اس کی نظیر دسابق میں ملتی ہے اور نہ آئندہ امید ہے۔ جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی شوق زیارت میں سینکڑوں بندگان خدا مصافحہ اور دست بوسی کے لئے موجود ہوتے۔

بمبئی میں بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر سب قافلہ جہاز میں سوار ہو کر تیرہ دن میں جدہ اور وہاں سے اونٹوں پر مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ ان دنوں مکہ معظمہ میں تھے۔ طواف و زیارت کے بعد سارا قافلہ ان کی زیارت کو حاضر ہوا۔ اور بعد فراغت حج مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور بیس دن وہاں قیام فرمایا۔

شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے اجازت حدیث اور حاجی امداد اللہؒ سے شرف بیعت

استاذ الاساتذہ شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنیؒ مدینہ منورہ میں تھے۔ سب حضرات ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جناب ممدوح بھی کمال شفقت اور گوناگوں عنایات فرماتے، اور باوجود انتہائی کم گوئی کے باخلاق و عنایات ہر ایک سے حسب درجات و مراتب گفتگو فرماتے۔ ہر عالم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اگر کسی مشہور محدث یا استاذ حدیث سے ملاقات ہو تو اس سے اجازت لی جائے۔ اور پھر جن بزرگوں سے واسطے کم آتے ہوں ان سے اجازت لینے کو ہر کوئی سعادت سمجھتا ہے۔ مگر مولانا شیخ الہندؒ کا استاذ کا کمال ادب ملاحظہ کیجئے کہ مولانا نانوتویؒ کی موجودگی میں شاہ صاحبؒ سے اجازت و سند حدیث لینا خلاف نیاز مندی سمجھا۔ لیکن واپسی کے قریب جب حضرت استاذ ہی نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے بکمال بشاشت مولانا شیخ الہندؒ کو سند حدیث عطا فرمائی۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہوا، تو حضرت نانوتویؒ کی استدعا پر شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہؒ نے نہ صرف مولانا شیخ الہندؒ کو شرف بیعت عطا فرمایا بلکہ خلافت و اجازت بیعت سے ممتاز کیا۔ اور بعد میں تحریری اجازت نامہ ہندوستان روانہ فرمایا۔

مراجعت وطن

بعض رفقاء کو مصارف کی دشواری ہونے لگی تو حضرت حاجی صاحبؒ کے اشارہ پر مجبوراً یہ مقدس قافلہ مراجعت فرمائے ہندوستان ہوا۔ جدہ پہنچ کر کلفت انتظار سے بچنے کے لئے جلد ایک ایسے جہاز میں سوار ہو گئے جس میں مسافر کثیر اور جگہ تنگ تھی۔ باوجود باہمی مروت و ایثار کے سب کو نہایت دقت اور تکلیف پیش آئی۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ کو مقامات مقدسہ اور اپنے بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور خانہ کعبہ کے ادب و احترام کی وجہ سے دور تک پا پیادہ چلنے کی تکلیف سے خاصی تکان تھی۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ہدہ (حدہ) پہنچ کر بخار ہو گیا۔ جہاز کی تنگی اور کش مکش سے اس پر مزید اضافہ ہوا۔ سوار ہونے کے تیسرے دن بعد صفراء کے دورہ سے بخار تیز ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ ساتھی مایوس ہو گئے۔ جہاز میں وبا بھی تھی، دو تین آدمی روزانہ فوت ہو جاتے تھے اس لئے اور زیادہ خطرہ تھا، نہ دوا تھی نہ علاج نہ جائے راحت نہ سکون۔ مولانا شیخ الہندؒ نے خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا اور استاذ کا خوب خوب حق خدمت ادا کیا۔ تمام تمام رات بیدار رہے۔ عدن پہنچے تو بھاگ دوڑ کر کہیں سے کونین، گلاب اور لیموں تلاش کر کے لائے اور حضرت مولانا کو قدرے افاقہ ہونے پر قافلہ کی جان میں جان آئی۔ چودھویں روز جہاز بمبئی پہنچا۔ دو ایک روز وہاں قیام کر کے مولانا شیخ الہندؒ اپنے استاذ اور مربی و مرشد کو ان کے قصبہ نانوتہ پہنچا کر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں دیوبند واپس آئے۔

شیخ الہندؒ کی غیر حاضری میں تقریباً چھ ماہ مولانا عبدالعلیؒ ان کی جگہ کام کرتے رہے۔ واپسی پر آپ بدستور سابق درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت نانوتویؒ نے بھی دیوبند قیام فرما لیا۔ اس لئے استفادہ

کمالات استاذ کے لئے شیخ الہندؒ کے مشاغل علمیہ میں دلچسپی اور زیادہ ہوگئی۔ نو نو دس دس اسباق روزانہ پڑھاتے اپنی مشہور کتاب " ایضاح الادلہ " تحریر فرماتے اور حضرت استاد کو سنا کر خوشنودی حاصل کرتے اور شب کا بہت سا حصہ علاوہ کتب بینی کے عبادت، درود و وظائف میں گزارتے۔ انہی دنوں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی تحصیل علم کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ اور منجملہ اور اسباق کے ملاحسن اور مختصر المعانی حضرت شیخ سے پڑھیں۔

حضرت شیخ الہندؒ اپنے ان مشاغل حسنہ میں جن کو وہ ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے نہایت محویت کے ساتھ مشغول تھے کہ ناگاہ ۱۲۹۷ھ کا واقعہ ہائلہ اور صدمۂ جانگزا حضرت نانوتویؒ کی وفات کا پیش آیا۔ حضرت واپسی سفر حج میں مریض ہو کر صحت یاب ہو گئے تھے لیکن کھانسی کی شکایت رہ گئی تھی اور کبھی کبھی تنفس کا دورہ ہو جاتا تھا۔ ۱۲۹۷ھ میں مرض میں زیادتی ہوگئی اور بہت ضعیف ہو گئے۔ پنجشنبہ (۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ) کو انتقال فرما گئے۔ اس کے تیسرے دن بعد سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے بھی وفات پائی اور صرف ایک دن کے فاصلے سے دنیا اپنے وقت کے دو بہترین محدثوں سے خالی ہوگئی اور طبقہ صلحاء اور اہل علم پر غم پر غم اور صدمہ پر صدمہ پڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رحلت استاد کا اثر مخدوم استاد کی وفات کے حادثہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو بالکل پژمردہ کر دیا۔ تعلیم و تعلم سے دل سرد ہوگیا۔ رنج و غم تو تھا ہی، اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی دل نشین ہوگیا تھا جس کو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے کہ " ہمارے مشاغل علمی اور درس و تدریس صرف اس لئے تھے کہ کچھ استعداد اور قابلیت پیدا ہو جائے اور حضرت کے مضامین و ارشادات کو سمجھنے لگیں، اب کہ حضرت ہی رخصت ہو گئے اس قیل و قال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ، فکر معاش نے ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کر لیں گے "۔ چنانچہ آپ نے مدرسہ آنا بھی چھوڑ دیا اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے۔ مگر حق تعالٰی نے آپ کے ذریعے سے احادیث نبویہ کی نشر و اشاعت اور علوم دینیہ کی خدمت اور فیوض قاسمیہ کی افادت مقدر فرمائی تھی۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ (قدس سرہٗ) کو خود بھی حضرت نانوتویؒ کی وفات کا صدمہ کچھ کم نہ تھا۔ کیونکہ آپ سے زیادہ مولانا کا قدر شناس کون ہو سکتا ہے، لیکن حوادث و نوازل کے وقت اہل عزم خود بھی سنبھلتے ہیں اور دوسروں کو بھی سنبھالتے ہیں اور حق تعالٰی کے علم میں جو امر مقدر ہوتا ہے باوجود ظاہری ناسازگاری کے اس کے لئے ایسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

مہتمم صاحبؒ نے ایک دو مرتبہ سمجھایا اور تیسری مرتبہ اپنے ساتھ مدرسہ لے آئے۔ نادیہ نشینی اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں جو کچھ فرق ہے وہ حضرت بھی خوب سمجھے ہوئے تھے مگر دوسری حالت کا غلبہ تفرید و تجرد کو ترجیح دیتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہ کے ارشاد نے الہام ربانی اور لطیفۂ غیبی کا کام دیا۔ بزرگوں کی عظمت اور ان کے ادامر کی وقعت حضرت کے قلب میں ہمیشہ بدرجۂ کامل رہی۔ مولانا ممدوح کے ارشاد کی تعمیل کی اور بچشم گریاں درس جاری فرما دیا۔

حضرت نانوتوی کے مخصوص تلامذہ میں سے دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن امروہوی بھی ترک تدریس میں حضرت مولانا کے ہم خیال اور شریک حال تھے۔ ایک ماہ تک مغموم و محزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے، لیکن اہل دیوبند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ارشاد سے مجبور ہوکر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسی میں مشغول ہوگئے۔

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ دارالعلوم کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مدرس اول کی وفات کا سخت صدمہ پیش آیا۔ مولانا ممدوح خود بھی ایک نمونۂ سلف، جامع العلوم، جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، اور حضرت نانوتوی کے ہم عصر اور جانشین سمجھے جاتے تھے۔ مدرسہ کے سرپرست اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قرار پائے تھے مگر چونکہ آپ کا قیام اپنے وطن گنگوہ میں تھا اس لئے ہر وقت پر معاملہ میں شریک حال نہ رہ سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ذات بابرکات سے کلی جزوی ہر قسم کے امور میں نہایت قوی اعانت پہنچتی تھی اور ہر قسم کے فیوض و برکات سے متمتع ہوتا رہتا تھا اور یہ کہ تمام علماء عصر مولانا کے والد ماجد مولانا مملوک علی صاحبؒ کے خوشہ چیں اور شاگرد تھے۔ ایسے قوی الاثر جامع الصفات عالم کے سایہ سے محروم ہوجانا دارالعلوم کے لئے کوئی معمولی صدمہ نہ تھا، لیکن سوائے صبر و تسلیم چارۂ کار کچھ نہ تھا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سید احمد صاحبؒ جو فنون ریاضیہ میں خصوصیت کے ساتھ امام کہلانے کے مستحق تھے بشاہرہ چالیس ۴۰ روپے مدرس اول مقرر ہوئے۔ مولانا مُلا محمود صاحب دیوبندی پینتیس ۳۵ روپے مدرس دوم۔ اور حضرت تیس ۳۰ روپے مشاہرہ پر مدرس سوم۔ اور مولانا عبدالعلی صاحبؒ مدرس چہارم۔

اس تغیر سے تقریباً دو ہی سال کے بعد دارالعلوم کے سب سے قدیم اور بافیض عالم مُلا محمود صاحبؒ کی وفات ہوگئی اور حضرت مولانا انہی کے مشاہرہ پر مدرس دوم ہوگئے۔ ترقی مدارج اور اضافۂ مشاہرہ سے حضرت مولانا کے کار تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ حضرت بخلوص و للہیت تمام علوم کی کتابیں پڑھا رہے تھے اور طلبہ نہایت شوق و گرویدگی کے ساتھ دن رات میں جب بھی موقع ملتا تھا حضرت کے فیوض حاصل کرتے رہتے تھے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس

۱۳۰۵ھ میں مولانا سید احمد صاحبؒ مدرس اول اپنی ضروریات کے خیال اور بعض مصالح سے بڑی تنخواہ پر بھوپال تشریف لے گئے۔ تعلیم تو حضرت پہلے ہی سے بڑی جماعتوں کو دے رہے تھے اور جیسا کہ سابق میں گزرا۔ اب سے بارہ سال پہلے ۱۲۹۲ھ و ۱۲۹۵ھ سے کتاب صحاح و بخاری شریف و دیگر علوم کی انتہائی درسیات پڑھا رہے تھے۔ اب آپ مولانا سید احمد صاحبؒ کے مشاہرہ پر باتفاق آراء اکابر و اصاغر مدرس اول نامزد ہوئے۔ اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۳۹ھ تک تینتیس سال حضرت مولانا صدر مدرس رہے، اور آپ کی ذات بابرکات سے مدرسہ کو جو ترقی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مولانا کو کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرات پر نظر نہیں ہوئی۔ اور جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دارالعلوم کی خدمت کو خدائے تعالیٰ کا کام اور دینی فرض سمجھ کر بجا لاتے

رہے ۔ مشاہرہ قبول فرماتے تھے مگر بضرورت و کراہت ۔ اگر آپ متاع دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پر بٹھاتے اور صابع روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے ۔ لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاد (قدس سرہٗ) کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبزی و شادابی کو مطمح نظر بنائے رکھا اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کر دی ۔ دارالعلوم کے مخالفوں نے بدنیتی سے موقع بموقع دل میں رنجش ڈال کر علیحدگی پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکام رہے ۔ پیرجی عبدالرزاق صاحب گنگوہیؒ مہتمم مدارس اسلامیہ دہلی نے بہت اور حسن نیت سے کوئی تحریک کا موقعہ نہ چھوڑا ، مگر دل میں حسرت ہی لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت دہلی قیام فرما کر فیوض جاری فرمائیں ۔ اور بجا طور پر الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے خاندان کی نیابت کا حق دہلی میں رہ کر ادا فرمائیں ۔

استقامت ، استقلال اور محنت و ریاضت

۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ آپ کا مشاہرہ پچاس روپے ہو گیا آپ نے خاموشی سے قبول فرما لیا ۔ دو مرتبہ استاد شفیق حضرت نانوتوی رح کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں "محمود حسن کب تک مدرسہ سے مشاہرہ لیتے رہو گے" دونوں مرتبہ پورا عزم مشاہرہ چھوڑ دینے کا فرمایا لیکن حضرت گنگوہیؒ کے ادب سے مجبور تھے ، اجازت نہ دی بلکہ ہنس کر فرمایا کہ ۔نہیں ان کو کہنے دو ، ہرگز نہ چھوڑو ۔۔۔ مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہو گئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے پچھتر روپے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ بالکل بند کر دیا پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے ۔

حضرات منتظمین کی جاں فشانی اور تدابیر حسنہ اور مدافعت اعداء کو بھول جانا کفران نعمت ہے اور مناسب مواقع پر اس کا مفصل اظہار واجب و لازم ، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی معنوی برکت کے ساتھ ظاہری مستعدی و تندہی اور دل سوزی نے بھی مدرسہ کے لئے باران رحمت کا کام کیا اور مدرسہ دیوبند کو ایک عظیم الشان دارالعلوم کی حیثیت تک پہنچا دیا ۔ صبح کی نماز ادا فرما کر درس کے لئے آ جاتے ۔ کبھی پیشاب یا وضو کے لئے درمیان میں اٹھتے تو مضائقہ نہیں ورنہ متصل اور مسلسل درس دیتے ہوئے گیارہ بارہ بج جاتے تھے اور ظہر کے بعد پھر یہی مشغلہ موجود تھا ۔ عشاء کے بعد بہت دیر تک کتب بینی کرنا اور پھر کچھ دیر آرام کر کے اپنے مولیٰ کی عبادت اور بطرز مسنون ادائے تہجد میں مشغول ہونا اور بعد تہجد کے طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھانا ، اور نماز فجر کے بعد عصر تک تعلیم میں مصروف رہنا آپ کا ہمیشہ معمول رہا ۔

حضرت نے ۱۲۸۹ھ سے بحیثیت معین المدرسین دارالعلوم میں کار تعلیم شروع فرمایا تھا اور ۱۲۹۲ھ میں آپ باقاعدہ مدرس ہو گئے تھے ۔ اس لحاظ سے چوالیس سال کامل خدمت تعلیم میں بسر فرمائے اور ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۳۳ھ تک اڑتیس سال کامل علی الاتصال حضرتؒ نے علم دین کی اشاعت فرمائی ۔ اس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روز

سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا اور نہ کوئی ایسا شغل پیش آیا نہ کوئی مرض لاحق ہوا جس سے کار تعلیم میں دو چار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا۔ یہ نصف صدی (تقریباً) کا زمانہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہندوستان میں کیا ان آخری قرنوں میں دنیا میں ایسے بہت کم علماء شمار ہو سکتے ہیں جنہوں نے اس قدر طویل زمانہ افادۂ تلامذہ اور علوم اسلامیہ کی خدمات میں گزارا ہو۔

حضرت سے چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ علمی کام لینا تھا اس لئے ظاہری مختصر قد و قامت اور ضعیف بدن کے ساتھ اندرونی قویٰ نہایت مضبوط بنائے تھے باوجود خدمت تعلیم میں اس قدر محنت کرنے کے اور باوصف شب بیداری اور کثرت ذکر اللہ کے نہ ضعف دماغ کی شکایت رہتی تھی، نہ ضعف بصر کا خلل، نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ مقویات کے خواہاں، معمولی سادہ غذا استعمال فرماتے تھے اور وہ بھی بہت قلیل۔

اس عرصہ میں تمام ہندوستان میں آپ کے علوم و کمال خصوصاً فن حدیث کے تبحر اور مہارت کی دنیا میں شہرت ہوگئی تھی اور جابجا آپ کے فیوض پھیل گئے تھے، ہر نواح میں آپ کے شاگرد یا شاگردوں سے فیض یافتہ عالم باعث اشاعت علوم و موجب ہدایت خلق اللہ بن گئے۔ دارالعلوم میں دو قدیم بزرگوں کے سوا تمام مدرس آپ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی قابل اعتماد علمی درس گاہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں آپ کے بلا واسطہ یا بالواسطہ شاگرد مسند درس پر متمکن نہ ہوں۔

کابل، قندھار، بلخ بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپ کے علوم و فیوض سے مالامال ہوگئے۔ مولانا محمد اسحاق امرتسریؒ ایک باخدا عالم نمونۂ اتقیائے سلف نے مدینہ منورہ جاکر درس جاری فرمایا۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مولانا صدیق احمد صاحبؒ اسی مقدس دارالہجرت میں مخصوص طور سے اپنے مکان اور مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اشاعت علم کرنے لگے، اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رہ کا حلقہ درس خاص مسجد نبوی میں سید العرب والعجم کے روضہ منورہ و مطہرہ کے سامنے ایسی عظمت و برکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کے حلقے مختصر رہ گئے اور شرفائے مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے لگی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا۔ اخیر میں مرض بواسیر کا عارضہ ہوا تو بعض مخلصین نے کمانی دار گدہ بنوا کر رکھ دیا۔ اس پر بضرورت بیٹھتے تھے مگر کسی قدر گرانی و کراہت محسوس کر کے۔

تبحر علمی اور طریق درس

حضرت موصوف تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، منطق، معانی کی کتب محنت اور شوق سے بے تکلف پڑھاتے تھے اور ابتداء میں تو بہت ہی زیادہ مشغولیت و مشقت برداشت فرماتے تھے، مگر آخر میں بھی سنہ ۱۳۲۲ھ تک پانچ چھ گھنٹے روزانہ درس دیتے تھے۔ اس زمانہ کے بعد کچھ ضعف و امراض کے اور نیز اس سے کہ حضرت کے ممتاز تلامذہ علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ، مولانا سید حسین احمد مدنی رہ، اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

مدرسہ میں موجود تھے، آپ حسب ضرورت روزانہ دو یا تین گھنٹے درس دیتے تھے اور ترمذی شریف و بخاری شریف تقریباً ساڑھے نو ماہ میں بہ طمانیت تمام کرا دیتے تھے۔

حضرت کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا دوسرے مدارس کے فارغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت مؤدب طریق سے حاضر خدمت رہتے اور حضرت کمال عظمت و وقار سے درس دیتے۔ اوپر اوپر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا، دوسروں کی تحقیر اپنی تعریف کا نام و نشان نہ تھا، ہنسی مذاق اور تفریح طبع کے جملے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود۔ خطاب بالکل عام ہوتا تھا کسی کی خصوصیت نہ تھی۔ کم سواد طالب علم قرأت کرنے سے خود ڈرتے تھے۔ اور بے موقع سوال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے تھے اس طرح کہ حلقہ درس بالکل مجلس مناظرہ بن جاتی تھی۔ کبھی حضرت الزامی جواب سے طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے اور اور کبھی جامع مانع تقریر "شفاء لما فی الصدور" کا کام دیتی تھی۔ الزامی جواب میں ملکۂ تام تھا دو چار دفعہ اسی طرح ٹالتے رہتے بہت رد و بدل کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوت استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا۔

بہت سے ذی استعداد ذہین و فطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی استعداد سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنے شکوک و شبہات کے کافی شافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی و مضامین سن کر بہ سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسبی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

حلقہ درس دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن و حدیث حضرت کو ازبر تھے اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر۔ اور صحابہ و تابعین، فقہاء و مجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدی بناتے تھے نہایت سبک اور سہل الفاظ میں یا بامحاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا امنڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی نحیف جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان، ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا مسند درس پر تقریر کرتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی، لیکن سننے والے جانتے ہیں کہ جب صدر درس گاہ "نودرہ" میں تقریر فرماتے تو (باوجود درجہ قرآن مجید و مکتب فارسی کے بچوں کی آواز کے) مدرسہ کے دروازہ تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی۔

لہجہ میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی، چہرہ بنا لینا یا آنسو بھر لانا حضرت کا کام نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دل نشین ہو جاتی تھی اور سننے والا یہی سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔ اس لئے

بہت سے لوگ جو دور ہی دور سے دشمنوں کے افتراء کئے ہوئے عقائد فاسدہ سن کر بدعقیدہ ہو جاتے تھے ، اپنی اولاد و عزیزوں کے دیوبند آ کر تحصیل علم کرنے میں اس لئے مانع نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں گے۔

است: رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق و دقائق نقل فرماتے اور اپنی تحقیقات عجیبہ اور مضامین عالیہ سناتے مگر مفسرین و محدثین شراح و مصنفین کا ادب اس درجہ ملحوظ رکھتے تھے کہ کہیں شائبہ تنقیص بھی نہ آنے پاتا۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابوحنیفہ رح کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح ، چہرہ پر بشاشت ، تقریر میں روانی ، لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا ۔ دلیل پر دلیل ، شاہد پر شاہد ، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے ، تقریر رکتی ہی نہ تھی ۔ اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم رح کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف المزاج لوٹ جاتے تھے ۔ دور دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا بیان ثابت فرماتے کہ بات دل میں اتر جاتی تھی اور سامعین کا دل گواہی دیتا ، اور آنکھوں سے نظر آ جاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے ۔

بایں ہمہ ائمہ سلف کا ادب و احترام اور ان کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ " مذاہب مجتہدین حق ہیں اور سب مستدل بالکتاب والسنۃ ان کی تنقیص موجب بدبختی ہے اور سوء ادب باعث خسران " بے شک حضرت رحمۃ اللہ علیہ مَنْ عَمِلَ بِمَا یَعْلَمُ اٰتَاہُ اللّٰہُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کے مصداق اور اس شعر کے محمل تھے ۔ ؎

بینی اندر خود علوم انبیاءؑ　　　　بے کتاب و بے معین و اوستا

اس کے ساتھ ہی آپ نے نہایت محنت شاقہ اٹھا کر اور بقول شخصے دو دو چراغ کھا کر کتب بینی اور مطالعہ کا نہایت زیادہ اہتمام فرمایا تھا ۔ خصوصاً شروح حدیث بکمال غور و فہم مطالعہ فرمائی اور بعض کو کئی مرتبہ دیکھنے کی نوبت آئی ۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ذرا " عینی " اٹھا لاؤ ۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت بخاری کی شرح یا ہدایہ کی ، فرمایا اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہدایہ کی شرح لاؤ۔

لیکن حضرت صرف شراح کی تعلیم کے احاطہ میں محصور نہ تھے بلکہ وہ مضامین عجیب انہیں شروح و حواشی کے مطالعہ سے آپ کے ذہن صفی میں آتے تھے جو دید تھے نہ شنید ۔ حضرت نے شروح احادیث کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے اور ہمارے فقہاء و شراح کے مجمل دلائل کو اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ باید و شاید ۔ محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاص تعلق تھا ۔

امام بخاری رح کے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ پر کھول دیئے تھے یہاں تک کہ نظر بندی مالٹا کی یکسوئی میں آپ نے خود بخود اس داعیہ الٰہی سے مجبور ہو کر تراجم بخاری کے متعلق تحریرات لکھنی شروع فرمائی تھیں ۔ بخاری کے متعلق کوئی شخص سوال کرتا تو خوش ہو جاتے اور بیان فرمانا شروع کر دیتے ۔

امام مسلمؒ نے اپنی کتاب کے خطبہ میں امام بخاریؒ پر تعریض کر کے جو گرفت کی ہے اس پر فرمایا کرتے تھے کہ جب ملاقات ہوئی تو بخاریؒ کے خادم و عقیدت مند ہو گئے کاش اسی طرح امام ابو حنیفہؒ اور امام بخاریؒ کی ملاقات ہو جاتی، تو امام بخاریؒ اپنے تمام اعتراضات واپس لے لیتے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت کو شرح صدر کر دیا تھا اسی کا اثر طلبہ پر تھا۔ بمقتضائے آنچہ از دل خیزد در دل ریزد۔ وہ دقیق فرق، وہ لطائف و رموز سناتے کہ طالب علم بے ساختہ سبحان اللہ کہہ اٹھتے اگر امام صاحبؒ کے مناقب بیان فرمانے لگتے تو ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا بیان فرماتے چلے جاتے تھے، سلسلۂ کلام ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ مالٹا سے واپسی کے بعد ایک روز حسب عادت عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھے، مجمع تھا امام صاحبؒ کا ذکر آگیا پھر کیا تھا۔ لطائف، دقائق، حالات و واقعات بیان ہونے لگے اور جب تک مغرب کی اذان نہ ہوگئی سلسلۂ کلام ختم ہی نہ ہوا۔ حضرت مولانا کا طرز تحدیث اور جمع بین الاقوال والاحادیث وہی تھا جو ہندوستان کے نامی گرامی علمی خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہما کا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اقوال کو نہایت اعتبار و اعتماد کے ساتھ نقل فرماتے اور نہایت ادب سے نام لیتے۔ آپ کی سند حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے کمال تبحر پر نظر فرما کر اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا عبدالرحمٰن پانی پتیؒ نے بقاعدۂ محدثین آپ کو اجازت حدیث عطا فرمائی تھی۔ لیکن درس و تدریس اور قرأت و تحدیث کے لحاظ سے آپ کی سند حدیث دو طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک اور ان کے اساتذہ کرام کے ذریعہ سے محدثین و مؤلفین کتب احادیث اور جناب سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

اوّل :- عن مولانا الشیخ محمد قاسم۔ عن مولانا الشیخ عبدالغنی۔ عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق۔ عن مولانا الشاہ عبدالعزیز۔ عن مولانا الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ثانی :- عن مولانا الشیخ احمد علی السہارنفوری۔ عن مولانا الشاہ محمد اسحاق۔ عن مولانا الشاہ عبدالعزیز۔ عن مولانا الشاہ ولی اللہ قدس اللہ اسرارہم۔

حضرت مولانا کے بلا واسطہ فارغ التحصیل و عالم شاگرد چالیس سال میں کم درجہ اوسط پچیس سالانہ رکھنے کے بعد ایک ہزار ہوتے ہیں اور معمولی شاگردوں اور بعض کتب پڑھ کر چلے جانے والوں اور بالواسطہ شاگردوں کی تو کچھ انتہا ہی نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منتظمین میں چونکہ خلوص اور تقدس بدرجہ کمال موجود تھا اس لئے دارالعلوم ابتداء ہی سے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کر رہا تھا اور ان کی ظاہری و باطنی توجہ کے آثار و برکات اس میں جلوہ نما ہو رہے تھے اور اسی کا نتیجہ اس کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ دیگر اکابر کے بعد حضرت مولانا اس کی صدر مدرسی کے لئے تجویز کئے گئے۔ پھر آپ کی اہلیت و شہرت و عظمت اور شب و روز محنت اور ایثار و خلوص اور باطنی ہمت کی وجہ سے جو شہرت

وعظمت دارالعلوم کو حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اور گویا آپ ہی کے فیوض نے اس کو بجا طور پر دارالعلوم کا لقب دلوایا ہے۔ اس کے منتظمین نے جب بڑے بڑے خطرناک فتنوں میں سے اس کو سلامت بچا کر نکالا، اور شدید طوفانوں میں سے اسے ساحلِ نجات پر لگایا تو مولانا ان کے پشت پناہ تھے اور جب اپنی حسنِ سعی سے اس کو مدارج ترقی پر پہنچایا تو حضرت ان کے دست راست تھے۔

حضرت کو دارالعلوم سے اس قدر گہرا تعلق رہا ہے کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔ حضرت کے والد ماجد اس کے ابتدائی بانیوں اور اولین سرپرست ممبروں میں تھے۔ حضرت کبھی اس کے سابقین بہترین طلبہ میں تھے، کبھی معین کہلاتے تھے کبھی مدرس سوم و چہارم نظر آتے تھے، کبھی مدرس دوم سے صدر مدرسی کی مسند پر ممتاز دکھائی دیتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ کبھی ممبر مشورہ اور کبھی اعلیٰ سرپرست تسلیم کئے جاتے تھے، ہر حادث کی انتہا ہے اور ہر شے کو فنا۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد جب حضرت کے روحانی سرپرست ہونے کا نمبر آیا تو رخصت کا وقت بھی قریب آ پہنچا۔ یعنی آپ دارالعلوم کی مسلسل پینتالیس سال تک خدمت کرتے ہوئے ملک و ملت کی آزادی کی خاطر جب کمر ہمت باندھ کر میدان میں نکلے تو پھر دارالعلوم سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا جس کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔

محمودؒ کہ بود مرکز سرِّ وجود
آں نقطہ قضا ز لوحِ ہستی بزدود

ہر کس کہ باو رسد بجائے برسد
محمود رسید در مقامِ محمود

حضرت شیخ الہند رح کی سیاسی خدمات

آئندہ مضمون حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی خود نوشت سوانح نقش حیات ج ۲ سے ماخوذ ہے۔ ہم نے بعض جگہ مضمون کو مختصر کر دیا ہے۔ (الرشید)۔

تحریک انقلاب عرف ریشمی خطوط کی سازش

ہندوستان جب کہ سولہویں اور سترہویں صدی میں آسمان سیاست پر آفتاب درخشاں بن کر چمک رہا تھا اسی زمانہ میں سامان کسوف بن کر منحوس یورپین قومیں پہلے پرتگیز پھر ان کی دیکھا دیکھی انگریز، فرنچ، ڈچ، جرمن وغیرہ ہندوستان آئیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حکام نے مہمان نوازی کے فرائض حسب عادت سلاطین ہند انجام دیئے، ان کو نہ صرف داخلہ کی اجازت دی بلکہ سکونت تجارت، حقوق شہریت وغیرہ بلا رکاوٹ دیئے گئے، انگریز بھی مثل دیگر اقوام اس خوان نعمت سے فیض یاب ہوئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے انگریز تاجر اطراف و جوانب ہند میں پھیل گئے، ان کو اپنے یورپین ہم وطن اقوام سے رقیبانہ کش مکشیں بھی پیش آئیں۔ بالآخر ۱۶۰۰ء میں ان کے تقریباً ایک سو تاجروں کی منظم جماعت بنام ایسٹ انڈیا کمپنی بن گئی۔ جس نے تجارتی کاروبار اجتماعی قوت سے جاری کیا، اور غدارانہ بلکہ ظالمانہ طریقہ سے بہت زیادہ کمایا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی نیتیں فاسد اور ارادے نہایت خباثت آمیز ہوتے گئے، یہاں تک کہ انہوں نے ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ آف بنگال پر حملہ کر دیا اور اس کے ارکین دولت میں سے میر جعفر اور امی چند دو وزیروں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو کر ملک گیری اور حکومت شروع کر دی۔ یہ چسکا ان کو ایسا لگا کہ ہر وقت اور ہر آن یہی دھن لگی رہتی تھی۔ بالآخر ۱۸۰۳ء تک تقریباً اکثر ہندوستان میں ان کا مکمل اثر اور پورا اقتدار قائم ہو گیا۔ اور اس قدر جرأت ہو گئی کہ بادشاہ دہلی سے جبراً اپنی حکومت پر دستخط کرا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ "خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکومت کمپنی بہادر کی" ان حالات کو علمائے اسلام دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے، آخر کار حکام سلطنت کی غفلت، بے پرواہی، بے وفائی، بزدلی، ارباب اقتدار کے آس پاس کے نفاق کے مظاہروں وغیرہ نے مجبور کیا کہ عام مسلمانوں کو متنبہ کیا جائے

(اس سے قبل شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اپنے مخصوص انداز میں، کتابی صورت میں تحریروں کے ذریعہ حکام و ارباب اقتدار کو طرح طرح سے اشتباہ کر چکے تھے لیکن یہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے) چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے جانشین رشید حضرت شاہ عبدالعزیز رح نے آزادی کے متعلق فتوے دے دیا اور عام مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد کرانے کے فریضہ کو سمجھایا۔ اس وقت سے مسلمانوں اور خصوصاً اہل علم میں یہ تحریک انقلاب شروع ہوئی اور تقریباً بیس برس کے عرصہ میں تمام ہندوستان میں شعلہ جوالہ بن کر یہ تحریک پھیل گئی اور ایک مکمل نظام اور مکمل قوت شروع ہو گئی بسنہ ۱۸۲۴ء میں مغربی سرحد (شمالی صوبہ سرحد) میں پہنچ کر اس کی عملی کارروائی جاری ہو گئی، جس کی امارت و قیادت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہما نے کی (اس کی تفصیل دیکھنے کے لئے مولانا غلام رسول مہر کی تصنیف "سیرت شہید" اور مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تصنیف "سیرت سید احمد شہید" ملاحظہ فرمائی جائے جن میں اس تحریک کے متعلق سیر حاصل تفصیل پیش کی گئی ہیں) چھ برس تک کامیابیوں کے ساتھ یہ کارروائی جاری رہی مگر انگریزی چالبازیوں اور آپس کے نفاق اور غداریوں وغیرہ کی وجہ سے ۱۸۳۰ء میں شکست ہوئی اور تحریک تقریباً فیل ہو گئی۔ انگریزوں نے شرکاء تحریک پر عرصہ دراز تک انتہائی آزار اور انتہائی تکلیف کے اعمال جاری رکھے اور ملک میں ہندوستانیوں کی عام لوٹ کھسوٹ اور ایذاء دہی میں وہ انسانیت سوز حرکتیں کیں جن کی وجہ سے انگریزوں سے ملک بھر میں عام ناراضگی پھیل گئی اور ۱۸۵۷ء کا مشترک واقعہ پیش آیا جس میں ہندو اور مسلمان آپس میں مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے سربکف ہو گئے تھے۔ بدقسمتی اور خائنوں کی بدعملی کی وجہ سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان سب ہی برباد کئے گئے مگر مسلمانوں پر بربادی اور مظالم بہت زیادہ ڈھائے گئے اور ہر قسم کے انتہائی مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ شدت مظالم اور انگریزوں کی فوجی اور اسلحہ جدیدہ کی بے پناہ طاقت کی نمائش کی بنا پر ہندوستانیوں میں جنگ کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی ہمت نہ رہی، خوف و ہراس کا دور دورہ ہو گیا اور مظالم شنیعہ کا اندھیرا بنسبت سابق کئی گنا زائد پھیلا دیا گیا۔ بالآخر تنگ آ کر آئینی انقلاب کی تحریک بسنہ ۱۸۸۵ء میں بصورت کانگریس جاری کی گئی، اس کی رفتار بہت دھیمی تھی اور بالمقابل انگریز ہر قسم کے تنڈ کی کارروائی کر رہا تھا، تا آنکہ بنگال کی تقسیم کی نوبت آ گئی۔ لارڈ کرزن نے بنگال میں چاروں طرف افتراق کا جال پھیلا دیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑا کر حکومت برطانیہ نے اپنا مقصد خوب حاصل کیا مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موقعہ پر تقسیم کے منسوخ کر دینے کا اعلان کر دیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں یوپی میں ناگری کا اور اس کے بعد کانپور میں مسجد اور کلکتہ میں توہین جناب سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر فائرنگ کا فتنہ برپا کر دیا۔ ادھر ٹرکی جو عرصہ دراز سے مسلمانوں کا قبلۂ توجہ اور خلیفۂ دینی چلا آتا تھا اس کے ساتھ مظالم اور دردناک ناانصافیوں خصوصاً جنگ طرابلس اور بلقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے ایسے واقعات لگاتار پیش آئے جنہوں نے تمام ملک عموماً اور مسلمانوں کے قلوب میں خصوصاً بے چینی پیدا کر دی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جن کی گہرائی نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور ٹرکی پر زیادہ مرکوز رہتی تھی۔ ان واقعات سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ ان کے لئے آرام

دہین تقریباً حرام ہوگیا۔ تاریخ دانی اور گزشتہ واقعات ہند و ممالک اسلامیہ ایشیا و افریقہ اور یورپ وغیرہ پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان عمل میں نہ صرف خود نکلیں بلکہ ہندوستان کے ذی اثر علماء و قائدین کے ساتھ مل کر ایک ایسی تحریک چلائیں جس سے انگریز قوم کے نحس قدم ہندوستان سے نکل جائیں تاکہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ممالک اسلامیہ و افریقہ وغیرہ سے بھی اس کا اقتدار ختم ہو جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی مختصر تاریخ میں ہم ذکر کر کے آئے ہیں کہ مولانا مرحوم کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہم اللہ اجمعین سے حاصل تھا، سالہا سال ان کی خدمت عالیہ میں انتہائی اخلاص و شغف بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہنا ہوا تھا۔ اور ان حضرات کی وہ کامل و مکمل ہستیاں تھیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ سلگتی رہتی تھی، اس لئے حضرت شیخ الہندؒ کے دل میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت کی فیاضیوں سے ایسا قلب عطا ہوا تھا جس میں انسانی غیرت، اخلاص اور للہیت، وطن اور قومی حمیت، اسلامی ہمدردی وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ دماغ ایسا قوی عطا کیا گیا جس میں نہ صرف نقلیہ و عقلیہ کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے، بلکہ واقعات تاریخیہ اور اشعار ادبیہ اردو، فارسی، عربی کے بے شمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اعلیٰ درجہ کی عطا ہوئی تھی کہ مشکل سے مشکل مسائل ادنیٰ توجہ سے حل فرما دیتے تھے، اس لئے بیرون ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان اور طرابلس کے دل گداز اور ہولناک مظالم اور اندرون ہند کی انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں اور شرمناک وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ کی فراوانی نے انتہائی درجہ میں مایوس اور مضطرب کر دیا اور آمادہ کر دیا تھا کہ عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان انقلاب میں سربکف، کفن بردوش نکل پڑیں، زمانہ کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں، کاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور و خوض میں گزرا مگر چونکہ پانی سر سے گزر چکا تھا اس لئے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں قیاس سے بھی زیادہ مشکلات سامنے آئیں، سخت اور تند آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا، باد سموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے، احباب و اقارب مار آستین بن گئے، ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بن کر سد راہ اور کیوں نہ ہوتا، انگریز نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا نسیان ستاون کا سماں باندھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برق جہاں سوز سے زیادہ تباہ کن شمار کی جاتی تھی۔ برطانوی تشددات اور مظالم نے اس قدر قلوب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خفیہ پولیس اور

سی ۔ آئی ۔ ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن میں شبہ کرنا بھی بے دینی اور کفر سمجھا جا سکتا تھا ، چاروں طرف خفیہ پولیس کا جال بچھا ہوا تھا پھر کس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ہم خیال اور ہم زبان باہم عمل ہو سکتا ہے ۔ خصوصا جب کہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ دھرتا ہو ، بہر حال مولانا نے تمام خطرات سے قطع نظر ضروری سمجھا اور " ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم " کہتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اس بحر زخار اور ہولناک طوفان میں کود کر آگے بڑھے اور لوگوں کو ہم خیال اور رفیق سفر بنانے لگے ، بڑے بڑے علماء اور مشائخ سے چونکہ ناامید اور مایوس تھے ، (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی چاہئے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی) وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے بہت زیادہ خطرات لاحق ہوتے ہیں ۔ اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھدار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے ۔ جن میں سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی ہیں ۔ مولانا عبید اللہ صاحبؒ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور نو مسلم شاگرد تھے ، سمجھ اور حافظہ اعلیٰ پیمانہ کا اور ہمت و استقلال بے نظیر قدرت نے عطا فرمایا تھا ۔ اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ میں تعلیمی کام کرتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد و خیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے اس کو زائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک و شبہات دین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے پکے مسلمان بن جائیں ۔ حضرت شیخ الہند دہلی تشریف لے گئے اور مولانا عبید اللہ صاحبؒ سے ملاقات کی اور تذکرہ میں فرمایا کہ " جب کہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد و زندیق بنا دیں گے ۔" اور واقعہ بھی تھا ڈبلیو ہنٹر کہتا ہی ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو) چنانچہ مولانا عبید اللہ صاحبؒ کی سمجھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اسکیم آگئی اور وہ عالی ہمتی اور تن دہی کے ساتھ تمام ہولناک خطرات کو پس پشت ڈالنے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئے ۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ

> " مولوی عبید اللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا حالانکہ مولوی عبید اللہ تو تعلیمی جد و جہد میں منہمک اور مشغول تھے میں نے ان کو ادھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا "

الغرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور اپنا ہم عمل بنا لیا ، چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ ، پنجاب ، اور سرحد وغیرہ میں تھے انہوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے ہموار کیا اور اس تحریک کا ممبر بنایا ، نیز دہلی میں رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے ۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم ، مولانا محمد علی جوہر مرحوم ،

مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد؟ وغیرہ حضرات کے لئے بھی مولانا عبیداللہ صاحبؒ ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبیداللہؒ کو سرحد، یاغستان، سندھ وغیرہ میں بھیجا اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا۔ (یہ اسکیم کیا تھی اس کا مفصل تذکرہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سیرتی خاکہ میں ملاحظہ کیا جائے)۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ابتدائی کارگزاری

اس تحریک کی ابتداء میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (وائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا اور وطن عزیز کو آزاد کرانا ممکن نہیں[1] ہے اس کے لئے مرکز اور اسلحہ، سپاہی، مجاہدین وغیرہ ضروری ہیں، بنا بریں مرکز یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے تھے اور قوی ہیکل وجانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق و متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انہی سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔ اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں۔

الف :- ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے تنازعات قدیمہ اور شخصی وقبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

ب :- ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

ج :- ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

د :- حضرت سید احمد شہیدؒ کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ستیانا اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں عرصے سے چلی آتی ہیں ان کو دور کرنا چاہیئے) انہیں مقاصد کے لئے حاجی ترنگ زئی صاحبؒ سے بھی بار بار استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کے لئے کوشش کریں۔ بالآخر حاجی صاحب موصوفؒ جنگ عظیم چھڑ جانے پر آزاد قبائل میں گئے، مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہو گیا۔

اس تحریک آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت

حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اس میں حضرت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقاء انقلاب ٹھہرا کرتے تھے ان کو راز داری کے ساتھ خدام خاص ٹھہرا دیتے تھے۔ اکثر تنہائی کے اوقات میں یارات کو ان سے حضرت شیخ الہندؒ کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال پارٹیشن والے) ہوتے تھے۔ چونکہ راز داری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہ ہو سکے اور نہ حضرت سے پوچھنے کی نوبت آئی۔ علاوہ مذکورہ بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر بھی بے شمار تھے جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے، اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے نہایت سرگرم لوگوں کی فہرست پیش کر دی ہے اور یہ پانچ شاخیں بتلا دی ہیں جو کہ علاوہ مرکز دیوبند

---

[1] اس وقت نان وائلنس کا حربہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور کانگریس کی جو کوششیں ۱۹۱۲ء تک تھی ان سے کامیابی کی تمنا موہوم بلکہ عبث تھی کیونکہ اپنی ڈپلومسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ برسوں کی جدوجہد ایک لمحہ میں ختم کر دیا تھا۔ [2] اس مقام کا حاشیہ مضمون کے اختتام پر بطور ضمیمہ ملاحظہ فرمائیں۔

کے ہمارے علم میں آسکیں۔ ۱۔ دین پور، ۲۔ امروٹ، ۳۔ کراچی محلہ کھڈہ، ۴۔ دہلی، ۵۔ چکوال۔ ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی کی اور انتہائی اخلاص کی بنا پر صدر کہلانے کے مستحق ہوتے تھے۔ ورنہ باقاعدہ تقرر صدر اور سیکریٹری وغیرہ کا مقتضائے وقت اور ماحول کی بنا پر ممکن ہی نہ وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں عملی استحقاق مراد ہے رسمی کارروائی مراد نہیں۔

حضرت شیخ الہند کی ابتدائی کارگزاری

اس تحریک کی ابتداء میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (وائلنس) ہندوستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مرکز اور اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں۔ بنا بریں یاغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا، اور انہیں سے کامیابی کی امید کی گئی۔ اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں۔

الف :- ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

ب :- ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

ج :- ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

د :- حضرت سید احمد شہید کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد) جو کہ ستیانہ اور چمرقند میں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں جو عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دور کرنا چاہئے۔

چنانچہ اس لئے مولانا سیف الرحمن صاحب کو دہلی سے، مولانا فضل ربیؒ اور مولانا فضل محمود صاحبؒ کو پشاور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحبؒ وغیرہ کو آمادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے۔ ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ میں بفضلہ تعالے بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انہی مقاصد کے لئے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحبؒ سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مقاصد کے لئے کوشش کریں۔ ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں۔ ان کے حل کرنے کے خیال سے تاخیر فرما رہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد ترک بھی مجبور کر دیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انہوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں وہ انگریزوں نے ضبط کر لئے، اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں گھسیٹنے والے تھے، یہ ان معاملات کے علاوہ تھے جو کہ طرابلس غرب اور بلقان، کریٹ، یونان وغیرہ میں قریبی زمانہ میں پیش آئے تھے۔ بہرحال ترکی حکومت نے مجبور ہو کر اعلان جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کر دیا گیا۔ انگریزوں

نے عراق (بصرہ) پر، عدن پر، سویز پر، چناق قلعہ پر۔ اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر۔ اس پوزیشن کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہندؒ نے حاجی ترنگ زئی صاحبؒ کو مطلع کر کے ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں اور وہ ضروری کاروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا۔ چنانچہ جب حاجی صاحب مرحوم پہنچے تو مجاہدین کا جمگھٹا شمار سے زیادہ ہوگیا۔ مجاہدین چمرقند (حضرت سید احمد شہید) کی جماعت میں مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلہ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جانی اور مالی بے حد نقصان اٹھا کر اپنی سرحد پر لوٹ آنا پڑا۔ اور اپنے استحکامات قدیمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہوگیا۔ اس پر انگریزوں نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کاروائیاں شروع کر دیں۔

الف :- فوجوں کو اطراف ہندوستان سے جمع کر کے سرحد پر بھیجنا۔

ب :- عوام میں پروپیگنڈہ کرنا کہ یہ جہاد نہیں ہے، جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا، بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے۔

ج :- پانی کی طرح روپیہ خرچ کرنا اور اپنے لوگوں کو قبائل کے سرداروں کے پاس بھیجنا اور مال و زر بے شمار دے کر ان کو جماعت مجاہدین اور حاجی صاحب موصوف سے توڑنا۔

د :- عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمانان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہیئے اور اس وقت انتظار ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا علم بلند نہ کریں۔

ہ :- اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کر کے دستخط کریں۔ اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں۔

و :- امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبز باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا، اور جہاد کے لئے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمہارے لئے فلاں فلاں وعدے پورے کر دیئے جائیں گے۔

ان اور ان جیسی دیگر ڈپلومیسیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ اثر ہوا اور بہت برا ہوا۔ مگر ایسا نہ ہوتا اگر مجاہدین کو رسد اور کارتوسوں کی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آجاتیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانان ہند کے ہیجان اور اضطراب کو روکنے کے لئے ہندوستان میں اعلان کیا گیا۔

الف :- ترکوں کو جنگ کے لئے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک از خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم ترکوں کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔

ب :- یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لائڈ جارج نے اپنے

بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔

ج ۱۔ ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات، جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد وغیرہ پر بمباری نہ کریں گے۔ اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے، مگر بالکل اس کے خلاف کیا گیا جس کا تذکرہ ہم مفصل طور پر عہد شکنیوں کے باب میں کر چکے ہیں۔

د ۱۔ ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبدالحمید مرحوم کا فرمان مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا، اور ہندوستان میں پروپیگنڈہ کیا خلیفہ کے حکم پر چلنا مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔

چنانچہ امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل مرحوم اپنی تزک میں لکھتے ہیں کہ۔ اسی فرمان خلیفہ کی بنا پر سرحدی قبائل ٹھنڈے پڑ گئے۔ بہرحال ترکوں کے خلیفۂ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھوائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہند کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لئے پیش کئے گئے، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت برے الفاظ کہے۔

حضرت شیخ الہند کا سفر حجاز

حضرت شیخ الہند کے پاس برابر کیفیات جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ابتدائی گزدیوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہاد حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بحمداللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر رسد اور اسلحہ کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں، ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے اگر کارتوس اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں، ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں، آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔

چنانچہ اس امر کی بنا پر حضرت شیخ الہند کا ارادہ بدلا اور مولانا عبیداللہ صاحبؒ کو کابل اور خود کو استنبول پہنچانا ضروری قرار دیا۔ مولانا عبیداللہ صاحبؒ کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی ڈائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفرنامہ مالٹا میں لکھ چکے ہیں[1] ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں سیاسی کارناموں کو باقتضاء وقت ہم نے اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا۔ اور بعض امور کا جان بوجھ کر انکار کیا تھا کیوں کہ ماحول اس وقت یہی اسی کو چاہتا تھا اب چونکہ موانع زائل ہو چکے ہیں اس لئے صرف ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت سرحدی واقعات ہو رہے تھے، حکومت ہند بوکھلائی ہوئی تھی اور

---

[1] اس مقام کا حاشیہ مضمون کے اختتام پر بطور ضمیمہ صفحہ ۸۳ پر ملاحظہ فرمائیں

وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سی، آئی، ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت اور خطرناک تھیں، اس لئے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عمل داری سے نکل جائیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا، فوراً روانہ ہو گئے، اب حکومت کا شبہ اور قوی ہو گیا۔ چونکہ ترکی حکومت جنگ کر رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند وہاں جا کر ساز باز کریں گے اس لئے ان کو روکنا اور گرفتار کر لینا چاہئے، مگر وہ ملک کی اندرونی ہیجان اور گڑبڑ سے اس زمانہ میں بہت بچتی تھی۔ اس لئے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کئے گئے، مگر اس طرح کہ ہیجان کی نوبت نہ آئے۔ حضرتؒ کے سفر کی خبر معمولی نہ تھی ہر جگہ تار چلے گئے تھے ہر جنکشن پر آدمیوں کا جمگھٹا ہو جاتا تھا اس لئے راستہ میں کوئی کاروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بمبئی پہنچے تو وہاں بھی ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ گرفتاری کے لئے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پہنچا تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر یوپی نے بواسطہ مرکزی حکومت عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کو جہاز سے اتار لو۔ مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحبؒ کے لگے ہوئے تھے انہوں نے تار میں اس قدر تاخیر کر دی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا۔ پھر تار جدہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کر لو، اترنے نہ دو۔ مگر اس وقت گورنر حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدہ سے پہلے حجاج کو جزیرہ سعد میں اتار کر مکہ معظمہ پہنچایا جائے۔ اس لئے وہ تار کپتان کو اس وقت ملا جب کہ تمام حجاج جزیرہ سعد میں اتر چکے تھے۔ البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ متعدد سی، آئی، ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کر دیئے تھے تاکہ وہ تمام حرکات و سکنات کی نگرانی رکھیں اور نوٹ کرتے رہیں، مگر جزیرہ سعد میں اترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں شخص انگریزوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہیں۔ ان کو ترکی پولیس نے گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں حج کرا کر ہندوستان واپس کر دیا۔ تاہم کچھ مخفی لوگ باقی رہ گئے۔ بہرحال گرفتاری کی کوششیں پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہندؒ اللہ تعالےٰ کی حفاظت میں آگے آگے محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

حافظ عبدالجبار صاحبؒ دہلوی سے مولانا شیخ الہندؒ کی ملاقات

مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر کام کرتے ہیں، مگر دہلی کے تاجر حاجی علی جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے تجارت بھی ان کی بڑے پیمانہ پر ہے اور دین داری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے۔ اہل شہر اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خاندان کا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین مجاہدین ستھیانہ وغیرہ سے بھی قدیمی تعلق ہے۔ اس لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبدالجبار صاحبؒ سے جو کہ اس خاندان میں عمر اور سمجھ دار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے ملے اور ان سے ۔۔

گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات

معاملات ذکر کرکے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کرانے کی استدعا کی۔ انہوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ برسوں کی تجارت کرتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف تھے اور وہاں کے ترکی سکول کے پڑھے ہوئے تھے بلایا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ کر دیا۔ وہ گئے اور غالب پاشا سے ملاقات کرادی۔ اور جو باتیں حضرت شیخ الہند نے کیں ان کا ترجمہ کرکے غالب پاشا کو سمجھایا۔ غالب پاشا نہایت توجہ اور غور سے تمام باتوں کو سنتے رہے۔ معمولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں۔ اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس روز واپس آگئے۔ غالب پاشا نے ہندوستان کے معزز تاجروں سے بالا بالا تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے؛ لوگوں نے حضرتؒ کی علمی اور عملی حیثیت، شہرت اور قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔

لہذا اگلے دن جب حضرت ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو بہت زیادہ اعزاز کیا اور نہایت تپاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا قبول کیا۔ دیر تک تحریک اور مشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا، ان سے ملنے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے کا اصرار کیا تو انہوں نے ایک تحریر تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے بحیثیت گورنر حجاز لکھ کر دی۔ اور ایک تحریر گورنر مدینہ بصری پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد علیہ شخص ہیں ان کے مطالبات پورے کئے جائیں۔ پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں۔ کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ضرور کریں گے۔ عنقریب صلح کی مجلس منعقد ہوگی تو ہم اور ہمارے حلفا۔ جرمنی اور اسٹریا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے پوری جدوجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی لیڈر سست پڑ جائیں اور انگریزوں کی باتوں میں آکر اس کے انتداب (مینڈیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو اخباروں، خاص مجلسوں، تقریروں، تحریروں میں اندرون ہند اور بیرون ہند ایک زبان اور ایک قلم ہو کر یہی مطالبہ رکھنا چاہیئے، اور جب تک مقصد حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا پروپیگنڈا پوری طرح جاری کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے آپ کو واپس جانا اور آپس میں اتفاق واتحاد کے ساتھ مطالبہ کرانا ازبس ضروری ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں میں اگر ہندوستان جاؤں گا تو راستے ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لئے تیار کرکے ہندوستان بھیجتا ہوں۔ اگرچہ وہاں کی جماعتیں کانگریس وغیرہ اس پر عملدرآمد کر رہی ہیں مگر اب آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہوگی اور پہلے سے زیادہ زور دار طریقے پر یہ مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بالفعل بالا بالا ہندوستان کی مغربی حدود میں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں

میرے مشن کے لوگ کام کر رہے ہیں، ان میں مل کر کام کروں گا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ معظمہ میں رہے دو تین ملاقاتیں نہایت رازدارانہ ہوئیں۔ مکہ معظمہ کے ہندوستانی باشندوں یا انگریزی سی، آئی، ڈی کو خبر نہ ہو سکی۔ پھر غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں تھوڑے سے دن قیام کر کے استنبول روانہ ہوں گے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ مولانا محمد میاں صاحبؒ مولانا سہول صاحبؒ وغیرہ کو آخری قافلہ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان کو روانہ کر دیا۔ جدہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا، اس لئے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔ جدا ہوتے وقت مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ کو دیوبند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا۔ اور مولوی محمد میاں صاحبؒ کو کہ بعد میں محمد منصور انصاریؒ کے نام سے مشہور ہوئے، خاص شعبوں کی نگرانی سپرد کی، غالب پاشا کی تحریر بھی ان ہی کو دی گئی۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اگرچہ پہلے سے اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہمنوا ہو گئے تھے۔

میرا سیاسیات میں داخل ہونا

میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک علمی جد و جہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ سویز کے لئے متطوعین (والنٹروں) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لئے مدینہ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ عملی جد و جہد کی نوبت نہیں آئی تھی اب حضرت شیخ الہندؒ کے واقعات اور خیالات سے میں بھی متاثر ہوا، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتداء اور بسم اللہ کا وقت تھا۔ اور یہی وقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔ اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحبؒ جب تک حجاز میں رہے بالکل متفق اور ہمنوا رہے۔ تقدیری امور پیش آ کر رہتے ہیں۔ کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے، ان میں سے دو نوجوان مدینہ منورہ میں رہ گئے ہندوستان واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینہ منورہ میں مقیم رہے کوئی تفتیش ترکی پولیس نے نہ کی مگر قافلہ روانہ ہونے کے بعد تجسس شروع ہوا اور ہر باقی رہنے والے کی دیکھ بھال شروع ہوئی۔ وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ بہت سادے بزرگ تھے ان کو ان دونوں کے متعلق حسن ظن تھا مولانا نے ان کو گورنر مدینہ کے یہاں برأت کی۔ اس لئے پولیس کمشنر نے مولانا کو بھی مشتبہ قرار دیا۔ اور گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو نہ صرف ان دو نوجوانوں کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی طرف سے بھی بدظنی کرنا شروع کیا۔

ادھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ نے جدہ سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پانچ چھ چھ ورقوں پر بھیجنے شروع

گئے۔ وہاں ان کو کوئی کام نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمہ کو بلا دھڑک مضامین لکھتے تھے اور چونکہ بوجہ جنگ ڈاک خانہ میں کوئی خط غیر عربی یا ترکی نہیں لیا جاتا تھا، تو انہوں نے بدویوں کے ذریعہ بھیجنا شروع کیا۔ وہی ڈاک لانے والا بدوی کبھی ذریعہ پر لاتا تھا۔ پوسٹ آفس کی مہر اور ٹکٹ ان پر نہیں ہوتے تھے یہ طریقہ حجاز میں جاری تھا۔ وہ ڈاک لانے والا بدوی کچھ اجرت لے کر مکتوب الیہ کو پرائیویٹ خط پہنچا دیتا تھا۔ کسی طریقہ سے وہ خطوط بدوی سے پولیس کمشنر نے حاصل کر لئے، وہ خطوط انسر ہوئے۔ تو پولیس کمشنر کو ان کے ترجموں سے اور بغیر پوسٹ آفس آنے سے شبہ ہوا، اس نے گورنر مدینہ بصری پاشا کو بدظن کر دیا۔ جب کہ ہم سب مطمئن تھے، پولیس کمشنر کی طرف سے گورنر مدینہ طیبہ کے پاس یہ شکائتیں پہنچیں اور وہ ان سب حضرات سے بدظن ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب شیخ الہند صاحبؒ اس سے ملنے اور استنبول جانے کے لئے تعاون کرنے گئے تو اس کا رخ بدلا ہوا پایا اور دیکھا کہ وہ غیر اطمینان بخش باتیں کر رہا ہے۔ اس پر مزید کاروائی یہ کی گئی کہ دونوں حضرات (شیخ الہند رہ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ) کو آفس میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی کہ دونوں جوابات قلم بند کر کے شام کو بھیجے گئے۔ اس لئے سب کو فکر ہوئی کہ کہیں کوئی فتنہ سامنے نہ آجائے۔ جنگ کا زمانہ ہے، ہر ایک حکومت اس وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رہ نے ان احوال کو دیکھ کر اسی ترجمان (دمکی تاجر) کے واسطے سے غالب پاشاؒ کو خط لکھا کہ یہاں گورنر مدینہ رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ پولیس کمشنر نے گورنر مدینہ کو مشتبہ کر دیا ہے کیوں کہ ان کو ہمارے مخالفین نے بدظن کر دیا ہے۔ اس خط کے پاتے ہی غالب پاشاؒ نے گورنر مدینہ کو نہایت تاکیدی خط لکھا کہ مولانا محمود حسن صاحب بہت بڑے اور معتمد علیہ شخص ہیں میں نے پوری تحقیق کر لی ہے ان پر ہرگز شبہ نہ کرو۔ اور ان کے منشا کے مطابق ان کو انور پاشا کے پاس روانہ کر دو۔ اس سے گورنر مدینہ منورہ کا رویہ اور خیال یک بارگی بدل گیا، اور اس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر معذرت کی اور پولیس کمشنر کو بلا کر تنبیہ کی، اور حضرت شیخ الہند رہ کو کہا کہ آپ تیاری کر لیں، جب آپ تیار ہو جائیں گے بھیج دیا جائے گا، اس کے ایک دو دن بعد ہی خبر آئی کہ انور پاشاؒ اور جمال پاشاؒ مدینہ منورہ آرہے ہیں۔

انور پاشاؒ اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد اور ملاقات

اس وقت تک مدینہ حجاز ریلوے جاری تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی، تار بھی جاری تھا یکایک تار آیا کہ یہ دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کو مدینہ منورہ پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے بھی عرضی تیار کی۔ حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہوگئی، اور اہل شہر استقبال کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ چونکہ انور پاشاؒ اس زمانہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشاؒ ہوتے تھے فلیق (ڈویژن) کے جو کہ محاذ جنوبی اور عربی پر یعنی میدان سویز سینا، حجاز پر متعین تھا، کمانڈر تھے، اس لئے انور پاشاؒ کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری رکھتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں۔ اور جمال پاشا کو صرف اپنے محاذ کی خبر گیری ضروری تھی۔ اس لئے انور پاشاؒ تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے جب محاذ جنوبی پر پہنچے اور سوریہ (سیریا شام) اور سویز وغیرہ سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہ دوجہاں سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام کے روضہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل

کرلیں اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا گیا، اور جمعہ کا مبارک دن اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ چنانچہ جمعہ کی صبح کو تقریباً ۹ یا ۱۰ بجے وہ سپیشل ٹرین جس میں یہ دونوں وزراء اور رفقاء تھے، حسب اعلان مدینہ منورہ پہنچی۔ وقت معین سے پہلے مشتاقان ملاقات اور زائرین کی بے شمار تعداد نے تمام اسٹیشن اور اس کے جوانب کو بھر دیا تھا۔ اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا انتظام کیا گیا تھا۔ جب دونوں حضرات اترے تو اسٹیشن کے بڑے ہال میں آئے، وہاں میونسپلٹی کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا، چائے کا پہلے سے انتظام تھا۔ روساء شہر اور معززین کا تعارف کرایا گیا۔ ایڈریس کا جواب دینے کے بعد مسجد نبویؐ کی طرف روانگی ہوئی۔ چونکہ جمعہ کا وقت قریب آگیا تھا اس لئے یہی قصد کیا گیا کہ روضۂ حضور علیہ السلام سے فارغ ہو کر مسجد ہی میں ٹھہرے رہیں۔ نماز جمعہ سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر جائیں۔ جلوس کی روانگی کے وقت مٹن سواری کے لئے پیش کی گئی تو انور پاشاؒ نے انکار کر دیا، اور کہا کہ ہم غلامانہ طریق سے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں اس لئے پیدل چلیں گے۔ اہل شہر نے پہلے ہی سے جلوس کی مندرجہ ذیل ترتیب دے رکھی تھی۔

ارباب طریقت کا مجمع مع اپنے اپنے مریدین کے سب سے آگے آگے زریں جھنڈے لئے ہوئے اور ذکر و تسبیح بالجہر کے ساتھ اشعار مدحیہ پڑھتے ہوئے چل رہا تھا، ان کی سات یا آٹھ جماعتیں تھیں۔ اس کے بعد حرم محترم نبوی کے خدام کی علیحدہ علیحدہ مختلف جماعتیں تھیں۔ مؤذنوں کی جماعت، جاروب کشوں کی جماعت۔ اماموں کی جماعت، خطیبوں کی جماعت علیحدہ علیحدہ تھیں، سب کے اخیر میں حجرۂ شریفہ کے خصوصی خدام آغاوات (خواجہ سراؤں) کی جماعت تھی۔ سب کے سب اپنی اپنی یونیفارم (وردیاں) پہنے ہوئے حمد و صلوٰۃ، دعاء و ثناء پڑھتے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکام شہر تھے، تمام جلوس کے دائیں بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی۔

میں (کاتب الحروف) تاک میں تھا کہ موقعہ ملے تو انور پاشاؒ کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کر دوں۔ چنانچہ قطار چیر کر انور پاشاؒ کے قریب پہنچا اور اس عرضی کو جس میں حضرت شیخؒ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی گئی تھی، پیش کر دی۔ انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو دے دی، مفتی مامون بری کو جو کہ مدینہ منورہ میں تمام مذہبی اور دینی طبقات کے رئیس سردار تھے، اور نقیب الاشراف شامی رحمۃ اللہ علیہ کو جو کہ رفقاء انور پاشا میں سے تھے میں نے پہلے سے تیار کر لیا تھا، ان کی اعانت اور ہمدردی کی وجہ سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا، اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ موقعۂ ملاقات پر پہنچے، ایک تنہا اور بند کمرہ میں ملاقات ہوئی، جمال پاشا سے باتیں ہوئیں اور غالب پاشا کا خط ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے اور تمام باتیں غور اور اطمینان سے سنیں۔ اور فرمایا کہ تحریک مطالبہ آزادی اہل ہند کو مستعد طور سے جاری رکھنا چاہئے۔ جب تک مقصود یعنی آزادی کامل حاصل نہ ہو جائے ساکت نہ ہوں۔ عنقریب صلح کی مجلس بیٹھے گی ہم اہل ہند کی آزادی کے لئے پوری جد وجہد عمل میں لائیں گے، تم لوگ مطمئن رہو جس طرح ممکن ہوگا

ہم ان کی یعنی اہل ہند کی امداد و اعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کے لئے انہوں نے کہا کہ تمہاری خواہش کے مطابق تحریری دیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہئے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہئے تاکہ اہل ہند سمجھ سکیں۔ انہوں نے اس کو قبول کیا مگر یہ کہا کہ چونکہ یہاں کا قیام حسب پروگرام تھوڑا ہے اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں اس لئے ہم شام (دمشق) جا کر تحریریں مکمل بھیج دیں گے۔ حضرت شیخ الہند رہ نے مطالبہ کیا کہ مجھ کو مدود افغانستان تک بالا بالا پہنچا دیا جائے ہندوستان کے راستے سے مجھ کو وہاں تک (مرکز تحریک یعنی یاغستان) اس وقت پہنچنا غیر ممکن ہے۔ انہوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اس لئے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے۔ یا تو آپ جدہ ہی کے راستہ سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی کی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام فرمالیں۔ یہ اطمینان بخش باتوں کے ہو جانے کے بعد ہم واپس آگئے۔

مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں جلسۂ علماء اور حضرت شیخ الہندؒ

مفتی مامون بری مرحوم صدر علماء مدینہ کے پاس انور پاشا کا حکم اسی شب میں پہنچا کہ میں علماء مدینہ منورہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک عالم کے حلقہ درس میں علیحدہ علیحدہ جا کر تقریریں سنوں، اس لئے میری خواہش ہے کہ صبح کو بعد از اشراق مسجد نبوی میں علماء مدینہ جمع ہو جائیں اور اپنی اپنی تقریروں سے ہم کو مستفیض فرمائیں۔ مفتی صاحب موصوف چونکہ ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت شیخ عبد الغنی صاحب مرحوم مجددی دہلوی رہ کے شاگرد تھے اس لئے کاتب الحروف اور حضرت شیخ الہند رہ اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نہایت دوستانہ بلکہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے، انہوں نے نقیب العلماء کو بھیجا کہ انور پاشا چاہتے ہیں کہ صبح کو اشراق کے بعد علماء کا اجتماع مسجد نبوی (حرم محترم) میں ہو اور علماء تقریر کر کے حاضرین کو مستفیض کریں، اس لئے تجھ کو اس وقت حاضر ہونا چاہئے اور میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر دو حضرات مشائخ بھی تشریف لائیں۔

ہمارے لئے یہ زریں موقعہ تھا ہم نے قبول کیا۔ چنانچہ اجتماع ہوا، اور مقام صدارت انور پاشا کے لئے تسلیم کیا گیا مفتی صاحبؒ ان کے سامنے وسط میں بیٹھے اور اپنے بائیں حضرت شیخ الہند رہ اور ان کے بائیں مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور ان کے بائیں کاتب الحروف کو بٹھایا گیا۔ مفتی صاحبؒ نے اولاً انور پاشاؒ اور جمال پاشاؒ سے تمام علماء حاضرین کا تعارف اور مصافحہ کرایا، بعض حضرات نے کچھ نعتیہ اشعار بلند آواز سے پڑھے اس کے بعد تقریر کا حکم ہوا۔ حضرت شیخ الہند رہ اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمہم اللہ نے یہ عذر کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں، ہم کو عربی زبان میں تقریر کی عادت اور مہارت نہیں ہے اس لئے ہم معافی چاہتے ہیں۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا، مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی۔ میں نے حسب مناسب وقت فلسفۂ جہاد پر مبسوط اور مفصل تقریر کی، جس میں عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کے لئے جہاد عقلی طور پر ضروری

ہے اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال مضمر ہے، اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا یہ تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی، اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا، اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے۔ بعد از تقریر بھوں نے خوشی اور ممنونیت کا اظہار کیا، اس کے بعد دوسرے علماء نے دوسرے موضوعوں پر تقریریں کیں مگر افسوس کہ حاضرین مجلس نے ان کی تقریروں کو اس قدر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے بعد یہ جلسہ ختم ہو گیا۔ انور پاشا نے کچھ نقد، حاضر ہونے والے علماء کے لئے بذریعہ مفتی صاحب موصوف بطور نذرانہ بھیجا۔ جو کہ پانچ اشرفی فی کس تقسیم کیا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے عذر کیا کہ ہمارے پاس خرچ کافی مقدار میں موجود ہے ہم کو حاجت نہیں ہے، تو کہا گیا کہ یہ نقد صدقہ اور خیرات نہیں، یہ عطیہ شاہانہ ہے۔ اس کو قبول کرنا چاہئے۔ تو دونوں حضرات نے قبول فرما کر مجھ کو ہی دے دیا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کا شام کو روانہ ہونا اور تحریرات کا وہاں سے بھیجنا

اس جلسہ کے چند گھنٹہ بعد دونوں حضرات اور ان کے رفقاء اسپیشل ٹرین میں شام کو روانہ ہو گئے اور دو تین دن کے بعد تحریریں تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں کی دستخط سے حضرت شیخ الہندؒ کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ شام سے آگئیں سب کا مضمون ایک ہی تھا صرف زبان کا فرق تھا جس میں ہندوستانیوں کے مطالبہ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارہ میں امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو جو کہ ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ پر اعتماد کرے اور ان کی اعانت کرے۔

تحریرات اور وثائق کا ہندوستان پہنچانا

چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو، میں مرکز تحریک یاغستان جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کر کے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں۔ اس لئے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد بنائے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر پہنچا دیئے جائیں، مگر انگریزی عملداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی کسی چیز کا نکال کر لیجانا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ اس لئے تجویز فرمایا کہ لکڑی کا صندوق کپڑے کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو۔ اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کر رہا تھا، اس سے کہا گیا اس نے اسی طرح جا دی لکڑی کا صندوق بنا دیا، اور کھدے ہوئے تختے میں کاغذ رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی بصیر کیوں نہ ہو شبہ بھی نہ کر سکے۔ صندوق میں کچھ نائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی تھان ریشمی اور غیر ریشمی مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لئے رکھ دیئے گئے، اور چونکہ ہر سفینہ میں تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا، تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہند کے بقیہ رفقاء اور حضرت مولانا خلیل احمد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء روانہ کر دیئے جائیں، چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لئے جہازوں کی آمد و رفت عام دستور کے مطابق نہ تھی اس لئے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خان جہان پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدرآباد سندھ کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے ممبر تھے) باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد فرما رہے تھے۔

اور ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ اپنے مکان پر پہنچ کر ان کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب (رئیس موضع رتھیڑی، ضلع مظفر نگر) کو دے دیں گے، وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو اتروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز اور آپ کے رفقاء مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ کو

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کا قافلہ ۱۲ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر اخیر ماہ مذکورہ میں مکہ معظمہ پہنچا۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظمہ میں قیام فرما کر طائف کا قصد فرمایا۔ اور ۲۰ رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور دیگر رفقاء مکہ معظمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہند۔ شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے۔ جب دس شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظمہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد صاحب اور دوسرے رفقاء جہاز آجانے کی وجہ سے جدہ روانہ ہو گئے ہیں۔ چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ الہند کے طائف سے واپس ہونے کی نہ تھی، اس لئے یہ سب حضرات بغیر انتظار اور بلا ملاقات روانہ ہو گئے تھے حضرت شیخ الہندؒ نے ضروری سمجھا کہ ان سب سے الوداعی ملاقات کی جائے اس لئے حضرت شیخ الہندؒ بھی جدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اتار کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا تو جانے والے حضرات ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب تھے۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن خانجہان پوری۔ اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی رہ گئے تھے۔ ان سبھوں کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ساحل (پورٹ) تک رخصت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا۔

تحریرات کا ہندوستان پہنچنا اور سی آئی ڈی کی تفتیش سے بچ کر نکل جانا

بمبئی میں سی آئی ڈی کو حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہندؒ تشریف لائیں گے۔ اس لئے انگریزی پولیس سی آئی ڈی

؎ بلکہ اسی مقصد سے دو مہینہ پہلے جدہ روانہ ہو چکے تھے مگر بندرگاہ پر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور شاہ بخش صاحب موصوف مکہ معظمہ جا کر بانتظار جہاز ٹھہر گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند معہ دیگر رفقاء جب مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت تک یہ وہیں تھے اور جہاز کے منتظر تھے۔

اور اہل شہر کا بہت بڑا مجمع جہاز پر پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے مخلصین میں سے تھے مولانا ہادی حسن صاحبؒ سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجئے میں اس کو نکال دوں گا۔ اور جہاں پہنچانا ہو اس کا پتہ دے دیجئے وہاں پہنچا دوں گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف نہیں تھے مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص و صداقت کا یقین ہوگیا اور صندوق ان کے حوالے کر دیا۔ یہ صاحب عام مسافروں کے سامان کے ساتھ یہ صندوق بھی قلیوں سے اٹھوا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جا کر بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ پولیس اور سی، آئی، ڈی حضرت شیخ الہندؒ کو ڈھونڈنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہند نہیں ہیں البتہ ان کے ساتھ کے کچھ لوگ ہیں، تو پولیس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور مولانا ہادی حسن صاحبؒ کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی۔ حتیٰ کہ ہاتھ کی چھڑی بھی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔ مگر بحمداللہ کوئی چیز مشتبہ نہیں نکلی۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہنچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے پوچھ گچھ ہوئی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا اور مولانا محمود حسن صاحبؒ کا ساتھ نہ جاتے میں تھا نہ آتے میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح حج و زیارت میں میری شرکت بھی رہی۔ میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں۔ ایک مختصر یا عشرہ حضرت مولانا موصوف کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مولانا ہادی حسن صاحب رہ کو روک لیا گیا۔ ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکایا گیا، سختی بھی کی گئی اور لالچ بھی دیا گیا۔ مگر یہ نہایت مستقل رہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی۔ جب ہر قسم کی سختی اور طمع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تو ایک ڈیڑھ دن بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

صندوق خان جہاں پور میں

مولانا محمد نبی صاحب رہ کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی چیز ہے۔ جیسے ہی صندوق پہنچا۔ اس کے کپڑے نکال کر کر دی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیئے گئے اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ ان کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی۔ اور ایک تختہ کے اندر سے یہ تینوں کا غذات برآمد ہوئے، فوراً ہی ان کو نکال کر محفوظ کر لیا۔

لہ حاجی شاہ بخش صاحب سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے جن کو خیری برادرس نے برلین سے جاری کیا تھا۔ اور جو اعلانات ترکی سے ترغیب وجہاد وغیرہ میں شائع ہوئے تھے ان سب کو انہوں نے زنبیل میں حفاظت سے رکھ رکھا تھا۔ جب جہاز پر پولیس کی یہ یورش دیکھی تو یہ اس بھیڑ میں زنبیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی سے نکل گئے۔ چونکہ غیر معروف شخص تھے کسی کو بھی شبہ نہ ہوا۔ مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کر لئے گئے اور کچھ دنوں نظر بند رہ کر رہا ہو گئے۔

پولیس کی یورش اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز کی کرامت

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی، آئی، ڈی نے پتہ چلا لیا کہ وہ کاغذات ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحبؒ کے یہاں ہیں۔ فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دوڑ پہنچی اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد مدنی صاحبؒ اس وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے۔ سپاہیوں کی دوڑ دیکھ کر جلدی میں ان کاغذات کو توڑ مروڑ کر صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری مردانہ مکان میں ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔

تلاشی دس بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چار بجے تک جاری رہی۔ عورتوں کو ایک کمرہ میں الگ بند کر دیا تھا۔ ہر شخص کی تلاشی لے کر مردانہ مکان سے بھی نکال دیا گیا۔ صرف ایک نمبردار صاحب پولیس کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ کھیل کھلونوں اور عورتوں بچوں کی ڈبیوں تک کو کھول کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی کم بختی آئی۔ اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کیا گیا۔ مگر جس چیز کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوئی۔ کیوں کہ وہ صندوق و صندوق ہی نہ تھا۔ اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہندؒ کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مردانہ مکان میں سب کے سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔

چھ گھنٹہ کی سرگرم تفتیش اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر میں ہے۔ یہاں جناب حاجی نور الحسن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ نے یہ طے فرما دیا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کرا کر فلاں فلاں مرکز میں بھیجیں گے پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی مگر ناکام واپس ہوئی۔

حاجی احمد مرزا فوٹو دہلی کے یہاں تلاشی اور ناکامی

سراغ رساں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لئے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا مگر اب تک وہ تحریریں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھیں۔ حاجی نور الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت ان کو لے جا رہے تھے۔ جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ پولیس دوکان کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ حاجی صاحب ان تحریروں کو جیب میں ڈالے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔

دوسرے وقت حاجی نور الحسن صاحب مرزا صاحبؒ کی دوکان پر پہنچے۔ مرزا صاحبؒ کی ثابت قدمی اور پختگی ملاحظہ کیجئے کہ پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے، خدشہ اور خطرہ موجود ہے، مگر ہر خطرہ سے بے نیاز ہو کر حاجی صاحب سے فوٹو لئے عین اس وقت کہ پلیٹیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ پولیس پہنچ گئی۔ ساری دوکان چھان ماری۔ ہر ایک اہم ٹٹولا، مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کو حضرت شیخ کی کرامت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

حاجی صاحبؒ کا حسب ہدایت کام کرنا

فوٹو کی کاپیاں تیار ہوگئیں حاجی نور الحسن صاحبؒ نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچانے کا حکم تھا، پہنچا دیا۔ یہ غلط ہے کہ ان تحریرات کو جلا دیا گیا۔ جیسا کہ مولانا عبید اللہ صاحبؒ اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ وہ تو اس زمانہ میں کابل میں تھے ان کو غلط خبر پہنچائی گئی۔ یہ تمام فوٹو ذمہ داران مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے مگر حکومت کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہو رہی تھی تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلا دیا ہو تاکہ کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

ان تحریرات کا کارآمد نہ ہونا

یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کارآمد ہوئے اور حکومت ترکیہ اور ان کے حلفاء پوری طرح امداد کرتے رہے مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ جرمنی اور ترکی کی فتحمندی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف بن گیا اور مسٹر ولسن کے پر فریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار حسب اتحادیوں (انگریزوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پر آگئے اور ادھر شریف حسین نے غدر اور خیانت کر کے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلا دی۔ تاآنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترک فوج میں سے بھاگنے لگے، اور جد وجہد سے جان چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی پر ناکامی ہی سامنے آگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا وہ واقع ہوگیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا مالک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کا طائف روانہ ہونا اور محصور ہوجانا

انور پاشاؒ اور جمال پاشاؒ سے جب تحریری دستاویز حاصل کرلیں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قصد تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالا بالا یاغستان (یعنی اپنی تحریک کے مرکز پر پہنچ جائیں) مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ روک لیا تھا جنگی محاذ ان راستوں پر قائم ہوگئے تھے۔ اس لئے یہی قصد فرمایا کہ بحری راستے سے سفر کیا جائے اور بمبئی نہ جایا جائے بلکہ بلوچستان کی کسی بندرگاہ (مکران وغیرہ) پر بھیس بدل کر بادبانی جہاز سے پہنچیں اور پھر یاغستان کو وہاں سے روانہ ہوجائیں مگر چونکہ مختلف مصالح سے آخری ملاقات غالب پاشاؒ سے ضروری سمجھتے تھے، چند ضروری باتیں اسی ملاقات میں طے کرنی تھیں۔ اس لئے پہلے مکہ معظمہ اور پھر وہاں سے طائف کے لئے روانہ ہوگئے، غالب پاشاؒ ان دنوں طائف میں تھے حضرت نے عام لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ان دنوں گرمی زیادہ ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے روضہ کی زیارت بھی کرنی ہے اس لئے میں طائف جارہا ہوں۔ نصف شعبان تک واپس آجاؤں گا۔ چنانچہ ۲۰ رجب کو مکہ معظمہ سے روانہ ہوکر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے اور دو تین دن کے بعد غالب پاشاؒ سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے ہوئیں۔ اور کچھ کے لئے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کردی۔ ہم سب طائف

میں محصور ہو کر رہ گئے۔ جس کی تفصیل ہم نے سفر نامہ میں لکھ دی ہے۔ ایام حصار میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ غالب پاشا سے ملے۔ پاشا موصوف نے چند اصولی باتیں بتانے کے بعد مجبوریاں ظاہر کیں اور کہا کہ آپ مکہ معظمہ جا کر ہندوستان کو جلد از جلد چلے جائیں۔ اور ہندوستانی رائے عامہ کو آزادی کامل کے مطالبہ پر متفق کریں۔ مجلس صلح جو عنقریب منعقد ہونے والی ہے۔ انگریز پوری کوشش کرے گا کہ ہندوستان آزاد نہ ہو۔ یا کم از کم ہندوستانیوں کو زیر سایہ برطانیہ اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے مگر ہندوستانی باشندوں کو چاہئے کہ بغیر مکمل آزادی کے کسی چیز پر راضی نہ ہوں۔

تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر آجانے کی سہولت حاصل ہوئی اور چھ شوال کو ہم وہاں سے نکل کر مکہ معظمہ پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کیمپ کا کمانڈار تھا۔ اس نے ایک شب ہماری مہمانداری کر کے صبح تک مکہ معظمہ تک ہماری سواری کا انتظام کر دیا۔ ہم دس شوال کو مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ چونکہ زمانہ حج کا قریب تھا اس لئے حضرت شیخ الہندؒ کا ارادہ ہوا کہ حج تک یہاں قیام کیا جائے، آنے والے حجاج سے اہل وعیال کی خیر وعافیت بھی معلوم ہو جائے گی اور ممکن ہے کوئی متعارف یا رشتہ دار بھی آجائے، تو اس سے اس کا پتہ چل جائے گا کہ انگریزی پالیسی حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اور دیگر سیاسیوں کے متعلق کیا ہے۔ اگر نرم ہوئی تو بمبئی کے راستے سے واپس ہوں، ورنہ کوئی دوسری صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحبؒ آخری جہاز میں اوائل ذی الحجہ میں آگئے ان سے احوال معلوم ہوئے۔

ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبدالرزاق رحمہما اللہ کی غیر معمولی ہمدردی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے ایک عزیز

ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب رحمہما اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں گرانی زیادہ ہے حضرت شیخ الہندؒ تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ رفقاء بھی ہیں۔ ویسے بھی حضرت موصوف کا حوصلہ فراخ اور دسترخوان وسیع ہے۔ لہذا حضرت کے پاس جو اثاثہ ہوگا وہ ختم ہو گیا ہوگا۔ اب کوئی اور رقم بھیجنی چاہئے۔ حج کا زمانہ تھا۔ حجاج جا رہے تھے، کسی معتمد حاجی کے ذریعے رقم بھیجی جا سکتی تھی۔ لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت کے کسی قریبی عزیز کو جو خانگی حالات سے پوری طرح واقف اور خانگی امور میں بے تکلف ہو۔ بھیجا جائے تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے حالات بھی تفصیل سے معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو جن کا نام لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس خدمت کے لئے جو کہ ان کے لئے سراسر سعادت تھی۔ کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو رہا تھا۔ نامزد کیا گیا۔ مزید برآں تار کے ذریعہ جہاز میں سیٹ بھی متعین کرالی۔ اور روانگی کے لئے ایسا وقت مقرر کیا کہ بمبئی پہنچ کر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ یہ عزیز دفعتاً دیوبند سے روانہ ہوتے اور بمبئی پہنچتے ہی بندرگاہ پر چلے گئے۔

اس عجلت اور راز داری کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کو رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکا یہاں تک کہ عزیز موصوف کی روانگی کا علم بھی حکومت کو اس وقت ہوا جب جہاز روانہ ہو چکا۔ لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہ بھی ہو گیا۔ اس

ف اس مقام کا حاشیہ مضمون کے اختتام پر بطور ضمیمہ صفحہ نمبر ۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔

سے ئے حکومت ہند کی طرف سے عدن تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہ کاغذات وغیرہ قبضہ میں کر لئے جائیں چنانچہ جب جہاز عدن پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی اور عزیز موصوف کی تلاشی لی۔ مگر کوئی چیز ایسی برآمد نہ ہو سکی جس پر شبہ کیا جا سکے۔ لہذا پھر عزیز موصوف بخیریت جدہ اور پھر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حضرت کو اہل وعیال کی خیریت معلوم ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر عزیز موصوف اور ان کے رفقاء نے جن میں مولانا ولی حسن صاحب حسن پوری بھی تھے، بیان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی پالیسی حضرت کے بارے میں بہت سخت ہے۔ جب کوئی جہاز بمبئی پہنچتا ہے تو سی، آئی، ڈی اور باوردی پولیس کا بڑا دستہ جہاز پر پہنچتا ہے اور ڈھونڈتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کہاں ہیں۔ جب تک اطمینان نہیں ہو جاتا کسی مسافر کو اترنے نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ حضرت اس زمانہ میں بمبئی پہنچیں یا ہندوستان تشریف لے جائیں۔

عزیز موصوف نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا بھیجا ہوا ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔

مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ کا راندیر سے ایک ہزار روپیہ بھیجنا

مذکورہ بالا رقم کے علاوہ ایک ہزار روپیہ مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ اور راندیر کے احباب نے تاجروں کے ذریعے بھیجے تھے جو انہیں ایام میں پہنچے تھے۔ ان دونوں رقول کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبد الجبار دہلویؒ کے یہاں بطور امانت جمع کرا دیا۔ چنانچہ مالٹا میں ضرورت پڑنے پر رقم منگوائی گئی اور کام آئی۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

عزیز موصوف کی واپسی

اس وقت تک مدینہ منورہ پر ترکوں کا قبضہ تھا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود شریف حسین کی اور انگریزوں کی فوجیں کامیاب نہ ہو سکی تھیں جنگ جاری تھی اور حجاج کی آمد و رفت کے راستے مسدود تھے، لہذا عزیز موصوف مدینہ طیبہ نہیں جا سکے اور حج سے فراغت کے بعد پہلے ہی جہاز سے آپ کو واپس ہونا پڑا۔ اس قدر عجلت سے واپسی کا ایک اور سبب بھی تھا جس سے انگریزی حکومت کے شبہات میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب واپسی کے لئے عزیز موصوف جہاز پر سوار ہوئے تو بہاؤ الدین محافظ حجاج، اور سی، آئی، ڈی انسپکٹر نے بڑی سختی سے تلاشی لی اور ہر ایک چیز چھان ماری، مگر کوئی چیز مشتبہ برآمد نہ ہوئی۔ جہاز بمبئی پہنچا تو پھر ان کی تلاشی لی گئی اور ان کو حراست میں لے کر الہ آباد پہنچا دیا گیا۔

افشاء راز

یہ محترم عزیز حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے جو رشتہ رکھتے تھے اس کا تقاضا تھا کہ ان پر اعتماد کیا جائے بالخصوص ایسی صورت میں کہ [illegible] ہی کے کام سے پوری راز داری کے ساتھ ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ حجاز شریف پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ مولانا ہادی حسن صاحبؒ مذکورہ بالا "تاریخی صندوق" لے کر آئے تھے، جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر کے نینی تال میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ لہذا تشویش اور بے چینی تھی کہ جس مقصد کے لئے اتنی کوشش کی گئی، اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی کیا گیا یہ سب کچھ بے نتیجہ رہتے

گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوں۔ اس بناء پر حضرت شیخ الہندؒ نے عزیز موصوف کو صندوق کا راز بھی بتا دیا۔ اور یہ بھی فرمادیا کہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوا لئے گئے ہیں۔

دوسری طرف عجیب و غریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل ناتجربہ کار اور نوگرفتار تھے۔ اور سی، آئی، ڈی کے وہ افسر[1] جنہوں نے الہ آباد میں ان سے گفتگو کی، وہ پولیس کے کہنہ مشق شاطر اپنے فن کے بہترین ماہر تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھمکا کر، پولیس کی جابرانہ کارروائیاں عمل میں لا کر اور متعدد اوقات میں طرح طرح کی جرح کر کے وہ تمام باتیں معلوم کرلیں جو عزیز موصوف کے حافظہ میں تھیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی تھیں کہ اگر ثابت ہو جائیں تو نہ معلوم کتنوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑتا۔ اور عبور دریائے شور اور حبس دوام کی سزا پاتے، صندوق کا قصہ بھی انہیں کے ذریعہ معلوم ہوا۔ گویا سی آئی، ڈی کو دولت کا خزانہ مل گیا۔ فوراً مظفر نگر پولیس کو تار دیا گیا اور مظفر نگر سے دوکش خاں جہان پور پہنچی اور مولانا ہادی حسن صاحبؒ کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ پھر حاجی نورالحسن صاحبؒ اور حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا جس کا ذکر پہلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

حج کے بعد حضرت شیخ الہند کا مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سفر میں پہلا حج ۱۳۳۳ھ میں کیا تھا۔ پھر دوسرا حج طائف سے واپسی پر ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں کیا۔ قاضی مسعود احمد صاحبؒ اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہوئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر یاغستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیئے۔ حضرت نے بار بار فرمایا کہ مکہ معظمہ میں ہمارا قیام مناسب نہیں۔ کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بدظن ہی نہیں بلکہ برہم اور مخالف ہے اور شریف حسین انگریزی حکومت کے آلۂ کار ہیں لہذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ اس لئے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیئے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ لیکن اگر تنہا حضرت کی ذات مبارک ہوتی تو معاملہ آسان تھا۔ مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ چند رفقاء تھے جو اپنا سب کچھ قربان کر کے حضرت کے ساتھ ہوئے تھے وہ حضرت کو کسی حال چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے اور نہ حضرت کی جدائی پسند کرتے تھے۔ چونکہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا لہذا کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ رہتا تھا۔ سردی اور گرمی کے کپڑوں کے

---

[1] یعنی (۱) مسٹر سین۔ (۲) تصدق حسین ہاپوڑی۔ (۳) مظہر علی تھانوی۔ یہ تینوں افسر یوپی میں کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے مشن آزادی کے متعلق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔ مسٹر سین انگریز تھا۔ یوپی سی آئی ڈی کا افسر اعلیٰ تھا مگر مہذب قانون کا پابند تھا اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی۔ لیکن تصدق حسین اور مظہر علی نہایت جابر و ظالم تھے ان میں انسانیت اور تہذیب نام کو نہ تھی۔ انہوں نے حضرت کے ساتھیوں پر نہایت وحشیانہ مظالم کئے۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بنا پر دوائیں بھی ساتھ رہتی تھیں۔ اس قسم کی اور بھی ضروریات تھیں اب سب کے حمل ونقل کے لئے چند سواریاں درکار تھیں۔ اور خاموشی سے دفعتاً روانہ ہونا مشکل تھا۔ تاہم جب حضرت کا شدید تقاضا ہوا تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے چنانچہ ہم دو چار روز بعد روانہ ہونے والے تھے کہ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حائل ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ۔

محرم ۱۳۳۵ھ کی آخری تاریخوں میں شیخ الاسلام مکہ معظمہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علماء مکہ عصر کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام نے بھیجا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرا دو۔ اس کو دیکھا گیا تو عنوان یہ تھا۔ من علماء مكة المكرمة المدرسين بالحرم الشريف المكي۔ (مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو مکہ کے حرم شریف میں درس دیتے ہیں) اور اس میں تمام ترکوں کی تکفیر اس بنا پر کی گئی تھی کہ انہوں نے سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن قرار دیا گیا تھا، اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا وغیرہ وغیرہ۔ حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ یہ محض ان علماء کی طرف سے ہے جو حرم مکی میں پڑھاتے ہیں۔ اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور حرم مکی میں مدرس بھی نہیں ہوں اس لئے مجھ کو کسی طرح اس پر دستخط کرنا درست نہیں ہے، وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطرناک ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر کیا کیا جائے نہ عنوان اجازت دیتا ہے نہ مضمون۔ مضمون میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سنا گیا کہ شیخ الاسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے، خطرہ تھا کہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین خود جدہ گیا اور وہاں سے حکم بھیجا کہ فوراً مولانا محمود حسنؒ اور ان کے رفقاء اور سید ہاشم اور حکیم نصرت حسین کو گرفتار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف طریقوں سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل سفرنامہ[1] میں صحیح طور پر لکھ دی گئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہم سب گرفتار کر کے جدہ بھیجے گئے۔ ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے۔ پھر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیر حراست سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ ربیع الاول کو سویز پہنچے۔ وہاں سے گوروں کی حراست میں جو کہ پندرہ یا سولہ تھے اور بندوق اور سنگینوں سے مسلح تھے ہم کو قاہرہ ریل میں بھیجا گیا۔ اور اسی دن عصر کے بعد ہم کو جیزہ کی سیاسی جیل (معتقل) میں داخل کر دیا گیا۔ اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا، اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا، اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائل تھے جن میں سی۔ آئی۔ ڈی کے بیان اور رپورٹیں درج تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مگر بعد میں بیانات لینے اور سوالات کرنے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالہ دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی

[1] اس مقام کا حاشیہ مضمون کے اختتام پر بلفظہ صفحہ نمبر　　پر ملاحظہ فرمائیں۔

کی ان جملہ کارروائیوں کی بنا پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان، کابل، فرنٹیر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہیں۔ اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں سے کی ہے بہت سی ایسی باتیں بھی پوچھی گئیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو اطلاع نہیں ہے حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق اس کے پاس بہت بڑا رجسٹر تھا۔ بہر حال ہر شخص نے جوابات حسب اقتضاء وقت اپنی سمجھ کے مطابق دیئے۔ اگرچہ ہم میں سے سب کے سب ایسے ہی تھے کہ جن کو ایسے امور کا سابقہ اس سے پہلے نہیں پڑا تھا۔ اور بوجہ اس خیال کے کہ یہاں مصر میں ہندوستان کے واقعات اور وہاں کی کارروائیوں کا جاننے والا کوئی نہ ہوگا۔ ہم نے آپس میں کوئی قرار داد بھی طے نہیں کی تھی۔ مگر اظہار اور جوابات سب کے تقریباً ایک ہی جیسے رہے، اگرچہ علیحدہ علیحدہ ہوئے جیزہ کی جیل (معتقل) میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا۔ اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ فروری ۱۹۱۷ء میں ہم کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ گوروں کی پوری گارد سنگینوں سے مسلح ہماری حراست کرتی تھی۔ اسی روز شام کو مالٹا جانے والے جہاز پر سوار کئے گئے اور ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں مالٹا پہنچ گئے۔

۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً تین برس ۲ مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم مالٹا سے روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لئے تمام ترکی آفیسر (جو کہ اس وقت تک رہا نہیں ہوئے تھے) صدر اعظم ٹرکی سے لے کر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہو گئے۔ اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہاتھ اٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام آفیسروں نے ان کی موافقت کی۔ آمین آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔ یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب و غریب تھا۔ بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹا سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رتبے والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص اور اس ہیئت دعائیہ اور آمین کا اظہار کسی کے لئے نہیں ہوا تھا۔ انگریز افسر بہت سے وہاں موجود تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے۔ مگر یہ عزت حقانی تھی۔ جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ شخص جس نے قول و عمل میں کبھی اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا۔ جس کو اہل دولت اور اصحاب مناصب کے اختلاط سے وحشت ہو جس کو تکلف صوری اور طلب وجاہت دنیاوی سے نفرت ہو جس کی چال ڈھال، بیٹھنا اٹھنا، رفتار و گفتار وغیرہ سب سے مسکنت اور تواضع ٹپکتی ہو، اس کی یہ عزت اور تمکنت، خلق خداوندی میں عام قبولیت اس کے تقوے اور للہیت اور بارگاہِ خداوندی میں بلند پائگی کا اثر نہ تھا تو کس چیز کا تھا۔ ع

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست

گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وآمدنا بامدادہ فی الدنیا والآخرۃ۔ آمین۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہنچا، اور ۲۶ جمادی الثانی سیدی بشرین جو کہ قرار گاہ اسراء مصر میں تھا۔ داخل کر دیئے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کر دیئے گئے۔ سویس میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کئے گئے۔ یہاں پونے دو مہینہ کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچایا گیا۔ ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو دیئے۔ ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحبؒ کو دیوبند میں۔ دوسرا ڈاکٹر انصاریؒ کو دہلی میں۔ تیسرا حکیم اجمیریؒ کو بمبئی میں ہم نے دے دیا۔ جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ تار کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

" ہم ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے " مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ - ۸ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔

بمبئی پہنچنے اور خلافت کمیٹی کے استقبال کرنے کی کیفیت

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی، آئی، ڈی کا افسر انگریز مع دو تین ہندوستانی افسروں کے آیا اور حضرت شیخ الہندؒ سے کہا کہ میں تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرہ میں چلے گئے۔ اس نے کہا " مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان کے ملے ہرگز جہاز سے نہ اتریں " یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہمیں جہاز پر ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں۔ ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت انتظار کیا، جب وہ نہ پہنچے تو میں اور مولانا عزیر گل صاحب اسباب لے کر کنارہ پر چلے گئے۔ بعد کو مولوی رحیم بخش صاحب آئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لئے اسپیشل ڈبہ ریل میں ریزرو کرا دوں گا۔ آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ کا انتظار کر کے حسین احمد اور مولوی عزیر گل کنارے پر چلے گئے ہیں وہ آجائیں تو روانگی ہو سکے گی۔ چونکہ ہمارے کنارہ پر پہنچنے پر زور کی بارش ہو گئی اور دریا میں طوفان آگیا۔ جہاز دریا میں کنارہ سے دور لنگر انداز ہوا تھا اس لئے اس روز کوئی ہوڑی حضرت شیخ الہندؒ کو جہاز سے لانے کے لئے نہ مل سکی۔ اگلے روز ۲۱ رمضان المبارک کو حضرت اتر سکے۔

مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے، مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ تحریک خلافت میں شریک نہ ہوں اور بالا بالا ریل پر سوار ہو کر دیوبند چلے جائیں۔ سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ اسی لئے وہ اگلے دن اتارنے کے لئے اسٹیمر پر پہنچے۔ مگر جب لانچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کمیٹی نے زور دار استقبال کیا۔ نعرہ ہائے تکبیر سے فضا گونج اٹھی اور حضرت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجویز کر چکے تھے لے گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب ہجوم کی شدت کی وجہ سے حضرت

کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جملہ کارکن، حضرت کے مذاق آزادیٔ ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے ہم نوا تھے اس لئے بالطبع ان سے مل گئے اور مولوی رحیم بخش صاحب مرحوم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

جلسۂ عام اور سپاسنامہ

مسلمانان بمبئی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیر انتظام کھتری مسجد میں جلسۂ عام کیا گیا اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں "ایڈریس" پیش کیا گیا۔

دہلی، لکھنؤ، دیوبند وغیرہ سے استقبال کے لئے آنے والے حضرات

ان حضرات کی فہرست جنہوں نے دور دراز سے بمبئی پہنچ کر پلیٹ فارم پر حضرت کا استقبال کیا، بہت طویل ہے۔ خاص خاص اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند مع صاحبزادگان۔ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مرحوم۔ جناب حکیم محمد حسن صاحب مرحوم (برادر خورد حضرت شیخ الہند)۔ مولانا محمد حنیف صاحب مرحوم (خواہرزادہ و داماد حضرت شیخ الہند)۔ حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری۔ برادر کلاں ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ نواب محی الدین خاں صاحب مراد آبادی قاضی بھوپال مرحوم۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم مہتمم و صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب عرف ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ حاجی احمد مرزا صاحب مرحوم فوٹو گرافر دہلی۔

مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی۔ اور۔ مسٹر گاندھی

بمبئی کے دو روزہ قیام میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں مسٹر گاندھی بھی تشریف لائے اور حضرت رحمہ اللہ سے گفتگو کی۔

دہلی کو روانگی

بمبئی میں دو روزہ قیام فرماکر ۲۳، اور ۲۴، رمضان المبارک کی درمیانی شب میں ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوئے اور ۲۵، رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۳، جون ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہوکر ۲۶، رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچے۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

حضرت شیخ الہند کی عام مقبولیت اور راستہ میں اسٹیشنوں پر استقبال

ایک وہ زمانہ تھا کہ نہ صرف احباب بلکہ تلامذہ، مریدین اور عزیز و اقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کو پھانسی دی جائے گی ورنہ کم از کم حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا پائیں گے۔ اس لئے مریدنا

اور شاگردوں تک نے نہ صرف تعلق ارادت اور شاگردی سے انکار کر دیا تھا بلکہ تعارف سے بھی منکر ہو گئے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوئے گھبراتے تھے بلکہ اس محلہ اور کوچہ میں بھی نہیں گذرتے تھے جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا۔ اور حضرت کے لئے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بعض مدعیان اخلاص تو جان و عزت کے خطرہ سے انگریزوں کے سی، آئی، ڈی اور مخبر بن گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آگیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہنچے، لوگ سروں پر بٹھاتے، ہر ایک اسٹیشن پر عقیدت مند مخلصین کا ہجوم پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتا تھا۔ حضرت شیخ الہند تک پہنچنا اور آپ سے مصافحہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر۔ میرٹھ چھاؤنی۔ مظفر نگر۔ دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لئے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدنداں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء یعز من یشاء و یذل من یشاء انہ علی کل شئ قدیر۔

رولٹ رپورٹ کے الفاظ اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کمشنر کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ دشمن جو اپنی سطوت و طاقت کے نشہ میں بدمست ہو کر کہتا تھا کہ میں سمندروں کا خدا ہوں، میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا، مجھ پر اگر آسمان ٹوٹ پڑے تو میں سنگینوں پر اٹھا لوں گا۔ اس مغرور اور جابر طاقت نے اس تحریک سے کیا اثر لیا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حیثیت تھی، اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں اور کس طرح کامیابی کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اس کے نتائج کیا ہوئے، اور اس تحریک نے دیس کی کیا کیا خدمتیں سرانجام دیں، اور اس کے کارکنوں نے کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا، الفضل ما شہدت بہ الاعداء

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیرا نمبر ۱۶۴ میں درج ہے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کے واقعات کا انکشاف ہوا۔ اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا، یہ ایک منصوبہ تھا جو اس خیال سے ہندوستان میں تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کی شورش[1] سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے۔

---

[1] اگر فقط یہ مسلمانوں کے لئے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرتاپ کو صدارت کیوں دی جاتی۔ اور حکومت موقتہ میں غیر مسلموں کے لئے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی جیسا کہ آئندہ آئے گا۔ ۲۔ اگر مسلمانوں کے لئے یہ منصوبہ تھا تو ہردیال کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی امانتیں کیا گواہی دیتی ہیں۔ دیکھو رولٹ رپورٹ فصل پنجاب۔ ۳۔ جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنانا تھا جیسا کہ آئیگا اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا جس میں رام چندر جیسا مشہور و معروف بھی ممبر تھا تو انہیں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کیگئی۔ بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمار میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

نے میاں محمد ایک شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا۔ مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطۂ حجاز میں پہنچ گئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں جس میں اس نے باغیانہ تعصب کی تبلیغ کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص (مولانا عبید اللہ) اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا (شیخ الہند) کا اہم مقصد یہ تھا کہ بہ یک وقت ہندوستان پر باہر سے بھی حملہ کرایا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں بغاوت بھی پھیلائی جائے ہم اس جد وجہد کی تفصیل بتلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے عمل میں لائے۔ عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے ہندوستانی متعصب جماعت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترکی، جرمنی مشن سے ہوئی اور ان کے ساتھ اس نے بھائی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا دیوبندی دوست میاں محمد بھی اس سے جا ملا۔ یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب کے ساتھ عرب گیا تھا اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک اعلان حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا سے وصول کیا تھا۔ یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے محمد میاں نے اس کی کاپیاں راستہ میں ہندوستان اور سرحدی قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔

مولوی عبید اللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لئے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق مہندر پرتاب نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا۔ اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا۔ اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب ولہجہ کا ایک اخبار جاری کیا۔ جس کا نام اسلامک فرٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدار برادری سے جا ملا۔ ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت موقتہ (پروویژنل گورنمنٹ) نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے۔ جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور رستم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا ۔

ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاب کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔ زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ اور اس کی ایک تصویر ہمیں (رولٹ کمیٹی کے ارکان کو دکھلائی گئی تھی۔ حکومت موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا عبیداللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ (جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا) ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدرآباد سندھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں۔ اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں۔ ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زرد ریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام [1] بھاگے ہوئے (مہاجر) طالب علموں کے واقعات غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا۔ اور حکومت موقتہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے کرنے کی تجویز ہوئی تھی اور اس کا کام اسلامی حکومتوں

---

[1] ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لئے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجمنٹ اور میگزین پر حملہ کرنا تھا۔ اس تاریخ کو ۱۴۰ آدمی جن میں سے کچھ مسلم تھے ریل کے ذریعے فیروز پور پہنچے۔ مگر فوج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی۔ ان میں سے پندرہ مسلمان طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین (مجاہدین) سے جانے کے لئے نکل چکے تھے۔ (رولٹ کمیشن، رپورٹ فصل پنجاب، پیرا نمبر ۱۶۴، ہم نے پنجاب سے متعلقہ فصل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے ۱۵ طالب علموں نے کالج چھوڑا، اور مجاہدین سے جا ملے۔ اس کے بعد وہ کابل گئے۔ وہاں ان کو پہلے تو سختی سے نظر بند رکھا گیا اور بعد میں رہا ہو کر نگرانی کے ماتحت نقل و حرکت کی اجازت دے دی گئی۔ وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ تین کو حکومت روس نے گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے حوالہ کیا۔ انہوں نے اپنے برتاؤ کے متعلق ندامت کا اظہار کیا اور انہیں مشروط معافی مل گئی۔ ان پندرہ طلباء کو ان کے مداحوں نے مہاجرین کا لقب دیا تھا۔ ان میں سے جو دو واپس ہوئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں۔ ایک طالب علم تو ایک مطبوعہ ٹریکٹ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے اعلان کیا ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملہ کر کے ان مقامات کی بے حرمتی کا خطرہ ہے اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت کر کے کسی اسلامی ملک میں جانا چاہیئے۔ دوسرے طالب علم کو بھی اس سلطانی اعلان سے جوش آیا تھا اور انگریزی اخبار کی تصویر سے بھی اسے صدمہ پہنچا تھا جو اس کے خیال میں نفرت کی لہریں پیدا کرنے والی تھی۔ (حاشیہ ص ۵۹،۶۰ ذاتی ڈائری)

کے درمیان سلسلۂ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ تک پہنچا دیں۔ مولانا عبید اللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتب و مکمل نقشہ تھا اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سالار بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران، اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلباء میں سے ایک کو میجر جنرل بننا تھا اور چھ کو لیفٹیننٹ کرنیل۔ ان اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے جن اشخاص کو تجویز کیا گیا تھا ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقرر کے بارے میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی، چند پیش بندیاں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آ گئے اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جنگی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستخط کرنے والا غالب پاشا بھی جنگی قیدی ہے۔ اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کئے ہیں۔ اس خط کے مشمولہ حصول کا ترجمہ یہ ہے۔

"ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لئے کود پڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آ گئے ہیں۔

اس لئے مسلمانو! جس عیسائی حکومت کے بند میں تم پڑے ہوئے ہو۔ اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کر کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو۔ ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کرو۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مولوی محمود حسن آفندی (سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا۔ اور اسے ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہئے۔ اور آدمیوں — روپیوں اور ہر اس چیز سے امداد کی جائے جس کی ضرورت اسے پیش آ سکتی ہے۔"

(ذاتی ڈائری از ص۵۴ تا ص۵۶)

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

رولٹ کمیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہو سکا۔ تاہم ان تحریروں سے حضرت شیخ الہند کی جلالت و عظمت اور ان کے بلند ارادوں اور استقلال و عالی ہمتی اور بلند پروازی کا کافی اندازہ ناظرین کو ہو گیا ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے بارہا فرمایا کہ

"حضرت شیخ الہند" تو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچتے تھے "

اور جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تعزیت کے لئے دیوبند تشریف لائے اور رو کر کہنے لگے کہ۔

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال نے ہماری کمر توڑ دی "

یورپین قومیں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیر خواہ ہو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتی ہیں اور اس کا احترام کرتی ہیں۔ اگرچہ سیاستہً وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹا کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی آفیسر انگریز آتے تھے۔ تو حضرت شیخ الہند کو دور سے دیکھ کر ہیٹ (انگریزی ٹوپی) اتار کر سلام کرتے تھے اور با ادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کھڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات اپنے ترجمۂ قرآن کے لکھنے میں مصروف رہتے مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے آفیسر آ کر باادب کھڑے ہو جاتے تھے اور آپ کی مصروفیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے تھے۔ حالانکہ معمولی گورا بھی بڑے بڑے گورنمنٹ پرستوں، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم و تکریم عمل میں نہیں لاتا تھا۔ پرنس جرمنی (جرمن کا شاہزادہ) جو کہ امڈن جہاز سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹا میں ایک عرصہ تک رہا تھا۔ ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص عید البقر کے موقعہ پر حاضر ہوتا تھا اور مبارک بادی پیش کرتا تھا۔ اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرمنی، آسٹرین، بلگیرین اور ترکوں کا تھا۔ مسٹر برن جو کہ گورنر یوپی کا سیکرٹری انگریز تھا۔ مولانا عزیز گل صاحب سے بعض استادوں کے تذکرہ پر کہنے لگا کہ گڑگڑ ہی رہا اور شکر چینی بن گئی (یعنی تمہارے وہ اساتذہ کم ہمتی کی وجہ سے نیچے ہی رہے اور تم اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے) یہ تو دنیاوی عزت اور وقعت کا معاملہ ہے مگر ہم کو اللہ تعالےٰ کے یہاں آخرت میں اس سے بدرجہا زائد وقعت کی امیدیں ہیں ؎

سگِ اصحابِ کہف روزے چند		پے مردم گرفت مردم شد
پسرِ نوح با بداں بہ نشست		خاندانِ نبوتش گم شد

اسی پر جب شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں آ کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جو کہ اس کی اور اس کے آباء اجداد اور اولاد و خاندان کی ولی نعمت بھی تھی کفرانِ نعمت کر کے برباد کر دیا۔ تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ؎

با بداں یار شد شریف حسین		خاندانِ شرافتش گم شد

چنانچہ تھوڑے ہی زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے مٹا دیا گیا۔ شریف حسین کو اس کے آقاؤں نے ہی نظر بند کر کے جزیرہ سائپرس (قبرص) میں پہنچا دیا۔ اور وہ اسی طرح وہاں بیچارگی کی حالت میں مر گیا۔ آخرت کی خبر خدا جانے۔ اس کے لڑکوں شریف عبداللہ کو شرق اردن کی بے برگ و بے گیاہ وادی کا

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری

حضرت شیخ الہندؒ اس سفرِ حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد وجع المفاصل میں مبتلا ہو چکے تھے۔ سردیوں میں یہ درد ترقی کر جاتا تھا بسیڑھیوں پر چڑھنا، اترنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اس سفر میں اس طرح شاملِ حال ہوا کہ تمام زمانۂ اسارت میں یہ تکالیف بہت کم اور تقریباً معدوم ہو گئی تھیں۔ مالٹا نہایت سرد جگہ ہے۔ ہم کو ابتداء میں خیموں میں رکھا گیا تھا۔ سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی۔ مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجود لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدہ اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ حسبِ عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے۔ اور چونکہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی ایک شب میں کئی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی۔ تاہم بلا تکلف بار بار وضو کرتے تھے اگرچہ بعد میں ہم گرم پانی اور آگ کے مہیا کرنے کا انتظام بھی کر سکے۔ تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ تب بھی بلا تکلف حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے اعمال بجا لاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی شکایتیں تمام سفر میں نمودار نہ ہوئیں جو پہلے تھیں۔ البتہ ہندوستان پہنچ جانے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں شکایات لوٹ آئیں اور بڑھنے لگیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جذبۂ آزادیٔ ہند اور انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کا نہ صرف قائم رہا بلکہ اور قوی اور ترقی پذیر ہو گیا۔ ان میں مصائب مالٹا وغیرہ سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کئے ہوئے ہوں کہ اس بیماری سے اچھے ہوتے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جد وجہد کے لئے آمادہ کروں گا۔ اور یقیناً اگر عمر وفا کرتی تو ضرور وہ ایسا کرتے مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے۔ باوجودیکہ یونانی اور ڈاکٹری معالجوں کی فراوانی تھی اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم بھرتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا مگر تقدیر کے سامنے تدبیر کیا کر سکتی ہے۔

میرا ایامِ بیماری میں غیر حاضر ہونا

چونکہ ۲۶ ۱۳ھ، ۱۳۲۷ھ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان بحکم والد صاحب مرحوم بوجہ وفات اہلیۂ اولیٰ برائے عقدِ ثانی آیا تھا اور فرصت کو غنیمت جان کر دورۂ حدیث شریف کی پرانی تمنا کو حاصل کر سکا تھا۔ چونکہ اور رشتہ دار کنبہ والوں نے نکاح کرنے سے بخوفِ سفرِ حجاز انکار کر دیا۔ اسلئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی توجہ اور عنایت سے عقدِ ثانی قصبہ بھراؤں ضلع مراد آباد میں سید حکیم غلام احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہو گیا تھا۔ اگرچہ حکیم صاحب نے بشرطِ واپسی یک سال اہلیہ مرحومہ کو مدینہ منورہ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر مختلف ایسے مواقع آتے رہے کہ مجھ کو دیوبند میں تقریباً تین سال ٹھہرنا پڑ گیا۔ پہلے سال میں میں بخاری شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس دفعہ پڑھانے میں خصوصی مراعات فرماتے تھے جو کہ عام طلبہ کو حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس ۶ برس کے عرصۂ قیامِ مدینہ منورہ میں

یعنی ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک کتب درسیہ، غیر درسیہ عموماً میں نے نہایت پڑھائیں۔ تقریباً چودہ پندرہ اسباق مختلف علوم درسیہ کے روزانہ پڑھاتا تھا۔ طلبہ کا ہجوم تھا۔ اکثر مضامین غامضہ پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس لئے مباحث علمیہ کی مشکلات زیر نظر ہو گئی تھیں اور ان کی گتھیوں کو سلجھانا بجز حضرت شیخ الہندؒ کے کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی استحضار مسائل دیکھ کر نہایت کشادہ پیشانی سے بحث فرماتے تھے اور مشکلات کو بہت توجہ سے حل فرما کر بہت سے ایسے مضامین ذکر فرماتے تھے کہ عام مستفیدین کو ان کے سننے کی نوبت بھی نہیں آسکتی تھی۔ علاوہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تمام اساتذہ اور ارباب اہتمام انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ انہوں نے اگلے سال معقول تنخواہ پر خدمت تدریس پر مقرر کر دیا۔ اور ارباب شوریٰ نے یہ تجویز پاس کرادی کہ حسین احمد جب بھی ہندوستان میں آئے بلا تجدید تقرر خدمات تدریسیہ انجام دیا کرے اور کتب درسیہ میں اونچے درجے کی کتابیں حدیث و فقہ و تفسیر وغیرہ کی پڑھانے کے لئے دی گئیں۔ اسی عرصہ میں جلسہ دستار بندی بھی منعقد ہوا۔ اور اس کی خدمات بھی حسب استطاعت انجام دینی پڑیں۔

چونکہ میں اپنی خواہش سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر جدہ سے ہوا تھا تاکہ سفر میں حضرت کی خدمات سرانجام دوں اور حتی الوسع تکالیف سفر کم کردوں۔ اس لئے واپسی پر قصد مصمم تھا کہ بمبئی پہنچ کر حجاز کو واپس ہو جاؤں گا بمبئی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام کا بہت بڑا گروہ مل جائے گا۔ میرے خدمت میں حاضر رہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اور نہ ضرورت ہے۔ مگر اس خیال کو جب میں ایک روز سویز میں ظاہر کیا تو فرمایا کہ میں تراجم ابواب بخاری کی شرح لکھنا چاہتا ہوں مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا۔ میں سمجھ گیا۔ کیونکہ ایام اقامت دیوبند میں بھی یہ کام شروع کیا گیا تھا اور حضرت نے میری اس وقت کی خدمات کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ جو وقت آپ اس کے لئے عطا فرمائیں، اس وقت میں چاہے کیسا ہی بلند مرتبہ شخص آئے اس کے لئے صرف نہ فرمائیں۔ فرمایا کہ قبول ہے۔ مگر ہماری بھی ایک شرط ہے۔ میں نے عرض کیا وہ کیا ہے۔ تو فرمایا کہ پھر کہیں گے۔ اس لئے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ دیوبند میں حضرت کی خدمت میں تا اختتام تراجم الابواب رہوں گا۔ مگر جب بمبئی پہنچا اور تحریک خلافت کا زور شور دیکھا۔ اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تحریک آزادی کی جدوجہد کی طرف قوی تر ہو گیا ہے اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں تو یقین ہو گیا کہ کسی قریبی زمانہ میں تراجم الابواب کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں۔ اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں۔ تو فرمایا کہ تیرا جانا تو کسی طرح اس زمانۂ شریفی میں مناسب نہیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے دونوں بھائیوں مولوی سید احمد مرحوم اور محمود احمد کو بھی لکھ دے کہ وہ یہاں ہی آجائیں۔

تو پھر میں نے عرض کیا کہ اچھا تو اتنی اجازت عطا فرمائیں کہ میں بمبئی میں ۳، ۴ دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیوبند پہنچوں۔ میرے چند احباب یہاں ہیں ان سے ملنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اسی پر اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ چنانچہ ساتھ ساتھ ہی دیوبند پہنچنا ہوا۔

حافظ زاہد حسن صاحب امروہی میرے خصوصی محسن ہیں ۔ ان سے ہمیشہ بہت گہرے تعلقات چلے آتے ہیں۔ وہ بھی بمبئی تشریف لائے تھے چونکہ وہ مدرسہ امروہہ جامع مسجد کے مہتمم تھے اور مدرس مدرسہ مذکورہ ۔ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم کی کسی وجہ سے مدرسہ امروہہ سے برداشتہ خاطر ہو کر میڈھو یا چھتاری کے مدرسہ میں چلے گئے تھے ۔ اس لئے حافظ صاحب موصوف نے مجھ پر زور دیا کہ وہاں کی ملازمت قبول کر لے ۔ بمقتضائی ضروریات وقتیہ میں نے کہا کو قبول کر کے عرض کیا کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے لیں ۔ انہوں نے دیوبند پہنچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو راضی کر لیا ۔ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے دیوبند کے لئے فرمایا کہ اس کی مدرسی یہاں کی پہلے سے منظور شدہ ہے ۔ بحث و تمحیص کے بعد وہ بھی راضی ہو گئے ۔ چنانچہ یورپ کے سفر کوڑہ جہاں ۔ غازی پور ۔ فیض آباد ۔ لکھنؤ ۔ مرادآباد سے واپس ہو کر امروہہ چلا گیا ۔ اور کتب تدریسیہ متعلقہ مدرس اول کی تدریس میں مشغول ہو گیا ۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حضرت کا حکم محرم مجھ کو ملا کہ تجھ کو یہاں دیوبند میں میرے پاس رہنا چاہیئے ۔ اس زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بیماریوں کی شکایت شروع ہو گئی تھی ۔ مہمانوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور تحریک آزادی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری فرما رہے تھے ۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد اور حکم سے میں امروہہ گیا ہوں اور وہ بھی آپ ہی کا مدرسہ ہے اس کا قائم رکھنا ضروری ہے تو فرمایا کہ مجھ کو یہاں تیری ضرورت ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً فلاں فلاں حضرات موجود رہتے ہیں ۔ فرمایا کہ یہ لوگ تو اپنی نگہداشت بھی نہیں کر سکتے میری نگہداشت کیا کریں گے ۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا ۔ اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حافظ زاہد حسن صاحب کو لکھتا ہوں ۔ چنانچہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی ۔ وہ فوراً آئے اور عرض و معروض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک مہینہ کے لئے حسین احمد کو امروہہ کی اجازت دے دی جائے تاکہ ہم اس مدت میں دوسرے مدرس کا انتظام کر لیں ۔ حضرت اس پر راضی ہو گئے اور میں امروہہ جا کر تدریس میں مشغول ہو گیا ۔ میرے جانے پر مرض کی زیادتی ہو گئی ۔ کچھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ حضرت کا تار پہنچا کہ میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں تو مجھ سے علی گڑھ میں مل ۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علی گڑھ اور جامعہ ملیہ

تحریک خلافت کا زور تھا انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی ۔ ترک موالات کا جوش تھا ۔ اس لئے چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی برطانیہ سے ترک تعلق کر لے ۔ مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیاں یونیورسٹی کب اس کو گوارا کر سکتے تھے ، انہوں نے سخت مخالفت کی ۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی ۔ اور آزاد درس گاہ قائم کرنے کے لئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو ۔ تیاری کرنے لگی ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب ناگ پور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اس میں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی ۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ

اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا۔ جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی۔ اور تمام مسلمانوں، اور طلبہ مسلم یونیورسٹی کو زور دار شدومد سے دیا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں، اور تمام کالج اور سکول گورنمنٹ امداد چھوڑ دیں۔ اور اگر کالجوں اور سکولوں کے زعماء ایڈ نہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی فتوے کی وجہ سے گورنمنٹ نے رحیم بخش کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بھلانے اور فتویٰ واپس لینے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتوے ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔ جیسا کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتوے بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتوے حاصل کیا۔ اور وہ چھپ کر شائع ہوا۔ فتوے مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

" بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ قال اللہ تعالیٰ۔ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصٰبرین۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بگڑ جائے تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔

اور تم کو نیکی اور تقوے کی معاونت کرنی چاہیئے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو۔

ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین۔

کفار کی موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے۔ اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی وہ شخص بھی ان ہی میں شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ ساکرم ضعیف　　　آدمی کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد! آج جب کہ شرق و غرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ جب کہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے طوفانوں کی موجوں سے ٹکرا کر خداناکردہ پاش پاش ہو جائے۔ جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے۔ بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علماء ہند کی تعداد کثیر اور

ہندو ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جد وجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائیں۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن جو فرض شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اس کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، اور جیسا کہ میری طویل زندگی سے شاہد ہے۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز وفلاح سے ہو، یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔ مالٹا سے واپس آکر مجھ کو علم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بست وکشاد نے آخری طریقۂ کار اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات وحقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے۔ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صریح تعلیم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوۂ حسنہ کو مضبوط تھام لیں۔ اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب طیبہ کی پوری جانچ کرکے اس کو بے خوف وخطر انجام تک پہنچائیں۔ اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً وعملاً ترک کردیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے۔ اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضاء ہونا چاہئے کہ وہ

۱ سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے۔

۲ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے۔

۳ صرف اپنی ملک کی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

۴ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جائیں ان پر عمل کریں۔ بشرطیکہ

۱ اتباع شریعت کیا جائے اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

۲ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقائص امن کا اندیشہ ہو۔ اس سے احتراز کیا جائے اور ہر کام افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کو مد نظر رکھ کر کیا جائے

۳ ارشاد عثمانؓ اذا احسن الناس فاحسن معھم واذا اساؤا فاجتنب اساتھم۔ (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو۔ اور جب کہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو) کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین۔

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی

۳، ذلیقعدہ ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتوے جمعیتہ علماء ہند کے متفقہ فیصلہ کی صورت میں تقریباً ۵ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔
الغرض اسی تحریک اور اسی فتوے اور اسی تحریر کی بناء پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر زعماء مسلم یونیورسٹی پہلے سے آزاد اور قومی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا بہرحال گورنمنٹ پرستوں نے انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور غداریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ بجز سیلی روح کب اس کو گوارا کر سکتی تھیں۔ انہوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوئی۔ تو مجبوراً آزاد نیشنل یونیورسٹی کے لئے جلسہ کرنا چاہا۔ اور اہل الرائے کو دعوت دی اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ خدام نے اس سفر کو خطرناک اور نہایت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جد وجہد کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیر تک فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت کا جواب حسب ذیل تھا۔

"اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہوں گا"

چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اجلاس کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبۂ صدارت کا مضمون مولانا شبیر احمد صاحب[1] کو بتلا کر تحریر کا حکم دیا۔ اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے تو اس کو سن کر حسب منشاء ترمیم فرما کر چھپنے کا حکم دیا گیا۔

اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا۔ ہر قسم کا علاج جاری تھا مگر بجائے فائدہ، زیادتی تھی۔ بخار لازمی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا تقاضا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے تاکہ میں پوری توجہ سے اپنی آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کر سکوں۔

---

[1] حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مہتمم دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب سر جیمس گورنر یو۔پی نے دلوایا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالے علیہ نے اس کو واپس کر دیا۔ اور ایسی مؤثر تقریر مجمع خصوصی میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام مجمع متاثر ہو کر بیک زبان واپسی کا متقاضی ہوا۔

مگر چونکہ علی گڑھ کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں اسلئے قرار پایا کہ علی گڑھ کے جلسہ سے فارغ ہو کر براہِ راست دہلی روانہ ہو جائیں گے اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائیں گے۔

میرا علی گڑھ اور پھر دہلی پہنچنا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا اجلاس میں صدارت فرمانا

دیوبند سے تار آیا کہ میں فلاں گاڑی سے علیگڑھ جا رہا ہوں۔ تو مجھ سے وہاں مل۔ حسب الحکم میں وہاں پہنچا حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ کی کوٹھی پر قیام تھا۔ وہیں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے شرکت اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے۔ دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا۔ خطبہ صدارت جناب مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے پڑھا جو کہ مطبوعہ ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں۔

۱ میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امید وار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا را جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ۔ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ ان چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا۔

پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

۲ اے نونہالان وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔ تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

۳ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوے نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں۔ یا حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں۔ تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کا جاہل رہنا اچھا ہے۔

۴ ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر

طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروغ سے بے خبر ہوں۔ اور اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں قوم و ملک کی حمیت نہایت ادنےٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو۔ اور جس کا تمام تر انتظام عملی اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہند نے فرمایا ہے منصف انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ص ۲۰۲ میں ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے۔

"مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو واقعی باغیرت اور خود دار ہیں دنیا دار لوگ ہمیشہ قائم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے بے لچک حقائق کے مقابلے میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں۔ لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔"

(صفحہ ۳۰۲ ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ایم اے ایل ایل بی)

علی گڑھ سے واپسی

اجلاس مذکورہ سے فارغ ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت توجہ سے علاج فرمایا۔ چونکہ اس سے پہلے امرتسر میں جمعیۃ العلماء کا انعقاد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ اور مولانا کفایت اللہ صاحبؒ۔ مولانا احمد سعید صاحبؒ اور دیگر حضرات کی جد و جہد سے ہو چکا تھا۔ اور پہلا جلسہ بھی وہیں ہو چکا تھا۔ اس لئے اہل الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس دہلی میں بڑے پیمانہ پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے تاکہ احوال حاضرہ میں علمائے اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق ہو سکے۔ کیونکہ حضرت کو عام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ حسن اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی استدعا کی گئی تو آپ نے قبول فرمایا۔ اور ۸، ۹، ۱۰ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر کی گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبہ صدارت پر مامور فرمایا۔ اور مضامین ضروریہ ذکر فرما دیئے۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کرکے پیش فرمایا اور حضرت کو سنایا۔ بعد ضروری اصلاحات اور ترمیم کے حضرت نے چھپوانے کا ارشاد صادر فرمایا۔ خود حضرت اس قدر بیمار اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجودیکہ وہ دہلی میں تھا نہیں جا سکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے پڑھا۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء اپنی کتاب "علماء حق" ص ۲۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز اگرچہ حیات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے بلکہ علماء کی آرزو یہی تھی کہ جمعیۃ علماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی امتیاز حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کر لے جس پر کاربند ہو کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتی رہے۔

حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر علماء ملت اور ملی سیاست کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ کے اس خطبہ صدارت نے علماء ملت کو مندرجہ ذیل اصولی نظریات کی ہدایت فرمائی۔

۱ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے۔ جس سے ترک موالات فرض ہے۔

۲ تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ ہیں۔

۳ استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

۴ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعت اعدار کے لئے جائز ہو سکتا ہے باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں، تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں"

(ص ۱۱ خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند جملے بلفظہ درج ذیل ہیں۔

"کچھ شبہ نہیں کہ اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد

قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائدین نے کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اس کیلئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لئے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما، قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقت ور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی۔ ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں لیکن محکموں اور الواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذاء رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے مخاطب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔

اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیئے، یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے لئے مہلک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی، اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں

کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں ہم قائل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے"۔

(ص۳۱ خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مطبع قاسمی۔ از علماء حق ص۱۴۱)

حضرت شیخ الہندؒ کی بیماری اور وصال

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تو جناب مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ "حیات شیخ الہند" میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل ہے۔ بنابریں ہم اس کا اختصار ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں۔

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ایک بجے دن کو مالٹا سے بمبئی پورٹ پر تشریف فرما ہوئے۔ بمبئی میں دو دن قیام فرماکر ۲۲ رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰ جون بعد از مغرب روانہ وطن ہوئے۔ ۲۴ رمضان المبارک مطابق ۱۲ جون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ ایک روز قیام فرماکر ۲۵ رمضان المبارک مطابق ۱۳ جون ۱۹۲۰ء بروز یکشنبہ بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے اور اسی روز ۹ بجے دیوبند پہنچے۔ استقبال کرنے والوں کا ہر اسٹیشن پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔ مہمانوں کی اطراف و جوانب سے بہت زیادہ آمد تھی۔ بنا بریں ۱۳۳۸ھ ۱۰ شوال تک دیوبند ہی میں قیام فرمانا پڑا۔ ورنہ پختہ ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑہ جہاں آباد ضلع فتح پور، مرحوم کی تعزیت کے لئے پہنچیں۔ جہاں ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے۔ وہاں سے الہ آباد۔ غازی پور۔ فیض پور۔ لکھنؤ۔ مراد آباد ہوتے ہوئے ۲۵ شوال کو دیوبند واپس ہوئے۔ چونکہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لئے درمیانی مقامات پر نہ جا سکے۔ اگرچہ عقیدتمندوں کے بہت تقاضے تھے۔

۱۷ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو اہلیہ محترمہ مرحومہ نے داغ مفارقت دیا۔ جس کا اثر طبع مبارک پر ہونا طبعی امر تھا۔ ماہ ذالحجہ میں دیوبند میں موسمی بخار اور تپ و لرزہ کا بہت زیادہ شیوع ہوا۔ چنانچہ عشرۂ محرم کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی مبتلاء تپ و لرزہ ہو گئے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ وجع مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندوستان پہنچنے کے بعد عود کر آئی تھی۔ مگر تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے۔ اور نشست و برخاست، آمد و رفت پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے مگر اس تپ و لرزہ نے یکبارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ نشست و برخاست، آمد و رفت کی طاقت جاتی رہی

معالجہ یونانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔ بعد انتہائی کمزوری اور مرض کے اواخر محرم سے افاقہ تدریجی طور پر شروع ہوا۔ مگر افاقہ کی رفتار بہت سست تھی۔ ۲ صفر کو بتقریب صحت احباب اور طلباء دارالعلوم کی دعوت کی گئی۔ جس کا اہتمام مخلصین نے از خود کیا تھا۔ افسوس کہ قدرت کو یہ خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔ ۶ صفر کو پھر بخار آیا اور پیچش بھی ہوگئی۔ اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ اطباء نے ورم جگر تشخیص کیا۔ اسی زمانہ میں سفر علی گڑھ کی تحریک ہوئی۔ جس کو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔ کمزوری اس قدر تھی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے خطبہ پڑھا۔ اگلے روز علی گڑھ سے واپس ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔ معالجہ نہایت توجہ سے ہوا جس سے تخفیف کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۴ ربیع الاول تک اطمینانی حالت رہی مگر ۱۵ ربیع الاول یوم شنبہ کو پھر لرزہ بخار آیا اور حالت نہایت نازک ہوگئی۔ بخار بہت تیز ہوگیا۔ حالت اگر تشویشناک مگر ہوش و حواس بجا تھے۔ آدمی پہچانتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے بات بھی فرماتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سوانح ص۱۴۶ میں لکھتے ہیں۔

(۱۸ کی شب کے متعلق)۔ رات بھر یہی حالت رہی۔ سینہ پر بلغم تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفع نہیں کر سکتے تھے صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو خلاف امید حلق میں اتر گیا۔ ۶ بجے کچھ اجابت ہوئی اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ ضعف لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا تھا اور باوجود ہوش بجا ہونے کے ایک استغراقی حالت تھی۔ مخصوص لوگ چارپائی کے گرد جمع تھے دل دھڑک رہے تھے۔ طبیعت ہراساں تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر کو بہت تغیر ہوگیا۔ حضرت دنیا سے بالکل غافل ہو گئے تھے تنفس طویل اور غیر طبعی ہوگیا۔ اور انقطاع عن الدنیا وتوجہ الی الرفیق الاعلی کا گمان غالب آنے لگا۔ چارپائی کے گرد حاضرین خاموشی اور آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیر فانی اور واجب الوجود ہستی کو یاد کیا۔ جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا تھا۔ یعنی بلند آواز سے تین مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔

مولانا شبیر احمد مرحوم کا بیان ہے (جس کو مولانا خلیل احمد صاحب نے نقل فرمایا کہ) حضرت نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر

افسوس تو یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد ہوتا اور اعلاء کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے سورۂ یٰسین شروع کی مگر وہ جوش گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے اس لئے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کرلیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر سیدھی کرلیں۔ اور ۸ بجے جب کہ مولوی صاحب بالکل اخیر پر پہنچے تو آپنے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کے لئے زبان کو حرکت دی اور خاص الیہ ترجعون کی آواز پر قبلہ رُخ ہو کر ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کرلی کس اور سہولت سے سانس منقطع ہوگیا اور روح مقدس روح و ریحان وجنۃ نعیم کی بہار دیکھنے کے لئے تمام اہل اسلام کو یتیم و بے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی۔ اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے"

(سوانح شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ص۱۴۷)

غم زدہ اور پریشان حال حاضرین کے صدمے اور قلق و بے قراری کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر تو وہ حالت رہی کہ ایک کو ایک کی خبر نہ رہی۔ کسی کی آہ نکلی کوئی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے جانکاہ حادثات پر آہ و نالہ اور چیخ و پکار ایک معمولی بات ہے۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا فیض صحبت کام آیا اور رضا بالقضا کا مضمون غالب ہوا۔

نصف گھنٹہ کے بعد منزل اول (قبر) کا فکر ہوا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی صاحب (حکیم محمد حسن صاحبؒ) اور خدام سے استفسار فرمایا۔ کہ اگر دہلی دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور احفاد کرام رحمہم اللہ تعالیٰ) کے مزارات میں سامان کیا جائے۔ اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آوے۔ جواباً کہا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے مخدوم استاد کے جوار باکرامت میں جگہ ملے۔ اور یہی آرزو اور کشش دوسری دنیا (مالٹا) سے کھینچ کر لائی تھی۔ نیز صاحب زادیاں بھی اب تک دہلی نہ پہنچی تھیں۔ اسلئے یہی رائے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہیئے۔[1]

---

[1] مگر مولانا جلیل احمد صاحب کا بیان یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہی تھی کہ حضرت کو مقبرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن کیا جائے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں دو مشکلات میں مبتلا ہوں۔ ایک یہ کہ دیوبند لے جائیں تو مذہب حنفی میں یہ غیر مستحسن ہے۔ اور دوم یہ کہ یہاں کے مقابر میں دفن کریں تو چونکہ اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تمام مسلمانوں کو انتہائی شغف اور محبت ہے لہذا خوف ہے کہ لوگ قبر کو پختہ

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

(سوانح ص۱۴۱)

دیوبند کو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مضمون کا مفصل تار روانہ کیا کہ "حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی۔ جنازہ شام کو دیوبند پہنچے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظامات میں مصروف ہوئے ادھر خدام نے غسل کا انتظام کیا۔ حکیم محمد حسن صاحب نے مخدوم ش شاگردوں کی امداد سے بطریق مسنون غسل دیا۔ اور کفن پہنا کر تابوت میں رکھا جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کرایا گیا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ریل کے متعلق تمام انتظامات درست ہوگئے۔ جن کی تکمیل میں دوسروں کو بہت دقت اور تاخیر پیش آتی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا تار امروہہ میں میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ میں نے امروہہ پہنچنے کی ان کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ غالباً سی، آئی، ڈی نے ان کو اطلاع دی ہوگی۔ دہلی میں آناً فاناً وفات کی خبر مشہور ہوگئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دوکانیں فوراً بند کردیں۔ ہزاروں مسلمان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار ہوتے ہی نماز جنازہ کے متقاضی ہونے۔ حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی خواہش اور اصرار ہے تو تم جنازہ پڑھ لو میں شریک نہ ہوں گا۔ تاکہ مجھ کو نماز کے دہرانے کا اختیار رہے۔ اور میں دیوبند میں پھر نماز اعزہ و اقارب کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتبہ بہت بڑے مجمع کے ساتھ نماز ادا کی گئی۔ اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا اسٹیشن کے قریب پہنچ کر بیس ہزار آدمیوں کی تعداد ہوگئی۔ وہاں پھر دوسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تابوت تھا روانہ ہوئی۔ پھر شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ نہ کردیں۔ اور ہم کتنا ہی صدائے احتجاج بلند کریں کچھ بھی نہ سنیں گے۔ پھر فرمایا کہ اہون البلیتین یہی ہے کہ جنازہ دیوبند ہی لے جایا جائے۔ وہاں قبر کے پختہ کرنے کا احتمال نہیں ہے اور صاحبزادیوں کی بھی اشک شوئی ہوجائے گی۔ اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا۔

[1] حضرت شیخ الہندؒ کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولانا عبداللہ مصری مولانا آزاد کا کلکتے سے ایک خط لے کر آئے جس میں لکھا گیا تھا کہ مدرسہ عالیہ کے طلباء نے ترک موالات کی تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کلکتہ ہی میں ایک آزاد نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کردیا جائے لہٰذا آپ ہمیں ایک مدرس دیں جو علم حدیث کی تمام کتابیں اچھی طرح پڑھا سکے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ کا نام تجویز کیا۔ لیکن انہوں نے بعض مجبوریوں کی بناء پر عذر کیا۔ بالآخر حضرت مدنیؒ کا نام تجویز کیا گیا۔ حضرت مدنیؒ جانے کے لئے تیار ہوگئے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اژدہام نہایت عظیم الشان تھا۔ بمشکل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا۔ اور بہت دیر میں مکان پر پہنچا۔ قبر چونکہ پہلے سے تیار تھی اس لئے بہت سے لوگوں کی رائے ہوئی کہ ابھی رات ہی میں دفن کر دیا جائے۔ مگر چونکہ صاحب زادیاں اور داماد جو کہ تار ملنے کے بعد دیوبند سے دہلی روانہ ہو چکے تھے۔ اور ابھی راستہ ہی میں تھے کہ جنازہ غازی آباد آگیا۔ اسلئے وہ غازی آباد اتر گئیں۔ مگر ہجوم کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روانگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہو سکی تھیں اس لئے ترجیح اس کو دی گئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اگلی ٹرین سے رات میں آگئیں۔ بہت سے عقیدتمند اور مخلصین کا بے شمار اجتماع سہارنپور، مظفر نگر وغیرہ اطراف وجوانب سے ہو گیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ، اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا۔ صبح تک یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہو گیا۔ جنازہ صبح کی نماز کے بعد دارالعلوم دیوبند میں پہنچا دیا گیا۔ نودرہ اور باہر کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بمشکل تمام صف بندی ہوئی۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ جنہوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی باقلب مضطر وچشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پر کیف سکوت طاری تھا اور ایک ہیبت و نورانیت مشاہد ہو رہی تھی۔ خواہ اس کو جذبات حسرت سمجھئے یا واقعیت وحقیقت کہئے۔

(سوانح صـ۱۵۲)

دیوبند میں اس وقت تک بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر مجمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے قبرستان تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ جنازہ مقبرہ میں پہنچا یعنی بیالیس برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لئے یہ شاگرد رشید فخر استاد اپنے مقدس مرشد واستاد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ قبر تیار تھی جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ اور حضرت کے داماد اور بعض مخصوص خادم قبر میں اترے۔ چاشت کا وقت تھا۔ نو بجے تھے کہ قدوۃ الواصلین۔ امام المحدثین والعارفین۔ قطب عالم منبع علوم وکمالات، بطل حریت، آزاد کنندہ ہندوستان۔ حاتم دوراں۔ بخاری زماں۔ کوہ وقار۔ وقار وحلم۔ آفتاب معرفت وعلوم گنجینۂ حکمت الٰہیہ۔ خزینۂ احادیث۔ سنن نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوۃ والتحیہ) کو لحد میں اتار دیا گیا۔ اور شریعت وطریقت کے آفتاب عالم تاب کو ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپا دیا گیا۔ ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو　　　گنجینۂ علوم ہے گنجینۂ زر نہیں

انا للہ وانا الیہ راجعون ط رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔ آپ کلکتہ جا رہے تھے کہ راستہ میں امروہہ والوں نے آپ کو ایک جھگڑے کے تصفیہ کیلئے جو سنیوں اور شیعوں کے درمیان تھا، اتار لیا۔ ابھی امروہہ ہی میں تھے کہ دہلی سے ڈاکٹر انصاری کا تار آگیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہو گیا ہے۔

میرا دیوبند پہنچنا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے دن امروہہ پہنچا۔ اور اسی روز جلسہ اور تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب کا تار پہنچا کہ حضرت کا وصال ہو گیا۔ اور جنازہ دیوبند جا رہا ہے۔ میں نے دیوبند جانے کا ارادہ کر لیا۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شام کی گاڑی نکل چکی تھی اس لئے رات کی گاڑی ملی۔ اور میں صبح کو تقریباً ۹ بجے دیوبند پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر جب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آ رہے ہیں۔ اپنی بدقسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس ہوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور دفن میں شرکت کر سکا۔ افسوس! ؎

قسمت کی بدنصیبی کو صبا دکیا کرے　　　سر پہ گرے پہاڑ تو فریاد کیا کرے

کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ دو چار روز رہ کر کلکتہ کا عزم کیا۔ تو حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دار العلوم دیوبند مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اپنی شدید بیماری کے دوران میں جب کہ خود حضرت میری حاضری کی ضرورت محسوس فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند ضرورتیں درپیش تھیں۔ ان سب کو نظر انداز فرما کر کلکتہ روانگی کا حکم فرمایا اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت کا حکم پس پشت ڈال دیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے خصوصاً جب کہ دار العلوم میں بہتر کارکن حضرات موجود ہیں میرا یہاں قیام کس طرح درست سمجھا جا سکتا ہے۔ الغرض میں نے کلکتہ کی روانگی پر اصرار کر کے حضرت مہتمم صاحب کو راضی کر لیا اور کلکتہ پہنچ کر اسباق حدیث شریف سنبھال لئے۔ مگر چونکہ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اطراف و جوانب کلکتہ میں بکثرت جلسے ہو رہے تھے۔ ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں اندرون بنگال بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا۔ جن میں سے مولوی بازار کے مشہور جلسہ کانگریس و خلافت میں بھی جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اجلاس کانگریس کے صدر مسٹر سی آر داس آنجہانی تھے۔ اور جلسہ خلافت اور جمعیۃ کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ اور دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دو مرتبہ ہندوستان یو۔ پی میں بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیوہارہ ضلع بجنور کا تھا اور اس جلسہ میں جمعیۃ کی صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم دار العلوم نے فرمائی تھی۔ اور جلسۂ خلافت کی صدارت کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقعہ پر بھی کانگریس کا اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر دہرہ دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا۔ ان جلسوں کے ضروری اقتباسات حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند نے اپنے رسالہ میں نقل کر دیئے ہیں[1]۔ اسی طرح سہارنپور کے مدرسہ مظاہر العلوم کے

---

[1] ملاحظہ فرمائیے رسالہ "حیات شیخ الاسلام"۔

سالانہ جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسوں میں حاضر ہونا پڑا جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا۔ اور دو سال قید با مشقت کی سزا بھے اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مولانا شوکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوئی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو یہاں ختم کریں۔ کیونکہ یہ احوال اکثر تحریروں میں آ گئے ہیں بخصوصاً مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رسالوں میں ذکر فرما دیئے ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں۔ نیز خطبات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اس لئے مزید تحریر غیر ضروری سمجھ کر قلم فرسائی بند کرتے ہیں۔

تصانیف

(۱) ترجمہ قرآن مجید۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے درس و تدریس اور سیاسی مشاغل کے باوجود کئی ایک کتب تحریر فرمائی ہیں۔ ان سب میں سرفہرست قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمۂ قرآن پاک مالٹا جیل میں سرانجام پایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شاید حضرت کو مالٹا جیل میں محبوس ہی اسی لئے فرمایا تھا کہ وہ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کر سکیں۔ سورۂ مائدہ تک حواشی تحریر فرمائے تھے کہ رہائی مل گئی۔ اور بقیہ فوائد و حواشی علامہ شبیر احمد عثمانی (رحمۃ اللہ علیہ) نے پورے کئے۔

اس ترجمہ و تفسیر کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مقبولیت عطا فرمائی کہ شائد کسی اور ترجمہ و تفسیر کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ یہی ترجمہ و تفسیر فارسی میں ترجمہ ہو کر حکومت افغانستان کے اہتمام سے کابل سے شائع ہوئی۔ تاج کمپنی لاہور نے اس ترجمہ و تفسیر کو اتنی عمدگی اور نفاست سے شائع کیا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔

۲۔ تراجم ابواب بخاری: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری کے تراجم کی تشریحات جو نہایت مشکل کام ہے۔

۳۔ تقریر ترمذی بزبان عربی: یہ تقریر ترمذی شریف کے حاشیہ پر چھپ چکی ہے اور مقبول خاص و عام ہے۔

۴۔ حاشیہ ابوداؤد شریف: یہ بھی حدیث پاک کی خدمت ہے۔

۵۔ حاشیہ مختصر المعانی: عربی معانی کی مشہور کتاب پر حاشیہ۔

۶۔ ایضاح الادلہ:

۷۔ شرح اوثق العریٰ فی تحقیق الجمعۃ فی القریٰ: حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کی شرح، مضمون نام سے ظاہر ہے۔

۸۔ جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل۔

لہ ملاحظہ فرمائیے علمائے حق جلد اول و دوم۔ و حیات شیخ الاسلام۔

حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۳۵

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے معتمد علیہ ساتھیوں کا اجمالاً تذکرہ کر دیا جائے کہ ان کے تذکرے کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا ۔

حاجی ترنگ زئیؒ ترنگ زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں اتمان زئی (خان عبدالغفار خان کا گاؤں) کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ حاجی صاحبؒ اسی گاؤں کے تھے۔ اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کا نام فضل واحد تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ صاحبِ علم و عمل اور مشہور پیران طریقت و سلوک میں سے تھے۔ حضرت مولانا شاہ نجم الدین معروف بہ بڈے ملاؒ کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ مولانا نجم الدین صاحب بڈے ملاؒ حضرت مولانا شاہ عبدالغفور صواتی معروف بہ حضرت صوات صاحبؒ کے جانشین تھے۔ مولانا عبدالغفور صاحب ریاست صوات (سوات) کے والی تھے۔ موجودہ والیٔ سوات جہان زیب، مولانا عبدالغفورؒ کے پڑپوتے ہیں۔ (حضرت مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور حاجی ترنگ زئی مرحوم کے پیر بھائی مولانا غلام حیدر صاحبؒ سے بیعت اور مجاز خلیفہ ہیں)۔ مولانا عبدالغفور صاحبؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ مل کر جہاد میں حصہ لیا تھا۔ اور ان کی کافی معاونت کی تھی۔ حاجی ترنگ زئی بھی اپنے پیران طریقت کے قدم بہ قدم چل کر غزا و سلوک دونوں کے مردِ میدان تھے۔ اس زمانہ میں ان سے زیادہ مقبول و معروف کوئی پیر اس علاقہ میں نہ تھا۔ یاغستان اور آزاد قبائل میں ان کے ہزارہا مرید تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے ایما پر بار بار ان کے پاس گئے اور ان کو مجبور کیا کہ وہ آزاد علاقہ میں ہجرت کر جائیں۔ اور وہاں کمان سنبھالیں۔ کیونکہ وہاں بے شمار مجاہدین تھے اور اسلحہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جنگ عظیم کی وجہ سے انگریز کی مشاق پلٹنیں باہر گئی ہوئی تھیں۔ لہٰذا یہاں

آزاد قبائل میں ان کو حاجی صاحب کی وجہ سے بار بار شکست فاش ہوئی۔ بالآخر انگریز نے ڈپلومیسی اختیار کی اور امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کو درمیان میں ڈالا۔ اور لکھوکھا روپیہ سرداران قبائل میں تقسیم کر کے یہ مشہور کیا کہ بغیر امیر کے جہاد جائز نہیں۔ لہذا امیر حبیب اللہ جو بادشاہ ہیں ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ اس دو دھاری تلوار کا اثر یہ ہوا کہ حاجی صاحب کے ساتھیوں میں پھوٹ پڑگئی۔ اور ان کی طاقت کمزور ہوئی اور شکست پر شکست کھانے لگے۔ آخر کار حاجی صاحب مرحوم کو ان کے ساتھی علاقہ مہمند میں لے گئے۔ وہ وہاں محفوظ ہو کر اقامت پذیر ہو گئے اور وہیں وفات پائی (رحمۃ اللہ تعالےٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین)۔

مولانا سیف الرحمٰنؒ

اصل میں قندھار کے تھے۔ آباؤ اجداد نے پشاور کے پاس سکونت اختیار کی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ عرصۂ دراز ریاست ٹونک میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اخیر میں مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرس اول ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو ہم خیال بنایا۔ اور یاغستان ہجرت کرنے کا مشورہ دے کر روانہ کیا۔ لوگوں کو وعظ و تقریر کے ذریعہ جہاد پر تیار کرتے رہے۔ نہایت ذہین، صاحب علم اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کے کہنے پر ملازمت چھوڑی تھی لہذا حضرت ان کو ماہ بماہ خرچ بھیجتے رہتے تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے۔ شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے آخری عہد میں انگریزوں کے احتجاج پر مولانا منصور کے ساتھ یاغستان روانہ کر دیئے گئے۔ مولانا کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں کر کے ہندوستانی معاملات سے علیحدگی کا وعدہ لے لیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ کی زندگی تک مستوفی الممالک کے ساتھ رہے۔ اور مستوفی کو جو کام انگریز دیتا اس میں اس کی امداد کرتے۔ سردار امان اللہ خاں کے عہد میں آزاد ہو کر کابل پہنچے اور بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ (رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین)۔

مولانا منصور صاحب انصاریؒ

ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے اور پیر جی عبد اللہ انصاری ناظم دینیات علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انبیٹھ کے متوطن تھے۔ دارالعلوم معینیہ اجمیر میں صدر مدرس رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ترجمہ قرآن میں معاون رہے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے نائب بن کر جمعیۃ الانصار میں کام کرتے رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حجاز گئے۔ مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا سے شیخ کی ملاقات کے بعد ہدایات لے کر ہندوستان لوٹے تاکہ یہاں کام کریں۔ حسب رپورٹ رولٹ غالب نامہ ان کے پاس تھا۔ جب ہندوستان آئے تو ریشمی خط انگریزوں کو مل چکا تھا۔ لہذا پکڑ دھکڑ شروع تھی۔ لہذا بھیس بدل کر یاغستان چلے گئے اور وہاں سے کابل۔ انگریز کے احتجاج پر مولانا سیف الرحمٰن کے ساتھ یاغستان روانہ کر دیئے گئے۔ مگر یہ کسی طرح بھیس بدل کر اور نام محمد منصور انصاری رکھ کر گرفتاری سے بچ گئے

اور سی۔آئی۔ڈی کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ امیر امان اللہ کے زمانہ میں کابل چلے گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ امیر امان اللہ کے تخت نشین ہونے کے بعد کابل سے جو سرکاری وفد استنبول گیا تھا اس کے ایک رکن تھے پھر ماسکو میں افغانی سفارت خانہ میں بطور مشیر شریک رہے۔ کئی ایک سیاسی اسلامی رسائل تصنیف کر کے شائع کئے۔ ان کے اہل و عیال کو ہندوستان میں ڈاکٹر انصاری رح تیس روپیہ ماہوار دیتے رہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری رح عرصہ دراز تک " مدینہ " بجنور کی ایڈیٹری نہایت قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ پھر بمبئی جا کر روزنامہ "جمہوریت" جاری کیا۔ مولانا منصور انصاری کا انتقال کابل میں ہوا۔ (رحمہ اللہ تعالے ورضی اللہ عنہ و ارضاہ آمین)۔

مولانا عزیر گل

قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندہ۔ دیوبند کے فارغ اور حضرت شیخ الہند رح کے خادم خاص۔ صوبہ سرحد اور یاغستان میں بار بار حضرت شیخ کے سفیر کی حیثیت سے گئے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی رح اور دیگر خوانین کو تحریک کے ہمنوا بنانے میں مولانا سندھی رح کے ساتھ ہوتے تھے۔ حضرت شیخ کے ہمیشہ ساتھ رہے۔ اسارت مالٹا میں بھی ساتھ تھے۔ لوگوں نے سی آئی ڈی مشہور کیا کہ حضرت شیخ ان سے بدظن ہوں۔ لیکن نہ حضرت بدظن ہوئے اور نہ ہی ان کا دل میلا ہوا۔ آخر تک ساتھ رہے۔ حضرت کے راز دار۔ خزانچی اور معتمد علیہ رہے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی کتنا عرصہ حضرت کے مکان پر قیام پذیر رہے۔ ایام تحریک خلافت میں دیوبند خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ پھر مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس ہو گئے۔ بعدہٗ وہاں ایک انگریز عورت سے اس کی خواہش پر تیسرا نکاح کیا اور پشاور چلے گئے۔

مولانا احمد اللہ صاحب رح

پانی پت ضلع کرنال کے باشندے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء رح کی اولاد میں سے تھے۔ فراغت دیوبند کے بعد مختلف جگہوں میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ پھر ترجمہ قرآن میں حضرت شیخ کے معین ہوئے ان کی دیانت و امانت پر شیخ کو بہت اعتماد تھا۔ بسا اوقات حضرت کی ڈاک انہیں کے سپرد ہوتی تھی۔ حضرت حجاز جاتے ہوئے انہیں اپنا نائب بنا گئے۔ ان کے پاس مشن کے ممبروں اور چندوں کا رجسٹر تھا۔ یہ ان کو لے کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سے تمام کاروائیاں عمل میں لاتے تھے حضرت اوسیکے کاموں میں اپنا نائب حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رح کو بنا گئے تھے۔ دونوں حضرات مل کر مشن کا کام کرتے تھے۔ گرفتاریوں کے وقت پولیس کے آنے سے چند گھنٹے قبل تمام کاغذات چھپا چکے تھے۔ ان سے بہت پوچھ گچھ ہوئی مگر انہوں نے کسی امر کا اقرار نہ کیا۔

اس کے بعد ان پر ایک مسلمان سی آئی ڈی مسلط کیا گیا جو نہایت اخلاص کا اظہار کرتا اور احکام شریعت پر مستعدی سے عمل کرتا رہا۔ اور دن رات ان کی خدمت کرتا رہا۔ ان کو اس پر اعتماد ہو گیا۔ اس لئے آہستہ آہستہ تمام باتیں

پوچھ لیں اور مشن کا ممبر بن گیا۔ وہ تمام معلومات حاصل کر کے غائب ہوگیا۔ اس پر ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر چونکہ الزامات کا کوئی تحریری ثبوت نہ تھا اور نہ ہی یہ اقرار کرتے تھے لہذا ان کو پنجاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد مولانا احمد چکوالی جو کہ اس سے قبل معافی مانگ کر آزاد ہو چکے تھے وہ آئے اور انہوں نے کہا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کے پاس متعدد تحریری ثبوت ہیں۔ آپ بھی معافی مانگ لیں۔ ایک ہمدم و ہمراز کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے چند دن بعد ان کو آزاد کر دیا گیا۔ پانی پت واپس آکر تعلیمی مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ اور تقسیم ہند سے کچھ پہلے بمرض ہیضہ پانی پت میں انتقال ہوگیا۔ (رحمہ اللہ تعالےٰ)

مولانا ظہور محمد خانؒ سہارنپور کے باشندے اور حضرت شیخ الہندؒ کے فدائی اور مخلص شاگرد تھے نہایت زیادہ ساکت و صامت اور ٹھوس کام کرنے والے سرگرم ممبر تھے۔ مشن میں ابتداء سے داخل ہوئے اور ہمیشہ ممبر بنانے اور چندہ فراہم کرنے کا کام کرتے رہے۔ حضرت کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس تھے کہ ان کو گرفتار کیا گیا۔ الہ آباد لے جائے گئے بہت پوچھ گچھ کی گئی مگر یہ گونگے بن گئے کوئی جواب نہ دیا۔ دو چار دن سختی کرنے کے بعد چھوڑ دیئے گئے۔ حضرت شیخ کی واپسی کے بعد چند سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے۔ (رحمہ اللہ تعالےٰ)۔

شیخ عبدالرحیم مرحوم سندھیؒ حیدرآباد کے باشندے اور مولانا سندھیؒ کے مخلص و وفادار نومسلم دوست تھے مشن کے سرگرم ممبر اور نہایت دیندار تھے مولانا سندھی نے ان کو ہموار کیا تھا۔ اور مولانا سندھی کو سرحد افغانستان تک پہنچانے میں انہوں نے بہت زیادہ مدد کی تھی۔ آچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔ عرصہ دراز تک سندھ میں ہندوؤں کو تبلیغ اسلام کرتے رہے بہت سے لوگ ان کی مساعی سے مسلمان ہو گئے جن میں ڈاکٹر شمس الدین بھی تھے۔ شیخ صاحب نے اپنی صاحبزادی کا نکاح ڈاکٹر صاحب سے کر دیا۔ افغانستان جانے کے بعد مولانا سندھی کی خط و کتابت انہی سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کچھ خطوط گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گئے اور راز فاش ہوگیا۔ مگر یہ روپوش ہو گئے اور پھر ہاتھ نہیں آئے کہا جاتا ہے کہ سرہند میں بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے روپوش ہونے کے بعد مشن کی برانچ حیدرآباد سندھ کا کام تقریباً ختم ہوگیا۔

حضرت مولانا غلام محمد صاحب دین پوریؒ مرحوم موضع دین پور۔ تحصیل خانپور سابقہ ریاست بہاولپور کے باشندے اور مشہور شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی کے خلیفہ اول تھے۔ بہت لوگ ان سے بیعت تھے چونکہ مولانا سندھیؒ کے پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد کے خلیفہ تھے لہذا ان کا اور مولانا سندھیؒ کا آپس میں بڑا گہرا تعلق وارتباط تھا۔ گویا دین پور اس تحریک کا ثانوی مرکز تھا۔ مولانا عبیداللہ کابل جاتے ہوئے اپنی صاحبزادی کو انہی کے پاس چھوڑ گئے تھے جن سے بعد میں مولانا غلام محمد صاحب

کا نکاح ہوا۔ ان سے ایک فرزند ارجمند پیدا ہوئے۔

ریشمی خط مولانا غلام محمد صاحب کے پاس بھی پہنچا تھا۔ انقلاب کی تیاری کے جملہ سامان یہاں جمع کر لئے گئے تھے اور مزید کوشش جاری تھی کہ فوج کی بڑی مقدار خان پور اسٹیشن پہنچی۔ وہاں کے مخلصین نے فوراً مرکز کو خبر دی۔ راتوں رات تمام رائفلیں، کارتوس وغیرہ منتشر کر دیئے گئے۔ صبح کو انگریز افسر مع فوج دین پور پہنچا۔ تو تفتیش کی کوئی چیز نہ تھی۔ ریشمی خط ایک ڈبہ میں بچوں کے کھلونوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ افسر نے اس ڈبہ کو اٹھایا مگر اوپر کے کھلونوں کو دیکھ کر رکھ دیا۔

غرضیکہ مخبری کے مطابق کوئی چیز نہ نکلی۔ اطراف وجوانب سے ہزاروں مخلص جمع ہو گئے تھے دین پور میں گرفتار کرنے کی افسر کو جرأت نہ ہوئی۔ افسر نے استدعا کی کہ ہمارا بڑا افسر خان پور سے اس سے مل کر ملئے۔ وہاں جانے پر کہا کہ یہاں سے وہ بہاولپور چلے گئے ہیں اس لئے بہاول پور تشریف لے چلئے۔ غرضیکہ آپ کو اس طرح ورغلا کر لے جایا گیا۔ اور ضلع جالندھر کے ایک قصبہ نور محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ ثبوت فراہم نہ ہونے پر چھوڑ دیئے گئے۔ مولانا کے کئی صاحبزادے فاضل دیوبند ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا عبدالہادی صاحب مدظلہٗ آج کل گدی نشین ہیں۔ نہایت صالح۔ متقی اور مرجع خلائق ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ۔ مولانا غلام محمد صاحبؒ کے خلیفہ ہیں۔

مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب امروٹیؒ

امروٹ ضلع سکھر کے باشندے اور سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھر چونڈی کے دوسرے خلیفہ تھے مولانا عبیداللہ صاحبؒ کو ان سے بہت وابستگی تھی۔ انہوں نے ہی مولانا سندھیؒ کا نکاح محمد عظیم خان یوسف زئی کی دختر سے کرایا تھا۔ اور مولانا سندھیؒ نے امروٹ رہ کر بہت کچھ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ موصوف خدا رسیدہ متقی، پرہیزگار اور نہایت جوشیلے بزرگ تھے۔ لاکھوں مرید تھے۔ان کی کرامات کا ان اطراف میں بڑا چرچا ہے۔ مولانا سندھیؒ نے ان کا تعارف حضرت شیخ الہندؒ سے کرایا۔ متعدد مرتبہ دیوبند آئے اور حضرت شیخ بھی ان سے ملنے امروٹ گئے۔ ان کا مقام سندھ کے اس علاقہ میں مشن کا مرکز رہا ہے۔ گرفتار ہوئے اور چند دن بعد رہا کر دیئے گئے۔ ایام تحریک خلافت میں انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ تعالےٰ ورضی وارضاہ۔

مولانا محمد صادق صاحب کراچویؒ

مولانا موصوف محلہ کھڈہ کراچی کے باشندے تھے۔ کتب عالیہ درسیہ اور اور دورۂ حدیث حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھا۔ ان میں اور مولانا سندھیؒ میں گہرے تعلقات تھے۔ مشن کے ممبر بنے اور سرگرمی سے کام کیا۔ جنگ عظیم میں جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انہوں نے لس بیلا وغیرہ بلوچستانی علاقہ میں بغاوت کرادی۔ کراچی سے ہر ہفتہ عراق کو جہاز میں فورس جایا کرتی تھی جس کی وجہ سے سٹر ٹاؤن شنڈ کمانڈر محاذ عراق پر بڑھتا ہوا ہر پڑاؤ پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ فوجیں کے بعد دیگرے

ایک ایک پڑاؤ کو سنبھالتی جاتی تھی۔ اور پیچھے سے کمک پہنچتی رہتی تھی۔ اس طرح نظام پیش قدمی کا چلتا تھا۔ جب بلوچستان وغیرہ میں بغاوت ہوگئی تو وہ فورسس اور فوج جو بصرہ کو جارہی تھی اس داخلی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سندھ میں اتار دی گئی۔ کئی ہفتہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر ٹاؤن شنڈ اپنی فتح مندی کے نشہ میں آگے بڑھتا چلا گیا پیچھے سے کمک نہ پہنچی تو کوت العمارہ میں محصور ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد جب بغاوت فرو کرنے کے بعد ہندوستان سے فوج پہنچی تو ترکی نوجوانوں نے حصار نہایت مضبوط کرلیا تھا۔ نہ اندر سے کسی کو نکلنے دیتے نہ باہر سے جانے دیتے۔ کئی ماہ تک محصور رہ کر بالآخر ٹاؤن شنڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب محصور ہوا تو اس کی فوج تیس ہزار تھی۔ جب آزاد کیا گیا تو کل تیرہ ہزار تھی۔ یہاں ہندوستان میں مخبری پر مولانا محمد صادق کو گرفتار کرلیا گیا۔ مگر خاطر خواہ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کاروار (مہاراشٹر کا شہر) میں نظر بند کردیئے گئے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد رہا کردیئے گئے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کے صدر مہتمم اور صدر مدرس رہے۔ خلافت کمیٹی سندھ، اور جمعیۃ علماء سندھ کا کام نہایت اولوالعزمی سے کرتے رہے۔ ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو وفات پاگئے۔ (رحمۃ اللہ تعالیٰ)

مولانا فضل ربی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید اور جوشیلے لیکن مستقل مزاج تھے اپنے وطن ضلع پشاور میں علمی مشاغل میں مصروف تھے کہ شیخ الہندؒ کے حکم سے یاغستان میں چلے گئے۔ اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتے رہے۔ حاجی ترنگ زئی رح کے ساتھ جہاد میں برابر کے شریک رہے۔ شکست کے بعد کابل چلے گئے۔ اور اپنی علمی استعداد اور اعلیٰ قابلیت کی بناء پر علمی ڈیپارٹمنٹ، افغانستان میں ملازم ہوگئے اور غالباً آج تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں متعلقین ان کے ساتھ ہیں۔

خان عبدالغفار خان موصوف اتمان زئی کے رہنے والے اور مشہور لیڈر ہیں۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں تعارف کے محتاج نہیں۔ حضرت شیخ سے ان کا بھی رابطہ تھا۔ جب کبھی ملاقات کرنی ہوتی تو دیوبند لائن کے کسی اگلے پچھلے اسٹیشن پر ملاقات کرتے اور ٹکٹ کسی دور جگہ کا ہوتا۔ اور پھر وہاں جاکر اتر جاتے۔ اور اس طرح بارہا ہوا۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی کو مطلق علم نہ ہوسکا۔ آج کل افغانستان میں ہیں۔

ڈاکٹر انصاری مرحوم ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ تین بھائی تھے۔ حکیم نابینا (حکیم عبدالوہاب صاحب) مرحوم سب سے بڑے تھے۔ منجھلے حکیم عبدالرزاق تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب چھوٹے تھے۔ تینوں بھائیوں کو حضرت شیخ الہندؒ سے بہت تعلق تھا۔ حکیم نابینا صاحب نے دیوبند میں تعلیم پاکر حدیث حضرت گنگوہیؒ سے پڑھی اور بیعت بھی ہوئے اور مرنے سے قبل وصیت کی کہ میری قبر حضرت گنگوہیؒ کے پاس بنائی جائے۔ چنانچہ انتقال

کے بعد ان کی لاش ایک کار میں گنگوہ لے جا کر ان کو حضرت گنگوہی کے قریب دفن کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری بعض مصالح کی بنا پر ظاہری طور پر دیوبند آمد و رفت نہیں رکھتے تھے۔ مگر ہمیشہ حضرت شیخ کی تحریک مالی معاون و سرپرست رہے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے گورنمنٹ کے اعلیٰ کارکنوں کے ذریعے سے بہت سی خبریں معلوم کر لیتے تھے۔ اور حضرت شیخ کو اطلاع دیتے تھے۔ جنگ عظیم کے شروع پر انہوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ عنقریب شیخ الہند کی گرفتاری ہو جائے گی لہٰذا وہ حجاز چلے جائیں۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی نے حضرت اور رفقاء کے ٹکٹوں کا انتظام کیا تھا۔ ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق بمبئی تک ساتھ گئے اور جملہ امور کی دیکھ بھال کی۔ اور مصارف حجاز نقد ادا کئے۔ اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہو گئی ہوگی۔ اگلے سال شیخ الہند کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود کو ایک ہزار روپے دے کر اپنے خرچ پر بھیجا۔ اور پیچھے گھر پر بھی تکفیل فرماتے رہے۔ مولانا عبیداللہ صاحب نے جب دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہند خود دہلی تشریف لائے اور مولانا سندھی کا ڈاکٹر صاحب سے تعارف کرایا۔ اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے تعارف کا ذریعہ بنے۔ مولانا سندھی کے اپنے الفاظ ہیں۔

"حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاریؒ سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مولانا ابوالکلام اور محمد علی جوہر سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا"

ایام جنگ بلقان میں ہلال احمر کے لئے جو دو وفد استنبول بھیجے گئے تھے اس کی ایک پارٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ الغرض یہ حضرت شیخ الہند کے مشن آزادی کی چوتھی برانچ جو کہ دہلی میں تھی کے صدر تھے اور نہایت راز داری اور سرگرمی سے کام کرتے تھے۔ البتہ مولانا عبیداللہ کے دہلی آجانے اور نظارۃ المعارف قائم کرنے کے بعد ان کی ظاہری جدوجہد کچھ ڈھیلی پڑ گئی جو ان کے کابل جانے کے بعد پھر قوی ہو گئی۔

ایام دار و گیر میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب کو سی۔ آئی۔ ڈی نے بلایا۔ اور بہت کچھ سوالات کئے گئے۔ سوائے مالی امداد کے اور کوئی گرفت کی چیز گورنمنٹ کے پاس نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی نے اقرار کیا اور کہا کہ مولانا ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں ہم پر ان کی ضروریات مہیا کرنا اور خدمت بجا لانا فرض تھا اور ہے۔ ہم اس کو بجا لاتے رہے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کہا گیا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی ہیں اور آپ ان کی امداد کرتے ہیں؟ تو جواب دیا کہ مولانا باغی نہیں ہیں۔ ان کو بغاوت کے ثبوت میں سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں دکھائی گئیں، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے قابل یقین نہیں ہے۔ جب حکومت کی طرف سے ان رپورٹوں کی صداقت کا اصرار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہبی پیشوا اور مرشد دین ہونے کی بنا پر امداد کی ہے۔ اگر حکومت مولانا کو ایسا سمجھتی ہے تو

میں حاضر ہوں جو سزا مجھ کو دینا چاہتے ہو دو۔ چونکہ سچائی کے ساتھ اقرار کرلیا تھا ادھر یورپ کے تعلیم یافتہ اور آئین سے بخوبی واقف تھے اس لئے حکومت نے ان پر دست درازی کرنا خلاف مصلحت سمجھا ان کو بھی اور ان کے بھائی کو چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اخیر تک سیاسی جد وجہد میں نہایت روشن اور مستعدی کے ساتھ شریک رہے۔ تحریک خلافت اور کانگریس کے ممبر رہے۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ جب تک زندہ رہے قومی لوگوں کا قیام ان ہی کی کوٹھی پر ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ہزاروں کے لحاظ سے ماہوار ان کا قومی لیڈروں کی آؤ بھگت اور قیام وطعام پر لگ جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک ایک وقت پر سینکڑوں رہنما ان کی کوٹھی پر ہوتے اور کھانا کھاتے۔ مشہور ومعروف آدمی ہیں مزید بیان کی حاجت نہیں۔ کئی دفعہ جیل گئے۔ حضرت شیخ آخری ایام انہی کے ہاں رہ کر علاج کراتے رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ۱۹۳۶ء میں دہرہ دون جاتے ہوئے ریل میں انتقال فرمایا۔ دہلی میں مدفون ہوئے اس صدی میں ہندوستان میں جو چند بڑے مخلص لیڈر ہوئے ان میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

مولانا محمد احمد چکوالیؒ چکوال ضلع جہلم پنجاب کے باشندے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مولانا سندھی کے مخلص دوست اور مشن کے سرگرم ممبر تھے۔ مشن تحریک آزادی کی پانچویں شاخ جو کہ پنجاب میں تھی، موصوف اس کے صدر تھے۔ نہایت استقلال اور بے جگری کے ساتھ شریک سفر رہے۔ ہزاروں کو ہم خیال اور ممبر بنایا۔ دیوبند میں ان کی آمد و رفت بارہا ہوئی۔ ایام دار وگیر میں ان کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ ابتداء میں کوئی الزام ثابت نہیں ہوسکا اور نہ آپ نے اقرار کیا۔ مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ہاتھوں میں آگئے اور سی۔آئی۔ڈی نے ان کو دکھلائے تو ان کی باتوں میں آکر اقرار کرلے اور آئندہ سیاست سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کرلے پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ ان کو رہا کر دیا گیا۔ اور یہی مولانا احمد اللہ صاحب کے ذریعہ بنائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لاہور میں ایک موٹر سے ٹکرا کر زخمی ہو کر انتقال فرما گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے صاحب زادہ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان صاحب لاہور میں کام کر رہے ہیں۔ اور ان کی صاحبزادی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے عقد میں آئیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ العزیز قصبہ رائے پور ضلع سہارنپور کے باشندے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ اکبر تھے۔ نہایت بزرگ متقی، باخدا انسان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الہند کے معتمد دوست تھے۔ ابتداء میں حضرت شیخ الہند نے ان کو خبر تک نہیں کی اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی اخفا کو جیسا کہ مقتضائے وقت تھا کام میں لائے۔ بگر اس قسم کی کارروائی مخلص دوستوں سے کب چھپ سکتی تھی اور ان کو خبریں ملتی رہیں۔ ۱۳۳۰ھ میں جب مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان آیا تو رائے پور حاضری کے وقت حضرت نے فرمایا کہ،

شیخ الہند لوگوں سے بیعتِ جہاد لے رہے ہیں یہ تو بہت خطرناک امر ہے انگریز کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اور مسلمانوں کا یہ مرکز علمی اجڑ جائے گا۔ چونکہ مجھ کو (حسین احمد مدنی رح) اس کی خبر نہ تھی لہذا لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور یہ عرض کیا کہ میں خود حضرت شیخ الہند سے پوچھوں گا۔ مولانا عزیر گل نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کرنا چاہئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس کو مشوش نہیں کرنا چاہتے وہ چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کا مقالہ ذکر کیا تو شیخ الہند نے فرمایا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے دعا فرمائی تھی کہ پچاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے گا۔ سو بحمد اللہ پچاس برس گزر چکے ہیں۔ اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن وجوہ انجام دے چکا ہے۔ یہ سن کر دم بخود ہو گیا اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جا رہے ہیں وہ صحیح ہیں اور حضرت کا اس امر میں پختہ خیال ہو چکا ہے اب اپنے ارادہ سے ٹل نہیں سکتے اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب اور شیخ الہند کی آپس میں تنہائی میں کھل کر بات چیت ہوئی تو حضرت شیخ الہند نے ان کو اپنا ہم خیال اور ہمنوا بنالیا اور دونوں حضرات یک جان و دو قالب ہو گئے اور اخیر تک اسی پر قائم رہے۔ اعلان جنگ کے بعد جب شیخ الہند حجاز جانے لگے تو انہیں کو اپنا قائم مقام بنا گئے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کر دی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم کو میرا قائم مقام سمجھنا اور مہتم بالشان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد اللہ انجام دیتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی طرح عمل درآمد کیا۔ حضرت رائے پوری نہایت دل سوزی۔ استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی راز داری کے ساتھ امور مہم کو انجام دیتے رہتے اور ان کے خاص خدام بھی دل چسپی لیتے رہے مگر افسوس کہ ہمارے مالٹا میں اسیر ہونے کے کچھ بعد ہی مولانا رائے پوری مریض ہوئے اور عرصہ تک بستر مرض پر نا چار اور ضعف میں مبتلا رہے۔ ایام دار و گیر میں سی۔ آئی۔ ڈی کا افسران کے پاس بھی تفتیش و تحقیق کے لئے گیا۔ مولانا مرحوم نے تمام الزامات کی تردید کر دی اور بعد میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ جس پر وہ ناکام واپس آیا۔ اور کہنے لگا کہ مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کے انتقال کی خبر حضرت شیخ الہند رح کو بزمانہ اسارت مالٹا پہنچی۔ اور حضرت شیخ کو بہت صدمہ ہوا اور عرصہ تک رہا۔ ان کے مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی لکھا جو آپ کے قصائد میں موجود ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ و رضی عنہ و ارضاہ۔

○

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر)۔ "سفرنامہ مالٹا" کی عبارت یہ ہے۔

مولانا مرحوم کا حجاز کو روانہ ہونا

ماہ شوال ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا۔ چونکہ مولوی عزیر گل صاحب خاص خادم کو اپنے وطن کی طرف جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا اس لئے ان کی واپسی کا انتظار فرمایا۔ اس مدت میں سامان سفر قدرے مہیا ہو گیا۔ عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب

غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں نہایت زیادہ امداد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنون منت رہے ۔ حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے ۔ اور ہر قسم کا ضروری سامان سفر نہایت فراخدلی کے ساتھ مہیا کر دیا ۔ بلکہ جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کر دیا ۔

مولانا کے رفقائے سفر مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی ۔ بہت سے ارباب عقیدت استفاضہ باخدمت کے لئے ساتھ ہو لئے جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں ۔

مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری ۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری ۔ مولوی محمد میاں صاحب انبہٹوی ۔ مولوی عزیز گل صاحب ساکن زیارت کاکا صاحب ۔ حاجی خان محمد صاحب مرحوم ۔ مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبندی ۔ حاجی محبوب خان صاحب سرہندی ۔ مولوی وحید احمد صاحب وغیرہ ۔

مولانا کے سفر کی نسبت افواہ عام لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ مولانا دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں اور اب ہمیشہ حرمین شریفین میں عمر بسر فرمائیں گے ۔ اور چونکہ مولانا مرحوم نے بخوف وفات اپنی جائیداد شرعی طریقہ پر ورثا میں تقسیم کر دی تھی اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال سے تقویت ہوئی ۔ مولانا نے ایک عرصہ تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا ۔ اس خاص افواہ کی وجہ سے ہر اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کے لئے موجود رہتا تھا ۔ طلباء مدرسہ نے اپنے اپنے اعزاء کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا ۔ غرضیکہ اسٹیشن پر ہزاروں کا مجمع تھا ۔ جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا ۔ مشایعت کرنے والے بھی بہت سے ساتھ ہو گئے تھے ۔ دہلی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جا کر چائے بھی نوش فرمائی ۔ اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آ گئے ۔ ناگرہ ریلوے سے روانہ ہوئے ۔ راستہ میں رتلام ۔ راندیر میں بھی قدرے قیام فرمایا ۔ کیونکہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مخلص خاص لوگ تھے جنہوں نے سخت اصرار فرمایا تھا ۔

راندیر سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچے اور انجمن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبدالرزاق صاحب نے پہلے سے آراستہ کر رکھا تھا ۔ قیام فرمایا ۔ وہاں بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا ۔ اگر انجمن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی ۔

بمبئی سے مولانا کی روانگی جو تاریخیں اکبر جہاز کی روانگی کی تھیں اس کے ٹکٹ مولانا مرحوم اور ان کے ساتھیوں کے لئے لئے گئے تھے ۔ مولانا اور ان کے بعض خاص خدام کے ٹکٹ سیکنڈ کلاس کمرہ کے اور باقی ماندہ چھتری یا ڈیک کے تھے ۔ چنانچہ بروز شنبہ ، ذی القعدہ ۱۳۳۳ھ کو جہاز پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہو گئے ۔ چونکہ اکثر ہمراہیوں کی طبیعت دریائی سفر سے مانوس نہ تھی اس لئے عموماً ان کو بدمزگی اور چکر وغیرہ

کی شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے میوہ جات اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقاء کے لئے مہیا کی تھی بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں ۔ بوجہ ظہور جنگ ان دنوں قرنطینہ جزیرۂ کامران سے اٹھا لیا گیا تھا ۔ اور قریب جدہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا ۔ چنانچہ وہاں جہاز نے لنگر ڈالا اور بخیر و خوبی مولانا اور ان کے رفقاء اترے اور ایام قرنطینہ نہایت عافیت سے انجام دے کر جدہ پہنچے ۔

خفیہ پولیس کی افواہ

بمبئی سے سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کر تقریباً آٹھ دس آدمی تمہارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں ان سے احتیاط رکھنا (ہم نہیں کہہ سکتے کہ بیان صحیح تھا یا غلط) چونکہ یہ بات اہل حجاز کو معلوم ہو چکی تھی ۔ کسی شخص نے جو غالباً جدہ یا مکہ معظمہ کا رہنے والا تھا اس کو ٹرکی پولیس تک پہنچا دیا ۔ اور جو لوگ مشتبہ تھے ان کے نام و نشان بتا دیئے اور کہہ دیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلط ہو کر آئے ہیں ۔ حالانکہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ ان کے رفقاء کو ۔ ٹرکی پولیس نے فوراً ان کو گرفتار کر لیا ۔ اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لئے حاضر ہوا ۔ مولانا خود تو آفس میں نہ گئے مگر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کو بھیج دیا ۔ چونکہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں اس لئے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی ۔ آئی ۔ ڈی ہونے یا مولانا پر مسلط کئے جانے کا نہیں ہے ۔ ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے سکتے جس کا ہم کو علم نہیں ۔ مگر پولیس ٹرکی نے اس جواب کو اس پر عمل کیا کہ چونکہ ان لوگوں نے پھر ہندوستان جانا ہے اس لئے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے ۔ الحاصل ٹرکی پولیس نے ان لوگوں کو زیر حراست رکھا اور اسی طرح ان کو حج کرا کر یہ کہا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینہ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا ۔ چونکہ ان لوگوں کے پاس اتنا خرچ نہ تھا اس لئے وہ بمبئی واپس کر دیئے گئے ۔

دوسری افواہ

بعض خفیہ پولیس کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہنچے تو وہاں کے افسر پولیس کے پاس تار آیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے اور آگے جانے نہ دیا جائے چونکہ مولانا کے پاس بڑا مجمع رہتا تھا اس لئے بمبئی کے مقامی حکام کو بلوہ کا خوف ہوا ۔ اور اس وجہ سے انہوں نے عمل درآمد سے پہلو تہی کی ۔ پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہنچا کہ مولانا کو جدہ میں اترنے نہ دیا جائے بلکہ جہاز پر ہی گرفتار کر لیا جائے ۔ مگر یہ حکم اس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ مولانا جزیرہ سعد میں برائے قرنطینہ اتر چکے تھے اس لئے ہمیں معذوری رہی ۔ (ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں ، مگر ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے ۔

مولانا مرحوم کی جدہ سے روانگی اور مکہ معظمہ میں داخلہ

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اونٹوں کی سواری پر مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور اٹھائیسویں کو مکہ معظمہ میں شب بحرہ گزار کر شام کو داخل ہوئے۔ وہ زمانہ طبعی طور پر حجاج کے ہجوم کا ہوتا ہے۔ مگر چونکہ جنگ کی وجہ سے بہت ملکوں سے حجاج کی آمد و رفت بند یا کمی پر تھی اس وجہ سے حسب دستور ہجوم میں کمی ضرور بھی مگر تاہم مکہ معظمہ کی گلیاں اور مکانات مسافرین سے لبریز تھے۔ حرم محترم میں بھی لوگوں کی کثرت تھی۔ مولانا مرحوم طواف قدوم و سعی وغیرہ کرنے کے بعد احباب سے ملنے اور ادائے عبادت میں بدل و جان مشغول ہوئے۔

○

(حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۱) ۔ لہ سفرنامہ اسیر مالٹا کی عبارت درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ الہند رہ بمعیت سید امین عاصم صاحب آمد و رفت کا اونٹ کرایہ پر کے ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ کو روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے۔ شہر پناہ کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصہ مکان میں سید امین عاصم صاحب مع اپنے متعلقین تھے اور نیچے کے ایک حصہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقط تین آدمی تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب۔ وحید احمد۔ اور کاتب الحروف حسین احمد۔

طائف طائف حقیقۃً ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر اس کا اطلاق بہت بڑے حصے پر کیا جاتا ہے جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں۔ یہ قطع زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں کے راستہ سے تین دن میں یہاں پہنچتے ہیں کیونکہ چکر زیادہ ہے اور چڑھائی بآسانی طے ہوتی ہے۔ اور جبل کرہ کے راستے سے جس میں خچر، گدھے، گھوڑے چلتے ہیں۔ ۲۴ گھنٹے بلکہ اس سے کم میں آدمی پہنچ جاتا ہے مگر راستہ دشوار گزار ضرور ہے۔ آدھے راستے سے ہوا بالکل متغیر ہو جاتی ہے، جب کہ مکہ معظمہ میں سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام نہ آتا ہو طائف میں ہلکی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے۔ جابجا باغات ہیں۔ ہر قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور۔ انجیر۔ برشومی (ناک پھل) انار۔ آڑو۔ آلوچی وغیرہ وغیرہ۔ جملہ سرد ملکوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں۔ زراعت اور سبزی ہر قسم کی پیدا ہوتی ہے۔ جابجا نہریں ہیں۔ کنوئیں میٹھے بکثرت ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ حجاز کے لئے طائف ہند کے لئے شملہ کی مانند ہے۔ ترکی کے گورنر اکثر گرمیوں کے زمانہ میں طائف میں رہا کرتے تھے۔ اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل حرب شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

فتنۂ حجاز جب ہم مکہ معظمہ میں پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں مشہور تھیں عام بدوؤں اور اہل شہر کی زبانی سنا جاتا تھا کہ عنقریب بدعملی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور بغاوت کرنے والا ہے۔

مگر ترکی کے استقلال میں کوئی فرق نہ تھا۔ ترکی فوج تمام حجاز میں غالباً چار پانچ ہزار تھی۔ کیونکہ اکثر فوج دوسرے مقامات پر جنگ پر چلی گئی تھی۔ شریف نے باب عالی کو اطمینان دلا رکھا تھا کہ حجاز کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جا کے ضرورت جنگ پر اپنی قوت لے جاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی جدہ۔ مکہ۔ طائف پر منقسم تھی۔ ہم کو یہ بھی اس وقت کہا گیا کہ جلد طائف جانا۔ اور لوٹ آنا چاہیئے۔ مبادا بدعملی ہو جائے۔ مگر ہم کو یقین کامل نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں یہ خبر بھی مشہور ہوئی تھی کہ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے کوئی خط شریف کے نام آیا ہے۔ یا تو تم ترکوں کو حجاز سے نکال دو، ورنہ ہم شریف علی کو (جو پہلے شریف حجاز تھا۔ اور شریف حسین کا بہنوئی ہے اور اس وقت مصر میں مقیم تھا اس کو، حجاز کا شریف بنا کر بھیجیں گے۔ نہ معلوم یہ خبر کہاں تک صحیح تھی۔ جدہ میں ہمیشہ جنگی آگبوٹ آتے اور بندرگاہ میں تین تین چار چار۔ اور کبھی کم زیادہ جمع ہو جاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے نہ وہ کچھ تعرض کرتے تھے اور نہ ترکی حکومت۔

ہم ان واقعات کو دکھلانا نہیں چاہتے جو کہ اس لستہ کے زمانہ میں ہوئے۔ اس مقام پر تو صرف حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا سفرنامہ لکھنا ہے۔ ہم کو طائف پہنچ کر کچھ طبیعت سیر ہونے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا تھا کہ شتربان آیا اور کہا کہ اگر چلتے ہو تو شتر حاضر ہے ورنہ آٹھ دن بعد آؤں گا۔ مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہفتہ اور یہاں پر قیام کر لیا جائے اس کے بعد مکہ معظمہ جانا چاہیئے۔ اتفاق وقت سے اس وقت طائف میں میوے بہت کم تھے۔ شہتوت اور شوبانیوں وغیرہ کا ابتدائی موسم تھا البتہ شہد خوب آتا تھا۔ دو چار دن بعد مولانا مرحوم نے تقاضا فرمایا کہ مکہ معظمہ جانا چاہیئے مگر شتربان جا چکا تھا۔ ایک دو دن بعد پھر تقاضا فرمایا۔ ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ آئندہ ہونے والے واقعات نے خلاف عادت مولانا کو تقاضائے سفر پر مجبور کیا ہے۔ جن کو نظر کشفی سے مولانا نے معلوم کر لیا تھا۔ مگر چونکہ ضبط اور اخفاء کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ ادھر مقام رضا میں قدم راسخ تھا۔ اس لئے چند مرتبہ ظاہری تقاضا کرنے کے بعد چپ ہو رہے۔ اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت زیادہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لئے جو لوگ باہر باغوں میں مقیم ہیں ان کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے مطوف سید ابن عاصم صاحب معہ اپنے اہل و عیال سید علی جبشی کے مکان پر چلے گئے اور ہمارے لئے بھی وہاں ایک کوٹھڑی لے دی۔ تمام شہر میں اس وقت عجیب ہل چل تھی۔ ۹ شعبان روز شنبہ کو ہم لوگ شہر میں چلے گئے تھے۔ ترکی افسروں کو بھی یہ بات محسوس ہو گئی۔ انہوں نے شہر کے اردگرد حسب قواعد مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور مکانوں کو مورچہ کے لئے مناسب جانا ان کو خالی کرا لیا۔ گیارہویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی سب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی۔ جو کہ زیر کمان داری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھیں۔ صبح صادق کے قریب ہم سب بمعیت حضرت مولانا مرحوم صبح کی نماز کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جا رہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز آئی پھر تو چاروں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں۔ ترکی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگ مورچے بنا رکھے تھے پورے طور سے

جواب دیتی رہی۔ اگرچہ ترکی فوج کی تعداد ایک ہزار مسلح سپاہی کے تھی باقیماندہ لوگ مسلح نہ تھے۔ مگر چونکہ منتظم جماعت تھی اس نے بدوی فوجوں کو بہت زیادہ اور قوی نقصان پہنچایا۔ بدوؤں کی تعداد بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ۔ جدہ۔ ینبع۔ مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آچکا تھا۔ کیونکہ شریف نے انتظام کیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ یہ کام ہو۔ اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلہ اور ترکاری۔ میوے لاتے تھے ان کا آنا بند ہوگیا۔ ادھر فوجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعد جنگ انہوں نے تاجروں سے موجودہ غلہ کی نصف مقدار لینی شروع کی۔ جس نے خوشی سے دے دیا اس کی مقدار میں سے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا۔ اور لئے ہوئے نصف کی قیمت اس وقت کے حساب سے لگا کر اس کو رسید دے دی۔ کہ حکومت ترکی بعد از جنگ یہ مقدار تم کو ادا کرے گی۔ البتہ جن لوگوں نے چھپایا۔ ان پر شدت کی گئی اور تمام مال تجارت ان کا خورد و نوش اور ضروریات فوجی قسم کا لے لیا گیا۔ فقط بمقدار ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے ان کو دے دیا گیا۔ ادھر تو شہر میں غلہ کی کمی، ادھر آمد بالکل بند۔ غرض کہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہوگئی۔ پھر شریف کے لوگوں نے نہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا۔ اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ اگر قشلہ (فوجی قیام گاہ) کا کنواں نہ ہوتا تو بہت زیادہ اشکال کا سامنا کرنا پڑتا۔

اگرچہ شریف کی فوج کثیر التعداد بھی تھی۔ اور اس کے پاس نئی عمدہ انگریزی رائفلیں بھی تھیں۔ اور انگریزی سامان جنگ نہایت کثرت سے تھا۔ مگر باوجود سعی بسیار ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ جب انہوں نے ہجوم کیا منہ کی کھائی۔ دن رات برابر گولیاں چلتی رہتی تھیں۔ ترکی فوج ان کے مجمعوں پر توپوں سے گولے برساتی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد وہ مصری فوجیں جو جدہ میں اس کے لے لینے کے بعد اتاری گئی تھیں اور جنہوں نے مکہ معظمہ کے قلعہ اور قشلہ کو توپوں کے ذریعے فتح کیا تھا۔ طائف میں معہ توپوں کے پہنچیں۔ اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ نصب کر کے قلعہ اور قشلہ پر گولہ باری کرنے لگیں۔ صبح صادق سے تقریباً بارہ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں۔ ترک بھی ان کا جواب دیتے تھے۔ یہی حال عید مبارک تک رہا۔ افسوس کہ عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہ کیا۔

مولانا کا رمضان طائف میں

چونکہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا اس لئے نہ تو دن کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن ہوتا تھا نہ مساجد وغیرہ میں تراویح کا انتظام حسب ضرورت ہو رہا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی بڑی مسجد ہے اس میں بھی تراویح الم ترکیف سے ہوتی تھیں۔ اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے۔ باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے مکانوں پر پڑھتے تھے کیونکہ ہر وقت گولیاں اوپر سے گزرتی تھیں۔ مولانا نے اولاً مسجد ابن عباسؓ میں حسب سابقہ عادت تراویح پڑھنا شروع کیں۔ مگر چونکہ راستہ وہاں کا ایسا تھا کہ جہاں پر گولیاں برابر آتی رہتی تھیں اس لئے اس مسجد میں جاتے وقت خطرہ ضرور رہتا تھا اور پھر ایک

شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز مغرب پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے۔ ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ اندھیرا ہو چکا تھا کہ بدوؤں نے ہجوم کیا۔ مسجد ابن عباسؓ کی چھت اور میناروں پر بھی ایک دستہ ترکی فوج کا تھا۔ اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا وہاں پر مورچہ بھی تھا۔ غرض کہ طرفین میں خوب تیز گولی اور گولوں کی بارش دیر تک ہوتی رہی۔ خود مسجد میں بھی برابر گولیاں برستی رہیں۔ جو لوگ مسجد میں باقی تھے وہ ایک کونہ میں جدھر گولیوں کے آنے کا گمان نہ تھا بیٹھ گئے۔ اس روز تراویح بھی نہیں ہوئی۔ صرف چند آدمی بوقت نماز عشاء فرض عشاء ایک طرف پڑھ کر جب سکون ہوا چلے گئے۔ اس کے بعد احباب خصوصاً سید ابن ہاشم نے اصرار کیا کہ آپ مسجد ابن عباسؓ میں نہ جایا کریں۔ دروازۂ مکان کے قریب جو مسجد ہے اس میں ہمیشہ نماز باجماعت پڑھا کریں۔ چنانچہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھا کرتے تھے اس میں تراویح فقط الم تر کیف سے پڑھی گئیں۔ اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نوافل میں سحر کے وقت تک مسجد میں مشغول رہتے تھے۔ اور مولوی عزیز گل صاحب اور کاتب الحروف بھی اسی مسجد میں علیحدہ علیحدہ نفلوں میں وقت گذارتے۔ چونکہ گرمیوں کی رات تھی۔ جلد تر سحور کا وقت ہو جاتا تھا پھر آکر کچھ سحری پکاتے جو کہ میٹھے چاول ہوتے تھے مگر چونکہ شکر وہاں نہ ملتی تھی اس لئے شہد کو بجائے شکر، چاول اور چائے میں استعمال کرتے تھے۔ اور اکثر تو نمکین چاول بغیر گوشت پکایا جاتا تھا۔ اس وقت طائف میں چاول وغیرہ بھی دستیاب ہونا مشکل ہوتا تھا۔ ایک آنہ والی روٹی آٹھ آنہ کو بمشکل ملتی تھی۔ مگر دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے سے چاول مولانا مرحوم کے لئے ہدیۃً بلا طلب بھیج دیئے تھے جو کہ عمدہ قسم کے تھے۔ انہوں نے بہت کام دیا۔ اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی ہم نے دس بارہ اشرفی طائف میں بوجہ سخت گرانی کھا ڈالیں۔

طائف سے روانگی

عید کے بعد چونکہ تمام اہل شہر بھوک سے مرنے لگے تھے۔ حکام کے پاس جاکر شکایت کی کہ اب ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس جتنے حیوانات دودھ سواری کے لئے تھے۔ کھا ڈالے۔ سب غلہ ختم ہو گیا اب ہمارے لئے کوئی صورت کیجئے۔ ہم سب مرے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا صبح آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباسؓ سے روانگی کے لئے ہم تم کو اجازت دیں گے ہم اپنی حد میں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ شریف کے آدمی تم کو نقصان پہنچائیں تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔

الحاصل لوگوں کو اس طرح ایک فارم معہ ان کے اہل وعیال کے نام دیا جاتا تھا۔ اور ان سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ کہیں جاکر ترکی حکومت سے جنگ نہ کریں گے۔ پھر ان کو معہ ان کے ضروری اسباب کے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔ جب اس طرح سے لوگ نکلنے لگے تو پھر ہم سبھوں کو بھی ضروری معلوم ہوا کہ نکل چلیں۔ چنانچہ ۶ شوال ۱۳۳۴ھ کو بوقت صبح ہم بھی باب ابن عباسؓ سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرتے ہوئے رقیم میں پہنچے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر شریف کا بیٹا عبداللہ بیگ جو کہ کمان دار بدوؤں کا تھا۔ مقیم تھا۔ اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا۔ یہیں مصری فوج کے خیمے بھی تھے چونکہ ہمارے پاس نہ سواری تھی اور نہ نقد وغیرہ اور راستہ دور تھا۔ ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے

تین دن تک پہاڑی راستہ کو قطع کرنا آسان نہ تھا۔ علاوہ ازیں سلسلہ باب بھی تھا۔ اس وجہ سے وہاں جانا ضرور ہوا۔ عبداللہ بیگ سے ملاقات ہوئی۔ اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔ ایک خیمہ کھڑا کرنے کا حکم دیا۔ ایک دنبہ ذبح کر کے دعوت پیش کی۔ عرب میں عادت ہے کہ معزز مہمان کی دعوت میں دنبہ ذبح کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کامل اکرام مہمان کا شمار نہیں ہوتا۔ اور پھر انجیر وغیرہ میوہ جات بھیجے اور ایک اشرفی نذر کی اور کہا کہ شب کو یہاں قیام کرو۔ علی الصبح تم کو روانہ کر دیا جائے گا۔ مگر علی الصبح لڑائی پر چلا گیا۔ اس کے لوگوں نے خالی پشت شتر کا انتظام کر دیا۔ کرایہ بھی خود دیا اور زاد راہ بھی۔ اس طرح وہاں سے روانہ ہو کر ہم دسویں شوال کو مکہ معظمہ علی الصبح پہنچے۔

O

حاشیہ متعلقہ صفحہ نمبر

ل حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف "سفرنامہ اسیر مالٹا" میں تحریر فرماتے ہیں۔

ایام حج میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکہ معظمہ تشریف لائے۔ سرکاری آدمی تھے۔ لن ترانیاں خوب ہانکتے تھے۔ شریف صاحب کے یہاں پہنچے۔ ترکوں کو ہر مجلس میں برا کہتے تھے حکومت موجودہ کی مدح سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی۔ انہوں نے ظاہر کیا کہ گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا میں آیا ہوں تاکہ حجاز کے احوال دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں۔ کیونکہ ہند میں اس وقت بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور عموماً اہل ہند برطانیہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بادشاہ حجاز کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک اعلان علمائے مکہ کی طرف سے لکھوا دیا جائے جس میں ترکوں اور ان کی حکومت اور خلافت کی برائیاں ہوں۔ ان کے استحقاق خلافت پر پر زور مضمون سے رد کیا گیا ہو۔ اس موجودہ انقلاب اور حکومت حاضرہ کی بھلائیاں ذکر کی گئی ہوں۔ چنانچہ ایک ایسا محضر تیار کیا گیا۔ اور وہاں کے ان علماء سے جن کو دربار شریف میں دخل تھا اور صاحب عزت و شوکت شمار کئے جاتے تھے۔ اس پر دستخط اور مہر کرایا گیا۔ بہتوں نے خوشی سے اور بہتوں نے خوف سے دستخط اور مہر کر دیا۔ خان بہادر موصوف کے پاس جب یہ محضر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ۔

"ان علماء کو کوئی ہند میں نہیں جانتا۔ کون تصدیق کرے گا۔ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب جو کہ علماء ہند میں ایک مشہور اور مسلم شخص ہیں ان کے اور دیگر علماء ہند کے دستخط اور مہر ہوں۔ نہ معلوم یہ اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعہ سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ اتفاقیہ تھا۔"

الحاصل اس مضمون کو وہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج جو کہ زمانہ حکومت ترکیہ میں مفتی احناف تھے اور اب انقلاب کے بعد عہدہ شیخ الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہو گئے تھے بذریعہ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا

اور آخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محضر کو لے کر مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں وہاں مکہ معظمہ سے جو لوگ مہاجرین ہند اور علم دوست تھے انہوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع کر رکھا تھا۔ مکان اقامت پر ہی درس دیا کرتے تھے۔ اور جب وہ کاغذ آیا تو چونکہ اس کی سرخی تھی من علماء مکة المکرمة المدرسین بالحرم الشریف المکی یعنی یہ تحریر مکہ مکرمہ کے ان علماء کی طرف سے ہے جو حرم شریف مکی میں پڑھاتے ہیں۔ اس سے ان سے کہا گیا کہ۔

اولاً:۔ اس سرخی کی وجہ سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں۔ کیونکہ وہ علماء مکہ میں سے نہیں اور نہ حرم مکی یعنی مسجد الحرام میں مولانا نے کبھی تدریس کی۔

ثانیاً:۔ اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور در بارۂ اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں آپ کو معلوم ہیں۔

ثالثاً:۔ اس میں وجہ تکفیر کی سلطان عبد الحمید خان کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا ہے حالانکہ کسی فقیہ نے اس کو موجبات کفر میں سے قرار نہیں دیا۔

رابعاً:۔ اس میں خلافت سلاطین آل عثمان کا انکار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر مخالف نصوص شرعیہ میں ہے۔

خامساً:۔ اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے۔

چونکہ کاتب الحروف کی نقیب العلماء سے کچھ پہلے سے معرفت تھی۔ اس لئے ان سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور مہر کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا عنوان اہل مکہ اور مدرسین حرم کے ساتھ مخصوص ہے۔ میں آفاقی شخص ہوں۔ پردیسی ہونے کی وجہ سے مجھ کو کوئی استحقاق اس پر دستخط کرنے کا نہیں۔ اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری وجہوں کو ان پر ظاہر نہ کرنا۔ اگر پھر انہوں نے اصرار کیا تب ان وجہوں کو پیش کیا جائے گا۔ وہ اسی وقت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے۔ اس محضر کا شہر میں پہلے سے چرچا تھا۔ جو لوگ حقانی تھے ان کو خوف لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس آیا تو ہم کیا جواب دیں گے اور کس طرح جان چھڑائیں گے مولانا مرحوم کے رد کرتے ہی پورے شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تو دوسروں کو بھی ہمت ہو گئی۔ ادھر شیخ الاسلام صاحب کو تنبیہ ہوئی۔ انہوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا کہ اس میں سے بحث تکفیر بالکل خارج ہو گیا مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا۔ جو عبارت دوسری مرتبہ بنائی گئی تھی۔ اس پر پہلے علماء سے فقط دستخط لے کر اخبار "القبلہ" میں چھاپ دیا گیا۔ اور اسی کو خان بہادر مبارک علی خان لے کر روانہ ہو گئے۔ خیر خواہوں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ شریف آپ کو کہیں اذیت نہ پہنچائے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ پھر کیا کیا جائے؛ مذہبی حیثیت سے اس پر مہر و دستخط کسی طرح درست نہ تھا۔ آئندہ جو کچھ تقدیر الٰہی میں ہو گا جھیلیں گے۔

بگیر راہِ حُسین احمد ار خُدا خواہی
کہ نائب است نبی را و ہم ز آلِ نبیؐ ست

سوانحِ مدنی

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حُسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

و

صدر جمعیۃ علماء ہند

۱۲۹۶ھ	۱۳۷۷ھ
۱۸۷۹ء	۱۹۵۷ء

ترتیب

مولانا الحاج الحافظ عبد الرشید ارشد

مجاہدِ کبیر سید احمد بریلویؒ کی طرح حضرت مولانا مدنی کی شخصیت مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے اگر ایک جماعت کے نزدیک مولانا موصوف محبوب ترین مخدوم و رہنما تھے تو دوسرے گروہ کے نزدیک مبغوض ترین انسان ۔ اور یہ بات ویسے کچھ فطری سی دکھائی دیتی ہے ۔ جو انسان جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس کی مخالفت زیادہ ہوگی ۔ حضرت سید احمد شہید مسلمانوں کی ایک جماعت کے نزدیک صحابۂ کرامؓ کی نشانی تھے ۔ ان کا اخلاق و کردار ۔ خلوص و عمل اس پایہ کا تھا کہ صحابہؓ کے بعد اس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے ۔ اور دوسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر کافر و مشرک اصلی سے برے آدمی تھے ۔ یہی صورتِ حال مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ہے ۔ دراصل بات یہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں سے جس نے بھی کتاب و سنت کی راہوں پر چلنے کی کوشش کی ہے اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے ۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنے علم و عمل کے اعتبار سے اس صدی کے نابغۂ روزگار انسانوں سے تھے ۔ اور انہوں نے بچپن سے لے کر وفات تک جہد و عمل سے بھرپور زندگی گزاری ہے ۔ ان سے ہمت مردانہ اور استقلال و استقامت کا ہر کہ و مہ معترف ہے ۔ دشمن و دوست بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مولانا غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ اور عزم و ثبات کے اعتبار سے کوہ گراں تھے ۔ تحریکِ آزادی کے آخری دور میں مسلمانوں کی باہمی نظریاتی کش مکش اور سیاسی پیچیدگیاں کچھ اس طرح پیدا ہوگئیں کہ اس خارزار وادی میں کسی کا دامن ایسا نہیں رہا جو کانٹوں سے نہ الجھا ہو اور کسی کے تلوے زخمی ہوئے بغیر نہیں رہے اور پھر ہنگامی دور میں چونکہ جذبات کی فراوانی ہوتی ہے ۔ فضا میں ارتعاش ہوتا ہے ۔ ہر کوئی تگ و دو میں مصروف ہوتا ہے لہٰذا کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ سکون کے ساتھ کسی فرصت میں حالات کا جائزہ لے کر کوئی صحیح فیصلہ کر سکے ۔ مثل مشہور ہے کہ آٹھ دس دانشور ایک جگہ بیٹھے تھے کہ اچانک دو آدمی ان کے سامنے آکر لڑنے لگے ۔ ایک نے پستول چلایا اور دوسرا گر پڑا اس کے بعد دو تین آدمی آئے اور اس مقتول کو اٹھا کر لے گئے ۔ اور یہ سب کچھ آناً فاناً ایک دو منٹ میں ہوا ۔ یہ تمام دانشور اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئے تو ہر ایک کا بیان مختلف تھا ۔ تقریباً یہی حال تحریکِ آزادی پاک و ہند

کے آخری دور کا تھا جس میں جو کچھ ہوا وہ سب کچھ ان حالات کا تقاضا تھا ورنہ یہ صورت ممکن ہی نہ تھی کہ ایک طرف کے سارے لوگ بے ایمان ۔ خود غرض ۔ مفسد اور دوسروں کے آلۂ کار ہوں ۔ اور دوسری طرف کے سارے لوگ مخلص نیک اور ایمان دار ہوں ۔ ایک نظریاتی کش مکش تھی ۔ دونوں جماعتیں اپنے اپنے دلائل کے ساتھ قوم کے سامنے آ رہی تھیں ایک فیصلہ تھا جس کو قلم لکھ چکا اور سیاہی سوکھ چکی ۔ ان حالات کا سہارا لے کر مدت بعد تک ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا مناسب نہیں ۔ بہتر یہ ہے کہ اخلاق و کردار ۔ علم و عمل ۔ اور جہد و ایثار کو سامنے رکھ کر شخصیات کا مطالعہ کیا جائے ۔ نظریات و خیالات میں ہمیشہ سے اختلاف چلا آیا ہے اور اگر یہ اختلاف نہ ہو تو زندگی ایک جمود سے زیادہ کچھ نہیں ۔ اس دنیا کی رونق اور آبادی اختلاف کی رہین منت ہے ۔

آئندہ سطور میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کے حالات آ رہے ہیں ۔ جن لوگوں نے حضرت مولانا کو دور سے دیکھا اور دور سے سنا وہ بھی سرسری ۔ امید ہے کہ حضرت مولانا کے صحیح حالات جاننے کے بعد ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی ۔

حضرت مولانا کا خاندان

خاندانی تعارف خود حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے ایک خط سے جو انہوں نے ایک سائل کے جواب میں کہ "کیا آپ سید ہیں ؟" لکھا تھا ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

" محترم المقام زید مجدکم ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ۔ مزاج شریف ۔

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا ۔ یاد آوری کا شکر گزار ہوں ۔ میرے متعلق نسبی حیثیت سے سید ہونے کا انکار جن حضرات نے کیا ہے وہ اس کے ذمہ دار ہیں ۔ میں تو اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا بھی نہیں ہوں ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مدارنجات نسب نہیں ہے عمل ہے ۔ اگر نسبی حیثیت سے کوئی اعلیٰ درجہ کا عالی نسب ہے مگر اعمال قبیح ہیں تو مثل پسر نوح علیہ السلام وہ راندہ درگاہ خداوندی ہے ۔ اور اگر چمار یا بھنگی زادہ ہے مگر وہ مسلمان متقی ہے تو اس کی فوز و فلاح مثل حضرت بلال و صہیب رضوان اللہ علیہما ہے ۔ میرے عمل اس ادعا کی اجازت نہیں دیتے ۔ مجھے شرم آتی ہے ۔

محترما ! میں اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کا باشندہ ہوں ۔ اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ کے بالکل متصل ہے ۔ تقریباً چار سو برس یا اس سے زائد سے ہمارے خاندان کی سکونت ہے ۔ وہاں کے اطراف و جوانب میں ضلع سلطان پور ۔ اعظم گڑھ ۔ اور فیض آباد کے دیہات اور قصبات میں صرف سادات اور بڑے ذات کے شیخ زادوں میں ہماری رشتہ داریاں صدیوں سے چلی آتی ہیں ۔ ہمارا آبائی پیشہ زمینداری اور پیری مریدی ہے ۔ شاہان دہلی مغلیہ خاندان کے ابتدائی بادشاہوں نے یا

ان سے پہلے بادشاہوں نے ہمارے اعلیٰ مورثوں کو ۲۴ گاؤں دیئے تھے۔ جن میں سے ۱۸۵۷ء تک ۱۳ باقی رہ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ایک ہندو راجہ نے جس سے پہلے سے عداوت چلی آتی تھی بڑوں کے انتقال اور بدعملی کی اشاعت کی وجہ سے سب پر قبضہ کر لیا۔ اور اللہ داد پور لوٹ لیا۔ ہمارے قدیمی کاغذات پر بھی قبضہ کر لیا۔ بے شمار خزانے۔ غلہ اور سامان اس نے لوٹا جس کو وہ ایک ماہ تک گاڑیوں میں منتقل کرتا رہا۔ اس کے حصار کے زمانہ میں عورتیں اور بچے بھیس بدل کر رشتہ داروں کے نہیال شہر ٹانڈہ کے بعض محلوں میں مامون تھے پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اور دوسرے لوگ بھی نوکر اور رعایا کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تھے۔ بہرحال اگر کسی کو تفتیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد دور نہیں ہے وہاں جا کر تفتیش کر کے حال معلوم کر سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد صرف دو گاؤں ہمارے خاندان کے پاس رہ گئے تھے۔ جن میں والد مرحوم کا ایک آنہ آٹھ پائی تھا جس کو فروخت کر کے والد مرحوم نے حجاز کا قصد کیا تھا۔

ہمارے مورث اعلیٰ جو کہ اللہ داد پور میں اولاً پہنچے ہیں ان کا نام شاہ نور الحق قدس سرہ العزیز ہیں ان سے لے کر مجھ تک سترہ پشتیں گزری ہیں جن کا سلسلہ حسب ذیل ہے۔

حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بخش بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن بن شاہ محمد ماہ شاہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ محب اللہ بن شاہ محمود بن شاہ لاجن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبد الواحد بن شاہ محمد زاہد بن شاہ نور الحق۔ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم۔

یہاں تک ہمارا شجرۂ نسبی موجود ہے اس کے بعد کا شجرۂ طریقت ہے نسبی موجود نہیں ہے۔ شاہ نور الحق صاحب خلیفہ ہیں شاہ داؤد چشتی کے۔ وہ شاہ عتاب الدین چشتی کے۔ وہ شاہ نجم الدین چشتی کے۔ وہ شاہ رومی چشتی کے۔ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی۔ وہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمہم اللہ تعالیٰ وقدس اسرارہم کے۔ اس کے بعد شجرہ میں وہی اسماء بزرگان طریقت میں درج ہیں جو خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے تمام شجروں میں مذکور ہیں۔

بہرحال یہ احوال مختصر ہیں۔ والحقیقۃ عند اللہ محترما! اگر قبولیت عند اللہ نصیب ہو تو نجاح وفلاح ہے ورنہ سب ہیچ ہے۔ اخباروں وغیرہ میں ایسے مضامین لانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو ضرورت ہے کہ اپنی قوم کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترقی دیں۔ نسبی حیثیت سے غرور اور تکبر بے موقعہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ترقی سے مانع ہو جاتا ہے۔ سادات پر تمام مسلمانوں کی خدمت

گزاری سے دیں کہ سادات تمام مسلمانوں کو اپنا غلام سمجھیں اور ان سے خدمت کی خواہش کریں۔

تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ ایک روز امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بغداد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے فرمانے لگے کہ۔ بھائیو! تم میں سے جس کو روز قیامت میں اللہ تعالیٰ بخش دے تو میری شفاعت کرنا۔ لوگوں نے تعجب کیا اور کہا کیا ہم آپ کی شفاعت کریں، حالاں کہ آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ہیں۔ تو فرمانے لگے کہ یہی چیز میرے لئے باعث بے چینی ہے۔ امت کے تمام مسلمان میرے نانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں اور میں ان کے خاندان کا بچہ ہوں۔ قاعدہ ہے کہ مہمانوں کی خدمت گزاری خاندان کے چھوٹوں پر ضروری ہوتی ہے۔ اگر وہ کوتاہی کرتا ہے تو صاحب خاندان بہت خفا ہوتا ہے۔ اور چھوٹوں کی سرزنش کرتا ہے۔ اگر قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے سوال کیا کہ جعفر! تم نے میرے مہمانوں کی کیا خدمت کی، تو میں شرم کی وجہ سے منہ نہ اٹھا سکوں گا۔

یہ ارشاد حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا صحیح ہے اور سادات کے لئے نہایت عبرت کا فرمان ہے۔ مگر افسوس کہ ہم انتہا کی غفلت میں مبتلا ہیں۔ میں نے جب سے یہ ارشاد دیکھا ہے بہت فکرمند رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

ہمیں فخر نسبی کا موقع صرف اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور ہمارے آقا ولی نعمت نانا جان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ اس سے پہلے یہ مفاخرت جہالت اور نادانی ہے۔

سادات کا فرض سب سے زیادہ اور اولین ہے کہ آقائے نامدار علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت کو زندہ اپنے عمل سے کریں۔ اور آپ کی سنتوں پر نہایت مضبوطی سے چلیں۔ اور ہر امتی کا خیر خواہ خواہ وہ کیسا ہی غریب اور جاہل اور چھوٹی ذات کا مسلمان ہو احترام کریں اور اس کی خدمت گزاری کریں۔ وہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا بلایا ہوا مہمان ہے۔"

حضرت مدنی رح کا یہ طویل مکتوب ہم نے اس لئے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کو اس رجل رشید کی افتاد طبع کا اندازہ ہو اور معلوم کر سکیں کہ حسین احمد کس شخصیت کا نام ہے۔

ولادت و تعلیم و تعلم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی ولادت ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی شب میں بوقت گیارہ بجے بمقام بانگر مئو ضلع اناؤ میں ہوئی۔

یہاں آپ کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب، خلیفہ مجاز مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی، مدرس تھے۔ تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا۔ آپ نسباً حسینی سید ہیں۔ آپ کے والد ماجد بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ذاکر۔ شاغل۔ بڑے پاکباز و باخدا انسان تھے مستجاب الدعوات لیے کہ خود حضرت شیخ مدنی نقش حیات میں لکھتے ہیں۔

" ایسے بہت سے واقعات پیش آئے کہ جس نے ان کو ستایا اور اس کے واسطے انہوں نے بددعا کی اور وہ کبھی پنپنے نہ پایا "

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

" کشف ان کا بہت قوی اور زیادہ تھا۔ متعدد بار مکاشفات ان کے صحیح ثابت ہوئے۔ ایک دفعہ انہوں نے مدینہ منورہ میں فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص کو ہندوستان جانا ہوگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام نکلے گا "

حضرت کی والدۂ محترمہ رابعۂ وقت۔ پابند شریعت۔ بڑی صابر اور قانع خاتون۔ سارے اوقات ذکر و شغل سے معمور و مشغول۔ شیخ مدنی تین سال کے تھے کہ آپ کے والد محترم پنشن لے کر اپنے وطن ٹانڈہ تشریف لے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ تیرہ سال کے ہوئے تو آپ کو دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ گویا ایک شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سامنے رکھ دیا گیا۔

" ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات "

حضرت شیخ الہند نے ہونہار شاگرد کو پہلی نظر میں پہچان لیا کہ جوہر قابل ہے۔ لہذا حضرت شیخ الہند نے ابتدائی کتابیں بھی مولانا مدنی کو خود پڑھائیں۔ جب کہ حضرت کے مشاغل بڑی جماعتوں کو بھی اوقات مدرسہ کے علاوہ پڑھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایک شوقین اور ذہین طالب علم کو شروع ہی سے لائق فائق استاد مل جائیں تو کیا کہنے سونے پر سہاگہ۔

حضرت مدنی رحکو اپنے وقت کے بہترین اور یگانہ روزگار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ استاذ العلوم حضرت شیخ الہند۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب والد ماجد حضرت شیخ الہند۔ حضرت مولانا عبد العلی صاحب محدث دہلوی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری۔ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمہم اللہ اجمعین۔ تعلیم کے دوران آپ ہمیشہ اعلیٰ نمبر لے کر پاس ہوتے رہے۔ عربی مدارس میں انتہائی نمبر پچاس ۵۰ ہوتے ہیں مگر آپ اکثر و بیشتر کتابوں میں ۵۱ - ۵۲ - ۵۳ نمبر لیتے رہے۔ اور صدرا جیسی مشکل اور ادق کتاب میں ۵۰ نمبر حاصل کئے۔

۱۳۱۶ھ میں آپ کے والد ماجد بقصد ہجرت بمع اہل و عیال عازم حجاز ہوئے تو حضرت مدنی کو بھی اپنی معیت

سے سرفرازی بخشی اور قافلۂ مہاجرین نے حجاز مقدس پر پہنچ کر رحمۃ للعالمین کے جوار رحمت کو اپنے لئے فلاح دارین سمجھا اور وہیں پر اقامت فرمائی۔ اسی طرح حضرت مدنی کو مشیت ایزدی نے اکتساب فیض نبوت اور تحصیل مجد و شرف کے وہ گراں قدر مواقع عطا فرمائے جو سب کو نہیں ملا کرتے۔ صرف ان ہی کو ملا کرتے ہیں جنہیں خداوند باری تعالیٰ اپنی رحمت کیلئے مخصوص کر لیتے ہیں۔

اس وقت مدینہ منورہ میں دو کتب خانے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام" اور دوسرا محمودیہ"۔ ان دونوں ہی کتب خانوں میں علاوہ مطبوعات کے مختلف علوم و فنون پہ نایاب قلمی کتابیں بھی تھیں جن سے حضرت کو استفادہ کا پورا موقعہ ملا۔ عسرت اور معیشت کی تنگی قیام مدینہ میں آپ کے شامل حال رہی۔ اس لئے بیشتر ایسا بھی ہوا کہ آپ نے کتابیں نقل کر کے اپنی معیشت کے سامان مہیا کئے۔ مگر کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہ فرمایا جس سے خودداری اور عزت نفس کو ٹھیس لگے۔ مدینہ منورہ میں آپ کا خانوادہ تیرہ افراد پر مشتمل تھا مگر صرف بارہ چھٹانک مسور کے پانی پر یہ تمام حضرات قناعت فرماتے تھے۔

ادبیات کی تکمیل آپ نے مدینہ منورہ کے معمر ادیب مولانا شیخ آفندی عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائی۔ جو علماء حجاز میں اپنی ادبیت کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان میں ساڑھے چھ سال کی مدت میں آپ نے سترہ فنون کی ۶۷ کتابیں اپنے مشفق اساتذہ کرام سے پڑھیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو جو خصوصی لگاؤ اور تعلق تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل کتب سے ہو سکتا ہے جن کو حضرت شیخ نے حضرت شیخ الہند سے پڑھا۔

دستور المبتدی۔ زراوی۔ زنجانی۔ مراح الارواح۔ قال اقول۔ مرقات۔ شرح تہذیب۔ تہذیب۔ قطبی۔ تصدیقات وتصورات۔ محیطے۔ مفید الطالبین۔ نفحۃ الیمن۔ مطول۔ ہدایہ اخیرین۔ ترمذی شریف۔ بخاری۔ ابو داؤد شریف۔ تفسیر بیضاوی نخبۃ الفکر۔ شرح عقائد نسفی۔ حاشیہ خیالی۔ موطا امام مالک۔ موطا امام محمد۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اگر استاذ اور شاگرد قابل ہوں تو استاد ایک دو کتابوں میں ہی شاگرد کی ساتھ ساتھ تربیت کر دیتا ہے اور یہاں تو ۲۳ کتابیں شیخ الاسلام بننے والے شاگرد نے اپنے وقت کے سب سے بڑے استاذ والنسان سے پڑھیں۔ اور ساڑھے چھ سال شرف تلمذ حاصل کیا۔

تکمیل علوم کے ساتھ ساتھ ہی آپ نے مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمادیا۔ شوال ۱۳۱۸ھ تک آپ کا درس امتیازی حیثیت سے لیکن ابتدائی پیمانہ پر رہا۔ ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور ماہ محرم میں ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ واپس حاضری ہوئی۔ اس کے بعد آپ کا حلقہ درس بہت وسیع ہو گیا۔ اور طلباء کا ایک جم غفیر آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ اہل علم میں حسد و رقابت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ خصوصاً مدینہ منورہ میں کوئی ہندی نژاد عالم کا حلقہ درس وسیع ہو جائے تو اس پر اہل عرب کی رقابت قدرتی طور پر زیادہ ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ کی طرف نگاہیں اٹھنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک عجمی عالم

زیادہ دیر تک ہماری تنقید و جرح کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مگر ایک ذہین و فطین استاد جس نے شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رہ جیسے کامل الفن اور وحیدان عصر سے استفادہ کیا ہو وہ کسی سے کب مات کھا سکتا تھا۔ علماء کے حسد و رقابت اور تنقید و جرح کے باوجود حضرت کے حلقۂ درس میں توسیع ہوتی گئی۔ اور اس قدر توسیع ہوئی کہ مشرق وسطیٰ، افریقہ۔ چین۔ جزائر۔ مشرق الہند تک کے تشنگان عالم آپ کی طرف کھنچے کھنچے چلے آنے لگے۔ اور آپ کے زیر درس درسیات ہند کے علاوہ مدینہ منورہ۔ مصر۔ استنبول کی کتابیں مثلاً

اجرومیہ۔ دہلان۔ کفراوی۔ الفیہ۔ ابن عقیل۔ شرح الفیہ ابن ہشام۔ شرح عقود الجمان۔ استعارات رسالہ وضعیہ۔ لقاضی عضد۔ بدلعیۃ ابن حجر۔ ملتقی الابحر۔ درر۔ شرح جمع الجوامع للسبکی۔ شرح مستصفی الاصول۔ ورقات۔ شرح منتہی الاصول۔ مسامرہ شرح مسائرہ۔ شرح طوالع الانوار۔ جوہرہ۔ الفیہ راصول حدیث، بیقونیہ و دیگر کتب اصول حدیث وغیرہ ادق علمی کتابیں رہیں۔

قدرت نے آپ کو دماغ و ذکاوت وہ اعلیٰ درجہ کا عطا فرمایا تھا کہ جس کی نظیر خود آپ ہی تھے۔ نیز آپ کوئی سبق بغیر مطالعہ کے نہ پڑھاتے تھے۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں صرف ۳ گھنٹے آرام کرتے اور بقیہ درس و مطالعہ نیز ذکر و اوراد میں گزارتے۔ آپ دوران درس اپنے سامنے کتاب کبھی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ طالب علم کی قرأۃ کے بعد مسائل پر تقریر فرماتے۔ حالانکہ علمائے مدینہ نہ صرف کتاب کو دوران درس سامنے رکھتے بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھ میں لے کر پڑھاتے تھے اور تقریر کے وقت عبارت شرح یا حاشیہ کی سناتے تھے مگر حضرت سب زبانی کرتے تھے۔

اس طرح آپ نے روزانہ چودہ پندرہ اسباق کا درس دیا۔ جس میں کتب عالیہ حدیث وتفسیر۔ عقائد و اصول بھی شامل تھیں۔ ان وجوہ کی بناء پر آپ کی پورے حجاز میں دھاک بیٹھ گئی اور یہ صرف مطالعہ و محنت کی بناء پر نہ تھا۔ بلکہ ساتھ ساتھ مجاہدہ و ریاضت اور ذکر و شغل بھی جاری تھا اور بفحوائے من عمل بما علم علمهُ اللّٰہ بما لا یعلم۔ (جو پڑھے پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ خاص سے ایسے علوم عطا فرماتا ہے جو کسی سے پڑھنے میں نہیں آتے) آپ کو علم لدنی عطا ہوا تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ منزل رابغ کی شب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں نصیب ہوئی۔ یہ سب سے پہلی زیارت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر پاؤں میں گر گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھیں ہیں ان کے متعلق اتنی قوت ہو جائے کہ مطالعہ میں نکال سکوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تجھ کو دیا۔ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر خیزی۔۔

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

حق تعالیٰ نے آپ کو حجاز میں وہ عزت و وجاہت عطا فرمائی جو ہندی علماء کو تو کیا یمنی۔ شامی۔ مدنی علماء کو بھی حاصل نہیں تھی اور آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی اور آپ کو ۲۴ سال کی عمر میں شیخ العرب

والہم کے معزز القاب کے ساتھ سرفراز کیا گیا۔ اور ان اطراف میں آپ ان القاب کے ساتھ مشہور و معروف ہوگئے۔

عرب کے چند ممتاز شاگرد
آپ کے شاگردوں میں سے بہت سے تعلیم و تدریس. قضا اور انتظامی محکموں کے بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے۔ چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

مولانا عبدالحفیظ کردی۔ جو مدینہ منورہ میں محکمہ کبریٰ داہی کانڈہ کے رکن تھے۔

مولانا احمد بساطی۔ جو مدینہ طیبہ میں نائب قاضی رہے۔

محمود عبدالجواد مدینہ میونسپلٹی کے چیئرمین۔

مشہور الجزائری عالم و مجاہد شیخ بشیر ابراہیمی۔ [1]

راہ سلوک و تزکیہ نفس
کرماہ شعبان میں کتب درسیہ اور ان کے امتحان سے فراغت کے بعد مولانا مدنی حضرت شیخ الہند کے اشارے پر اپنے برادر بزرگ مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم کے ساتھ آستانہ عالیہ قطب الاقطاب سید العارفین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں استدعا بیعت طریقت و ارشاد بیش کی بحضرت رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود عذر دخواست قبول فرماکر سلاسل اربعہ میں بیعت فرمالیا۔ ان دنوں مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد نے ہجرت حجاز کا قصد فرمالیا تھا۔ اور فرمایا کہ چونکہ تم مکہ معظمہ جارہے ہو لہٰذا وہاں حضرت مرشد قطب العالم حاجی امداد اللہ مہاجر کی موجود ہیں ان ہی سے ذکر و شغل کی تلقین حاصل کرلینا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس بیعت مبارک کے آثار اسی دن سے دل میں پلنے لگا۔ رویائے صالحہ کا سلسلہ بھی جب ہی سے شروع ہوگیا۔

مکہ معظمہ پہنچ کر حسب ارشاد شیخ طریقت۔ مولانا مدنی حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تلقین وارشاد والی بات نیز ان کا سلام و پیام پہنچایا۔ حضرت حاجی صاحب نے نہایت شفقت فرمائی اور فرمایا کہ ”ہر روز صبح یہاں ہمارے پاس آکر یہ عمل کیا کرو“ چنانچہ مولانا مدنی روز حاضر ہوتے رہے۔ اسی سال حج و عمرہ اور دیگر مناسک سے فارغ ہونے پر اواخر دسمبر ۱۸۹۸ء میں حاضر ہونے اگرچہ وقت عام ملاقات کا نہ تھا تاہم باریاب ہوئے۔ باوجود نقاہت و ضعف کے اٹھ کر بیٹھ گئے اور غایت شفقت سے مولانا مدنی اور ان کے برادر خورد مولانا سید احمد کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ تم کو اللہ تعالےٰ کے سپرد کیا۔ اس ارشاد پر مولانا اور ان کے بھائی خاکش رہے۔ فرمایا کہو کہ میں نے قبول کیا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے حسب ارشاد کلمات کہے۔ اسی سال ماہ جمادی الثانیہ میں حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ درمیان میں کچھ عرصہ حاجی صاحب کے بتائے ہوئے اشغال ترک ہوگئے تھے۔ حضرت کے وصال کے بعد پھر شوق پیدا ہوا اور مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں

---

[1] افسوس کہ یہ سطور تحریر کرکے اخبار کا مطالعہ کیا تو ان کے انتقال اور ان نظر بندی کی خبر پڑھی۔

تعلیم کردہ ذکر کرنے لگے۔ خود ان کے اپنے الفاظ ہیں۔

"چونکہ بدن میں حرکت پیدا ہوتی تھی اس لئے لوگوں کے مطلع ہونے کا خیال اس امر کے باعث ہوا کہ بیرون شہر قریب مسجد اجابہ بعض افتادہ کھجوروں کی جھاڑیوں میں جاکر تنہائی میں جب تک جی لگے ذکر کیا کروں۔ چنانچہ اس حالت پر ایک زمانہ گزرا۔ اس اثناء میں جو رویائے صالحہ اور حالتیں پیش آتی تھیں گنگوہ شریف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں بذریعہ مکاتیب پیش کرتا رہتا تھا۔ الطاف بیکراں کے ساتھ ہمیشہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جوابات میں مفید ارشادات کے ساتھ اعانت فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ حضرت خواجہ ابراہیم ابن ادھم رحمۃ اللہ علیہما ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ ایک تہائی کھجور کا عنایت فرمایا اور کہا کہ باقی دو ثلث دوسرے مشائخ طریقت کے ذریعے سے تجھ کو دیئے جائیں گے۔ اس قسم کے بہت سے خواب دیکھے۔ بالآخر جنوری ۱۹۰۱ء کے رمضان یا شوال میں کرامت نامہ پہنچا کہ تجھ کو ایک مہینہ کے لئے گنگوہ آنا چاہئے۔ اس پر حضرت والد صاحب مرحوم نے ارادہ فرمایا کہ صرف مجھ کو گنگوہ شریف بھیجیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو وہاں کی حاضری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ وہ ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ میں خفیہ طریقہ پر بقصد حاضری گنگوہ شریف روانہ ہوگئے۔ اگرچہ حضرت والد صاحب کا مقصد یہ تھا کہ بعد از حج جب کہ قوافل وقافلے مدینہ منورہ سے جدہ واپس ہوں گے اس وقت مجھ کو بھیجیں گے۔ مگر بھائی صاحب کی تنہائی کی بناء پر حکم فرمایا کہ تو بھی چلا جا۔ بھائی صاحب حج قریب ہونے اور جہاز نہ ملنے پر مکہ معظمہ چلے گئے۔ چنانچہ ہم دونوں نعمت حج اور عمرہ سے فیض یاب ہونے کے بعد جدہ واپس ہوئے مگر دخانی جہازوں کا کرایہ زیادہ تھا جس کے ہم متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ بالآخر اوائل محرم ۱۳۱۹ھ میں بادبانی جہاز دلغلہ مسقط جانے والا ملا۔ جس نے تقریباً سوا مہینہ کے بعد مسقط پہنچایا۔ مسقط سے ہر ہفتہ میں دخانی جہاز کراچی جاتا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد وہ جہاز آیا۔ دو دو روپیہ فی ٹکٹ پر کراچی پہنچنا ہوا۔ اور پھر اوائل ماہ ربیع الاول میں گنگوہ شریف کی حاضری نصیب ہوئی۔ اس اثناء میں تمام راہ میں میرے مشاغل سلوک برابر جاری رہے۔ اور بفضلہ تعالےٰ رویائے صالحہ اور مختلف احوال وارد ہوتے رہے۔

گنگوہ شریف پہنچنے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت زیادہ عنایات فرمائیں۔ والد صاحب مرحوم کے خطوط سے چونکہ حضرت کو پوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی اس لئے یہاں انتظار تھا۔

بھائی صاحب مرحوم سہارنپور سے بالا بالا حاضر خدمت ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ میں پہلے دیوبند جاؤں گا۔ اور وہاں سے خدمت اقدس میں حاضر ہوں گا۔ بھائی صاحب مرحوم سے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں کے لئے ہم نے ایک ایک جوڑا کپڑا تیار کرا رکھا ہے مگر حسین احمد کے حاضر ہونے کے بعد دوں گا۔ چنانچہ جب میں دیوبند سے براہ نانوتہ پیدل حاضر ہوا تو وہ جوڑے جو کہ ابھی جدید تھے ہر ایک کو عطا کئے گئے چونکہ اس میں کرتا۔ پاجامہ۔ ٹوپی ہی تھی اس لئے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہم دونوں اپنے اپنے عمامے لاتے ہیں۔ اور پیش کر دیتے ہیں۔ جناب ان کو بھی ہمیں دے دیں۔ فرمایا کہ اس کو پھر دیکھا جائے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بکمال شفقت آخری شغل سلوک تلقین فرمایا۔ میں نے اپنے رویاء کو جو کہ راستہ میں دیکھے تھے تنہائی میں پیش کیا۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ میں حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ اور اس سے پہلے ایک مقدار کھجوروں کی حضرت کے یہاں بطور ہدیہ پیش کر چکا ہوں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ تو خود آ کر ان کھجوروں کو تقسیم کر دے۔ میں نے عرض کیا حضرت یہ کھجوریں تو میں آپ کے لئے لایا ہوں میرے یہاں تو اس کی دوکان ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ نہیں میں جانتا ہوں کہ کن مشقتوں سے کھجوریں حاصل ہوتی ہیں۔ مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس خواب کو سن کر فرمایا۔ حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں سے تجھ کو اجازت ہو گئی۔ میرے یہاں سے بھی عنقریب ہو جائے گی۔

چونکہ اجازت و خلافت میرے گمان میں بھی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو اس کا، خواستگار نہیں ہوں۔ اس پر غالباً سکوت فرمایا۔ بارگاہ رشیدی کی حاضری میں بفضلہ تعالیٰ معنوی نعمتیں بہت حاصل رہیں۔ ایک شب پندرہ دن کے بعد۔ بعد عشاء میں حضرت کی کمر دبا رہا تھا۔ بین النوم والیقظہ کی حالت ہوئی اور سنا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ تجھے چالیس دن بعد اجازت ہوگی۔ اس کے ٹھیک چالیس[۴۰] دن بعد حضرت نے بعد عصر فرمایا کہ اپنے عمامے لے آؤ۔ بھائی نے دو عمامے حاضر کئے۔ حضرت نے ہر دو کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے دست مبارک سے باندھے اس کے بعد بھائی صاحب سے فرمایا جانتے ہو یہ کیسی دستار تھی؟ بھائی صاحب نے فرمایا کہ یہ دستار فضیلت تھی۔ فرمایا نہیں یہ دستار خلافت ہے تم دونوں کو مجھ سے اجازت ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ خدمت میں رہنا ہوا۔ مگر بہت جلد افتراق جسمانی کی نوبت آ گئی۔ افسوس کہ اپنی تن پروری اور نفس پرستی ہمیشہ میدان عمل میں سد راہ ہوتی رہی جس کی بنا پر ناقص رہا۔ ورنہ نعماء الٰہیہ نے کبھی بخل نہ فرمایا اور نہ حضرت مرشدی قدس سرہ العزیز کی توجہات اور حضرت شیخ الہند کی برکات نے اضافہ سے کوتاہی کی ہے

سودہ گشت از سجدۂ راہتاں پیشانیم	چند بر خود تہمت دین مسلمانی نہیم
از نکتۂ مقصود نہ شد فہم حدیثے	لا دین و لا دنیا بے کار بماندیم

حضرت شیخ الہند کی خدمت میں اگرچہ زیادہ رہنا نصیب ہوا۔ مگر باوجود ان کی توجہات کے اپنی نالائقیوں نے گل کھلانے میں کمی نہ کی۔ غرضیکہ میں اپنے اسلاف اور اکابر کرام کے لئے ننگ و عار ہی رہا اور حضرات اہل چشت اور دیگر مشائخ اہل طریق کا صحیح معنوں میں بدنام کرنے والا۔ تاہم بحمد کرالفضال خداوندی سے امیدیں ہیں کہ مثل سگ اصحاب کہف مجھ کو اپنے اولیائے کرام کے فیوض سے مستفید ہونے کا موقعہ عنایت فرمائیں گے اور اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں کہ دعوات صالحہ اور توجہات دہم سے اس روسیاہ کی دستگیری فرمائیں گے۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(از سلاسل طیبہ)

اسارت مالٹا اور حضرت شیخ الہند کی معیت

مشک از خر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتا ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سولہ سترہ سال مسجد نبوی میں درس حدیث دیتے رہے۔ تشنگان علوم دین ہزاروں کی تعداد میں اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے۔ حرمین۔ نجد و حجاز اور دیگر مقامات پر اب بھی آپ کے تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دوسرے علماء تو اپنے اپنے علاقوں میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر درس دیتے ہیں۔ مگر حضرت مدنی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ قال صاحب ہذا القبر[1] صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر حدیث پڑھایا کرتے ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند بھی حجاز تشریف لے گئے۔ ادائیگی حج کے بعد دربار نبوت میں حاضری دی۔ اسی سال جمال پاشا اور انور پاشا مرحوم بھی دربار رسالت میں حاضری دینے آئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شریف حسین نے انگریزوں کی شاطرانہ اور پرفریب سازش میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے خدام اور رفقاء کی معیت میں اس موقع پر ترکوں کی حمایت میں سرحدی قبائل کو آراستہ کیا۔ انور پاشا اور جمال پاشا کو نقشہ کار کی تشکیل میں کافی مدد پہنچائی۔ حاجی ترنگ زئی مرحوم۔ مولانا لطف الرحمٰن۔ مولانا فضل ربی۔ مولانا فضل محمود۔ مولانا محمد میاں۔ عرف محمد منصور۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر اشخاص سے اس موقعہ پر بہت کچھ کام لیا جاتا۔ مگر مشیت ایزدی کسی اور ہی نقشہ کی تشکیل کر رہی تھی۔ ادھر عرب کی بساط سیاست الٹ جانا قضائے مبرم بن چکا تھا۔ اور ادھر ان مردان کار

---

[1] فرمایا اس قبر والے نے صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے ابتلاء و آزمائش کی نئی راہیں باز ہو رہی تھیں۔ انگریزی چالیں کامیاب ہو گئیں۔ شریف حسین کی حکومت نے ترکوں کے خلاف "جہاد" شروع کیا تو علماء سے فتاوٰی لئے اور جیسا کہ ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے کہ علماء سوء اقتدار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتے ہوئے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کی مرضی کے مطابق فتوٰے دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ نہ صرف حجاز و نجد کے علماء نے بلکہ ہندوستان کے بیشتر علمائے سوء نے ترکوں کے خلاف جنگ کو جائز قرار دیا۔ انگریز ہر قیمت پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے وارنٹ گرفتاری ہندوستان میں ان کی موجودگی میں جاری ہو چکے تھے مگر بوجوہ اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اور حضرت شیخ الہند حدودِ حرم میں داخل ہو گئے۔ اب وہاں شریف حسین کی حکومت ہی گرفتار کر سکتی تھی اور شریف حسین ان دنوں انگریز کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا۔ بعض سرکاری عمائد شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی یہ فتوٰے حاصل کرنے کے لئے گئے۔ حضرت شیخ نے انکار فرما دیا۔ اس پر کئی سو علماء کا ایک فتوٰے دکھایا گیا۔ تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ ان بندگانِ طمع و زر کے فتوٰی کو میں پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتا اور اپنے پاؤں کے جوتے سے ٹھکراتا ہوں۔

گرفتاری کے لئے ایک بہانہ مطلوب تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند کو معہ ان کے رفقاء حضرت مدنی۔ مولانا عزیر گل اور دیگر ساتھیوں کے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں بھیج دیا گیا۔ یہ حضرات تقریباً ساڑھے چار سال وہاں مقید رہے۔ ان حضرات کے تقوٰے و زہد اور صبر و استقامت کا دوسرے قیدیوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ کئی قیدی جرمن تھے وہ تو بندۂ بےدام بن گئے تھے۔ حضرت مدنی نے بزمانۂ اسارت قرآن پاک حفظ کیا اور حضرت شیخ کے ساتھ شب و روز گزار کر کندن بن گئے۔ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پاک کا ترجمہ مکمل کر لیا۔ اور سورۂ مائدہ تک حواشی تحریر فرمائے۔ اور یہ ترجمۂ قرآن پاک اپنی افادی حیثیت سے اپنی مثل آپ ہے۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ان حضرات کو سیاسی و درسی مشاغل سے دور کر کے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ تاکہ ترجمۂ قرآن پاک مکمل ہو سکے۔ کہ جس سے مسلمانانِ عالم تا قیامت مستفید ہوتے رہیں۔

حضرت مدنی رح نے بزمانۂ اسارت حضرت استاد کی وہ خدمت کی کہ جس کی نظیر و مثال ممکن نہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ معمر اور مریض تھے۔ ٹھنڈا پانی استعمال کرنے سے تکلیف ہوتی تھی اور مالٹا میں بلا کی سردی پڑتی ہے مگر گرم پانی کہاں سے آئے۔ حضرت استاذ کو گرم پانی مہیا کرنے کے لئے مولانا مدنی عشاء اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد برتن میں پانی ڈال کر پیٹ سے لگا کر ساری رات بیٹھے رہتے اور تہجد کے وقت بکمال ادب و احترام استادِ محترم کی خدمت میں پیش کر

---

[1] اس سلسلہ میں اسیرِ مالٹا مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی رح۔ علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے مصنفہ مولانا محمد میاں۔ اور ریشمی خطوط کی سازش وغیرہ کتابیں پڑھی جائیں۔ ان میں حالات کی تفصیل ہے یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے حالات میں کچھ تذکرہ گزر چکا ہے۔

دیتے۔ بہت عرصہ کے بعد منتظمین جیل نے گرم پانی کا اہتمام کیا تو مولانا مدنی کو استاد کی اس خدمت سے محروم ہونا پڑا۔
مولوی ہدایت اللہ میاں چنوں۔ ضلع ملتان راوی ہیں کہ میں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ پوچھا کہ حضرت آپ ساڑھے چار سال حضرت شیخ کی خدمت میں رہے کہ آپ کی اس صحبت میں کوئی دوسرا حائل ہونے والا نہیں تھا آپ نے اس دوران میں بہت کچھ حاصل کیا ہوگا تو آپ آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔
مولوی صاحب! میں نکما تھا کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ میں نے پھر بار بار عرض کیا تو فرمایا کہ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ میں نے نیند پر قابو پالیا۔ اب جب خیال آنے سو جاتا ہوں اور جس وقت اٹھنا چاہوں بیدار ہو جاتا ہوں۔ پانچ دس منٹ کے لئے بھی سو سکتا ہوں۔ ارادہ کروں اور نیند آجاتی ہے اور اس قسم کی بہت سی حکایتیں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہیں کہ کسی جگہ گئے وہاں پانچ دس منٹ فرصت ملی سو گئے اور خود بخود اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہر حال نہ صرف نیند پر قابو پانا یہ حضرت استاد کی خدمت کرنے سے حاصل ہوا بلکہ معرفت کے وہ دریا ہضم کئے ہوئے تھے جس کا ایک جرعہ بھی بے خود کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اسارت مالٹا سے رہائی

بالآخر ۲۲ جمادی الثانی ۱۹۱۹ء کو حضرت شیخ الہند مع اپنے خدام کے مالٹا سے رہا کئے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں تحریک خلافت اور استخلاص وطن شروع ہو چکی تھی۔ حضرت مدنی رہ اپنے شیخ محترم کی ہمرکابی میں ہندوستان آئے۔ حکومت ترکی جو جنگ عظیم سے پہلے دول عظمیٰ میں شمار ہوتی تھی۔ اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے ممالک محروسہ پر عمل جراحی کر کے ہر ایک حصہ جسم کو یورپ کے کفن فروشوں نے تقسیم کر لیا تھا۔ حجاز عراق۔ شرق اردن کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے بنا کر برطانوی تولیت میں دے دیئے گئے تھے۔ حضرت مدنی رہ کے نزدیک آزادیٔ ہند ملت اسلامیہ کے نقطۂ نظر سے ممالک اسلامی کی آزادی کا واحد ذریعہ تھی۔ اس لئے آپ نے مدینہ طیبہ جانا مفید نہیں سمجھا اور یہیں مصروف کار ہو گئے۔ جیسا کہ آپ کے عربی مکتوب کے اس فقرہ سے وجہ اقامت ہند مترشح ہوتی ہے۔

"وانی ایضاً حسب الارادۃ الالٰہیۃ سافرت الی اقصی الدیار الھندیہ"

آپ بغرض اعلاء کلمۃ الحق ارض مقدسہ سے آزادیٔ ہند کا پروانہ لے کر وارد ہندوستان ہوئے اور کارکنان قضا و قدر کے فیصلۂ ازلی کے مطابق حضرت شیخ الہند کی تحریک اور آپ کے مشن کی کامیابی کا سہرا ان حضرات کے سر بندھا۔ ان میں سر فہرست نام شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مولانا آزاد کے دارالعلوم کلکتہ کی صدارت

حضرت مدنی پر اپنے شیخ اور مرشد کی اطاعت کا وہی غلبہ ہے جو کہ سلف میں علامہ سخاوی رہ کا ابن حجرؒ کے ساتھ۔ اور علامہ ابن قیم رہ کا علامہ ابن تیمیہ رہ کے ساتھ۔ اور ملا ہیثمیؒ کا اپنے شیخ عراقی رہ کے ساتھ تھا۔ علماء رسوم کو بڑا دھوکہ ہوا کہ انہوں نے حاشیہ نشینی اور حاضر باشی کا نام ارادت و محبت رکھا۔ حالانکہ ارادت و محبت کا معیار اطاعت شعاری، محبوب کی رضا جوئی

اور مرضئ محبوب کے سامنے تسلیم و رضا کے سوا دوسری اور کوئی نہیں ہے۔ شیخ الہند نے اپنے بجائے حضرت مدنی رح کو دارالعلوم کلکتہ کی صدارت سے نوازا۔ اور رخصت کرتے وقت شیخ الہند نے حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ سینے سے چمٹایا۔ اور تمام بدن پر اس کو پھیرا۔ اس وقت کا عالم ہی اور تھا جو ان ناسوتی آنکھوں سے وراء الورار واقفینِ رموزِ طریقت کے نزدیک عطاء فیوضِ روحانی کی خاص صورت تھی۔ جس کے شواہد سلف سے متوارث ہیں۔ حضرت مدنی رح کو خدمتِ شیخ سے جدا ہونا حد درجہ شاق تھا جس کے لئے سب کچھ قربان کر چکے تھے۔ زندگی کے آخری لمحات میں اس سے جدائی دردانگیز سانحہ تھا۔

بعض حضرات جو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق کے دعویدار تھے جب شیخ الہند نے مامور فرمانا چاہا تو یہ عذر کر کے جان چھڑالی کہ اس حالت میں جدائی شیخ سخت سوہانِ روح ہے حالانکہ اسارت مالٹا میں اس مفارقت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر چکے تھے۔ بلکہ بعض تو وہ تھے کہ جنہوں نے ذلت آمیز جد وجہد کر کے خطرۂ رفاقت سے جان بچائی تھی۔ یہ واقعات نہ صرف شیخ الہند کی جانشینی کی غمازی کرتے ہیں بلکہ نص ہیں کہ آپ کے سوا کسی اور پر یہ منصب نہ صادق آیا اور نہ آنا چاہیئے تھا۔ محمود و ایاز کا قصہ کس کو یاد نہیں۔ اصل محبت اطاعت و وفا کیشی میں ہے۔ چنانچہ آپ کی مجاہدانہ زندگی، خلوص، ایثار، صداقت، حق پرستی، فراخ حوصلگی، بلند ہمتی، تواضع وخاکساری اور آپ کا علم وعمل، زہد و تقوےٰ وغیرہ ایسے اوصاف وکمال تھے کہ جو لوگ شیخ الہند سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے حضرت مدنی رح کو حقیقی جانشین قرار دیا۔ سچ ہے "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"۔ عربی شاعر کہتا ہے:۔

بجدٍ لا بجدٍ کل مجدٍ وما جدٌ بلا مجدٍ بجدٍ۔

ہر طرح کی بزرگی کوشش سے حاصل ہوتی ہے نہ اس وجہ سے کہ اس کے باپ دادا بزرگ تھے اور نہ کوئی دادا بزرگی کے بغیر دادا بننے کے قابل ہے"۔

صدارت دارالعلوم دیوبند شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت اور منصب شیخ الحدیث ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی تمام وجاہتیں اور اعزازات ختم ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جب رکھی گئی تو خدا جانے وہ ساعت کتنی سعید تھی اور بانیان دارالعلوم کا کتنا خلوص تھا کہ دارالعلوم کی منصب صدارت پر اور منصب شیخ الحدیث پر جو حضرات فائز ہوتے رہے وہ علم وعمل، جہد وایثار، اخلاق وکردار کے لحاظ سے عالم اسلام کے ممتاز ترین اور منتخب روز گار انسان ثابت ہوئے۔ ان کی سیرت وکردار اور علمی وعملی شان کو دیکھ کر بے اختیار سلف صالحین کی یاد تازہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرونِ اولےٰ میں پہنچ گئے ہیں۔ پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رح تھے اور دوسرے شیخ الہند رح۔ ان کے بعد علامہ انور شاہ محدث کشمیری رح کی باری آئی۔ تو ان کے بعد قرعہ فال حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح پر پڑا۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے وقت کے جامع الصفات انسان تھے ان

کے علم و تحقیق کو دیکھ کر جہاں غزالیؒ و رازیؒ یاد آتے ہیں وہاں زہد و تقویٰ کو دیکھ کر احمد بن حنبلؒ کا زہد و تقویٰ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ سلوک و تصوف میں جنیدؒ و بایزیدؒ نظر آتے ہیں۔ جہد و ایثار میں حسین شہید رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ غرضیکہ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کا سلسلہ ایسے یگانۂ روزگار افراد میں رہا جو جامع الصفات تھے اور مختلف الانواع کمالات رکھتے تھے۔

۱۳۲۶ھ میں ایک اجلاس جس میں دارالعلوم کی ترقی پر غور و خوض ہو رہا تھا حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد قاری محمد طیب صاحب مدظلہ) نے حضرت شیخ الہندؒ سے فرمایا کہ اگر مولوی انور شاہ صاحب کشمیری، مولوی سہول بھاگل پوری، مولوی حسین احمد مدنی، مولوی عبدالصمد کرت پوری وغیرہ یہ حضرات یہاں آکر جمع ہو جاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ بات بہت پسند فرمائی۔ اگرچہ اس بارے میں سکوت فرمایا۔ لیکن نہ جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جد وجہد کے یکے بعد دیگرے دارالعلوم پہنچ گئے۔

چونکہ مبداء فیاض کو حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرے وقت عظیم الشان کام لینا تھا۔ لہذا آپ مستقل طور پر ابتداً میں دارالعلوم سے متعلق نہ رہ سکے۔ چنانچہ جب حافظ محمد احمد و حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما کی خواہش کے پورا ہونے کا وقت آیا تو خداوند قدوس نے ۱۹۲۷ء میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو دارالعلوم دیوبند کی رفیع مسند علم پر مستقل طور پر جلوہ افروز فرمایا اور دارالعلوم دیوبند نے آپ کی سرپرستی و صدارت میں جو علمی ترقی کی ہے وہ ظاہر ہے۔ دارالعلوم کی مسند علم پر دوسرے اکابر علماء و محدثین عظام جلوہ افروز رہے اور اس دور میں بھی دارالعلوم کے دارالحدیث میں حدیث کی شمع روشن ہوئی اور اس پر جان نثار پروانے آئے اور انہوں نے اپنی جان شمع و حدیث پر نثار کی۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اس مدنی محدث نے جب شمع حدیث روشن کی تو اس پر اس قدر پروانوں کا ہجوم ہوا، اور دارالحدیث علم و عرفان کے تابناک ستاروں سے اس قدر جگمگایا کہ دیوبند کی تاریخ میں اس کی نظیر ممکن نہیں۔

دارالعلوم نے اپنی مدت ۹۴ سال میں جو فضلاء پیدا کئے ان کی تعداد (۶۶۳۰) ہے۔ اس میں سے ۳۸۵۶ صرف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ باقی ۲۷۷۴ دیگر مشائخ رحمہم اللہ کے۔ برصغیر پاک و ہند کا شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہوگا جہاں پانچ دس جید علماء حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد موجود نہ ہوں۔

درس حدیث

۱۳۴۶ھ سے قبل آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مختلف اوقات میں متعدد اونچی کتابوں کا درس دیا۔ اور ہزاروں تشنگان علوم کو سیراب کیا۔ لیکن ۱۳۴۶ھ سے آپ نے مستقل طور پر درس حدیث ہی دیا۔ ۳۱ سال کا یہ عرصہ دارالعلوم میں علوم نبویہ کی خدمت میں گزارا۔ آپ نے صحاح ستہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۵۶ھ) کی صحیح بخاری اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۷۹ھ) کی سنن ترمذی۔ دو کتابوں کو اپنے درس کے لئے منتخب فرمایا۔ صحیح بخاری کی وجہ انتخاب تو ظاہر ہے کہ وہ بالاتفاق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ رہا سنن ترمذی کا انتخاب تو اس کتاب

کی چند خصوصیات ہیں جو بقیہ کتب صحاح ستہ میں نہیں ۔

خصوصیات سنن ترمذی

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ روایت کو بیان کرنے کے بعد اس کے درجہ کو ذکر کرتے ہیں یعنی صحیح حسن، غریب وغیرہ ۔ رواۃ کے سلسلہ میں جرح و تعدیل کرتے ہیں ۔ اگر کسی راوی میں کوئی ضعف ہے تو اس کو ذکر کرتے ہیں ۔ احادیث میں اگر کوئی لفظ نادر غریب الاستعمال آتا ہے تو اس کے معانی کو ذکر فرماتے ہیں ۔ تعارض روایات کو دور کرتے ہیں ۔ اگر روایات میں الفاظ فقہیہ ہوں تو مذاہب اربعہ کو ذکر کرتے ہیں اور پھر آپ ترجیح دیتے ہیں اگر کوئی راوی کنیت کے ساتھ معروف ہے تو اس کا نام ذکر کرتے ہیں ۔ ان کے قبائل کو ذکر کرتے ہیں ۔ وجوہ استدلال کو ذکر کرتے ہیں ۔ اور ترمذی میں مکررات بہت کم ہیں ۔ آخر میں کتاب العلل ہے ۔ چونکہ ترمذی میں منافع بہت زیادہ ہیں اور اس کی ترتیب ابواب فقہ پر ہے ۔ اس کے مؤلف شافعی المسلک ہیں علمائے ہند حنفی ہیں ۔ اس وجہ سے ان روایات پر جو بظاہر حنفی مذہب کے خلاف ہیں مکمل بحث کرنا پڑتی ہے اور حدیث کو فقہی انداز سے پڑھانے کے لئے سنن ترمذی کے علاوہ اور کوئی کتاب نہیں ہے ۔ اس لئے سنن ترمذی کو بقیہ کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے ۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اسباق میں اکثر ترمذی کو شامل رکھتے تھے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی لئے سنن ترمذی باقاعدہ اپنے درس میں رکھی ۔

سلسلہ سند حدیث

استاد جب شاگردوں کو پڑھاتا ہے تو اس سلسلہ میں اپنی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتا ہے ۔ برصغیر پاک و ہند کے اساتذہ کا سلسلہ سند امام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پر ختم ہو جاتا ہے ۔ وہاں سے امام بخاری رح ، امام ترمذی رح اور دوسرے محدثین تک پہنچتا ہے ۔ پھر تیسرا سلسلہ آئمہ حدیث سے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے ۔ اور یہ تیسرا سلسلہ صحاح ستہ کی کتابوں میں مذکور ہوتا ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا سلسلہ سند اس طرح ہے ۔

۱ :- مولانا حسین احمد مدنی عن محمود حسن دیوبندی عن محمد قاسم نانوتوی و رشید احمد گنگوہی عن شیخ عبد الغنی دہلوی، عن شاہ محمد اسحاق دہلوی ۔ عن شاہ عبد العزیز دہلوی ۔ عن الامام المحدث شاہ ولی اللہ دہلوی ۔

۲ :- مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ محمود حسن ۔ عن مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی (دونوں) عن شیخ عبد الغنی دہلوی و شیخ احمد سعید دہلوی و مولانا احمد علی سہارنپوری (تمام) عن شاہ محمد اسحاق دہلوی ۔ عن شاہ عبد العزیز دہلوی ۔ عن شاہ ولی اللہ قدس اللہ اسرارہم ۔

۳ :- مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ محمود حسن دیوبندی عن علامہ محمد مظہر نانوتوی و مولانا قاری عبد الرحمن الصانی (دونوں) عن شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ آخر تک ۔

۴ :- مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ مولانا عبد الغنی و مولانا خلیل احمد سہارنپوری (دونوں) عن مولانا رشید احمد گنگوہی و مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ آخر تک ۔

۵۔ قال الشیخ الاجل السید حسین احمد مدنی عن شیخ التفسیر حسب اللہ الشافعی المکی و مولانا عبد الجلیل برّادہ و مولانا عبد السلام داغستانی مفتی احناف مدینہ منورہ و مولانا سید احمد برزنجی مفتی الشافعیہ مدینہ منورہ رحمہم اللہ اجمعین۔

رأس المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدہٗ سے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ و امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلۂ سند مشہور و معروف ہے اور کتب مذکورہ میں طبع ہو چکا ہے اور اس سے اگلا سلسلۂ سند روایت میں مذکور ہے۔ اس طرح حضرت مدنی پانچ طریقوں سے اپنا سلسلۂ سند نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے تھے۔ اور یوں سلسلۂ سند محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو جاتا ہے۔

رعایت آداب علوم نبویہ علوم کتاب و سنت کے عظیم الشان آداب ہیں جن کی رعایت کرنا ہر معلم کو ضروری ہے چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ ان تمام کی مکمل رعایت فرماتے۔ مختصر طور پر چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱:۔ آپ کا مقصد علوم نبویہ سے شہرت۔ عزت و جاہ و احترام نہ تھا۔ بلکہ آپ کا مقصد فقط جناب باری تعالےٰ کا امتثال امر اور خوشنودی تھا۔ نیز آپ چاہتے تھے کہ علوم نبویہ کی نشر و اشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہو۔ تاکہ امت میں علماء زیادہ تعداد میں پیدا ہوں۔ اور جہلاء کی تعداد کم ہو۔ اللہ کے بندوں کو راہ راست پر لایا جائے اور دین الٰہی و سنت نبوی کی خدمت کی جائے۔

۲:۔ دوسری چیز معلم کے لئے ضروری ہے کہ معلم وہ طریقہ اپنے شاگردوں کے ساتھ اختیار کرے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضؓ کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ اس قدر شفقت و محبت سے پیش آتے تھے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

۳:۔ تیسری چیز معلم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے متکلمین سے کسی معاوضہ و اجر کا طالب نہ ہو کما قال اللہ تعالیٰ قل لا اسئلکم علیہ اجرا۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے میں تم سے کسی معاوضہ، اجر کا طالب نہیں ہوں۔ چنانچہ آپ نے مدت العمر اپنے کسی شاگرد سے کسی قسم کا طمع اور لالچ نہ کیا ان اجری الا علی اللہ پر عمل پیرا رہے۔

۴:۔ چوتھی چیز یہ ضروری ہے کہ اپنے شاگردوں کو اخلاق حسنہ کی جانب رغبت دلائے اور برائیوں سے بچنے کی تاکید کرتا رہے۔ چنانچہ آپ درس میں ہمیشہ سختی کے ساتھ ان دونوں باتوں کا حکم دیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی تو ترش لہجہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرماتے۔ ایک طرف تو شاگردوں پر شفقت کا یہ عالم کہ ان کے جوتے تک سیدھے کرتے دوسری طرف اگر کوئی خلاف شرع امر ان سے سرزد ہو جائے تو پھر عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔

۵:۔ پانچویں چیز یہ ضروری ہے کہ شاگردوں کو موعظۂ حسنہ کے ذریعہ سے نصیحت کرے۔ چنانچہ آپ ہمیشہ موعظہ بالحسنہ ہی فرماتے تھے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ معلم متعلمین کی قوت اذہان کے موافق علوم بیان کرے جس قدر کہ وہ تحمل کر سکیں۔ چنانچہ آپ بحکم آقائے نامدار انا معشر الانبیاء امرنا ان ینزل الناس منازلھم ونکلم الناس

بقدرِ علوم ہمہ پر پوری طرح عمل فرماتے تھے۔

نیز یہ سب سے زیادہ ضروری اور اشد ہے کہ معلم کے قول و فعل میں مطابقت ہو۔ دوسروں کو جس کی تعلیم دے تو پہلے خود اس پر عامل ہو۔ آپ کے پیش نظر اللہ تعالےٰ کا فرمان لم تقولون ما لا تفعلون کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہو گا جس کے علم نے اسے نفع نہیں دیا۔ نیز قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت اس آدمی کو ہوگی کہ جس کے علم کے سبب دوسرے لوگ جنت میں داخل ہو جائیں اور یہ اس پر عمل نہ کرنے کی بنا پر دوزخ میں ڈالا جائے ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا۔ لہٰذا آپ کے قول و فعل میں اعلیٰ درجہ کی مطابقت تھی۔ آپ کا عمل تفسیر شریعت تھا جس کو دنیا نے دیکھا۔ آپ کی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند دنیا کے سامنے ہے کسی قول و فعل میں تخالف نہیں پایا جاتا۔

علوم نبویہ کی نشر و اشاعت کرنے والے کے لئے یہ بھی بے حد ضروری ہے کہ وہ دوسرے اہل علم کا احترام کرے اور سلف صالحین سے عقیدت رکھے اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرے۔ چنانچہ آپ پوری زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔

درس کے وقت مضحک، ہزل نہ ہوتا۔ بلکہ علم، وقار، رفق اور مدارات کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ درس میں ہمیشہ باوضو رہتے اور خوشبو استعمال فرماتے تھے۔ متعلمین سے دوران درس بے تکلفانہ خطاب فرماتے اور بحکم حدیث نبوی انما انا لکم مثل الوالد لولدہ ۔ میں تمہارے لئے مثل والد کے ہوں۔ انتہائی شفقت سے پیش آتے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ دارالحدیث میں ایک مشفق باپ اپنی اولاد سے مخاطب ہے۔ دوران درس لطیف مزاح بھی فرماتے لیکن اس کے باوجود دارالحدیث میں مکمل سکوت و سکون ہوتا۔ اور طلبہ اس طرح ہمہ تن متوجہ ہو کر بیٹھتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔

طریقۂ درس درس کی احادیث میں جب آپ تلاوت حدیث کرتے تو اس سے پہلے یہ خطبہ مسنونہ پڑھتے تھے۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ اما بعد فان اصدق الحدیث کتاب اللہ واحسن الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار ۔

قرأت حدیث کے بعد اسناد حدیث کے متعلق تحقیق فرماتے۔ راویوں پر فن اسماء الرجال کی حیثیت سے

بحث فرماتے اور جرح وتعدیل فرماتے ۔ مناسب موقعہ پر رواۃ کے حالات بیان فرماتے ۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے اگر کسی کا نام آتا تو ان کی خصوصیات ذکر فرماتے ۔ اس کے بعد متن حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھاتے کہ اچھی طرح سے ذہن نشین ہو جاتا ۔ حدیث میں جو مشکل الفاظ آتے ان کی لغوی تحقیق فرماتے ۔ حدیث کے مراتب صحیح حسن وغیرہ بیان فرماتے ۔ حدیث پر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو اس کی وضاحت فرما کر چند قوی اور مستند جواب دیتے ۔ تعارض حدیث کو اس طرح دور فرماتے کہ یقین کرنا پڑتا کہ ان میں کبھی تعارض تھا ہی نہیں ۔ ہر حدیث کا صحیح اور عمدہ محمل بیان فرماتے ۔ اگر کوئی حدیث کسی جگہ مختصر آتی تو دوسری جگہ جو تفصیل آتی ہے وہ بیان فرماتے ۔ تراکیب نحویہ ، تشریح مقامات خصائص کتب ۔ فن حدیث کی اصطلاحات کی تشریح ۔ علل احکام ۔ امور شرعیہ کے عقلی ومشاہداتی دلائل ۔ صحابی کی احادیث مرویہ کی تعداد ۔ وجہ تخصیص مذاہب آئمہ اربعہ دیگر علوم وفنون کی اصطلاحات کی تشریح ۔ احادیث منسوخہ کی مکمل بحث ۔ فرضیت احکام کی تواریخ وشان نزول ۔ فرق حقہ و باطلہ کے عقائد کی تشریح معہ دلائل ۔ تفسیر آیات ۔ تشریح معجزات مستند قصص انبیاء ۔ ابحاث متعلقہ ایمان ۔ وجہ تسمیہ سور قرآنی ۔ عصمت انبیاء ۔ احوال آئمہ حدیث ۔ شرائط معمول بہا محدثین ۔ اثبات قدرۃ اللہ ۔ احادیث کے عنوان سے تحت عنوان احادیث کی مطابقت ۔ شعب ایمان وغیرہ کو مفصل بیان فرماتے ۔ اگر کوئی حدیث متعلق آتی تو تفہیم حدیث کے بعد اختلافات آئمہ بیان فرماتے اور ہر امام کے جملہ دلائل بالتفصیل بیان فرماتے اور سب سے آخر میں مذہب حنفی کو قوی دلائل سے مزین فرماتے اور دلائل کو معہ حوالہ جات بیان کرتے ۔ اور دیگر ائمہ کے دلائل کے چند قوی جوابات دے کر مذہب حنفیہ کو حدیث سے مطابق فرماتے تھے ۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ حنفی مذہب احادیث نبویہ کے بالکل مطابق ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو تفقہ فی الدین میں دستگاہ کامل حاصل ہے ۔

مراتب صحابہ رضی ۔ تابعین وتبع تابعین ۔ فقہ ۔ حدیث ۔ مذاہب محدثین ۔ اسامی محدثین ۔ رواۃ حدیث کے مساکن و اوطان ۔ انساب محدثین ۔ کنیات صحابہ رضی وتابعین واتباعہم ۔ قبائل رواۃ ۔ محدثین کی عمریں ۔ ان کی ولادت ، وفات القاب فی الاسانید ۔ زیادۃ الفاظ فقیہہ بزیادۃ راوی ۔ اولاد صحابہ رضی ۔ علل احادیث ۔ رواۃ شاذ ۔ الفاظ غریبہ کی تشریح طبقات محدثین ۔ ذکر مدلسین ۔ مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ جملہ لوازم درس حدیث کا آپ دوران درس التزام فرماتے تھے ۔ غرضیکہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث کتاب وسنت اور اس کے پورے متعلقہ علوم وفنون پر حاوی ہوتا تھا ۔

خصوصیات درس

۱ ۔ دوران درس جب کسی نبی کا اسم گرامی آتا تو علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والتسلیم فرماتے اور اگر کسی صحابی کا نام تنہا آتا تو رضی اللہ عنہ ۔ اور اگر سند حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آتا تو رضی اللہ عنہ وعنہم فرماتے ۔ اور اگر ائمہ مذہب علماء و اولیاء سلف کا نام آتا تو بالالتزام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے بشرطیکہ

وہ اہل سنت والجماعت سے ہوں۔ اس پر پابندی سے خود بھی عمل فرماتے اور طلبہ کو بھی تاکید فرماتے تھے۔

۲:۔ دوران درس طلبہ جس قدر بھی سوالات کرتے۔ آپ ان کے تسلی بخش جوابات عنایت فرماتے۔ حالانکہ روزانہ اوقات درس کا ایک کثیر حصہ اس میں صرف ہوتا تھا۔ ان سوالات میں درس سے غیر متعلق سوالات بھی ہوتے تھے۔ مگر آپ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیتے تھے اس سے یہ مقصد ہوتا تھا کہ متعلقین کو مسائل کما حقہ ذہن نشین ہو جائیں اور کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ سوالات و جوابات کا یہ طولانی سلسلہ آپ کے درس کے علاوہ اور کسی درس میں نہیں ہوتا تھا۔

۳:۔ کسی موقعہ پر اگر استشہاد کلام عرب کی ضرورت واقع ہوتی تو آپ متعدد اشعار اور بے شمار عبارتیں کتب لغت کی بلا تکلف بیان فرماتے اس موقعہ پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ لغت و ادب کی کتابیں کھلی ہوئی ہیں۔ اور بلا تکلف ان کو پڑھتے جا رہے ہیں۔

۴:۔ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف کے ختم کے موقعہ پر جب آپ اپنے مخصوص لہجہ میں آخری حدیث حدثنا احمد بن اشکاب قال حدثنا محمد بن فضیل عن عمارۃ بن القعقاع عن ابی زرعۃ عن ابی ھریرۃ (رضی اللہ عنہم) قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم کی تلاوت شروع فرماتے تو قلوب پر رقت طاری ہونے لگتی تھی۔ اور آپ حاضرین پر روحانی توجہ فرماتے تو تمام لوگ زار و قطار رونے لگتے تھے اور دل کانپ جاتے تھے اور لوگ توبہ واستغفار اس طرح سے کرتے تھے گویا کہ دربار خداوندی میں حاضر ہیں۔ اور رو رو کر اپنے گناہوں سے معافی چاہ رہے ہیں اور اس موقعہ پر جو دعا مانگی جاتی تھی۔ آنکھیں اشکبار۔ دل مضطرب۔ زبان لڑکھڑاتی ہوئی۔ رونگٹا رونگٹا کانپتا ہوا۔ غرض ہر شخص ماہی بے آب کی طرح تڑپتا تھا اور توبہ واستغفار اور دعا کرتا تھا۔ عجیب منظر ہوتا تھا۔ اس کا بیان کس طرح سے کیا جائے اس کے اظہار کے لئے الفاظ کہاں سے لائے جائیں۔

خدا گواہ ہے کہ دارالعلوم کے ہر دور میں بخاری ختم ہوئی مگر اس انداز کا ختم بخاری کہاں۔ دارالعلوم کی تاریخ میں آس اس کی نظیر ملنا ممکن نہیں۔ روحانیت کا یہ عظیم الشان منظر شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آپ کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔

۵:۔ دوران درس امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ اعتصام بالکتاب والسنۃ کی تلقین ہمیشہ فرماتے متعلمین کے عقائد۔ اخلاق۔ اعمال کی اصلاح کے جو مواعظ و نصائح ضروری ہوتے سب کی تلقین فرماتے۔

شیخ الاسلام اور تحریکِ آزادیٔ ہند

فرنگی اقتدار سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کئی سو سال سے مسلمان بادشاہ اس ملک کے نظم و نسق پر بلا شرکت غیرے قابض چلے آرہے تھے۔ انگریز کے اقتدار کے شروع ہی میں انگریزی حکومت کے خلاف ملی اور عملی جد وجہد مسلمانوں نے ہی شروع کی۔ یہ تاریخی حالات تفصیل طلب ہیں اور اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس جد وجہد آزادی میں سب سے نمایاں کردار علمائے حق نے ادا کیا۔ اور گزشتہ دو صد سالہ تحریکات آزادی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان تمام تحریکوں کی سرپرستی اور قیادت علمائے حق نے ہی کی۔ اگرچہ بعض امراء و رؤسا اور عوام بھی اس میں حصہ لیتے رہے تاہم یہ ثمرات بھی علمائے حق کی جد وجہد کا نتیجہ تھے۔ علماء پر غیر ملکی سامراج کے خلاف کام کرنے کا دوہرا فرض عائد ہوتا تھا ایک کتاب وسنت کے عالم ہونے کی حیثیت سے۔ دوسرا ہندوستانی اور محب وطن ہونے کی حیثیت سے۔ اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بلکہ جہاں بھی مسلمان بستے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی مشکلات کا علاج علماء حضرات نے کیا کہ علماء کسی خاص نسل یا خاص ملک کیلئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ حاملین قرآن اور مجاہدین اسلام نے قرآن کی روشنی میں انسانیت کی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے۔ اور تنگ وحیائی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ مجدد الف ثانی رح۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ اپنے اپنے زمانے میں نہ صرف علم وفضل کے امام رہے بلکہ دینی سیاست کے مقتضیات کے مطابق دنیا کی رہنمائی اور حجروں سے نکل کر میدانوں کی جادہ پیمائی و نبرد آزمائی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا دربار رشید میں ہونا۔ اور امام زہری کا عبد الملک کے زمانہ سے لے کر یزید بن عبد الملک کی حکومت تک رہنا۔ عبد الملک کے دربار سے امام شعبی کا قیصر روم کی طرف سفیر ہو کر جانا۔ علامہ ابن حزم کا پانچویں صدی ہجری میں وزارت کے بارِ خطیر کو برداشت کرنا۔ یہ سب واقعات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ علماء برحق ہمیشہ سے عامۃ المسلمین کی سیاسی رہنمائی کرتے چلے آئے ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ابتدائے تعلیم ہی سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بن چکے تھے اور وہ انہیں اس نہج سے تربیت دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہو کر اسلامیان ہند کی قیادت کر سکیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں غربت و تنگ دستی نے ان میں جفاکشی اور صبر وتحمل کا مادہ پیدا کیا۔ مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خاص توجہ نے مزید جلا بخشی۔ برسہا برس مدینہ منورہ روضۂ اطہر کے پاس بیٹھ کر کتاب وسنت کے درس نے ان کو مصفا کر دیا۔ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خلعت و دستارِ خلافت بخش کر ان کو مزید قابل بنایا۔ اور آخر میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں اسارتِ مالٹا نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اب وہ صرف مولانا حسین احمد مدنی نہیں رہے تھے کہ کسی خانقاہ کے حجرے میں یا کسی مدرسہ و مسجد کے گوشہ میں بیٹھ کر تنہائی میں اپنا

وقت گزار دیں ۔ وہ اپنے زمانہ کی تین مایۂ ناز شخصیتوں کے پروردہ تھے کہ جن کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ تینوں اپنے زمانے کے سب سے بڑے مسلمان تھے ۔ مولانا حسین احمد مدنی رہ نے جنید وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رہ کی بزم عرفان سے بادۂ یثربی سے سرشار ہوئے ۔ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی محفل ارشاد و ہدایت کے صدر نشین قرار پائے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجاہد اعظم کے قدموں میں بیٹھ کر جاں بازی و سرفروشی کا سبق سیکھا ۔ اب آپ بیک وقت بزم علم و عرفان کی شمع روشن ۔ محفل ارشاد و ہدایت کے شہ نشین ۔ میدان خدمت و سیاست کے شہسوار ۔ دائرہ تاریخ و اقتصاد کے مرکز ۔ جامعہ شعر و ادب کے پیشرو ۔ غرض علم و عمل کی جملہ خوبیوں کی آراستہ و پیراستہ آپ کا وجود گرامی بن کر رہ گیا تھا ۔ اس ابر کرم سے ہر طالب تحقیق بقدر استعداد فیض یاب اور ہر تشنہ کام معرفت بقدر ظرف و پیمانہ سیراب و شاداب ہوتا تھا ۔

جوہر علم و صداقت گوہر یکتائے فن　　شب چراغ آگہی ، سوز و گداز انجمن
مشعل راہ طریقت شمع تہذیب کہن　　آبروئے بزم امکاں عظمت خاک وطن
مرد میدان شجاعت پاسبان عقل و ہوش
سرخیٔ خون شہیداں ، سرفراز و سرفروش
پیکر زہد و تقدس ، جانشین انبیاء　　شان تقدیس امم ، ناموس دین مصطفیٰ
رہنمائے عالم اسلام ، فخر ایشیا　　یعنی مولانا حسین احمد اسیر مالٹا
جن کے اٹھتے ہی جبین حادثہ خود جھک گئی
ایک ساعت کے لئے نبض دو عالم رک گئی

○

اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد اسلامیان ہندوستان کے سب سے محبوب قائد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ تھے ۔ جن کو پوری قوم نے متفقہ طور پر اب شیخ الہند کہنا شروع کر دیا تھا ۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تمام خاندان ۔ تمام معتقدین ۔ تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا کہ حضرت شیخ الہند کے جانشین مولانا حسین احمد مدنی ہیں ۔

اس زمانہ میں سیاسی تحریکات کا شاب تھا ۔ لیڈروں کا شمار نہ تھا ۔ مگر تمام سیاسی لیڈروں نے حضرت شیخ الحرم کو شیخ الہند رہ کا جانشین تسلیم کیا ۔ اور ہر اخبار جو جو حضرت مولانا مدنی کا نام شائع کرتا تھا تو آپ کے نام کیساتھ جانشین شیخ الہند ضرور لکھتا تھا ۔

چنانچہ آپ نے صحیح جانشین ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں

کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا۔ اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل حکومت برطانیہ کے خلاف ملک و قوم کی سیاسی تحریکات میں جوش عمل کی روح پھونکنے لگے۔

مقدمہ کراچی اگرچہ ابھی مالٹے سے تشریف لائے ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے مگر یہ سرفروش رہنما اور کتاب و سنت کا ترجمان پھر ملک و ملت کے لئے عظیم قربانی دینے کے لئے تیار تھا۔

چنانچہ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی خلافت کانفرنس ہوئی جس میں حضرت شیخ نے ایک تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ۔

"گورنمنٹ برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا۔ اور ہر قسم کی اعانت کرنا سب حرام ہے۔ اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے"۔

شرکائے کانفرنس نے یہ تجویز پسند کی اور پاس کر دی۔ یہ تجویز اخبارات میں آئی۔ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ بغرض پورے ملک میں شور مچ گیا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت شیخ اور شرکائے کانفرنس گرفتار کر لئے جائیں گے۔ مگر فوری گرفتاری عمل میں نہ آئی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دیوبند میں گرفتاری کی افواہ پھیلی اور دیوبند کے تمام لوگ مضطرب و بے چین ہو گئے ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ہم حضرت کو گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔ بعد دوپہر ایک انگریز افسر کچھ مسلح پولیس لے کر دیوبند پہنچا۔ اور شام کو حاکم پرگنہ اور مقامی تھانیدار کو لے کر مسلح پولیس کے ساتھ نکلا۔ عوام کو فوراً پتہ چل گیا۔ فوراً بازار بند ہو گئے۔ اور لوگ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں میں انگریز افسر کے خلاف اتنا اشتعال پھیلا کہ وہ اس کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے۔ اور سرکاری افسر جو وارنٹ لے کر آئے تھے مکوں اور تھپیڑوں سے حملہ کر دیا۔ اتنے میں حضرت شیخ اور دوسرے ذمہ دار حضرات آ گئے اور انہوں نے بمشکل تمام آفیسروں کو بچا کر تہہ خانہ میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ پولیس باہر تھی مگر ان کو حکم دینے والے بند تھے۔ مجمع مطالبہ کر رہا تھا کہ ان کو ہمارے حوالے کر دو۔ حضرت مدنی رہ نے ان جوشیلے عوام کو پند و نصیحت کے سرد جام پلا کر ٹھنڈا کیا۔ اور ان کو ان شرائط پر راضی کیا کہ پولیس اب رات کو گرفتار نہیں کرے گی۔ بلکہ صبح کو ہم خوشی خوشی اپنے محبوب قائد کو جلوس کی شکل میں اسٹیشن پر پہنچا کر ریل میں بٹھائیں۔ ڈپٹی کلکٹر اور انگریز افسر نے یہ شرائط مان لیں اور لوگ رات کے گیارہ بجے منتشر ہو گئے۔

لیکن انگریز افسر نے سہارنپور اطلاع بھیج دی کہ دن میں مولانا مدنی رہ کو گرفتار کرنا ناممکن ہے فوراً گورا۔ یا گورکھا فوج بھیجدی جائے تاکہ رات ہی رات ان کو گرفتار کر کے دیوبند سے لے جایا جا سکے۔ ورنہ قصبہ میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گا کہ جس کی دوسری مثال کہیں نہیں ملے گی۔ چنانچہ سہارنپور سے رات ہی ایک سپیشل گاڑی میں گورا اور گورکھا

فوج پہنچ گئی۔ سب ہی لوگوں کو یقین تھا کہ رات کو بڑی فوج آئے گی۔ کچھ لوگ پہرہ دے رہے تھے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوگیا کہ فوج نے شہر کے اہم مقامات اور شاہراہیں روک دی ہیں اور حضرت شیخ کے مکان کا پورا محاصرہ کر لیا۔ حضرت شیخ گھر سے باہر تشریف لائے اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء سے خالق دینا ہال کراچی میں حضرت شیخ اور دوسرے شرکاء کانفرنس کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ اور حضرت شیخ نے عدالت کے رو برو وہ تاریخی بیان دیا جو ہندوستان کی سیاسی، ملی اور ادبی تاریخ میں مولانا آزاد کے قولِ فیصل کی طرح ایک عظیم مقام رکھتا ہے۔ اس بیان میں حضرت شیخ نے مولانا محمد علی جوہر کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

" ہندوستان ایک مذہب پرست ملک ہے۔ یہاں کے باشندے مذہبی تعصب میں دوسرے ملکوں سے بہت آگے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی حکومت کے لئے مذاہب کی رعایت کرنا نہایت ضروری سمجھا گیا ہے۔ مدبرین برطانیہ اور ملکہ وکٹوریہ نے اس کو راز سمجھا۔ اور یقین جان لیا کہ ہندوستان میں امن و امان قائم رکھنا مذہبی آزادی پر مبنی ہے اس لئے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے وہ اعلان شائع کیا گیا جس کا حوالہ مسٹر محمد علی نے دیا ہے جس میں مذہبی آزادی پوری پوری تسلیم کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی مداخلت کسی وقت بھی جائز نہیں رکھی گئی۔ اس میں صاف کہا گیا ہے کہ کسی مذہبی کام کرنے والے کو ستایا نہیں جائے گا۔ اسی وجہ سے اب تک امن و امان رہا ہے۔ میں اس اعلان پر توجہ دلانے کے بعد اپنی شخصیت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

میں دو حیثیتیں رکھتا ہوں۔ میری ایک حیثیت یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ میں عالم دین ہوں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں قرآن کریم کے تمام کے تمام کُل حرفوں اور کلمات پر پورا ایمان رکھوں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام پر یقین رکھوں۔ چنانچہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی بھی دنیاوی طاقت قرآن کریم کے کسی حرف یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم سے کسی کو روکے تو وہ ہرگز ہرگز نہ رکے۔ جب کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے تو اس کو قرآن کریم کے تمام احکام پر یقین کرنا، اور عمل کرنا ضروری ہوگا۔"

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے قرآن پاک اور سنت رسول اللہ سے دلائل و براہین پیش کرتے ہوئے کہ ہر مسلمان پر اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت لازمی اور ضروری ہے اور یہ کہ ہر ایسی حکومت کی اطاعت نہیں کرنا چاہئے جو خدا اور رسول کی مخالفت کرتی ہو۔ فرمایا۔

"میری حیثیت عالم اور مذہب اسلام کے محافظ ہونے کی ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اپنا فرض پورا کردوں۔ یہ فرض ہر عالم پر فرض ہے کہ قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام ہر شخص تک پہنچائے۔ چنانچہ قرآن کریم کی کئی آیتیں پڑھ کر ترجمہ کر کے بتایا کہ خدا کا حکم یہ ہے اور کہا۔

"پیغمبروں کے بعد علماء کا یہی طریقہ ہے۔ علماء کی بات پر کوئی توجہ کرے یا نہ کرے علماء کا فرض ہے کہ حق بات لوگوں تک پہنچائیں"۔

حضرت شیخ رح نے فرمایا کہ۔

"اب میں اس ریزولیوشن کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن شریف میں مسلمانوں کے قتل کرنے کی سزا جس قدر سخت ذکر کی گئی ہے۔ کفر کے بعد کسی گناہ کی اس قدر سخت سزا ذکر نہیں کی گئی۔ حضرت نے اس جگہ دس بارہ قرآنی آیات اور اسی قدر احادیث اس کی دلیل میں پیش کیں۔

اس مقام پر مجسٹریٹ نے حضرت شیخ سے کہا کہ اب بھی کچھ باقی ہے۔ میں نے آپ کا وعظ خوب سن لیا ہے بس اب ختم کیجئے۔

حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے نوٹ لکھ لئے ہیں ان کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔ اور یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ریزولیوشن خالص مذہبی ہے۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ پورا قرآن شریف سنا دیں۔

حضرت نے فرمایا کہ میرا بیان تو سننا پڑے گا اور بیان شروع کر دیا۔

ہال میں عجیب کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام سامعین حضرت کا منہ تک رہے تھے اور ہر آدمی کی زبان پر تھا مرحبا۔ جزاک اللہ! یہ تیرا ہی کمال ہے کہ تو تلواروں کے سائے میں حق کی صدا بلند کر رہا ہے۔

مجسٹریٹ۔ میں نے بہت غور سے آپ کی تقریر سنی۔ اب ختم کر دیجئے۔

حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ میں نے ابھی خلافت اور ترک موالات کا مسئلہ نہیں چھیڑا۔ صرف فتوے کا ذکر کر رہا ہوں۔ پھر فرمایا کہ اچھا میں اپنا بیان جلد ہی ختم کرتا ہوں۔ اور بیان شروع فرما دیا۔ بہت سی حدیثیں پڑھ کر ثابت کیا کہ۔

"انگریزی فوج میں بھرتی ہونا۔ بھرتی کرانا۔ انگریزی فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دینا۔ انگریز کی فوج کی امداد کرنا۔ یعنی جنگی قرضہ دینا سب حرام ہے"۔

سامعین حضرت والا کی تقریر سن کر لرز گئے۔ ان دنیا والوں کو تو یقین تھا کہ حضرت اپنے بچنے کی فکر فرمائیں گے۔ اپنی تجویز کی تاویل کریں گے۔ بڑے بڑے وکیل حضرت شیخ الاسلام کی صفائی میں بحثیں کریں گے۔ مگر ملت اسلامیہ کا یہ عظیم فرزند

اپنی بات کا پکا تھا۔ وطن کی جلیل القدر شخصیت کی زبان سے جو بات نکلی تھی اس پر جما ہوا تھا۔ حضرت مولانا نہ صرف اپنی تجویز کا اقرار کر رہے تھے اور اسے مضبوط و محکم بنا رہے تھے۔ آج امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی سنت کو زندہ کر رہا تھا۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔

"یہ رزیولیوشن کوئی نئی بات نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب! ہمیشہ سے مذہب اسلام کا یہی فیصلہ ہے اور اٹل ہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ یہ ہمارے خدا اور رسول کا حکم ہے اس کی اشاعت کو روکنا مذہب میں کھلی مداخلت ہے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ اس کی اشاعت کا کیا یہی وقت تھا؛

حضرت والا نے فرمایا۔

مجسٹریٹ صاحب! اس کی اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا یہی تقاضا ہے جس طرح مریض کی سخت حالت دیکھ کر طبیب دوا اور پرہیز میں سختی کرتا ہے بالکل اسی طرح علماء کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی حالت کو گرتا دیکھ کر بہت جلد انکو سنبھالنے کی کوشش کریں۔

" دوسری وجہ یہ ہے کہ فتح بیت المقدس کے وقت مسٹر لارڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اس جنگ کو صلیبی جنگ کے نام سے موسوم کیا ہے اور مسٹر چرچل نے بھی اس کو صلیبی جنگ کہا ہے"

اب میں ایسی حالت میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جو مسلمان عیسائیت کا ساتھ دے گا وہ صرف گنہ گار نہ ہوگا بلکہ کافر ہو جائے گا"

یہ آخری فقرے سن کر لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ بلا خوف عدالت، پولیس اور فوج "حسین احمد مدنی" زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ہر شخص خواہ ہندو، یا مسلمان، بے چین و بے قرار نظر آ رہا تھا۔ عدالت کو مخاطب کر کے حضرت شیخ نے فرمایا۔

" اگر گورنمنٹ کا منشا مذہبی آزادی سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کرے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کریں کہ ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا۔ اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی سوچ لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ کیونکہ جب مذہبی آزادی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی۔ اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کریم کو جلا دیں، احادیث کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کریں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا

میں ہوں "

مولانا محمد علی جوہر رہ بھی اس مقدمہ میں ماخوذ تھے اور اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ اس موقعہ پر جب حضرت شیخ مدنی رہ نے اپنی بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر حضرت مدنی رہ کے پاؤں چوم لئے۔

بگیر راہ حسین احمد از خدا خواہی　　　که نائب است نبی را و ہم زآل نبی است

مختصر یہ کہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد علی جوہر رہ، مولانا شوکت علی رہ معہ دوسرے رفقاء کے سیشن سپرد کر دیئے گئے۔ سیشن میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء سے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ نے مسٹر کینیڈی جوڈیشل کمشنر سندھ کی عدالت میں پھر بیان دیا۔ حضرت شیخ الاسلام رہ نے فرمایا۔

" جو قرارداد میں نے پیش کی ہے وہ قرارداد نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے اور مذہبی فرض ہے۔ یعنی خدا کے رسولؐ کا حکم ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا لارڈ ریڈنگ کا کام نہیں۔ بلکہ علماء کا کام ہے۔

آج انگریز گورنمنٹ کی فوجی بھرتی اس لئے حرام ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کے مارنے کے لئے بھرتی کیا جا رہا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ ہے۔ قرآن شریف میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ مسلمان کے لئے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے۔ اس لئے یہ ملازمت بھی حرام ہے "

حضرت نے فرمایا۔

" ہم اس تجویز کو خدا اور خدا کے رسول کا حکم جانتے ہیں۔ ہم کسی طرح مجرم نہیں ہیں۔ بلکہ ہماری یہ کمزوری ہے کہ ہم اب تک فوجوں میں جا کر خدا کا یہ حکم بیان نہیں کر سکے۔

کمشنر کینیڈی نے کہا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ فوج کی نوکری جائز ہے۔

حضرت شیخ پر انتہائی جلال کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور فرمایا۔

" اگر کوئی مسلمان عالم دین ہمیں احکام قرآنی کی تعمیل سے روکے گا تو ہم اس کی بات بھی ہرگز ہرگز نہیں مانیں گے۔ کیونکہ ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق　خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں "

اس پر سرکاری وکیل اور جج نے کہا کہ ہم تعزیرات ہند کے پابند ہیں ہم قرآن و حدیث کو نہیں جانتے۔

حضرت نے فرمایا۔ میں قرآن و حدیث کا پابند ہوں۔ اور تمام مسلمانوں کو پابند ہونا چاہیے۔ مزید فرمایا۔

"میں اس بات پر خوش ہوں گا کہ لارڈ ریڈنگ اور لارڈ جارج آج اس بات کا اعلان کر دیں کہ مسلمانوں کو قرآن اور حدیث پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ بات ہمارے لئے خوش آئند ہوگی اور ہندوستان چار ماہ کے بجائے دو ماہ میں آزاد ہو جائے گا اور گورنمنٹ برطانیہ کا پول کھل جائے گا۔"

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو فیصلہ سنایا گیا۔ اسیران اور جیوری کے ارکان نے فوج میں بغاوت پھیلانے یا کسی فوجی کو ملازمت سے باز رکھنے کے جرم سے بری قرار دیا اور جج نے بھی اتفاق کیا۔ البتہ زیر دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ تعزیرات ہند دو سال قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا۔ اور چند دن بعد حضرت کو سابرمتی جیل میں بھیج دیا گیا۔

دو برس کی قید بامشقت کاٹنے کے بعد اب رہائی کا وقت آیا۔ دیوبند میں استقبال کی تیاریاں شروع ہوئیں ہر گھر میں عید کی سی خوشی تھی مگر حضرت شیخ بغیر کسی اطلاع کے رات کی تاریکی میں تن تنہا تشریف لے آئے۔ لوگوں میں جوش تھا۔ جلوس نکالنے پر اصرار تھا لیکن حضرت شیخ نے فرمایا۔

جلوس کیسا؟ کیا برطانیہ کو ہم نے شکست دے دی۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں بلکہ اس بات کا رنج ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے۔ کبھی شکست خوردہ لوگ بھی جلوس نکالا کرتے ہیں۔ ماتم کرو ماتم وغیرہ وغیرہ "

ان الفاظ کو سن کر لوگ رنجیدہ ہوئے اور چپ ہو گئے۔

اسی طرح ہندوستان کے دوسرے مقامات پر حضرت کی آمد پر جلوسوں کے پروگرام بنائے گئے مگر حضرت نے تمام کو سختی سے منع کر دیا کہ شیخ نمود و نمائش کی خاطر کوئی کام نہ کرتے تھے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا مدنی نے دیکھا کہ ملک کی حالت ابتر ہو چکی ہے۔ فرقہ وارانہ سیاست پروان چڑھ رہی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ چند دن پہلے تک ملک کے تمام باشندے ایک پلیٹ فارم پر جمع تھے اور متحد تھے مگر آج سب جدا جدا ہو چکے تھے۔ انگریز حکومت جو عوام کے اتحاد سے کل تک پریشان تھی۔ آج بے حد مضبوط اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بڑے بڑے علمبردار فرقہ واریت میں مبتلا ہو چکے تھے اور انگریز کی ذلیل پالیسی " لڑاؤ اور حکومت کرو" کامیابی سے چل رہی تھی۔ ملک کے بہت سے مقامات پر ہندو مسلم بلوے ہو رہے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے ملک کا اندازہ پوری طرح فرمایا تو سہارنپور کی جامع مسجد میں تقریر فرمائی جس میں وطن کی محبت تھی۔ آزادی کی لگن تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات پر قلبی رنج کے تاثرات تھے۔ اتحاد کا پیام تھا۔ مگر ہندوستانی عوام انگریز کے جال میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے فرمایا۔

یہ تمام قصے انگریز کے اشارے پر ہو رہے ہیں۔ بہت جلد اس جال سے نکلو اور ملک کی آزادی کی جد وجہد کرو۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان تحریکات سے تم کمزور اور حکومت طاقت ور ہو رہی ہے تمہاری نا اتفاقیاں تم سب کو مصائب میں مبتلا کر دیں گے۔ اگر تم نا اتفاقی کے جال میں پھنسے رہے تو تم ہمیشہ غلام رہو گے اور پوری دنیا تم کو ذلیل سمجھے گی۔"

اس تقریر کے بعد حضرت شیخ نے غازیانہ انداز میں پورے ملک کا دورہ کیا اور عوام کے جلسوں میں جوشیلی تقریریں کیں مگر پورے ملک پر تحریک خلافت کی ناکامی کا گہرا اثر تھا۔ ملک کا ہر لیڈر مایوسی سے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو تک رہا تھا۔ خود حضرت شیخ بھی بعض حالات سے متاثر تھے۔ قید کی مشقت کا بھی ایک اثر تھا کہ جیل سے رہا ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور قید و بند کے مصائب کا اثر زائل نہ ہوا تھا مگر ملک کے حالات کا تقاضا تھا کہ آپ "کوکناڈا" میں جمعیۃ علماء کے اجلاس کی صدارت کریں۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ حکومت برطانیہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور سخت ہو چکی ہے مگر "کوکناڈا" کے اجلاس میں حضرت شیخ نے ثابت کر دیا کہ شیر زخمی ہونے کے بعد ہمت نہیں ہارتا۔ بلکہ ہر ضرب کے بعد پہلے سے زیادہ بہادر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس اجلاس کا خطبۂ صدارت انتہائی سخت ہے اور جس جرم پر دو سال کی سزا ہوئی تھی اسی کو پوری قوت سے دہرایا گیا ہے۔

اجلاس کوکناڈا کی صدارت

حضرت شیخ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اعلان فرمایا۔

"برٹش گورنمنٹ کی ناپاک پالیسی، ہندوستانی فوجوں سے اپنی اغراض کے لئے مسلمان قوموں اور ان کے دار و دیار، مال و منال، اور عزت و آبرو پر ہتھیار اٹھواتی ہے ان کو قتل کرواتی ہے، ان کو ہر طرح پامال کراتی ہے۔ اگر کوئی فوجی اس کو حلال جان کر کرے گا تو حسب احکام شریعت کافر ہو جائے گا۔ اگر حرام جانتا ہوا، خوف یا دنیاوی طمع کی وجہ سے اس کا مرتکب ہوا ہے تو سخت گنہ گار اور فاسق ہو گا۔ وہ استحقاق اس کا رکھتا ہے کہ نہ اس کی توبہ قبول ہو اور نہ اس کو کبھی دوزخ سے نکالا جائے۔ چنانچہ متعدد آیات بے شمار احادیث اور فقہائے کرام کے اقوال موجود ہیں۔ مگر چونکہ حاجات معاشیہ نادار ہندوستانی مسلمانوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ان گناہوں میں مبتلا رہوں۔ اس لئے ان کے اور پولیس وغیرہ کے ایمان اور دین کی سلامتی فقط اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہو۔

حضرت شیخ الاسلام نے مزید فرمایا۔

ضروری اور فرض ہے کہ متذکرہ پالیسی کی بناء پر اس گورنمنٹ سے مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی عزت و شوکت کو کم اور اس کی قوت کو فنا کیا جائے اور یہی اعلیٰ

درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ کے ساتھ ہوگی ۔ ہندوستان کی مکمل آزادی اور سوراج انگلستان کی موت کے مترادف ہے ۔

حضرت شیخ نے سوال فرمایا ۔

لیکن کیا یہ انگریز سے مقابلہ صرف مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے کیا جائے یا صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے لئے ؟

پھر آپ نے خود ہی فرمایا ۔

" نہیں - پورے ہندوستان کے لئے ۔ مغرب کے مقابلہ میں تمام مشرق کے لئے یہ جنگ ہونا چاہئے ۔

نہ صرف ہندوستان کی مکمل آزادی بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ

حضرت شیخ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا یہ اعلان دسمبر ۱۹۲۳ء کو کناڈا میں جمعیۃ علماء ہند کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے اس وقت فرمایا جب کہ بڑے سے بڑا لیڈر ہوم رول قبول کرنے کے لئے قریب قریب تیار ہو گیا تھا ۔ مگر حضرت نے ملک کے لیڈروں سے الگ ہندوستان کی مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ کر دیا تھا ۔ کانگرس نے مکمل آزادی کا مطالبہ اس کے چھ سال بعد اپنے لاہور کے اجلاس میں کیا ۔ مگر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے کمال جرأت کرتے ہوئے ۱۹۲۳ء میں اس کا مطالبہ کر دیا تھا ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج سیاسی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اس میں بڑی شدومد سے یہ لکھا جاتا ہے کہ کانگریس نے ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کی قرار داد پیش کی اور مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا ۔

سائمن کمیشن کی آمد ۔ نہرو رپورٹ اور حضرت مدنی رح

۱۹۲۷ء میں ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لئے سفارشات کرے ۔ مگر حضرت شیخ رح نے جگہ جگہ تقریریں کیں اور بتایا کہ دستور تو بنے ہندوستان کی حکومت کا اور بنائے انگریز ۔ ایسے دستور کو کسی طرح پسند نہیں کیا جا سکتا ۔ لہذا سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے ۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا سب سے پہلے فیصلہ اور تجویز حضرت مدنی نے کیا ۔ بالآخر کانگریس اور دوسری تمام جماعتوں کا بھی یہی فیصلہ ہوا کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے ۔ اور بائیکاٹ کیا گیا ۔ اس کے بعد ملک میں ایک جماعت بنی اور اس نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا دستور حکومت ہندوستانیوں ہی کو بنانا چاہئے ۔ چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے مل کر ایک کمیٹی بنائی ۔ جس کا صدر موتی لال نہرو کو چنا گیا ۔ اور یہ نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اس کمیٹی نے جو دستور حکومت بنایا ۔ وہ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے ۔ مگر اس رپورٹ میں بھی ہندوستان کی مکمل آزادی کا تصور نہ تھا ۔ اس لئے حضرت شیخ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے

فرمایا کہ یہ دستور ناقص اور ناقابلِ عمل ہے ہم مکمل آزادی کے سوا کسی دستور کو نہیں مانیں گے۔ اور کسی طرح مکمل آزادی سے کم پر راضی نہ ہوں گے۔

ساردا ایکٹ اور اس کی مخالفت

ابھی مذکورہ بالا سیاسی کش مکش چل رہی تھی کہ برطانیہ نے ایک قانون ساردا ایکٹ کے نام سے پاس کیا جس میں نکاح کے لئے عمر کی تحدید کر دی گئی تھی کہ اس سے کم عمر میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ چونکہ صریحاً اسلامی تعلیمات کے منافی تھا لہٰذا اس کے بارے میں حضرت مدنی رح کی سرپرستی میں علماء نے فیصلہ کیا کہ اس کو نافذ نہ ہونے دیا جائے اور پورے ملک میں اس کی مخالفت کی جائے۔ جمعیۃ علمائے ہند میدان میں آئی اور سول نافرمانی کا ریزولیوشن پاس کیا اور پورے ملک میں علماء نے اس قانون کو بے اثر بنانے کے لئے مخالفت کرتے ہوئے بے شمار چھوٹے چھوٹے بچوں کے نکاح پڑھوا دیئے۔ اور جیل جانے پر راضی ہو گئے چنانچہ ساردا ایکٹ تھوڑے دنوں میں بے اثر بنا دیا گیا جو اب تک ہندوستان میں بے اثر ہے۔

۱۹۲۸ء میں ہندوستان میں سیاسی دور کا سن ہے۔ اس میں بے شمار سیاسی جماعتیں بنیں اور انہوں نے مختلف مطالبات کئے۔ مگر شیخ الہند رح کے سچے جانشین کو صرف ایک ہی دھن تھی کہ ہندوستان کو مکمل آزادی ملے۔ چنانچہ اگلے سال ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس کی اور یوں کانگریس نے چھ سال بعد وہی کام کیا جس سے حضرت مدنی ۱۹۲۳ء میں فارغ ہو چکے تھے۔

کانگریس کیساتھ باضابطہ تعاون برائے مکمل آزادی

حضرت شیخ نے اس دوران پانچ چھ برس بنگال اور آسام میں بسر کئے تھے آپ جس زمانہ میں سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اسی زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم انقلاب آیا۔ اور بزرگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ حضرت مولانا علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیتیں دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئیں۔ ان حالات میں دارالعلوم میں جو اتنا بڑا خلاء پیدا ہوا۔ اسے پُر کرنے کے لئے حضرت مہتمم صاحب مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم کی نظر حضرت شیخ پر پڑی۔ ان حضرات نے حضرت کو دارالعلوم دیوبند بلا کر بے حد اصرار کیا کہ آپ دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئیں۔ حضرت کا انکار تھا۔ مگر ان حضرات کے بے حد اصرار پر صدر مدرسی کا منصب اس شرط پر قبول کرنے پر تیار ہو گئے کہ آپ سیاسی تحریکات میں بدستور حصہ لیتے رہیں گے۔ دارالعلوم کی جانب سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بہر حال آپ

---

[1] مفتی پنجاب حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے بیٹوں۔ فاضل مدیر جامعہ رشیدیہ اور قاری لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کمسنی میں نکاح پڑھائے اور یوں اپنے گھر میں اس قانون کی مخالفت کی۔

دیو بند تشریف لے آئے اور پورے ہندوستان میں مسلمانانِ ہند کی سیاست کی سرپرستی و قیادت کرتے رہے ہر جگہ اور ہر مقام پر فرماتے تھے کہ مکمل آزادی کے بغیر ہندوستانیوں کے مصائب کا حل ناممکن ہے۔

چنانچہ کانگریس یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نازک وقت میں حضرت مدنی رہ کی ذات گرامی قدرمتی ہوا گے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسر اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ اور مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لئے کانگریس کی شرکت کا مشورہ دیا چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس امروہہ ضلع مرادآباد میں کیا گیا۔ جنگ آزادی کی خاطر کانگریس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اس بارے میں تعاون کیا جائے اور جمعیۃ علمائے ہند نے ایک مستقل دائرہ حربیہ قائم کیا۔

حضرت مدنی اور سلوک و تصوف

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی حیات طیبہ جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر صحابہؓ بہت سی صفات کے جامع تھے۔ وہ بیک وقت صف شکن مجاہد تھے۔ معلم و مربی تھے۔ مدبر و سیاست دان تھے۔ عمال حکومت تھے۔ مرشد و شیخ تھے۔ اپنی گوناں گوں صفات و خصوصیات کی بناء پر ان میں۔ ایک ایک کئی کئی کے برابر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں قلیل ہونے کے باوجود کسی شعبۂ حیات میں کسی کلیدی جگہ کے لئے بھی کام کے افراد کی کمی نہ تھی۔ انہیں حضرات کرام کے بارے میں علماء امت کا بیان ہے۔

بااللیل رھبان ــــ وبالنہار فرسان　　　　رات مصلے پر گزرتی اور دن گھوڑے کی پیٹھ پر۔

اس امت مرحومہ میں بعد میں بھی ایسے ایسے جامع لوگ پیدا ہوتے رہے جو بیک وقت زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کر سکتے تھے اور کرتے رہے۔ اس آخری دور میں حضرت سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما انہی لوگوں میں سے تھے۔ جو بیک وقت مسندِ ارشاد و ہدایت کے شہ نشین بھی تھے اور معرکۂ حق و باطل میں جانباز سالار بھی۔ دارالعلوم دیو بند نے بھی ایسی کئی شخصیتیں پیدا کیں۔ جن میں سرفہرست نام بانیانِ دارالعلوم دیو بند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما۔ اور اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی۔ حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی۔ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کا ہے۔ امت میں ایسے لوگ تو بے شمار پیدا ہوئے جنہوں نے کسی خاص شعبہ میں کمال مہارت حاصل کی اور شہرت و عزت کے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ مگر جامع الشان خال خال پیدا ہوئے۔

دوسرے بزرگوں کے حالات اسی کتاب میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ یہاں پر حضرت مدنی رہ کے حالات اختصاراً ذکر کئے جا رہے ہیں۔ حضرت مدنی کے رسوخ فی العلم والسیاستہ کے متعلق شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ انسانی زندگی

کا ایک بہت بڑا شعبہ تہذیب اخلاق کا ہے ہوسکتا ہے کہ آدمی بہت بڑا عالم ہو ۔ مدبر و مفکر ہو ۔ مگر اس کی اپنی زندگی نمونہ کی زندگی نہ ہو ۔ اور دنیا کے اکثر و بیشتر لیڈر اور نام نہاد علماء اسی زمرے میں آتے ہیں ۔ انسان کو ذاتی طور پر اپنی، تہذیب کرنے کے لئے تزکیۂ نفس کرنا پڑتا ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سلوک و تصوف کی راہ بھی کہا جاتا ہے چونکہ آج کل یہی اصطلاح معروف ہے لہذا ہم نے اسی کو عنوان بنایا ہے ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن میں چار ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں ۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم اٰیات ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة ۔

۱ ۔ تلاوت قرآن ۔ ۲ ۔ تزکیۂ نفس ۔ ۳ ۔ تعلیم کتاب ۔ ۴ ۔ تعلیم حکمت ۔

تزکیہ کو، دل کی صفائی ۔ اعمال کی پاکیزگی ۔ اصلاح باطن ۔ خلوص نیت اور تہذیب اخلاق سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں ۔ بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ۔ میں اس لئے آیا ہوں تاکہ عمدہ اخلاق کا اتمام و اہتمام کروں ۔"

عالم یا لیڈر بننا بڑا آسان ہے لیکن اپنے آپ کو اس ڈھنگ میں ڈھال لینا کہ سر مو سنت نبویہ علیہ التحیۃ والصلوٰۃ سے انحراف نہ ہو نا بڑا مشکل ہے ۔ بہت کم لوگ ہیں جو از خود اپنی اصلاح کرسکیں ۔ اگر جسمانی امراض کا علاج کوئی خود بخود طب کی کتابیں پڑھ کر نہیں کرسکتا ۔ تو باطنی امراض کا بھی خود علاج نہیں ہوسکتا ۔ بہت سی امراض ایسی ہیں کہ انسان جن کو مرض ہی نہیں سمجھتا ۔ تکبر اور غرور کا نام خود داری اور عزت نفس رکھ دیتا ہے ۔ اس کو خودی کا رنگ دے دیتا ہے ۔ بعینہ جسطرح ایک پاگل کبھی اپنے آپ کو پاگل نہیں کہتا ۔ بلکہ اپنے آپ کو عقلمند اور دوسروں کو پاگل قرار دیتا ہے ۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کسی صاحب نظر سے تعلق پیدا کیا جائے ۔ یہی بات تھی کہ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب کو بھیجا گیا ۔ ورنہ صرف کتاب بھی تو بھیجی جاسکتی تھی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہاں کس قدر بلیغ انداز میں اس کی شرح کی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

" توفیق الٰہی کی سینکڑوں راہیں ہیں ۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں ۔ مگر سب سے پُرامن اور آسان راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے ۔" (تذکرہ)

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے جو ان کا اپنا تجربہ و مشاہدہ سے اور امر واقعہ ۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم		تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور یہ بھی غالباً انہی کا فرمودہ ہے ۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء		بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سابق میں گزرا کہ انہوں نے یہ راہ ابتدا ہی میں طے کر لی تھی۔ اور اس سلسلہ میں انہیں اپنے وقت کے سب سے بڑے شیوخ مرشدوں کے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نہ صرف صحبت و صحبت حاصل ہوئی۔ بلکہ یہ ان کی آرزوؤں اور دعاؤں کا ثمرہ ہیں۔ لیکن حضرت مولانا کی زندگی کا یہ پہلو لوگوں کی نگاہوں میں نمایاں نہ ہو سکا۔ بہت سے لوگوں نے انہیں شیخ الحدیث اور دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس سمجھا۔ اور بہت سے لوگوں نے انہیں ایک سیاسی لیڈر خیال کیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تیسری حیثیت شیخ و مربی ہونے کی ان دونوں حیثیتوں سے بڑی تھی مگر انہوں نے اس کو بہت کم ظاہر ہونے دیا اور اس روپ میں بہت کم ظاہر ہوئے اور اپنے آپ کو ہمیشہ اخفا میں رکھا۔

درویشی اور ولایت

درویشی اور ولایت کیا ہے؟ درویشی نبوت کا عکس جمیل ہے۔ فضائل نبوت کا روشن مظہر ہے۔ لیکن نبوت کیا ہے؟ شاید آپ یہ سوال کریں۔ تو نبوت کی تعریف میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سامنے رکھئے کہ۔ نبوۃ الی الحق ۔ اور۔ توجہ الی الخلق۔ کی صفت کے کمال کا نام ہے۔ اسے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ۔ نبی وہ ذات ہے جو ہر وقت خدا کی طرف متوجہ رہے اور خلق خدا پر بھی نظر رکھے۔ حق کی طرف توجہ کرنے سے خلق خدا کی طرف اس کی توجہ کم نہ ہو۔ اور خلق خدا کا خیال حق کی لگن میں خلل انداز نہ ہو۔ نبی ہر آن حق سے بھی واصل ہوتا ہے اور خلق میں بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی ایک نکتہ میں نبوت کے سارے کمالات و فضائل جمع ہیں۔

اب دیکھئے ولایت کیا ہے؟ جو انسان اس صفت میں جتنا زیادہ نبی سے قریب ہوتا ہے وہ درجہ ولایت کے اتنے ہی بلند مقام پر فائز ہوتا ہے۔

اسلام سے پہلے۔ اور ایک طبقہ آج بھی۔ یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے بندوں کو چھوڑ کر۔ خدا کی دنیا کو چھوڑ کر حق کی لگن میں پہاڑوں اور ویرانوں میں مراقبہ کرنا ولایت ہے۔ یا سسکتی ہوئی انسانیت ظلم و استبداد میں دبے ہوئے سماج اور ریاست کی بے انصافیوں میں تڑپنے والے عوام سے بے تعلق ہو کر اللہ اللہ کرنا دلوں کے تزکیہ کے لئے روحانی اوراد و وظائف کی تعلیم دینا۔ بے روزگاری اور جن بھوت اتارنے کے نقش تقسیم کرنا۔ بس یہی ولایت ہے۔

حالانکہ نبی جہاں توجہ الی الحق کی وجہ سے عبادت اور ریاضت کرتا ہے۔ شب بیداری میں خدا کو یاد کرتا ہے ذکر الٰہی کے لئے خلوتوں کا سکون تلاش کرتا ہے۔ وہاں وہ خلق خدا پر بھی کامل نظر رکھتا ہے۔ انسانوں کے دکھ درد میں ان کے کام آتا ہے۔

فرعونی اقتدار ہو یا قریش کا استبداد۔ اس سے مظلوم انسانیت کو نجات دلانے کے لئے ہر قسم کی جد و جہد کرتا ہے۔ سماجی بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ لوگوں میں عادل جج بن کر بھی بیٹھتا ہے۔ اور اچھا معلم بھی۔

اچھا شہری بننے کی بھی تعلیم دیتا ہے اور یہودی جیسے دشمن حق. پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے.

جب نبوت میں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا مکمل احساس شامل ہوتا ہے تو پھر ولایت کو بھی ہمیں اسی معیار پر پرکھنا پڑے گا. کیونکہ اولیاء انبیاء کرام تک اپنا سلسلہ پہنچاتے اور ان کے جانشین سمجھے جاتے ہیں.

ہم ولی اور درویش اسے نہیں مان سکتے جو اجتماعی ذمہ داریوں سے بھاگتا ہو. جو ملک پر قبضہ جمائے ہوئے ظلم و استبداد کے خلاف کش مکش کرنے سے گریز کرتا ہو. جو عوام کی خدمت کے کاموں کو دنیا داری کہتا ہو. تمدن و سیاست کے ہنگاموں سے گھبراتا ہو. جب یہ بات صاف ہو گئی کہ ولایت کیا ہے کہ اللہ اللہ بھی ہو اور عوام کی خدمت بھی. اور خدا کی محبت بھی ہو اور بندگان الٰہی کا درد بھی. آخرت کا فکر بھی ہو. اور ملک و قوم کا خیال بھی. تو آئیے اسی معیار پر "مدنی درویش" کو پرکھیں.

موجودہ دور کے اس درویش کامل کی شان ہے کہ عبادت و ریاضت میں وہ جنید و شبلیؒ ہے. علم و فضل میں بخاریؒ و رازیؒ ہے. اصلاح و تجدید میں وہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے. خدمت خلق میں وہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ساتھی معلوم ہوتا ہے. اور بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ بے حد متواضع اور خاکسار ہے.

مدنی درویش. سفروں میں جاڑے کی راتوں میں پلیٹ فارم کسی کونہ میں مصلی پر کھڑے ہو کر تہجد میں مشغول ہے خدام گزارش کرتے ہیں کہ حضرت ویٹنگ روم میں کیوں نہ کھڑے ہو گئے؟ تو جواب ملتا ہے لوگوں کی نیند خراب ہوتی ہے مجھ جیسے ننگے خودے اور روسیاہ انسان کو کیا حق ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو پریشان کرے.

۱۲ بجے رات کو بخاری شریف کا درس دے کر فارغ ہوتے ہیں سیدھے مہمان خانے میں تشریف لاتے ہیں. مہمانوں کے بستر اور تکیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں. ایک دیہاتی مہمان کو تکلیف میں پاتے ہیں. پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص حقہ کا عادی ہے. فوراً چلم لے کر جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اسے حقہ بھر کے پلاتے ہیں.

حق کی طرف توجہ کا یہ حال کہ ایک قدم شریعت و سنت کے خلاف نہیں اٹھتا. منہ پر اگر کوئی تعریف کرتا ہے تو کھڑے ہو کر اسے روک دیتے ہیں. مجال نہیں کہ سٹیج پر کوئی شاعر شیخ کی مدح میں کوئی قصیدہ پڑھے. جہاں کسی نے تعریف میں زبان کھولی، اور جمالی درویش کا جلال بھڑک اٹھا. بندگی کا اتنا گہرا رنگ کہ اگر کوئی عقیدت کے جوش میں ہاتھ چومنے کے لئے ذرا جھکے تو ہاتھ کھینچ لیں. کسی کو پیر دبانے کی اجازت نہ دیں. اور خود رات کو سوتے میں اپنے مہمانوں کو ہمیشہ دباتے رہیں. پھر توجہ الی الخلق کا یہ عالم کہ بندگان الٰہی کو انگریزی سامراج کے ظلم کی چکی میں پستا ہوا دیکھا تو پوری قوت سے آزادئ وطن کے لئے میدان میں اتر آئے. ذکر الٰہی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وعظ فرمایا تو دلوں کو نور ایمان سے روشن کر دیا. برطانوی سامراج کے مذموم ارادوں اور انسانیت سوز مظالم پر تقریر کی تو کمزوروں میں حریت و آزادی کی تڑپ پیدا کر دی.

پھر آزادی کی جد وجہد۔ کسی لالچ میں نہیں۔ کسی عہدے کے لئے نہیں۔ صرف بندگانِ الٰہی کو ظلم سے نجات دلانے کے لئے۔ وطنِ عزیز کی پیشانی سے غلامی کا داغ مٹانے کے لئے۔ اور صرف "حب وطن" کی سنت رسول کو زندہ کرنے کے لئے۔

کسے معلوم تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستی سے ناپاک وطن کو ظلم وستم سے بھرے دشمن۔ وطن یعنی مکہ کو پاک اور محبوب فرمایا تھا۔ مکہ کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

ما اطیبک بلد و احبک۔ مکہ! تو کس قدر پاک ہے اور مجھے محبوب ہے۔

یہ محبت وطن کا اعلان تھا۔ اسی سنت کو اس مجاہد نے زندہ کر کے دکھایا۔ اس پہ ملک و وطن میں بڑی بڑی بحثیں ہوئیں۔ مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا۔ اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظت وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادئ وطن کے لئے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے وطنیت اور قومیت کے نعرہ پر اس شیخ مجاہد کو مطعون کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان میں پاکستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم کہا۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو فراموش کر سکتی ہے؟

یہ مدنی درویش جامع صفات شخصیت کے چند نقوش ہیں۔ جب کوئی اللہ کا بندہ اس ولی کامل۔ مرد مجاہد، غازی اسلام کے حالات پر کچھ لکھنے بیٹھے گا تو وہ بتائے گا کہ:

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کون تھے اور کیا تھے؟

مسندِ ارشاد و ہدایت پر بیٹھ کر جو کام کیا وہ اتنا زیادہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے کہ ایک شیخ الحدیث۔ سیاسی لیڈر۔ اور مدبر و مفکر اپنی ان بے پناہ مصروفیات سے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ مسترشدین پر بھی توجہ دے سکے اور اپنے لاکھوں مریدوں کے حالات کوائف معلوم کر کے ان کی تربیت کر سکے۔ لیکن یہ ہماری بھول ہے۔ اللہ تبارک وتعالےٰ جب اپنے کسی بندے سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کے وقت میں برکت عطا فرما دیتے ہیں چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ دوسرے اسلامی ممالک تک حضرت مدنی رح کے مُرید پھیلے ہوئے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ حضرات جنہیں حضرت سے آگے مرید کرنے کی اجازت ہے جنہیں خلفائے مجاز کہتے ہیں۔ صرف ان کی تعداد ایک سو ساٹھ تک پہنچتی ہے۔

مکارمِ اخلاق حضرت مدنی رح کی زندگی کا یہ باب بہت وسیع ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے فضائل و محاسن کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ حضرت نے لمبی عمر پائی۔ اور اتنے لمبے عرصہ میں کروڑوں انسانوں سے ملاقات ہوئی۔ ہر کہ ومہ آپ کے حسنِ اخلاق کا مداح نظر آتا ہے۔ اور ہر کوئی حضرت کی تواضع۔ انکساری۔ اور حسن خلق کا نیا قصہ سناتا ہے اور اگر ان تمام واقعات کو جمع کیا جائے جو مختلف لوگ بیان کرتے ہیں تو صرف ان کو قلم بند کرنے

کے لئے ایک دفتر چاہیئے ۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا تاثر ملاحظہ فرمایئے ۔
" شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ العالی کے فضل و کمال ۔ مرتبہ و مقام پر تو وہ گفتگو کرے جو خود بھی کچھ ہو ۔ مجھے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ تو مولانا کے ایک ہی کمال اور ایک ہی کرامت کا ہے اور وہ آپ کی بے نفسی ۔ سادگی ۔ تواضع اور انکساری ۔ اور خدمت خلق کا عشق ہے ۔ کہتا ہوں اور گویا خانۂ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں ۔ کہ وہ بہترین دوست ہیں ۔ بہترین رفیق سفر ہیں ۔ مہمان ہو ۔ تو آپ کی میزبانی میں اپنے معمولات کو ترک کر دیں گے ۔ روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آنے تو خود قرضدار ہو جائیں گے لیکن آپ کی حاجت ضرور کہیں سے پوری کر دیں گے ۔ خدانخواستہ بیمار پڑ جایئے تو تیمارداری میں دن رات ایک کر دیں گے نوکری کی ضرورت پیش آئے ۔ کوئی مقدمہ کھڑا ہو ۔ کسی امتحان میں بیٹھ جایئے تو سفارشناموں میں اور عملی دوڑ دھوپ میں نہ اپنے مرتبہ کا لحاظ کریں گے ۔ نہ اپنی صحت کا ۔ نہ خرچ کا جس طرح بھی ہو گا آپ کا کام نکالنے پر تل جائیں گے ۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ جو معاملہ بھی رکھتے ہوں اپنے خوردوں بست گردوں اور مریدوں کے ساتھ یہ روش رکھتے ہیں کہ خادم کو مخدوم بنا کر ہی چھوڑتے ہیں ۔ حالی کے شعر کے معنی اب جاکر روشن ہوئے ہیں ؎

ہم نے ادنیٰ کو اعلیٰ کردیا   خاکساری اپنی کام آئی

بہت سنا ہے کہ یہ شان محمود الحسن شیخ الہند دیوبندی رح کی تھی ۔ اگر یہ صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے زائد کسی کو نہیں پہنچتا ۔ فرصت میسر آتی تو اس متن کی شرح بھی اپنے قلم سے کرتا ۔ اور پھر نوبت شرح پر حواشی کی آتی ۔ اور ایک مختصر المعانی پر کئی کئی مفصل اور مطول تیار ہو جاتے ۔ ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

جو لوگ علم الاحسان یعنی تصوف و سلوک سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انسانی شرف و مجد اور کمالِ انسانیت کا مدار قوائے فکری و عملی کے اعتدال پر ہے اور فن سلوک میں جن اصولِ اخلاق سے بحث کی جاتی ہے وہ چار ہیں ۔
طہارتؒ ۔ عجز و نیاز ۔ سماحتؒ ۔ اور عدالتؒ ۔ آخر الذکر وہ ملکہ ہے جب انسان افراط و تفریط سے بچکر فکر و عمل دونوں میں اعتدال پر قائم رہتا ہے تو یہ عطیۂ خداوندی خوش قسمتی سے نصیب ہوتا ہے ۔ اس ملکہ کے پیدا ہو جانے کے بعد ایک انسان مجموعۂ اضداد بن جاتا ہے ۔ لیکن ہر جذبہ اور ہر فعل کا محل الگ الگ ہوتا ہے ۔ اور اس بنا پر اس میں موزونیت اور حسن تناسب پیدا ہو جاتا ہے ۔ حضرت امام العصر رح کی شخصیت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کا یہی وصف جامعیت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر نظر آتا ہے اور اسی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ امام العصر رح اپنے زمانہ

میں انسانی شرف و مجد کے ایک اعلیٰ پیکر ہیں ۔ اور ایسے لوگ روز روز نہیں پیدا ہوا کرتے ۔ بلکہ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں ۔ اور بقول مولانا سعید احمد ایم اے اکبر آبادی ۔ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ کہ ۔

میں ہندوستان سے باہر عالم اسلام کے بہتیرے علما ۔ اور مشائخ سے اور ان کے حالات و سوانح سے باخبر ہوں اور ان میں کتنے ہیں جن سے مجھ کو ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہے اس کے باوجود موجودہ زمانہ میں جامعیت اوصاف فضائل کے اعتبار سے اگر کوئی شخصیت پیرو مرشد بنانے کے قابل ہے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی ہی شخصیت ہے ۔ لیکن بایں ہمہ مجھ کو آج تک نہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل ہوا ہے اور نہ شرف تلمذ ۔ اس بنا ء پر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ محض اندھی عقیدت کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہیئے ۔ اصل یہ ہے کہ امام العصر دامت برکاتہم ان افراد میں سے ہیں جو اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہیں ۔ اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے پیچھے ہیں لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں ۔

خودداری

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم سے فراغت پاتے ہی اپنے والدین کے ساتھ مدینہ طیبہ ہجرت کر جاتے ہیں ۔ وہاں پہلے سے نہ کوئی جائیداد ہے اور نہ وہاں اپنا کوئی کاروبار چل رہا ہے اور نہ کوئی ذریعہ معاش ہے ۔ لوگ ہجرت کر جاتے ہیں تو حکومت سے وظیفہ پانے کے خواہش مند ہوتے ہیں ۔ دوسروں کی خیرات وصدقات پر نگاہ رکھتے ہیں ۔ مگر مولانا اور مولانا کے والد محترم اسے پسند نہیں کرتے ۔ مولانا ایک مدرسہ کی خدمت کرنے لگتے ہیں ۔ کتابیں نقل کرتے ہیں ۔ اور مولانا کے والد محترم ایک چھوٹی سی دوکان کھول لیتے ہیں ۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ان کے والد ماجد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب نے جو مدینہ طیبہ کے کامیاب ڈاکٹر تھے ۔ حد درجہ اصرار کیا کہ مولانا حسین احمد مدنی ۔ مولانا عبدالحق صاحب کو بطور ٹیوشن تعلیم دیں ۔ لیکن عین انہی ایام میں جب کہ فاقہ کی یہ حالت تھی کہ گھر کے تیرہ آدمی ۳ پاؤ مسور کے پانی پر قناعت کرتے تھے ۔ ٹیوشن گوارا نہ کی ۔ البتہ اس کے لئے آمادہ تھے کہ بلا کسی معاوضہ حسبۃ للہ جیسا کہ حرم اطہر میں اور طلبہ کو درس دیتے ہیں مولانا عبدالحق کو بھی درس دیتے رہیں طرفین سے یہ اصرار عجیب تھا ۔ اور اس میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے ۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب کو سپر انداز ہونا پڑا ۔ اور کتنا عرصہ بغیر کسی معاوضہ کے پڑھاتے رہے ۔ اتنی بے تکلفی اور یگانگت کے باوجود ان حضرات کو یہ علم نہ ہو سکا کہ گھر اکثر فاقے ہوتے ہیں اور یہ معلوم اس وقت ہوا کہ جب یہ تنگدستی خوشحالی میں بدل چکی تھی ۔

ذوق عبادت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان بندگی اور عبادت تھی ۔ اسی لئے عبدہٗ و رسولہٗ کے ممتاز خطاب سے آپ کو نوازا گیا ۔ جیسا کہ اللہ رب العزت اپنی شان ربوبیت اور معبودیت میں یکتا اور بے مثل ہے ۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شان عبدیت اور بندگی میں کامل اور بے مثل تھے ۔

اسی کمال عبدیت نے کمال رسالت اور رسولوں کی سیادت کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ باوجودیکہ آپ اللہ کے محبوب ترین بندے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ساری رات قیام و سجود میں گزار دیتے۔ پاؤں پر ورم آجاتا۔ سوال کرنے پر ارشاد ہوتا۔

افلا اکون عبداً شکوراً　　کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

اس بیسویں صدی میں محب رسول اور متبع سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم مولانا سید حسین احمد مدنی کے ذوق عبادت کا وہ لوگ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے حضرت کی نمازوں کو دیکھا ہے۔ ان کی نماز حقیقی نماز ہوتی تھی جس کو حدیث پاک میں معراج المومنین کے نام سے فرمایا گیا ہے اور جس کو احسان کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے کہ۔

"اللہ کی اس طرح عبادت کر گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے" (بخاری شریف)

جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بندہ سارے عالم سے دستبردار ہو کر اپنے معبود کے ساتھ سرگوشی میں مشغول ہے اور بارگاہِ خداوندی میں باریاب ہے۔ جو آیت بھی نماز میں تلاوت ہوتی تھی سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا گویا وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ کیفیت و رقت طاری ہوتی کہ جس کا بیان دشوار ہے۔ بارہا دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سفر میں ہیں۔ یا سفر کی مشقت برداشت کر کے آئے ہیں اور پھر سفر کرنا ہے۔ مگر جب نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تو ایسی شان کے ساتھ پڑھتے کہ گویا نہ پہلا تعب ہے نہ آئندہ کوئی سفر کرنا ہے۔

ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے اور "دل بیار و دست بکار" کے پورے مصداق تھے اور اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب انتہائی سوز و گداز کے ساتھ یا حی یا قیوم برحمتك استغیث بار بار پڑھتے تھے وصال سے ایک روز قبل کوئی صاحب دم کر رہے تھے کہ حضرت نے انتہائی بے قراری سے بار بار یہی پڑھا۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا کوئی تکلیف یا درد ہے؟ ارشاد فرمایا کہ یہی کیا تکلیف کم ہے کہ آپ حضرات مشغول ہیں اور میں بے کار پڑا ہوں۔ عرض کیا گیا حضرت آپ نے تو بہت کام کیا ہے اتنا کام تو ایک جماعت بھی نہیں کر سکتی۔ ارشاد فرمایا کہ۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

یک لحظہ ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی

رمضان المبارک کے مہینہ میں ۱۲ بجے تک خود تراویح پڑھاتے۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر تہجد میں مشغول ہو جاتے۔ اور سارا دن تلاوت قرآن کریم میں بسر ہوتا۔

اتباع شریعت وسنت

ایک مکتوب میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"آپ ذکر اور اتباع شریعت وسنت پر مداومت کرتے رہئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اصلاح رفتہ رفتہ ہو جائے گی۔"

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس دور میں شریعت محمدی اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ تھی۔ اس لئے ان کی ہر ادا سے انسانیت نمایاں تھی۔ کیونکہ اصل انسانیت دنیا کے سب سے بڑے انسان کے نقش قدم پر چلنے میں ہے۔ جو آدمی دنیا کے سب سے بڑے انسان کی جتنی اتباع کرے گا وہ اتنا انسانیت سے قریب ہوگا۔ حضرت مدنی چونکہ متبع سنت تھے لہذا دیکھنے والا پہلی نگاہ میں بھانپ لیتا تھا کہ واقعی انسان ایسے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپ سے ملتا تھا تو آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

وہ ہزاروں، لاکھوں ارادت مند جو حضرت مدنی رحمہ سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی شہادت دینے میں قطعاً تامل نہیں کریں گے کہ جس مرشد عالم کے دامان رشد وہدایت سے وہ وابستہ ہیں۔ اس کے تعلقات کی خوشگواریوں کا معیار صرف یہی ایک تھا۔ یعنی اتباع سنت۔ اس قطب عالم کے یہاں رسومات قبیحہ کا توسلہ ہی ختم تھا۔ مباح رسومات میں بھی شرکت کے لئے یہ شرط ہوتی تھی کہ مباح کو سنت کا جامہ پہنایا جائے۔ مثلاً تقریبات نکاح میں شرکت کے لئے ضروری تھا کہ سادگی کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ پھر اگر حضرت مرحوم سے نکاح پڑھوانا ہے تو لازمی تھا کہ "مہر فاطمی" ہو۔ علماء نے اس میں بہت کچھ بحثیں کیں مگر حضرت کے طرز عمل میں تبدیلی نہ کرا سکے۔ کیونکہ یہ بحث خواہ کتنی ہی علمی ہو مگر اس محبوبیت سے محروم ہے جو مہر فاطمی کی مسنونیت کو حاصل ہے۔

ولیمہ مسنونہ کے لئے حضرت کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک بکری کی مقدار میں محدود رہے۔ گوشت کا شوربہ پکئے یا پلاؤ پکوائیے مگر اس کی مقدار ایک بکری سے زیادہ نہ ہو اور اسی کے بموجب عزیز و اقربا کو دعوت دیجئے۔ کیونکہ سنت مبارکہ کی تائید اسی کو حاصل ہے۔ اس قسم کے معاملات میں فقیہانہ اور مبصرانہ لطافت یہ ہوتی تھی کہ نکیر اور زجر و توبیخ، غصہ اور خفگی مکروہات تک محدود رہتی تھی۔ مباح پر چشم پوشی ہوتی تھی۔ اور جہاں نشاط اور انبساط کا تعلق تھا۔ وہ صرف مسنون صورت کے لئے مخصوص تھا۔

قریب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی یہ فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ اگر مراسم میں احتیاط نہیں برتی جا سکتی تو حضرت شیخ کی خوشنودی میسر نہیں آسکتی۔ البتہ اگر تقریبات میں سنت مبارکہ کی پابندی کا عزم ہے تو دور دراز گاؤں کے باشندے کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ حضرت کو اپنے یہاں نکاح مسنون کی تقریب میں مدعو کرے۔ حضرت بڑے شوق سے اس کی دعوت منظور فرماتے۔ اس کے یہاں پہنچنے کو پروگرام میں خاص اہمیت دیتے۔ پھر اس پیرانہ سالی میں کچے راستوں اور بیل گاڑیوں کی زحمت برداشت کرتے ہوئے اس کے یہاں پہنچتے۔ نہ بارش کی پرواہ ہوتی نہ گرمی یا سردی کی۔

داہنے ہاتھ سے کھانا۔ چھوٹا نوالہ لینا۔ اس طرح کھانا کہ برابر کے آدمی کو تکلیف نہ ہو۔ پلیٹ میں اپنے آگے سے کھانا۔ منہ اس طرح چلانا کہ آواز نہ ہو۔ بسم اللہ سے شروع کرنا۔ دعا مسنونہ پر ختم کرنا۔ اوّل اور آخر ہاتھ دھونا۔ کلی وغیرہ کرنا۔ ہر سنت کا لحاظ تھا اور اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ فلاں کام یا فلاں وقت میں کونسی سنت ہے تو وہ اس وقت

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل دیکھ لے ۔ بس وہی سنت ہوگا ۔ کھانا کھاتے وقت ساتھ ساتھ ذکر ہوتا رہتا تھا ۔ ہر لقمہ پر بسم اللہ ۔ کھاتے ہوئے سبحان اللہ ۔ الحمد للہ یہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ کوئی لقمہ بغیر ذکر کے حلق سے نیچے نہیں جاتا تھا ۔ اگرچہ قرآن حکیم نے اجازت دی ہے کہ اکیلے کھاؤ یا مل کر ۔ مگر آپ ہمیشہ اپنے ساتھ والے کو اپنی پلیٹ میں شریک کر لیتے تھے ۔ یہ معمول جیل میں بھی رہتا تھا ۔ اگر وہاں کوئی ساتھی نہیں ہے تو اے اور بی کلاس والوں کو جو اخلاقی قیدی خدمت کے لئے ملتا ہے اس کو شریک کر لیتے تھے ۔ غرضیکہ شیخ الاسلام کی زندگی کے جس پہلو پر نظر ڈالئے ۔ اتباعِ سنت ۔ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ محو استغراق فی ذکر اللہ کی وہ روشنی نظر آئے گی جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے ۔ زبان اس کی ترجمانی سے قاصر اور قلم اس کی نگارش سے عاجز ۔

میز کرسی پر کھانا یقیناً سنت کے خلاف ہے ۔ مولانا آزاد نے اپنی وزارت کے ابتدائی دور میں چند حضرات کی دعوت کی ۔ اور میز کرسی پر کھانا کھلایا ۔ حضرت مدنی رح کی طبیعت منقبض رہی ۔ بشاشت نام کو بھی نہ تھی اور آخر میں اشارہ بھی کر دیا اب مولانا آزاد کا لطیف اور پاکیزہ احساس ملاحظہ کیجئے ۔ چند دنوں بعد ان ہی حضرات کی پھر دعوت کی اور فرش پر کھانا کھلایا ۔ اس دن حضرت مدنی کی طبیعت میں فرحت و بشاشت تھی ۔

عزم و استقلال کوئی شخص سوائے انبیاء علیہم السلام کے پیٹ سے بڑا بن کر نہیں آتا ۔ البتہ بڑا بننے کی قابلیت و صلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے ۔ پھر جو ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ سے کارنمایاں انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے ؎

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق　　　　باشد بقدر ہمتِ تو اعتبارِ تو

حضرت مدنی رح کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے اور عزم و استقلال اور ہمت و حوصلہ کے کوہ ہمالیہ نظر آتے ہیں جو کام بھی انجام دیا پورے عزم و استقلال اور انتہائی ہمت و حوصلہ کے ساتھ انجام دیا جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود ہمت و حوصلہ میں جوانمرد تھے جو تمام جوانمردوں سے سبقت لے گئے تھے برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ حصولِ آزادی کے لئے جو جد وجہد کی ۔ اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا ۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت و وقعت برقرار رکھنے کے لئے جو کارنامے انجام دیئے وہ آپ ہی کا حصہ تھا ۔ اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو بہت کچھ کرتے ۔ جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہیں تھا وہ ہندوستانی حکومت سے کسی طرح مرعوب نہیں ہو سکتا تھا ۔ حصولِ آزادی کے بعد ایک ساتھی نے عرض کیا کہ اب تو حکومت اپنی

---

[1] اس معمول میں شدت اس لئے تھی کہ رجعت پسند برہمن اور تہذیب نو کا پرستار دونوں ہی اس بارے میں چھوت چھات کے قائل ہیں ۔ وجہ چاہے برہمن کی کچھ اور ہو ۔ اور اس کی اور ۔ مگر عملاً دونوں ایک ہیں ۔

بن گئی۔ ہنس کر فرمایا۔ ہمارے لئے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا۔ اب بھی جیل خانہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنی رح کے عزم و استقلال کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ورنہ مظلوم مسلمانوں کی تباہی۔ مسجدوں۔ خانقاہوں۔ مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا۔

۱۹۴۷ء کے خونی ہنگامہ میں جب ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ رہی تھی اور مسلمان کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی حضرت مدنی رح پورے حوصلہ کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور پورے وثوق کے ساتھ مسلمانوں کو ہند میں رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ایک آہنی دیوار بن کر سہارنپور کی سرحد پر جم گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی۔ آپ جہاں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا سبق پڑھا رہے تھے وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور باز پرس فرما رہے تھے۔

اسی دوران آپ نے پنڈت پنت وزیراعلیٰ یو.پی. سے سخت غضب ناک لہجہ میں حکومت کے رویہ کے خلاف ڈانٹ دی۔ تو پنڈت پنت نے کہا۔ دارالعلوم کی حفاظت کے لئے فوج بھیج دی جائے۔ تو حضرت مدنی رح نے سخت غصہ میں فرمایا کہ۔

"دارالعلوم تو خدا کا ہے۔ وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ آپ سہارنپور کی خبر لیجئے۔ اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارے میں مذبذب میں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دیں۔ میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کرلیں"

ان تہدیدی کلمات کے بعد جدید انتظامات مکمل کئے گئے اور فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ آگے بڑھنے سے رکی۔

انہماکِ مشاغل

جب انسان بڑے بڑے کارناموں سے بڑا بنتا ہے۔ تو جس قدر بڑا انسان ہوگا اسی قدر اس کے مشاغل کثیر ہوں گے اور ان ہی کے بقدر انہماک و اشتغال ہوگا۔ جو واقعی انسان ہیں وہ ہر وقت انسانی کارناموں میں مشغول رہتے ہیں۔ کھیل کود میں بے کار وقت نہیں گزارتے۔ اور نقلی انسان تو صرف کھانے پینے والا حیوان ناطق ہوتا ہے۔ ہر انسان چل دیتا ہے اور اس کے اعلیٰ مشاغل اور کارنامے اس کی یادگار رہ جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے مشعل راہ بنتے ہیں۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے روزانہ معمولات اور مشاغل اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

روزانہ شب کو تین بجے تہجد کے لئے بیدار ہوتے اور نماز فجر تک تہجد اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک تلاوت قرآن کریم اور مطالعۂ کتب۔ اس کے بعد مہمانوں کی معیت میں چائے اور ناشتہ۔ پھر تقریباً بارہ بجے تک دارالعلوم میں درس حدیث اور صدر مدرسی کے فرائض کی انجام دہی۔ اس کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرما کر تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے اور ان کی مختلف ضرورتوں اور گوناگوں مشکلات کو رفع فرماتے۔

کسی کو سلوک کی تلقین ہو رہی ہے اور کسی کو تعویذ دیا جا رہا ہے اور کسی کے سوالات کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ نماز عصر تک جاری رہتا۔ اور اسی دوران سادی چائے کا دور بھی چلتا تھا۔ عصر سے مغرب تک دار العلوم میں درس حدیث ہوتا تھا نماز مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل میں صرف ہوتا جس میں سوا پارہ یومیہ تلاوت فرماتے۔ نوافل کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے۔ اسی اثنار میں عشار کا وقت ہو جاتا۔ نماز عشار کے بعد دار العلوم میں تقریباً تین گھنٹے بخاری شریف کا درس ہوتا۔ اس کے بعد مہمانوں کا پتہ فرماتے۔ سو گئے یا جاگتے ہیں۔ کسی کو تکلیف تو نہیں۔ اگر کوئی بیمار ہوتا یا کمزور یا تھکا ماندہ ہوتا تو آہستہ سے اس کو دباتے رہتے اور اس کے بعد خود سوتے۔ تو گویا رات کے تین بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک تک۔ اکیس بائیس گھنٹے مشغولیت میں گزارتے تھے۔ صرف آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ دوپہر کو آرام ملتا تھا۔ سب سے زیادہ مشغولی کا وقت ظہر عصر کے درمیان ہوتا تھا۔ ڈاک کا انبار سامنے ہوتا تھا اور مہمانوں کا ہجوم پیش نظر۔ جو چالیس پچاس سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک کی ضرورت کا معلوم کرنا۔ پھر اس کو نہایت بشاشت وخندہ پیشانی سے جواب دینا یا پورا کرنا۔ ہر ایک کے حقوق مہمانی کو ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ڈاک بھی اتنی کثرت سے ہوتی تھی کہ بعض دفعہ سینکڑوں خطوط کا انبار سامنے آجاتا تھا۔ اس لئے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت شیخ طریقت بھی تھے اور عالم دین بھی۔ عامل کامل بھی تھے اور سیاسی پیشوا بھی۔ اور ان ہی سب امور کے متعلق تحریری اور زبانی۔ لوگوں کی فرمائشیں اور استفسارات بھی ہوتے تھے جن کو حضرت پورا فرماتے تھے

یہ روزمرہ کے مشاغل تھے جن کو کوئی جوانمرد بھی چند روز نہیں نبھا سکتا۔ جو ایک پیر مرد ضعف وبیماری کی حالت میں سالہا سال نبھا گیا اور کر کے دکھلا گیا۔ جو کھلی کرامت ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت مدنی رہ اپنے ان تھکا دینے والے مشاغل سے نہ گھبراتے تھے اور نہ اکتاتے تھے۔ اور نہ کبھی اس کا احساس فرماتے تھے۔ دراصل ان کا یقین تھا کہ انسان کام ہی کے لئے بنا ہے اور کام ہی سے انسان بنتا ہے اور سنورتا ہے۔ کثرت اسفار کے باوجود ان مشاغل پر مداومت کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔ شاید ہی حضرت مدنی رہ کے برابر کسی نے سفر کئے ہوں۔ سال کا تقریباً نصف حصہ سفر میں گزرتا تھا اور سفر کے مشاغل اور مصروفیتیں حضرت سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔

احساس فرض منصبی

وہ شخص بھی بھلا کیا ہے۔ جس میں اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی کا احساس نہیں جو شخص بھی جس قدر انسانیت سے آراستہ ہوگا۔ اسی قدر اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی میں چست وچالاک ہوگا۔ حضرت مدنی رہ ۲۸ برس دار العلوم دیو بند کی صدر مدرسی کے منصب پر فائز رہے اس دوران جس انہاک اور سرگرمی کے ساتھ آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ نے اس عرصہ کے دوران اپنی دوسری بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود دار العلوم کے انتظامی، تبلیغی اور تنظیمی کاموں میں اس قدر حسن خوبی کے ساتھ دل چسپی لی کہ دار العلوم کی ترقی اوج کمال کو پہنچ گئی اور دنیا میں اس کے نام کو روشن کر دیا۔

اسی طرح اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور اخیر میں تو کئی برس سے جمعیۃ کے مستقل صدر رہے۔ یہ صدارت بھی خطبۂ صدارت پڑھ دینے والی صدارت نہیں تھی۔ بلکہ اس صدارت کی ذمہ داری کا آپ کو پورا پورا احساس تھا۔ اور اسی احساس نے جمعیۃ علمائے ہند کو ایسے دور میں بھی سنبھالے رکھا جبکہ اپنے بھی اس کے وجود کو ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دوران جمعیۃ نے جو سیاسی کارنامے آپ کی سرپرستی میں سرانجام دیئے۔ ان ہی کی بدولت آج عالم اسلام میں مسلمانانِ ہند کا سر بلند و بالا ہے۔ اگر حضرت مدنی رح کی ہستی سیاسی سرگرمیوں میں اس قدر سرگرم عمل نہ رہتی تو کس کو معلوم ہوتا کہ اس تحریک آزادی میں مسلمانوں کا پورا حصہ ہے۔ جس کی بنیاد خود مسلمانوں نے ڈالی۔ اور اپنی جانبازیوں اور سرفروشیوں سے اس کو منتہیٰ تک پہنچایا۔ اور خاص طور پر جب مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان کا مطالبہ کر کے الگ ملک قائم کر لیا۔ اگر حضرت مدنی اور ان کے ساتھی نہ ہوتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اس قدر ابتر ہوتی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پھر دارالعلوم میں صدر مدرسی کے علاوہ شیخ الحدیث ہونے کی وجہ سے دو سب سے اہم سبق بخاری اور ترمذی شریف ہمیشہ آپ کے پاس رہتے تھے۔ روزانہ قیام میں سات آٹھ گھنٹے درس دینا آسان کام نہیں۔ اور پھر دو ڈھائی سو طلبہ کے سامنے بغیر لاؤڈ سپیکر کے آواز پہنچانا معمولی بات نہیں۔ پھر درس بھی پورے انبساط کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ہر مسئلہ کی تحقیق و تدقیق ہوتی تھی اور ہر طالب علم کے سوال کا جواب تسلی بخش دیا جاتا تھا جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ قیام کے دوران کبھی سبق کا ناغہ ہو یہ تو کیا ہوتا۔ سفر میں بھی سبق کا خیال رہتا تھا اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ جلد از جلد واپس پہنچ کر سبق پڑھایا جائے۔ سینکڑوں میلوں کے سفر سے واپسی ہوتی۔ سبق کا وقت ہوتا تو آتے ہی اعلان فرما دیا جاتا کہ سبق ہوگا۔ اب نہ کوئی تکان ہوتی نہ اضمحلال۔ حتیٰ کہ سفر حج سے ایک دفعہ واپسی ہوئی جس کی تکان ہفتوں نہیں اترتی اور دماغ یکسو نہیں ہوتا۔ اور واپسی بھی اس طرح ہوئی کہ جس ٹرین کے ذریعہ تشریف لائے وہ دیوبند نہیں رکتی تھی اس لئے رات کو ۱۲ بجے مظفر نگر اترنا ہوا۔ اور وہاں سے بذریعہ لاری دیوبند پہنچے۔ اس طویل سفر سے واپسی رات کی بیداری۔ اور ملاقات کے لئے آنے والوں کا ہجوم۔ پھر بھی سبق کا اعلان ہو گیا۔ اور مسلسل کتنی دیر درس جاری رہا اور اس شان سے بخاری شروع کرائی گئی جو آپ ہی کا حصہ تھی۔

سادگی و بے تکلفی

سادگی اور بے تکلفی بھی اعلیٰ انسانی جوہر ہے۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ سادگی اور بے تکلفی میں یکتائے روزگار تھے۔ شیخ طریقت۔ عالم ربانی ہونے کے علاوہ حضرت مدنی رح کی ظاہری شخصیت ایک بڑے سیاسی لیڈر رہنما کی تھی۔ اور ہر سیاسی لیڈر مسلم ہو یا غیر مسلم۔ ملکی ہو یا غیر ملکی۔ آپ کے آستانہ پر حاضری کو ضروری اور باعث فخر سمجھتا تھا۔ اس ظاہری عزت و وقار کے باوجود اپنی درویشانہ شان اور بوریہ نشینی کو برقرار۔ اور سنتِ نبوی کے موافق سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا صرف آپ ہی کا حوصلہ تھا۔ یہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے

ہیں اور اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ حضرت مدنی کا لباس۔ وضع قطع۔ رہائش۔ بود و باش۔ سب لطیف اور سادہ تھا۔ اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ۔ آپ سنت کے موافق چمڑے کا تکیہ استعمال کرتے تھے۔ اور چمڑے کا گول دسترخوان استعمال ہوتا تھا جس پر ہمیشہ ایک سالن ہوتا تھا۔ اور دائرے کی شکل میں کم از کم دس بارہ آدمی دسترخوان کے گرد بیٹھ کر ایک ہی برتن میں کھاتے تھے ان میں سے ایک حضرت بھی ہوتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ صبح کو ناشتہ کے ساتھ باسی روٹی اور مرچ کا اچار ہوتا تھا۔ یہی حضرت کا ناشتہ تھا اور یہی تمام مہمانوں کا۔ ایک دفعہ حضرت رہ نے کھانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ہم آپ حضرات کے ہاں جاتے ہیں تو آپ مرغ اور حلوے کھلاتے ہیں اور یہاں باسی روٹی اور مرچ کھانا پڑتی ہے۔ اس پر مولانا احتشام الحسن کاندھلوی جو ان تمام باتوں کے راوی اور محرر ہیں نے فرمایا کہ حضرت باسی روٹی اور اچار۔ مرغ سے زیادہ مزیدار ہے۔

تواضع اور انکساری

انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو شخص بھی اللہ تعالےٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالےٰ اس کو ضرور رفعت و سربلندی عطا فرماتے ہیں"۔ یہی تواضع و انکساری اصل شان عبدیت ہے جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہوگا وہ مجسمۂ تواضع ہوگا اور کبر و غرور سے بالکل مبرّا ہوگا۔ جو عبدیت کے بالکل منافی اور متضاد ہے۔

حضرت مدنی رہ کے متعلق گزشتہ سطور میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی رہ کی تحریر گزر چکی ہے کہ خادم کو مخدوم بنا کر چھوڑتے تھے۔ واقعۃً حضرت مدنی رہ تواضع اور انکساری کا ایک مجسمہ تھے کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور ہمیشہ نشست کے لئے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے ہر ایک چھوٹے بڑے کو "آپ" کے لفظ سے خطاب فرماتے تھے اور ہمیشہ اس انداز سے گفتگو فرماتے تھے کہ گویا "چھوٹا اپنے بڑے" سے گفتگو کر رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز تھا۔ گویا ان کی نظروں میں سب بزرگ تھے اور یہ خورد۔ ہر کام کے لئے خود سبقت کرتے اور ہر محنت و مشقت کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے۔

غایت تواضع اور انکساری کی وجہ سے اپنے مخالفین و معاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور کسی کو برے لفظ سے یاد نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ گورنمنٹ برطانیہ جس کی عداوت و نفرت آپ کی فطرت بن چکی تھی اس کو بھی ہمیشہ "مہربان گورنمنٹ" فرمایا کرتے تھے اگرچہ اس لفظ "مہربان گورنمنٹ" میں پورا طنز ہوتا تھا اور بعد کی تقریر میں گورنمنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیوں کا راز فاش ہوتا تھا۔ حضرت مدنی رہ کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو آپ کا گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا تھا۔ اور آپ ہر ایک کے سردار اور سرتاج بنے ہوئے تھے۔

اس انتہائی خاکساری کے باوجود حضرت مدنی رہ وقار و تمکنت کا کوہ طور یا کوہ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا

ہیبت و جلال چہرے پر عیاں تھا۔ باوجودیکہ حضرت مدنی رہ ہنس ہنس کر باتیں فرمایا کرتے تھے۔ مگر مخاطب کا دل اندر سے لرزتا رہتا تھا اور بمشکل بات کی جاسکتی تھی۔ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی فرماتے ہیں۔ یہ میرا حال تھا جو اپنی نالائقی کی وجہ سے تمام بزرگوں سے بات کرنے کا عادی تھا حتی کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی بے دھڑک جو جی میں آتا تھا کہہ دیتا تھا۔ اور حضرت تھانوی رہ کی جانب سے کبھی کسی گرانی یا ناگواری کا کبھی اظہار نہیں ہوا۔

میں نے اکثر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ سُنا ہے کہ "حضرت مدنی رہ سے ڈر لگتا ہے"۔ بار ہا ایسا ہوا کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کسی خاص مقصد اور بات کے لئے دیوبند گئے وہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلف ملاقات ہوئی اور ہنس ہنس کر باتیں ہوئیں۔ مگر مقصد کی بات زبان پر نہ آئی۔ اور واپسی کے بعد فرمایا۔ "حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی"۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ لباس کے معاملہ میں سخت گاڑھا کھدر پہننے میں بہت متشدد تھے۔ اور ہمیشہ ساری عمر کھدر پہنا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی اشیاء استعمال دیسی استعمال کرتے تھے اور ملنے جلنے والوں سے بھی یہی پسند کرتے تھے کہ وہ دیسی کپڑا پہنیں اور دیسی اشیاء استعمال کریں۔ اس کی ایک وجہ تو یورپین ممالک سے درآمد اشیاء سے نفرت مقصود تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت کا منشا تھا کہ ہمارے معاشرہ میں سادگی اور بے تکلفی آجائے تاکہ زینت ولباس پر جو ہمارے ہاں بے اندازہ اخراجات اٹھ جاتے ہیں وہ کم ہوں۔ اور اس دیسی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی میت کو لٹھے وغیرہ کا کفن دیا جاتا تو اس کا جنازہ پڑھ تو لیتے تھے مگر پڑھاتے نہیں تھے۔

بعض جلیل القدر مشائخ طریقت محض اس لئے گاڑھا کھدر پہننے کا اہتمام فرماتے تھے کہ شاید حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو جائے اور ولائتی کپڑے سے ان کو گرانی اور ناگواری ہو۔

ایثار و قربانی

ایثار و قربانی بھی ایک اعلیٰ انسانی جوہر ہے جس سے انسانیت پروان چڑھتی ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں مومنین قانتین کا وصف بیان کیا گیا ہے۔

"ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ"

"اور ایثار کرتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر اگرچہ خود ان کے لئے تنگی ہو"

حضرت مدنی رہ بھی ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے۔ ان طلباء کے اخراجات کی خود کفالت فرماتے تھے۔ جن کا دارالعلوم سے وظیفہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اور آپ ملنے والوں کی ضرورتوں کو خفیہ طور پر پوری فرماتے تھے۔ بار ہا یہ معلوم ہوا کہ اپنے رفقاء سفر کے تمام اخراجات حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خود برداشت فرماتے تھے۔ سفروں میں اخراجات کے وقت سب سے پہلے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ جیب میں جاتا تھا اور بٹوا نکال کر زبردستی جملہ اخراجات وہ اپنے پاس سے پورے فرماتے تھے اور اپنی ضرورتوں کو اپنے پاس سے پورا فرماتے تھے اور اس معاملہ میں بہت

سختی برتتے تھے۔ اور جو ہدایا دوسروں کی طرف سے آتے تھے بے دریغ ان کو رفقاء پر خرچ کرتے تھے۔

فیاضی و مہمان نوازی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے" (مسلم شریف)

پس معلوم ہوا کہ مہمان کا اعزاز و اکرام ایمان کا خاصہ ہے اور یہی انسانیت و شرافت کا اصلی تقاضا ہے۔ کہ اپنے پاس آنے والے کا ہر طرح اعزاز و اکرام کیا جائے اور فیاضی و فراخ دلی برتی جائے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اپنی آپ ہی مثال تھے جس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جن کو کبھی حضرت کے آستانہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ روزانہ کم و بیش چالیس مہمان حضرت کے دسترخوان پر ہوتے تھے جو مختلف خیالات اور مختلف اطراف کے ہوتے تھے۔ حضرت ہر ایک کا پورا پورا اعزاز و اکرام فرماتے تھے اور نہایت فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ کھانا اگرچہ ایک ہی ہوتا تھا مگر لذیذ اور مزیدار ہوتا تھا۔ حضرت دونوں وقت کا کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے اور خود بھی وہی کھاتے جو مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ کھانے میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ جو ہوتا تھا سب کے لئے یکساں ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص چیز پکوائی جاتی تو سب کے لئے پکوائی جاتی تھی۔

رمضان المبارک میں چونکہ مہمانوں کی تعداد سینکڑوں ہوتی اور سب کے لئے دودھ کی کسی چیز کا انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے حضرت خود بھی دودھ استعمال نہیں فرماتے تھے اور متعلقین کے اصرار پر فرما دیتے۔ اتنا کہاں ہے جو سب کے لئے دودھ کا بندوبست کیا جائے۔ اگر مہمان بے وقت بھی پہنچ جاتے تھے تو اسی وقت ان کے لئے کھانا تیار ہوتا تھا اور کبھی مہمانوں کی کثرت سے گھبراتے یا کتراتے نہیں تھے۔ بلکہ کبھی کوئی واقف دوسری جگہ ٹھہر جاتا تھا تو گرانی ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی ناواقف بلکہ مخالف بھی دسترخوان پر بیٹھ جاتا تھا تو اس کے ساتھ بھی پوری بشاشت کا اظہار ہوتا تھا۔

خود کم کھاتے تھے اور دوسروں کو زیادہ کھلاتے تھے اور بعد میں بچے ہوئے سالن کی پلیٹوں کو خود اپنی انگلیوں سے چاٹتے تھے اور دسترخوان پر گرے ہوئے ریزے اٹھا کر تناول فرما لیتے تھے۔ خود آہستہ آہستہ کھاتے تھے تاکہ سب مہمان خوب پیٹ بھر کر کھالیں۔ اور جب سب کھا چکتے تو فرماتے کہ میں ابھی تک کھا رہا ہوں اور تم پہلے ہی فارغ ہو گئے۔ یہ تو اچھا نہیں ہے باصرار اور کھلاتے تھے۔ غرضیکہ اس بارے میں آپ، اپنی مثال آپ تھے۔

اس بارے میں ہندوستان کے مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

" ۱۹۴۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کو مسلمان سوال کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا

اور مجھے اس کام پر مقرر کیا گیا کہ اس کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں۔ میں اس مواد کی فراہمی میں دیو بند بھی حاضر ہوا۔ محراب و منبر کے جلوے تو میں نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے۔ "خلوت" کے مطالعہ کا موقع اب ملا۔ جنگ عظیم کے بعد اشیاء کی گرانی، مولانا کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور، مگر اس سے حضرت مولانا کی مہمان نوازی میں کیا فرق آ سکتا تھا۔ اور جب مجھ، جیسے انجان اور بے دین کو مولانا نے باصرار اپنے مکان میں ٹھہرایا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سیاست رشتہ داری، دوستی، اور درس و تدریس کے واسطے سے مہمانوں کا کیا ہجوم رہتا ہوگا۔ جب میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے بڑے کمرے میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا۔

دین داروں کے معمولات سے میں یوں بھی گھبراتا ہوں۔ مگر پہلے دو دن میرے اوپر واقعی بڑے سخت گزرے۔ نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا۔ مگر مولانا کے ہاں تقریباً سبھی قائم اللیل تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ عشاء کی نماز کے بعد میں بمشکل گھنٹے بھر سویا ہوں گا کہ کسی کونے سے تکبیر بالجہر بلند ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح و وظیفہ میں۔ تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لئے اٹھ بیٹھے۔ پھر فجر سے پہلے اور بعد قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہوئی۔ تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو یا نہ ہو، مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چلا ہے۔ حضرت نے تبسم فرمایا۔ اور تیسرے دن سے مجھے ایک علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا۔ یعنی اب میں آزادی سے اپنے کمرہ میں رہتا تھا جو مجھے اپنے گھر میں حاصل تھی۔ چنانچہ میں نے مواد کی فراہمی کا وہ کام جس کے لئے میں حاضر ہوا تھا شروع کیا۔ اور اس سلسلے میں مجھے دیو بند کی مجاہدانہ تاریخ کے بہت سے نئے واقعات کا علم ہوا۔

دیو بند کے قیام کی غالباً چوتھی شام تھی کہ میں اپنے بستر پر دراز تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ گھومنے پھرنے کی وجہ سے کچھ تھکن زیادہ تھی۔ چنانچہ لیمپ گل کیا اور سونے لگا۔ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ مجھے کچھ غنودگی سی تھی کہ میں نے ایک ہاتھ اپنے ٹخنے پر محسوس کیا اور پھر دونوں ہاتھوں سے کسی نے میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا بہ نفس نفیس اس گنہگار کے پاؤں دبانے میں مصروف ہیں۔ میری بدحواسی اور شرمندگی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میں نے پاؤں جلد جلد سکوڑے اور بڑے ادب اور لجاجت سے

حضرت کو روکا۔ مولانا نے اس پر حسرت سے فرمایا۔ آپ مجھے اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ جیسے مہمان کی خدمت کر سکوں۔ مجھ پر اس ارشاد کے بعد جو گزری میرے لئے اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ بھی ہے کہ میں بارہ برس بعد آج پہلی بار اس واقعہ کا انکشاف کر رہا ہوں۔ اور اگر حضرت زندہ ہوتے تو اس راز کو فاش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ان کی فراخ دلی اور ان کے اخلاق کا یہ ادنیٰ نمونہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب بڑے تعجب اور حیرانی سے بارہ برس بعد اس کا انکشاف کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت نے سوتے میں ان کو دبایا۔ اور ان کو معلوم بھی نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت نے جسم دبانے کی باقاعدہ ایک استاد سے مشق بہم پہنچائی تھی کہ اس طرح عمدگی کے ساتھ سوئے ہوئے شخص کو دبایا جائے کہ اس کی آنکھ نہ کھلے۔

احتیاط و تقویٰ

مولانا عوام اور پبلک کے مال سے ضرورت اور واجبی مصارف کے علاوہ اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ مولانا کی کفایت شعاری اور احتیاط کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مولانا کلکتہ میں ہوتے ہیں۔ انہیں ایک جلسہ میں لمبے سفر کی دعوت دی جاتی ہے۔ دوسرے مدعوین کی طرح مولانا کے لئے سیکنڈ کلاس کے کرایہ۔ ایک خادم ساتھ لانے اور کچھ زائد خرچ کے لئے روپیہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۶ گھنٹے کا سفر ہے مولانا تنہا آتے ہیں۔ کوئی خادم ساتھ نہیں ہوتا۔ تھرڈ کلاس سے سفر کرتے ہیں اور راستہ میں ناشتہ وغیرہ میں کل سات آنے خرچ ہوتے ہیں۔ جلسہ میں پہنچ کر ناظم جلسہ کا دفتر معلوم کرتے ہیں اور وہاں پہنچ کر اپنے اخراجات کو ایک کاغذ پر لکھ کر بقیہ روپیہ جمع کرانے کے لئے رکھ آتے ہیں۔ اور جب واپسی کا وقت آتا ہے تو منتظمین جلسہ سو روپیہ بطور رخصتانہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا انکار فرماتے ہیں اور اتنا ہی لینا گوارا کرتے ہیں جتنا کہ آنے میں خرچ ہوا تھا۔ جب اور زیادہ مجبور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی کی منظوری اور خوشی سے پیش کیا جا رہا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ کمیٹی کے کتنے ممبر ہیں؛ جواب دیا جاتا ہے سات ممبر ہیں۔ مولانا پھر پوچھتے ہیں کہ اس جلسہ میں جو روپیہ خرچ ہو رہا ہے وہ آپ ہی لوگوں کا ہے یا عام چندے سے ہے؛ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ عام چندے سے ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پھر آپ حضرات کو اس طرح صرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ لوگ عرض کرتے ہیں کہ پبلک نے ہم کو اختیار دیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ پبلک نے آپ کو یہ سمجھ کر اختیار دیا ہے کہ آپ کفایت شعاری کے ساتھ واجبی خرچ کریں گے۔ آپ اس بے دردی سے خرچ کرنے کے مختار و مجاز نہیں ہیں۔ لوگوں کے اس قیل و قال اور پیہم اصرار کے باوجود مولانا نے واجبی خرچ کے علاوہ نہ لیا۔

آج کی دنیا میں ایسے لیڈر اور عالم مشکل ہی سے ملیں گے جو عوام اور پبلک کے سرمایہ میں اس طرح احتیاط

کرتے ہوں اور لا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل پر عمل کرتے ہوں۔ آج کل اچھے اچھے کو ایسے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بلکہ اگر اعتراض کا ڈر ہوتا ہے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی تاویل ڈھونڈ رکھی ہوتی ہے۔ کہیں پانے کی امید ہوتی ہے تو کسی نہ کسی طرح اشارہ و کنایہ ہی سے اظہار طلب بھی کر دیتے ہیں۔ مگر مولانا ہیں کہ ایسے مواقع سے نہ صرف فائدہ نہیں اٹھاتے، نہ صرف اپنے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے بلکہ اس کی شناعت و کراہت کا بھی اظہار فرما دیتے ہیں۔

ایک بار مولانا مقروض ہو جاتے ہیں۔ پاس ادائیگی کے لئے رقم نہیں ہوتی۔ کچھ دوستوں اور عقیدت مندوں کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ حیدرآباد میں نواب فخر یار جنگ معتمد محکمہ فنانس اور چند با اختیار حکام سے مل کر خیرات و ثواب کی مد سے پانچ ہزار روپیہ دلانا چاہتے ہیں۔ مولانا کو اس بارے میں جب اطلاع ملتی ہے تو آپ صاف کہہ دیتے ہیں کہ مجھے اس ذلت کے ساتھ ایسی رقم کا لینا منظور نہیں ہے۔

قناعت و استغناء حضرت مولانا کو برٹش حکومت ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے لئے کثیر مشاہرہ پر (اس وقت کے پانچ صد روپے) ماہوار پر بلاتی ہے مگر آپ اسے قبول نہیں کرتے۔

حکومت مصر جامع ازہر میں شیخ الحدیث کی جگہ دے کر ایک ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ۔ مکان۔ موٹر۔ اور سال میں ایک دفعہ ہندوستان آنے جانے کا کرایہ دینے کی پیش کش کرتی ہے۔ مگر مولانا وہاں تشریف لے جانے سے صاف انکار فرما دیتے ہیں اور دیوبند کی معمولی سی تنخواہ پر قناعت کرتے ہیں۔

مولانا رہ کے پاس مال آتا تو بہت جلد مستحقین کے پاس پہنچ جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی زندگی میں کبھی اتنا مال جمع نہ ہوا کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہو۔

مولانا رہ کے زہد و تقوٰے کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ مولانا دارالعلوم کی مدتوں سے خدمت کرتے تھے۔ ۵۰ سال کی طویل مدت دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں گزار دی۔ مگر ان دنوں کے علاوہ جن میں پڑھاتے بقیہ ایام کی تنخواہ نہ لیتے اگرچہ مدرسہ ہی کے سلسلہ میں کہیں آنا جانا ہوتا۔ یا مدرسہ ہی کی ضرورت سے کہیں سفر کرنا ہوتا۔ مگر پھر ایام تدریس کے علاوہ ان دنوں کی بھی تنخواہ نہ لیتے۔ مرض الوفات میں ایک مہینہ کی رخصت بیماری وغیرہ اور اس کے علاوہ کچھ چھٹیاں جو قانوناً حق تھا اور نہیں لی تھیں وہ بیماری میں شمار ہوئیں۔ ان سب دنوں کی تنخواہ جو ایک ہزار روپے سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ مدرسہ نے بھیجی۔ تو آپ نے یہ فرما کر واپس کر دی کہ جب میں نے پڑھایا نہیں ہے تو، تنخواہ کیسی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مہتمم صاحب قبلہ گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ حضرت رہ کا زہد و تقوٰے اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا۔ مگر اس میں شرعاً کوئی سقم نہیں ہے اگر آپ فرما دیں تو وہ رقم آپ کی خدمت

میں پیش کر دوں ؟

خالہ صاحبہ نے عرض کیا جس چیز کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پسند نہیں فرمایا اس کو میں کس طرح پسند کر سکتی ہوں آپ کا بہت بہت شکریہ بس آپ کی دعا کی ضرورت ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

حضرت کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں بڑے نڈر واقع ہوئے تھے۔ یہ ان کا ایک ایسا وصف تھا کہ علماء کرام کی جماعت میں بڑے بڑے ارباب جبہ و دستار ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیا مجال کہ داڑھی منڈا کر کوئی ان کے سامنے آجائے۔ کس کی جرأت کہ سر پر انگریزی طرز کے بال ہوں اور ننگے سر حضرت کے روبرو پہنچ جائے۔ اور ان چیزوں پر اس لئے زیادہ شدت تھی کہ لوگ سنت نبویہ کا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ داڑھی منڈانا۔ سر پر انگریزی بال رکھنا۔ اور پھر اس پر فخر کرنا۔ اور متشرع لوگوں کو حقیر جاننا گویا سنت نبویہ کی تحقیر و توہین ہی نہیں اپنے آپ کو کفر کی سرحدوں پر لا کھڑا کرنا ہے۔ بدیں وجہ حضرت ایسے لوگوں پر سخت ناراض ہوتے تھے اور ان باتوں پر ان کی گرفت سے نہ رؤساء بچ سکتے تھے۔ نہ ممتاز طبقہ۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی اس ادا کے نتیجہ میں ہزارہا چہروں پر داڑھیاں نظر آنے لگیں۔ اور ہزارہا سروں سے انگریز پرستی کا بوجھ اتر گیا۔ معروف کی اشاعت اور منکرات سے اس شدت سے روکنے والا جماعت علماء میں اب کاہے کو پیدا ہوگا۔ باطل پرست جماعتوں کا مقابلہ جس پامردی سے کرتے اور اس راہ میں ہر سب و شتم۔ طعنہ و تعریض کو جس خندہ پیشانی سے قبول کرتے۔ یقیناً اس کے اجر مضاعف سے عالم اخروی میں ان کا دامن مراد بھر دیا جائے گا۔ عمل و ہمت کی ایک چٹان تھی جس نے کبھی جھکنا نہ جانا۔ عزم و بلند حوصلگی کا ایک کوہ گراں تھا۔ جس کو حوادث روزگار اور انقلابات زمانہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکتے تھے۔

کون اس باغ سے اے باد صبا جاتا ہے
رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب قلم

حضرت مدنی رہ دنیائے علم کے آفتاب تھے۔ جہاں اپنے چمنستان روحانیت کو تازگی بخشی اور علم کے سبزہ زاروں کو سینچا۔ سیاسی دنیا کو بھی صبر و استقلال، متانت فکر۔ اصابت رائے۔ یقین محکم اور جہد مسلسل کا سبق دیا۔ سیاست کو ایک بلند کردار اور پاکیزگی دی۔ مذہب کو ایک نیا جوش اور نئی امنگ دی۔ زندگی کو عظمت اور وقار عطا کیا۔ مولانا کی مقدس زندگی کے بھی وہ پہلو ہیں جن پر دنیا کی نگاہ پڑتی ہے۔ لیکن آپ متبحر عالم، ممتاز سیاست دان۔ قومی رہنما اور روحانی دنیا کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ "صاحب قلم" بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے جو علمی مذہبی۔ روحانی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ مولانا رہ کے قریب رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حضرت مولانا رہ کے بے پناہ سیاسی و مذہبی، مشاغل اس بات کی اجازت ہی نہ دیتے تھے کہ وہ کوئی قلمی کام کریں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات چند سے زیادہ نہیں۔ اور یہ تصنیفات بھی اس لئے وجود میں نہیں آئیں کہ لوگ انہیں پڑھیں اور تعریف کریں۔ بلکہ قلم اس وقت ہاتھ میں لیا گیا جب اس کی اشد ضرورت محسوس کی گئی۔ اور لوگوں نے مسلسل اصرار اور بار بار تقاضے کئے۔ تصنیفات میں "اسیر مالٹا"۔ "متحدہ قومیت"۔ "نقش حیات"۔ "الشہاب الثاقب"۔ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ رسائل اور خطبات ہیں۔

"اسیر مالٹا" غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی۔ جب آپ کا قلم اور آپ جوان تھے۔ اس میں آپ کا قلم ایک طرف شمع آزادی کے پروانوں کو جد وجہد کی دعوت دے رہا ہے۔ اور دوسری طرف اس کی نوک سامراجیت کے قلب میں پیوست ہو رہی ہے۔ "اسیر مالٹا" میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مدرس اور انقلابیوں کے امام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ تعالے علیہ کی فداکارانہ زندگی کا ایک ایک گوشہ نمایاں کیا گیا ہے۔ "اسیر مالٹا" کے شروع کے چند اوراق میں بہت دل کش اور پسندیدہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کا گلدستہ اس قابل ہے کہ بار بار دیکھا جائے۔ اس کے لفظ لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے۔ اس کے جملے جملے میں محبت وعقیدت کی پیچ وتاب کھاتی ہوئی لہریں۔ جذبات کا گرجتا ہوا بادل اور انقلابات کی گونج ہے۔ اس کے نقطے نقطے میں احساسات کی دبی ہوئی چنگاریاں اور اس کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی غور وفکر کی دعوت۔ صبر واستقلال کا درس۔ یقین محکم اور عمل پیہم کی تلقین۔ تشکیل سیرت اور تعمیر حیات کا ایمانی پہلو بھی ہے مثلاً

> "اس نے بحر امدادی سے فیوض حاصل کئے۔ لیکن ڈکار نہ لی۔ اس نے قاسمی نہریں پی لیں مگر ہضم کر گیا۔ اس نے رشیدی گھٹاؤں اور دھواں دار بادلوں کو چوس لیا مگر بے اختیار نہ ہوا۔ دعوے نہ کیا۔ شطحیات نہ سنائیں۔ استقامت سے نہ ہٹا۔ شریعت کو نہ چھوڑا۔ عشق میں گھل کر لکڑی ہو گیا مگر دم نہ مارا۔ ؎
>
> در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
> ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن"

یہ انداز شروع کے چند اوراق میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کا قلم حالات وکوائف اور تجربات ومشاہدات کی اتھاہ گہرائیوں میں بہت احتیاط کے ساتھ اتر گیا ہے اور مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روانگی حجاز سے لے کر اسارت مالٹا۔ اور ہندوستان کی واپسی تک تسلسل واقعات کی ایسی تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ہندوستان، عرب ممالک۔ ترکی کی مظلومیت۔ اور اتحادیوں کے روباہی کرشمے اور ظالمانہ روپ کھل کر سامنے آگئے ہیں۔

"نقشِ حیات": یوں تو مولانا کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن اس میں تجربات کے علاوہ سیاسی معلومات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ اس میں آپ کا خاص اسلوب نگارش ہے جو بہت ہی سنجیدہ۔ بہت ہی جامع اور بہت ہی پاکیزہ ہے۔ آپ کا قلم بس وہیں تک چلتا ہے جتنا اسے چلنا چاہیئے۔ نہ اتنی تفصیلات وجزئیات ہیں کہ پڑھتے پڑھتے قاری کا جی اکتا جائے۔ اور نہ اتنا اختصار کہ مطلب ہی معلوم نہ ہو۔ جس بات کی تفصیل ضروری ہوتی ہے اسے پھیلا کر لکھتے ہیں اور جہاں اختصار ہونا چاہیئے وہاں مختصر ہی لکھتے ہیں۔

"نقشِ حیات" میں کثرت سے انگریزی اور اردو کی تاریخی کتابوں سے حوالجات پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ معقولات کے علاوہ فن تاریخ پر بھی عبور ہے۔ جب کوئی بات لکھتے ہیں بے دلیل نہیں لکھتے۔ مذہبی اور علمی مضامین ہوں تو ان میں جابجا آیات واحادیث پیش کی جاتی ہیں۔ اور تاریخی حالات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے تو تاریخی کتابوں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں یقینی کیفیت پیدا ہو جائے اور نتیجہ پر پہنچ کر کسی قسم کا شک وتردد باقی نہ رہے۔ ان کے سامنے ایک متعین اور کشادہ راہ کھول دی جائے۔

"نقشِ حیات" میں زیادہ تر انگریزوں کی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا۔ اس کی دولت لوٹی۔ اور پھر اپنے احسانات بھی جتائے۔ اور ہر طرح اپنے عیب وجرم چھپانے کی کوشش کی۔ مولانا نے ان کو ان ہی کی تحریروں سے بے نقاب کر دیا اور ان کی تمام قلعی کھول دی ہے اور یہ بات ثابت کر دی کہ انگریز ظالم تھے۔ انہوں نے ہندوستان کا خون چوسنے میں پورا ثبوت دیا۔

"نقشِ حیات" کوئی ناول نہیں۔ افسانوں کا مجموعہ نہیں۔ شعر و ادب کی کوئی کتاب نہیں۔ بلکہ ایک ایسے انسان کی خود نوشت سوانح ہے۔ جو دارالعلوم دیو بند جیسے عظیم دینی مدرسہ کے صدر مدرس و شیخ الحدیث ہے جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا بہادر سالار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت اور سنت نبویہ کا محب صادق ہے اسلام کے دشمن نمبر ایک "انگریز" کا ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا بھر میں سب سے بڑا مخالف ہے۔ مصنف کی ان تمام صفات وخصوصیات کو سامنے رکھ کر کتاب پڑھیں تو آپ کتاب کو ایک قیمتی دستاویز خیال کریں گے۔ ایک شیخ طریقت اور عالم باعمل کس طرح اپنی سوانح لکھ سکتا ہے۔ نتیجۃً کتاب کی دونوں جلدیں گذشتہ ڈیڑھ صدی کے حالات تحریکاتِ آزادی اور انگریزوں کی ہندوستان اور دنیا میں دسیسہ کاریوں کی ایک ایسی داستان ہے جس کو پڑھنے کے بعد قاری بہت کچھ حاصل کرتا ہے۔ اندازِ بیان سادہ اور بے تکلف ہے مثلاً۔

"لمبا اوقات میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھاتا ہوتا تھا۔ اور آدمی آ آ کر والد صاحب بلا رہے ہیں۔ طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اٹھانے

والا مزدور نہیں آیا۔ تم اس کام کو انجام دو۔ بہ مجبوری تمام دن یہ کام کرنا پڑتا۔ اور تمام اسباق کو معطل کرنا پڑتا۔ لہٰذا اوقات ایک ایک دو دو ہفتہ اسباق کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنے پڑتے "۔　(ص ۱۷، ج ۱)

اتنی سی مختصر تحریر میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک نقشہ ہی کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن اخلاص وانکسار کے ساتھ زندگی کی یہی وہ کٹھن منزل ہوتی ہے جسے عبور کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ چند سطروں نے ہمیں بتا دیا کہ انہیں کتابوں سے فطری تعلق اور دلی رابطہ تھا۔ لیکن والد صاحب کا حکم پہنچا۔ فوراً اس کی تعمیل کی۔ ایک طرف اطاعت والدین کی اور دوسری طرف سرکار دو عالم نبی کریم صلی اللہ علیہ کی سنت بھی ادا کی۔

مولانا کی تحریروں میں پاکیزگی، ستھرائی کے علاوہ یقین و عزم کی کیفیت ہر جگہ ملتی ہے۔ کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جہاں بزدلی۔ خوف اور تذبذب کا احساس ہو۔ ہر لفظ میں ٹھہراؤ ہے۔ ہر جملے میں وقار ہے ہر سطر میں، ایک تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صاحب طرز ادیب یا انشاء پرداز ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریر میں ایک انفرادیت ضرور جھلکتی ہے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کی بجائے انہوں نے اپنے مقصد اور موضوع پر ٹھوس۔ باوزن اور اصل باتیں پیش کی ہیں۔ جن سے ان کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والا فکر و عمل کا جذبہ لے کر اٹھے۔

مکتوبات شیخ الاسلام "اسیر مالٹا"۔ "نقش حیات"۔ "متحدہ قومیت"۔ "الشہاب الثاقب"۔ اور دیگر چھوٹے چھوٹے رسائل کے علاوہ آپ کے مکتوبات کو جمع کیا گیا ہے۔ اور یہ خدمت ملک کے نامور عالم مولانا نجم الدین اصلاحی نے "مکتوبات شیخ الاسلام" کے نام سے انجام دی ہے۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت والا مختلف خطوط لکھنے والوں کے جواب میں تحریر فرماتے رہے۔ مکتوبات فقہی، علمی، تربیتی اور سیاسی ہیں۔ یہ علم و معلومات کا ایک ذخیرہ ہیں۔ جن میں حضرت کی مقدس شخصیت اور شخصیت کا بلند اور پاکیزہ کردار کھل کر سامنے آگیا ہے۔ یہ مکتوبات رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

مکتوبات کا کونسا اسلوب پسندیدہ ہے یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی بے تکلفی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا ہے۔ تو کسی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط "غبار خاطر" کو بار بار اس وجہ سے پڑھا کہ ان میں ادب کی چاشنی۔ الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی خوب صورت ترتیب ہے۔ اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ معلومات کا دریا موجزن ہے۔ لیکن "مکتوبات شیخ الاسلام" کو اس لئے پسند کیا جا سکتا ہے کہ ان میں خالص علمی۔ اخلاقی اور روحانی باتیں ہیں۔ ایسے خطوط جن میں صرف زبان و بیان کی خوبی ہو۔ لیکن کوئی بنیادی فکری و عملی افادیت نہ ہو۔ ان کے مطالعے سے قاری حظ تو اٹھا سکتا ہے مگر اپنے فکر و عمل کے لئے کوئی سرمایہ حاصل

نہیں ہو سکتا۔ مگر مولانا کے خطوط پڑھ کر ہم بہت کچھ حاصل کر پاتے ہیں۔ ان خطوط کے متعلق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ مدیر دار العلوم دیوبند کی تحریر سے جو بطور مقدمہ مکتوبات کے شروع میں ہے۔ ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں۔

" ان مکاتیب اور ان کے مکنون علوم و احوال کی فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے اس کی جامعیت کا اندازہ لگا لینا مشکل نہیں رہتا جو حضرت ممدوح کی ذات میں ودیعت کی گئی ہے اور جو تمام ہی دینی طبقوں کے لئے یکساں شفا بخش ہے۔ حال و قال والے حضرات ہوں، یا براہین و استدلال والے ہوں۔ طالبانِ مسائل ہوں یا عاشقانِ دلائل۔ سب ہی کے لئے اس مختصر مگر جامع ذخیرہ میں سامانِ سیرابی موجود ہے۔ ان جامع ہدایات سے اگر ایک طرف طریقت و معرفت کے مسائل حل ہوتے ہیں تو دوسری طرف شریعت کے حکمیات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور جہاں شریعت و طریقت کے مقامات کھلتے ہیں۔ وہیں سیاست و ادارات اور قومی معاملات کے دقائق بھی واشگاف ہوتے ہیں۔ غرضیکہ بیک وقت شریعت و طریقت اور سیاست کے دقیق اور حیات بخش نکتے اس طرح زیبِ قرطاس ہو گئے ہیں کہ ایک جویائے حقیقت و معرفت۔ ایک متلاشی احوال و طریقت اور طلب گارِ شریعت و سیاست کے لئے یکساں شفاء اور سکون و روح کا سامان بہم پہنچا سکتے ہیں "

کہا جاتا ہے کہ مکاتیب شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جس کی شخصیت معلوم کرنا ہو۔ اس کے خطوط دیکھے جائیں۔ خطوط کے آئینہ میں شخصیت کی تصویر اپنے اصلی خد و خال میں صاف جلوہ گر نظر آتی ہے۔ "مکتوبات شیخ الاسلام" کے مطالعے کے بعد ہر شخص حضرت مولانا کی شخصیت سے متعارف ہو جائے گا اور اسے مولانا کی عظمت۔ پاکیزگی۔ اور علو ہمتی کا قائل ہونا پڑے گا۔ اور ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے بہت بہت مصروف۔ نہایت مخلص اور بلند کردار کے حامل تھے۔ مکتوبات، زبان کے اعتبار سے بوجھل ضرور ہیں اور ہونا بھی چاہئیں۔ کیونکہ جن مکاتیب سے تعلیم و ہدایت کا کام لیا جائے۔ علمی۔ فقہی۔ سیاسی اور باطنی مسائل کو سلجھایا جائے۔ ان میں عربی کے مخصوص الفاظ اور مصطلحات کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

مکتوبات کی دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کے باوجود نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت کے تمام مکتوبات ان دو جلدوں میں آ گئے ہیں۔ مرتب کو جو مکاتیب میسر آ گئے انہی کو انہوں نے جمع کر دیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کی طرح "مکتوبات شیخ الاسلام" کی حیثیت بھی بہت بلند ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ رشد و ہدایت کے سلسلے میں ان دونوں حضرات نے مکتوبات کے ذریعہ جو

کام سرانجام دیا ہے۔ تاریخ میں بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں تو تیسری شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی ہے۔ چوتھی مثال شاید پوری تاریخ میں نہ ملے۔

تدابیر صحت اور مدنی

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ صحت اور حفظان صحت کے اصولوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے کیونکہ ایک تندرست جسم میں دل و دماغ اور اعصاب بھی تندرست ہوں گے۔ اور تندرست انسان اپنے متعلقہ کاموں کو حسن و خوبی اور چستی و چالاکی کے ساتھ سرانجام دے گا۔ اور پھر ایک مسلمان کو تو ہمیشہ جہاد اور موت شہادت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ علمی اور عملی جہاد کے لئے جسمانی صحت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت مدنی نے دارالعلوم میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ تین شعبہ جات تعلیم نئے کھلوائے اور ان کے لئے فوراً ہی معلمین کا تقرر عمل میں لایا گیا۔

(۱) انگلش تعلیم کیلئے ایک معلم۔ (۲) ہندی تعلیم کے لئے ایک معلم۔ (۳) جسمانی ورزش اور تدابیر صحت کے لئے تیسرا معلم مقرر کیا گیا۔ جسمانی ورزش اور تدابیر صحت کے اس نگران کو استاد فن کہا جاتا تھا۔ اس شعبہ کے استاد محمد ظہیر ظفر نگری مقرر ہوئے۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ کھلے میدان میں اور تازہ ہوا میں ورزش کے اوقات صبح بعد نماز فجر اور شام بعد نماز عصر مقرر ہوئے تھے۔

ایک خط میں مولانا ایسی ہی چیزوں پر زور دے رہے ہیں۔ وہ ملاحظہ کیجئے۔

"میرے عنایت فرما بزرگو! ہم کمزور ہیں ہم میں اتفاق نہیں۔ ہم ہتھیار نہیں رکھتے۔ ہم مال نہیں رکھتے۔ ہمارا دشمن قوی ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کا سامان ہے۔ ہم کو اسے سیدھا کرنا ہے اور اس سے بدلہ لینا ہے۔ مگر ہمیشہ مقابلہ سمجھ اور طاقت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ یہی طریقہ قرآن۔ حدیث۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ اس لئے ہم کو جب تک ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ یعنی خلافت کی آزادی۔ جزیرۃ العرب۔ ہندوستان کی آزادی۔ پنجاب کی تلافی۔ اس وقت تک ہم کو نہ چین سے بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔

آپ یہ سوال کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

میں کہوں گا کہ آپ پر شرعاً فرض ہے کہ اگر آپ ایک مری ہوئی چیونٹی کی طرح کاٹ سکتے ہیں تو ضرور کاٹ لیجئے۔ اس کے معنی یہ نہ سمجھئے کہ خلاف امن کوئی بات کریں۔ خونریزی کریں۔ نہیں، نہیں۔ صلح اور مشورہ کے ساتھ جس قدر ممکن ہو انقصان پہنچائیں۔ دوسروں کو آمادہ کریں۔ دشمن کو کمزور کریں۔ ان کی تجارت کو گھٹائیں۔ ان کی محبت ان کے خوف کو دلوں سے دور کریں۔ لوگوں میں جرأت پیدا کریں۔ یہ کہنے سے نہ جھینپیں۔ لوگوں کو نرمی اور حکمت سے سمجھائیں۔ شدت کو کام

میں نہ لائیں ۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملائیں ۔ ملے ہوؤں کو نہ توڑیں ۔ اسی دھن میں رات دن لگے رہیں ۔

لوگوں میں سپہ گری پھیلائیں ۔ بانک ۔ پٹہ ۔ لکڑی ۔ تلوار ۔ گھوڑے کی سواری وغیرہ جو ہمارے بزرگوں کا طریقہ تھا ۔ جس کو تمام شریف خاندانوں کے لوگ سیکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے اس کی طرف لوگوں کو ترغیب دیں ۔ کم ازکم روزانہ ایک آدھ گھنٹہ اگر یہ عمل جاری رہے تو ہم خرما و ہم ثواب کا کام دے ۔ جسمانی صحت حاصل ہو ۔ ایک فن ہاتھوں میں رہے ۔ وقت بے وقت کام آئے اور مال و اولاد کی حفاظت ہو ۔"

شیخ الاسلام کے پسندیدہ اشعار

کسی شخصیت کا اندازہ ان اشعار سے بھی ہوتا ہے ۔ جن کو وہ عام طور پر استعمال کرتا ہو ۔ یا بے اختیاری میں اس کے منہ سے نکل جاتے ہوں ۔ یہاں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں جو حضرت مدنی رح کی زبان پر تقریر و تحریر یا مجالس میں بے اختیار آجاتے تھے ۔

نازپروردہ تنعم نہ بردراہ دوست　　عاشقی شیوۂ رنداں بلاکش باشد

○

عشق چوں خام است باشد بستہ ناموس و ننگ

○

عشق میں تیرے کوہ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو　　عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

○

نوبہار است جنوں چاک گریباں مدد ے　　آتش افتادگیاں جنبش داماں مدد ے

○

ہم نے تو اپنا آپ گریباں کیا ہے چاک　　اس کو سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

○

با درد بساز چو دوائے تو منم　　در کس منگر کہ آشنائے تو منم

○

گر کشتہ شوی مگو کہ من کشتہ شدم　　شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

○

یقین سے داں کہ آں شاہ نکو نام　　بدست سر بریدہ مے دہد جام

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　با کریماں کارہا دشوار نیست

○

یابم اورا یا نہ یابم جستجوئے مے کنم　　　بشنود یا نشنود من گفتگوئے مے کنم

○

بجز تو شاہا دگر ندارم بجز دیے تو درے ندارم　　　الیک سعی و بنکت اجو دان سالت بکم سوالی

○

فراق و وصل چہ خواہی رضاء دوست طلب　　　کہ حیف باشد از و غیر ازیں تمنائے

○

جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است　　　جز سر عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

○

سعدی بشوئے لوح دل از نقش غیر حق　　　علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است

○

دنیا و آخرت بگذار حق طلب کن　　　کیں ہر دو لولیاں را من خوب مے شناسم

○

یک لمحہ غافل ازاں شاہ نباشی　　　شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی

○

بڑے ہی درد سے یہ پڑھا کرتے تھے ؎

با با رشتہ سب سے توڑ
با با رشتہ رب سے جوڑ
با با رشتہ حق سے جوڑ

○

ہر آں کہ غافل از وے یک زماں است　　　ہماں دم کافر است اما نہاں است

○

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم　　　در حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

○

ذہبت الذین یعاش فی اکنافہم بقی الذین حیاتہم لاتنفع!

○

(وہ لوگ تو چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گزاری جاتی تھی۔ وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگی کچھ کارآمد نہیں)۔

○

حلیہ شیخ الاسلامؒ

موجودہ دور میں کسی شخصیت کی سوانح یا سیرت تب مکمل سمجھی جاتی ہے جب اس کا فوٹو بھی لگا دیا جائے۔ شرعی نقطۂ نظر سے فوٹو کا جواز نہیں۔ لوگ فوٹو سے اس کے خدوخال دیکھ کر اس کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم یہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا حلیہ بیان کرتے ہیں۔ تاکہ اس کے بارے میں یہ مضمون تشنہ نہ رہے۔

آپ کا رنگ گندمی تھا۔ قد درمیانہ۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم۔ آنکھیں بڑی بڑی سیاہ۔ کشادہ پیشانی۔ گھنی داڑھی۔ ناک نہ زیادہ اٹھی ہوئی اور نہ زیادہ لمبی متوسط اور درمیانی۔ سینہ نہایت چوڑا۔ دوہرا بدن۔ انگلیوں پر گوشت۔

ہمیشہ دینی اصلاح۔ اشاعت علوم اور پست ہمتوں کو ابھارنے اور پسماندہ طبقے کو آگے بڑھانے میں چست و مستعد۔ آپ کی مجلس نہایت باوقار ہوتی تھی۔ لغو اور بے ہودہ بات کوئی نہیں۔ سب خاموش اور مؤدب، وہی شخص بولتا تھا جس کو کچھ پوچھنا ہوتا تھا۔ یا کوئی خاص بات کہنا ہوتی تھی۔ تو وہ اس کا جواب تواضع۔ انکساری اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ حضرت کی طرف سے سنتا تھا۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

ادب الوقار و عز سلطان التقی فھو المھیب ولیس ذا سلطان

(یہاں سنجیدگی اور وقار بھی باادب ہے اور تقوے کا اقتدار مسلط ہے۔ شان و شوکت کچھ بھی نہیں پھر بھی رعب شاہانہ ہے)۔

حضرت کی گھریلو زندگی

بعض لوگ سوسائٹی میں بڑے بارعب اور سیرت و کردار کے مالک ہوتے ہیں مگر ان کی گھریلو زندگی نہایت گھناؤنی اور ناقابل رشک ہوتی ہے۔

ایک شہنشاہ زندگی کے اس میدان میں گدا نظر آتا ہے۔ علماء، فضلاء یہاں پہنچ کر علمی وقار اور فضیلت کی شان سے مبرا نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے جرنیل، امیر کارواں اس دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ اپنے امتیازات و ملبوسات منصبی اتار پھینکتے ہیں۔ سیاسیین و مدبرین یہاں عمومی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر دنیا اور زندگی کی اس کمزور ترین منزل میں جن کا باطن و ظاہر یکساں نظر آتا ہے وہ عارفین و واصلین الی اللہ ہی ہوتے ہیں۔

علمائے ربانی اور مشائخ حقانی کا اندر اور باہر یکساں نظر آتا ہے۔ گھریلو زندگی دیکھو تو باہر کی زندگی سے کھری اور باہر کی زندگی دیکھو تو گھریلو زندگی سے کھری۔ حضرت مدنی رح کی زندگی کا جو خاکہ آپ کو لاکھوں انسانوں کے بحر متواج میں معتقدین و متوسلین کے بے پناہ اور عقیدت مندانہ ہجوم میں۔ کانفرنسوں اور اجلاسوں کی مسند نشینی میں نظر آئے گا۔ بعینہ یہی نقوش گھر کی چار دیواری میں۔ بچوں اور اہل خانہ میں رونق افروز ہوتے ہوئے آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہی بڑائی کا معیار اور عظمت و عزت کا راز ہے۔ حضرت شیخ مدنی رح کی پوری زندگی خلوت و جلوت میں یکساں رہی۔ اور یوں سمجھئے کہ حضرت کن فی الخلوات کما انت فی الجلوات کے مکمل مصداق تھے۔ بحمد اللہ حضرت مدنی کی زندگی کا کوئی گوشہ راز یا پوشیدہ نہیں ہے۔

دیہات کی خواتین کبھی کبھی اہل خانہ کی نظریں بچا کر مطالعہ گاہ تک پہنچ جاتیں اور سامنے کھڑی ہو جاتیں۔ ایسی صورت میں حضرت بہت پریشان اور سراسیمہ ہو جاتے تھے اور اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ اور ملازم لڑکے یا صاحبزادیوں یا بیگم صاحبہ کو آواز دیتے تھے۔ جو فوراً منشار سمجھ جاتی تھیں۔ اور یہ صورت ختم کراتی تھیں۔

گھر میں بھی شریعت کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے اور سب ہی افراد خاندان کو تاکید بلکہ ضرورت کے وقت تنبیہ فرماتے رہتے۔ اس باب میں کسی کی ادنیٰ رعایت ملحوظ نہ تھی۔

ایک خاص الخاص عزیز ضیاء الحسن صاحب فاروقی لکچرار جامعہ ملیہ دہلی کرجو مانٹریال یونیورسٹی کینیڈا سے ڈاکٹر کی ڈگری لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں شادی کر کے داڑھی منڈا دی۔ رشتہ بڑا نازک تھا لیکن حضرت ناراض ہو گئے اور اس وقت تک راضی نہ ہوئے جب تک انہوں نے داڑھی رکھنے کا عہد نہ کر لیا۔ اور پھر دعا کرنے کا وعدہ کیا۔

اعزاء و اقارب میں جو لوگ مفلوک الحال ہوتے ان کی نہایت توجہ سے خبر گیری رکھتے۔ عید بقرہ عید کے موقعہ پر جب کبھی آبائی وطن ٹانڈہ جانا ہوتا تو نماز سے پہلے اعزاء کے ہر ہر گھر میں بنفس نفیس تشریف لے جاتے اور ہر ہر فرد کو عیدی تقسیم کرتے۔ اس دور میں نفسا نفسی میں کئی لوگ حقیقی پوتوں کے سر پر بھی شفقت کا ہاتھ نہیں پھیرتے لیکن حضرت اپنے بھائی کی اولاد اور ان کے پوتوں کی بھی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش و نگرانی کرتے۔ گھر کے افراد سے اپنے کام کے لئے کبھی نہ فرماتے۔ بدن دبوانے۔ سر پر تیل لگوانے۔ یا گرمیوں میں پنکھا کرنے یا سخت سے سخت گرمیوں میں بجلی کا پنکھا کھلوانے کی کبھی فرمائش نہ کرتے۔ اور جیسا باہر کے مریدوں یا شاگردوں سے کوئی کام نہ لیتے۔ ایسا ہی گھر کے افراد سے کام نہ لیتے۔ بلکہ اپنا کام اور دوسروں کا خود کرتے۔ اگر کوئی پنکھا لے کر کھڑا ہو گیا تو منع فرماتے ہوئے کہتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی پنکھا کروانا ثابت ہے؟ اگر کوئی گھر کا فرد کوئی کام کرنے پر بہت زیادہ

اصرار کرتا تو اجازت فرما دیتے۔

ہر متوسل و متعلق سے بچوں کی شادی کے سلسلے میں عجلت کی تاکید فرماتے تھے۔ لیکن اپنے گھر کے بچوں کے سلسلے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیدائش کے دن ہی سے دن گننا شروع کر دیتے تھے۔ جونہی کوئی بچہ حد بلوغ کو پہنچا۔ پھر کوئی حجت کام نہ دیتی تھی۔

صاحبزادہ اسعد میاں اور بھائی مولانا محمد صدیق صاحب کے پوتے سید فرید الوحیدی کی شادیوں کے لئے ۱۹۴۴ء کو نینی جیل سے قاری اصغر علی صاحب معتمد خاص کو تحریر فرمایا کہ میری رہائی کا ہرگز انتظار نہ کیا جائے اور ان کی شادیاں کر دی جائیں (چنانچہ صاحب زادہ اسعد میاں کی شادی فوراً تعمیل ارشاد کے لئے کر دی گئی۔ مولانا فرید الوحیدی لکھتے ہیں کہ۔ میرے متعلق جیل ہی سے میرے بڑے ماموں سید توکل حسین شاہ صاحب وکیل سہارنپور سے نسبت طے کر لی ہے۔ اور اب صرف نکاح باقی ہے۔ چنانچہ رہا ہوتے ہی کہا کہ اس کا نکاح کر دیا جانے۔ میں نے گھر عرض کیا کہ ابھی زیر تعلیم ہوں۔ تو فرمایا اس کو اس بارے میں بولنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ اگر پھر میں نے سنا تو سر توڑ دوں گا۔ اور نکاح میں اتنی جلدی دراصل معاشرہ کی حد سے بڑھی ہوئی خرابی کی طرف دیکھ کر تھا کہ بالغ ہونے کے بعد جلد شادی کر دی جائے۔ اور لڑکیوں کی جلد شادی کا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

اعزاء و اولاد

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۵ بھائی اور ایک بہن تھے۔

(۱)۔ حضرت مولانا محمد صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹے مولانا سید وحید احمد پیدا ہوئے جو اسارت مالٹا میں حضرت کے ساتھ قید رہے اور ان دنوں صغیر سن تھے۔ چنانچہ دونوں حضرات شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ نے ان کی تربیت کی۔ ان کی شادی مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ماموں زاد بہن کی لڑکی سے ہوئی۔ آپ نے ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور تین صاحبزادے، دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا حافظ سید فرید الوحیدی سلمہٗ ہیں جو دار العلوم دیوبند میں مبلغ اور ناظم شعبہ امور خارجہ ہیں۔ عربی کی تکمیل دار العلوم سے کی۔ اور انگریزی میں اعلےٰ تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اچھے مقرر اور انشاء پرداز ہیں۔ متعدد کتابوں کے ابھی سے مصنف ہیں۔

دوسرے لڑکے مولانا حافظ حاجی سید رشید الوحیدی فاضل دیوبند ہیں۔ نیک صالح اور اچھے شاعر اور انشاء پرداز ہیں۔ چھوٹے لڑکے مولانا سید سعید الوحیدی صاحب بھی فاضل دیوبند۔ نہایت ذہین طباع اور تیز ہیں۔ بڑی صاحب زادی کی شادی جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی سے ہوئی جو کینیڈا مانٹریال یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسلامیات پر کئے ہوئے ہیں۔ چھوٹی صاحب زادی کی شادی عنایت اللہ صاحب منظر اعظمی سے ہوئی جو علیگڑھ کے ایم۔ اے ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی میں استاد ہیں۔

(۲) ۔ دوسرے بھائی مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے ۔ جن کی شادی بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری بیوی جو مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی بہن تھیں ۔ سے ہوئی ۔ پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو یہ دوسری شادی بھائی کی بیوہ سے کی ۔ ان پر مدینہ منورہ میں بہت سے مصائب ٹوٹ پڑے جنگ عظیم کا زمانہ تھا ۔ مولانا سید حسین احمد مالٹا میں نظر بند تھے ۔ حضرت کے والد سید حبیب اللہ شاہ اور ان کے دو لڑکے مولانا سید احمد اور مولانا سید محمود کو قید کر کے انڈریا نوپل روانہ کر دیا گیا ۔ ان پریشان کن حالات میں مولانا سید احمد کی بیوی ۔ مولانا سید محمود کی بیوی اور حضرت مدنی کی صاحب زادی ۔ مولانا عبدالحق مدنی کے ساتھ ترکی جانے کے لئے روانہ ہوئیں ۔ اثنائے سفر میں مولانا سید احمد کی بیوی کا انتقال ہو گیا ۔ اور شام ہی میں مولانا سید احمد صاحب کی تیسری شادی ہوئی ۔ ان سے ایک صاحبزادی عائشہ مرحومہ ہوئیں ۔ جن کی شادی حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے صاحبزادے مولانا اسعد سے ہوئی ۔ ان سے ایک لڑکا ہوا تھا ۔ جو مدینہ منورہ مدرسہ علوم شرعیہ میں زیر تعلیم ہے ۔

(۳) ۔ مولانا سید حبیب اللہ شاہ کے تیسرے لڑکے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے ۔ آپ کی پہلی شادی موضع قتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی ۔ اس نکاح سے دو لڑکیاں ہوئیں ۔ ایک صغر سنی میں فوت ہو گئی ۔ اور دوسری کا انتقال شام میں ہوا ۔

حضرت کی دوسری شادی قصبہ چھپرالیوں ضلع مراد آباد میں حکیم قاری غلام احمد صاحب کی بڑی لڑکی سے ہوئی ۔ دو لڑکے اخلاق احمد و اشفاق احمد ہوئے ۔ اول الذکر آٹھ سال کی عمر میں اور مؤخر الذکر ڈیڑھ سال مدینہ منورہ میں فوت ہو گئے ۔ ان بچوں کی والدہ کا انتقال بھی مدینہ منورہ میں ہوا جب کہ حضرت مالٹا میں نظر بند تھے ۔

اس کے بعد تیسری شادی ۔ دوسری اہلیہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی ۔ جن سے دو بچے ہوئے ۔ ایک صاحبزادہ مولانا اسعد مدنی ۔ اور دوسری لڑکی ماجدہ خاتون ۔ جو بچپن میں سلہٹ میں فوت ہو گئی ۔ مولانا اسعد میاں کی شادی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ صاحب زادہ کی دوسری شادی مولانا حمید الدین صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کی صاحب زادی سے ہوئی ۔ صاحب زادہ مولانا اسعد کی والدہ کا انتقال ۱۳۵۵ھ میں دیوبند ہوا ۔ اور ان کی قبر حضرت مدنی کی پائین ہے حضرت کی چوتھی شادی ۔ حضرت کے چچا زاد بھائی سید بشیر الدین کی منجھلی لڑکی سے ہوئی ۔ جن سے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں ۔ بچوں کے نام ارشد اور اسجد ہے ۔ اس طرح سے حضرتؒ کے تین صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں ۔

صاحب زادہ مولانا اسعد میاں فاضل دیوبند ہیں ۔ اور آج کل دار العلوم میں مدرس ہیں ۔ نہایت صالح متقی اور پرہیز گار ہیں ۔ اچھے مقرر اور بہترین مدرس ہیں ۔ مہمان نوازی ۔ ایثار و توکل ۔ تواضع انکسار غرضیکہ جملہ اخلاق میں اپنے والد ماجد کے صحیح جانشین ہیں ۔ حضرت مدنی رح کی وفات کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ

سے دوسرے خلفاء کی موجودگی میں بیعت کرنے کی اجازت دی۔
(۴)۔ حضرت کے تیسرے اور مولانا سید حبیب اللہ شاہ صاحبؒ کے چوتھے لڑکے مولانا سید محمود احمد مدظلہ بقید حیات ہیں اور مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ صدر مجلس اوقاف اور بہت بااثر اور ذی ثروت شخصیت ہیں۔ اس سے قبل گورنر مدینہ کی کیبنٹ کے ممبر اور مختلف سرکاری کمیٹیوں کے ممبر رجسٹرار اور قاضی القضاۃ رہ چکے ہیں۔ اب خرابی صحت اور دیگر مشاغل کی بناء پر تمام سرکاری کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔

مولانا سید محمود صاحب کے ایک صاحب زادے اور تین صاحب زادیاں ہیں۔ صاحب زادہ سید حبیب نہایت دانش مند، جفاکش ہیں۔ اور قابل ہیں۔ عربی کے علاوہ ترکی اور اردو میں مہارت تامہ ہے۔ گورنر مدینہ کی کیبنٹ کے ممبر اور دیگر کئی کمیٹیوں کے ممبر ہیں۔ بعض اوقات گورنر مدینہ کی عدم موجودگی میں گورنر کے فرائض انجام دیتے ہیں۔
(۵)۔ پانچوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے سید جمیل احمد مرحوم تھے۔ جنہوں نے بعمر ۲۵ سال انتقال فرمایا۔ عمر کی اس قلیل مدت میں مرحوم نے ترکی عربی کالج میں تعلیم پائی۔ اور آخری امتحان میں سب سے اول آئے۔ حکومت ترکی نے مخصوص وظیفہ دیا مگر عمر نے وفا نہ کی۔
(۶)۔ چھٹی ہمشیرہ تھیں۔ جن کی شادی سید فاروق احمد ساکن ہنسور۔ ضلع فیض آباد سے ہوئی۔ مدینہ منورہ میں تھے۔ وہاں سے آئے تو بیوی اور دو بچیوں کا مدینہ میں انتقال ہوگیا۔ ان فاروق احمد کے حقیقی ماموں مولانا عزیز احمد قاسمی فاضل دیوبند۔ بی اے جامعہ ملیہ۔ دارالعلوم دیوبند میں شعبہ تبلیغ کے ناظم ہیں۔"
یہ حضرت مدنیؒ کے اخلاف اور صلبی اقلوب کا تذکرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہندی نژاد مولانا سید حبیب اللہ شاہ کی اولاد میں کتنی برکت عطا فرمائی۔ کہ ایک لڑکا شیخ العرب والعجم حسین احمد مدنی ہوا۔ جو اپنے عہد کا غزالی و جنید ہوا۔ اور جس کی یاد سے امام حنبلؒ اور امام مالکؒ کی یاد تازہ ہوئی۔ اور دوسرے لڑکوں میں سے مولانا سید محمود دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے مدینہ منورہ کی سب سے زیادہ بااثر اور ذی وقار شخصیت ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اللّٰهم مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بيدك الخير انك على كل شيء قدير ۔

سفرِ آخرت

۱۹۵۰ء گرمی کا موسم تھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ڈیڑھ ماہ کے دورے پر مدراس کی طرف روانہ ہوئے مگر جمعہ کے دن، اگست کی ابتدائی تاریخوں کو صرف بیس دن بعد لوٹ آئے۔ دارالعلوم والوں اور اعزاء واقارب کو خوشی تھی کہ حضرت قبل از وقت تشریف لے آئے۔ مگر ساتھ ہی حیرانی اور تعجب بھی تھا کہ حضرت

اپنے پروگرام کو کسی بھی واقعہ یا ارضی وسماوی حادثہ کے باعث ملتوی نہیں کرتے تھے۔ بعد میں مولانا اسعد میاں جو رفیق سفر تھے ان سے معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت زیادہ تکلیف ہوگئی تھی کہ آئندہ سفر جاری رکھنا خطرناک تھا۔ زیادہ چلنے یا تقریر کرنے سے سانس پھول جاتا تھا جس سے حضرت مجبور ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ دیو بند میں تشریف آوری کے بعد اس خطرناک بیماری میں بھی باوجود منع کرنے کے آٹھ نو دن سبق پڑھاتے رہے۔ بالآخر مجبور ہو کر سبق بند کیا اور بڑے دکھ کے ساتھ باضابطہ دارالعلوم سے رخصت لے لی۔ اور سہارنپور جا کر ایکسرے کرایا۔ اور سفر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے رائے پور جا کر ملاقات کی۔ ایکسرے سے پتہ چلا کہ پھیپھڑے ٹھیک ہیں مگر گردے میں خرابی ہے۔ اس اثناء میں خطوط کے جواب تصنیف۔ مطالعہ وغیرہ بھی کچھ کرتے رہتے اور نماز کے لئے مسجد میں آتے رہے۔ بعد میں ڈاکٹروں کے شدید اصرار پر پندرہ روز کے لئے جملہ مشاغل ترک فرما دیئے۔ مگر نماز ایک دن بھی بیٹھ کر نہیں پڑھی۔ اور مسجد میں جانے سے رکنا اتنا شاق گزرا کہ ہر وقت اس کی کوفت چہرے پر عیاں رہتی تھی اس پندرہ روزہ آرام کے زمانہ میں بھی مطالعہ کرتے رہے۔ یعنی حکیم الامت ؒ مؤلفہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی، محمد علی کی ذاتی ڈائری۔ حیات شبلی ؒ۔ (سلیمان ندوی)، اور بخاری۔ ترمذی وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ اول الذکر تینوں کتابیں مکمل مطالعہ فرمائیں۔

اگر کوئی اس دوران جاتا تو مطالعہ میں مصروف ومنہمک ہوتے۔ توجہ بھی نہ کرتے۔ اگر کوئی زور سے سانس لیتا تاکہ موجودگی کا علم ہو جائے۔ پھر بھی متوجہ نہ ہوتے۔ اور اگر از خود کوئی خدمت پوچھتا اور پرسان حال کرتا تو فرماتے "کوئی ضرورت نہیں ہے۔ الحمد للہ بہت اچھا ہوں" اور پھر مطالعہ کرنے لگ جاتے۔ وہیں کمرے سے اٹھ کر چارپائی سے اتر کر اپنے حجرے میں آتے ہیں۔ باجماعت نماز پڑھتے۔ فرائض تو ایک طرف سنن اور نوافل بھی کھڑے ہو کر پڑھتے۔ تہجد بھی ادا فرماتے۔ ۳-۴ روز کے بعد اصرار کرنے لگے مگر کسی نے نہ مانا۔ ایک دن ہی ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر باہر تشریف لے گئے۔ اس دوران حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ تشریف لے آئے ان سے مسئلہ پوچھا کہ یہ لوگ چارپائی پر نماز پڑھنے کے لئے کہتے ہیں۔ مسجد چھڑا دی۔ باہر جانا چھڑا دیا۔ بتائیے کیا کروں؟ انہوں نے فرمایا کہ۔ چونکہ چارپائی کی سطح برابر ہے لہذا اس پر پڑھ لینی چاہیئے۔ البتہ تیمم کی جگہ وضو ہی کریں اور حضرت رح وضو ہی کیا کرتے تھے۔ اللہ اللہ الحب للہ کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے۔

ایک دن کہا کہ قاری اصغر علی صاحب (خادم خاص ومجاز حضرت۔ جو حضرت کا حساب کتاب رکھتے تھے) کے پاس جا سکتے ہیں۔ ہم نے قاری صاحب کو بلا لیا۔ ان سے پوچھا۔ حساب کر لیا؟ (تقریباً ہر ماہ ہزار ڈیڑھ ہزار کا حساب معمولی بات تھی) ان کو معمولی رقم دی۔ انہوں نے کہا۔ اس سے کیا ہوگا۔ فرمایا لے جاؤ تمہیں کیا۔ اس کے بعد شیروانی منگائی اور اس سے ۲۰۔۵۰ نکلے۔ وہ ان کو بھجوا دیئے۔

ایک دن مولانا رشید احمد نبیرہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو بلا کر کہا کہ یہ چار منی آرڈر فارم لے لو اور منی آرڈر کر آؤ۔ ان میں سے ایک کسی لڑکی کے نام تھا۔ جس کا خط آیا تھا کہ میرے پاس سکول کی اس ماہ کی فیس نہیں ہے اگر جمع نہ کرائی تو نام خارج ہو جائے گا۔ آپ بہت تنگی میں ملتجی ہوں۔

حضرت نے فیس کی رقم مع کچھ زائد بھیجی تھی اور تسلی دی تھی۔ اور اسی طرح مستقل امداد چاہنے والوں کو اس سخت بیماری کی حالت میں نہیں بھولے تھے۔ مہمانوں کے متعلق مسلسل صاحب زادہ صاحب کو ہدایت دیتے رہتے تھے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔

وصال سے تین دن قبل تنفس اور سینے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ عام خیال تھا کہ صحت ہو گئی۔ اب کمزوری باقی ہے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ حق تعالےٰ نے ہر طرح کے تزکیہ کے بعد حیات مقدس کی شمع کی لو کو بھڑکا دیا ہے اور کچھ دیر بعد اس تاریک دور میں علم و عرفان کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو جائے گا۔

تین چار دن قبل کھانے پینے سے رغبت ختم ہو گئی۔ ایک دو چمچے کسی چیز کے کھا لیتے۔ ان ہی دنوں ایک دن فرمایا سردا نہیں ملتا؟ عرض کیا گیا مل جائے گا۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود کہیں سے نہ مل سکا۔ فرمانے لگے: زندگی میں پہلی بار کسی چیز کی خواہش کی تھی۔

اللہ اللہ کتنی بڑی بات فرما دی۔ دراصل حضرت کی زندگی اس قسم کی خواہشات سے بہت بلند و بالا تھی۔ بالآخر یہ خواہش پوری ہو گئی۔ کراچی اور لاہور سے سردا آ گیا۔ کراچی سے مولانا سجاد حسین کی معرفت اور لاہور سے مولانا حامد میاں نے بھیج دیا۔

ایک دن حضرت کو معلوم ہوا کہ ارشد سلمہٗ روزے رکھتے اور چار بجے مخلصین کے ساتھ دعائے صحت کرتے ہیں۔ اس پر مولانا اسعد مدنی کو بلا کر ڈانٹا۔ کہ میری صحت کے لئے یہ لوگ اپنی صحت کیوں خراب کرتے ہیں۔ ایک رات قبل مترنم آواز سے یہ شعر گنگناتے رہے۔

الٰہی میری زندگی ہے کیسی　　نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

آخری دن صحن میں چارپائی لائی گئی۔ اور یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ غیر اختیاری طور پوری کرائی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتقال سے چند گھنٹے قبل دو صحابیوں کے ہمراہ مسجد تک تشریف لائے تھے اور جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاں سے تشریف لے گئے۔ تقریباً اسی وقت اس محب رسول ہندی نژاد حسین احمد مدنی کا تین بجے بعد ظہر انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کا انتقال بھی ۱۳ جمادی الاول بروز جمعرات بعد نماز ظہر ہوا۔ اور یہی وقت و تاریخ و مہینہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کا ہے۔

قرب وجوار کے شہروں میں اسی وقت فون پر یہ وحشتناک خبر پہنچ گئی ۔ لوگ دیوانہ وار دیوبند پہنچ گئے ۔ دور دراز کے لوگوں کا خیال تھا کہ جمعہ کو بعد نماز جمعہ تدفین عمل میں آئے گی ۔ مگر صاحب زادہ مولانا محمد اسعد نے فرمایا کہ ابا جان ساری عمر سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے رہے ہیں ۔ اور حضور کا ارشاد ہے کہ تدفین میں عجلت کی جائے ہمیں جلدی کرنا چاہئے ۔ اگرچہ حضرت کی یہ وصیت نہیں ہے ۔ تاہم ان کی خوشی اسی میں ہے ۔ اور اس تتبع سنت کی میت کے احترام کا تقاضا ہے کہ آخری راحت گاہ پر جلد سے جلد پہنچایا جائے ۔ دیر لگا کر مسافر کی منزل کھوٹی کرنا مسافر کا احترام نہیں بلکہ اس کی شان میں ایک قسم کی گستاخی ہے ۔

بہرحال صاحب زادہ محترم نے فرمایا کہ تاخیر سے حضرت کی روح کو اذیت دینا نہ قرین انصاف ہے نہ تقاضائے احترام ۔ مختصر یہ کہ اگرچہ مرکز علماء یعنی دار العلوم کی شان اور خود حضرت مرشد رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے ذوق واتباع ، سنت کا لحاظ کرتے ہوئے جلدی کی گئی ۔ مگر تب بھی اپنے ہوش وحواس سنبھالنے اور غسل وکفن کے انتظام میں چار گھنٹے لگ گئے ۔

آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا ۔ آل انڈیا ریڈیو سے وفات کے تھوڑی دیر بعد خبر نشر ہو گئی تھی ۔ پورے ملک سے لوگ آرہے تھے ۔ قریب کے پہنچ گئے دور کے آرہے تھے ۔ مگر تاخیر سے بچنے کے لئے ½ ۱۲ بجے شب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ کے ایماء پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ نے نماز جنازہ پڑھائی قبرستان اگرچہ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا ۔ تاہم بیس پچیس ہزار انسانوں کے جم غفیر کو میت کے ساتھ وہاں پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے ۔ اور بالآخر شیخ الاسلام رہ کا جنازہ اپنے عظیم پیش رووں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہما کی قبروں کے پاس پہنچ گیا ۔ اور پھر عین اس وقت کہ روزانہ شیخ الاسلامؒ تہجد میں اپنے رب کے حضور پیش ہوتے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حاضر ہو گئے ۔ شاید کم ہی اس امت میں ایسے افراد ہوئے ہوں گے کہ خاص تہجد کے وقت جو خدا تعالےٰ کا اپنے بندوں سے ملاقات کا خصوصی وقت ہے دفن ہوئے ہوں گے ۔ بہرحال ہماری شنید کے مطابق تو حضرت شیخ الاسلام ہی کو یہ اعزاز نصیب ہوا کہ وہ خاص اس وقت میں روزانہ کی طرح اپنے آقا کی خدمت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حاضر ہو گئے ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت کے متعلق معاصرین کی آراء حکیم الامت ، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے چند ارشادات حضرت مدنی رح کے متعلق ان کے بعض خلفاء کی زبانی ۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ کی روایت ہے ۔

" بھائی میں ان جیسی (مولانا مدنی رح جیسی) ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں ۔ میں مولانا حسین احمد

صاحب کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور متدین جانتا ہوں ۔ البتہ مجھے ان سے جمعیت کے ساتھ اختلاف ہے اگر وہ جمعیت رفع ہو جائے تو میں ان کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی بن کر کام کرنے کو تیار ہوں ۔

بروایت حضرت مولانا خیر محمد صاحب خیر المدارس ملتان ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا ۔

" ہمارے اکابر دیوبند کے کچھ کچھ خصوصیات ہوتے ہیں ۔ چنانچہ شیخ مدنی رہ کے دو خداداد خصوصی کمال ہیں جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ ایک تو مجاہدہ جو کسی دوسرے میں اتنا نہیں ہے دوسرے تواضع ۔ چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے ۔"

بروایت مولانا عبد المجید بچھرایونی ۔ حضرت تھانوی رہ نے فرمایا ۔

" مجھ کو اپنی موت پر فکر تھا کہ بعد باطنی دنیا کی خدمت کرنے والا کون ہوگا ۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی رہ کو دیکھ کر تسلی ہوئی کہ یہ دنیا ان سے زندہ رہے گی ۔"

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رہ بہت شریف طبیعت کے ہیں ۔ باوجود سیاسی اختلاف رکھنے کے بھی کوئی کلمہ خلاف حدود آن سے نہیں سنا گیا ۔" (اشرف العلوم)

رائے گرامی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ ۔

" میرے نزدیک ابوحنیفہ زمانہ ۔ بخاری اوان ۔ جنید و شبلی عصر حضرت اقدس شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رہ کی مدح میں کچھ کہنے والا " مادح خورشید مداح خود است " کا مصداق ہے ۔ میرا خیال ہے کہ حضرت کے فضل و کمال تبحر فی العلم والسلوک سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو آپ نے سنا ہوگا کہ مولانا کی اسارت کی خبر سن کر حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے کس قدر رنج و حزن کے ساتھ فرمایا تھا ۔

مجھے علم نہیں تھا کہ مولانا مدنی رہ سے مجھے اتنی محبت ہے ۔ اس پر حاضرین مجلس میں سے کسی نے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خوشی سے گرفتار ہوئے ہیں ۔ تو حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے اس جملہ سے تسلی دینا چاہتے ہیں ۔ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۔ یزید کے مقابلہ میں اپنی خوشی سے نہیں گئے تھے ۔ مگر آج تک کون ایسا شخص ہے جس کو اس حادثہ سے رنج نہ ہوا ہو ۔"

بروایت حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ ۔ ارشاد حضرت تھانوی رہ ۔

" میں اپنی جماعت میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کے حسن تدبر اور مولانا حسین احمد صاحب کے

جو کشش عمل کا معتقد ہوں "

بروایت حضرت موصوف ۔

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رح کی مجلس میں حضرت مدنی رح کے کسی مجاہدانہ عمل کا حوالہ دیتے ، ہوئے کہا کہ حضرت آپ نے اس پر عمل نہیں فرمایا ۔

" بھائی میں ان جیسی (مولانا مدنی رح جیسی) ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں "

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی رح کا ارشاد ۔

" حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ثم المدنی ، آسمان علم و ہدایت کے آفتاب اور زہد و ورع میں یگانۂ زمانہ ۔ اور جہاد تخلیص وطن کے ایک ممتاز شہسوار ہیں ۔ ہندوستان کے مسلمان ان کی ذات گرامی پر جس قدر بھی فخر کریں بجا ہے ۔ وہ علم ہدایت اور مستحق منصب قیادت ہیں ۔ ان کی مذہبی اور وطنی خدمات سے تمام مسلمانان ہند واقف ہیں ۔ اور ان کے اخلاص و دیانت کے ، مخالف بھی معترف ہیں ۔ اور ان کی بے غرضانہ محبت کا لطف وہی حاصل کر سکتا ہے جو ان کی صحبت و معیت سے بہرہ ور رہا ہو "

مولانا عبدالماجد دریاآبادی اور مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف کے تاثرات آپ ملاحظہ کر چکے ہیں ۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ۔

مولانا نصراللہ خان عزیز لاہور کا سچا تاثر ۔

" امام برحق حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کو لوگ ان کے علم و فضل اور تقوٰے و طہارت کی بناء پر جانتے ہیں اور عقیدت و احترام کا سر ان کے سامنے خم کرتے ہیں ۔ لیکن مولانا کی حقیقی عظمت ان کا محض علم و فضل ۔ عبادت و اشغال وغیرہ نہیں ۔ بلکہ ان کی پاکیزہ شخصی سیرت ہے ۔ اس معاملہ میں ہندوستان تو درکنار غالباً عالم اسلام میں بھی ان کی مثال نہیں ملے گی جس طرح مولانا مدنی مدظلہٗ کی طرف دل کھنچتا ہے ۔ اس طرح کسی اور کی طرف نہیں کھنچتا "

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

" شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات ستودہ صفات نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے ایک بے بدل سعادت تھی ۔ قدرت الٰہی کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ فساد و فتن سے معمور اس دنیا میں انسانی سوسائٹی کی اصلاح و ارشاد ۔ تنبیہہ و رہنمائی کے لئے ہر صدی و قرن میں مصلحین اور ریفارمر پیدا ہوتے ہیں ۔ جن کی پوری زندگی اصلاح و خدمت کے لئے وقف ہوتی ہے اور جو اپنے عمل و کردار کے لحاظ

سے عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند و برتر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کی شخصیت ان مصلحین و مرشدین کی صف میں بھی بہت بلند موقف و امتیاز کی حامل تھی۔ حق تعالیٰ نے آپ کو علم و عمل۔ اعلیٰ کردار و اخلاق۔ عزم و استقلال اور ہمدردیٔ خلائق کے وہ تابناک جوہر عطا فرمائے تھے جو صدیوں کے بعد کبھی کسی انسان کو عطا ہوتے ہیں"

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن ناظم ربانی ندوۃ المصنفین دہلی کا ارشاد گرامی۔

"حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کے لئے موجب افتخار تھی۔ ان کا شمار دنیائے اسلام کے چند گنے چنے رہنماؤں میں ہوتا ہے آپ کی ہستی میں خلوص و شفقت۔ عظمت و وقار۔ حلم و عفو۔ عزم و ہمت۔ عجز و فروتنی۔ صبر و استقلال۔ غرضیکہ شریعت و طریقت کے تمام جوہر کچھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ ایک ذات میں ان خصوصیتوں اور کمالات کا اجتماع مشکل ہوتا ہے آپ کو دیکھ کر صحابۂ کرام رض کی زندگی کی خصوصیات کا نقشہ سامنے آجاتا تھا"

سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی رح کے تاثرات۔

"حضرت شیخ الاسلام رح آزادیٔ وطن کے جانباز جرنیل تھے اور بین الاقوامی شخصیت اور علم و عمل اور زہد و تقویٰ اور ایثار و قربانی کے مجسم پیکر اور اخلاق و انسانیت کا سب سے بلند و بالا مظہر اور سلف صالحین کی ایک زندہ یادگار تھے"

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری قدس اللہ سرہ العزیز کا تاثر۔

"بھائی! حضرت شیخ مدنی رح کا ذکر کیا پوچھتے ہو پہلے تو ہم یوں ہی سمجھتے رہے مگر وقت کی نزاکتوں اور ہنگامہ آرائیوں میں جب ہم نے اس مرد مجاہد کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جہاں شیخ مدنی کے قدم تھے وہاں اپنا سر پڑا دیکھا۔ ابھی حضرت اس وقت ملک و ملت کی خاطر باطل کے مقابلہ میں حق کا دامن تھام کر جس مردانہ وار صورت میں استقامت اور استقلال کے ساتھ قربانیاں پیش کر رہے ہیں یہ شان حسینیت کا مظاہرہ ہے"

بروایت جناب احسان قریشی پرنسپل گورنمنٹ کمرشل انسٹیٹیوٹ۔ سیالکوٹ۔

"۱۹۴۵ء میں میں امرتسر میں بطور لیکچرار متعین تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن مرحوم۔ راقم الحروف۔ مرحوم شیخ صادق حسن اور ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے چند دوسرے پروفیسر مسلم لیگ کو مستحکم بنانے

میں دن رات کوشاں تھے۔ اور قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کرتے تھے۔ ایک دن سنا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رہ اپنے سفرِ لاہور کے دوران امرتسر ریلوے اسٹیشن سے گزرنے والے ہیں۔ اور مسلم لیگی طلبا نے یہ سکیم بنائی کہ امرتسر ریلوے اسٹیشن پر ان پر گندے انڈے پھینکے جائیں۔ جب اسکی خبر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچی تو وہ بہت متردد ہوئے۔ مجھے فوراً بلایا اور کہا۔ تم پر لازم ہے کہ تم اس دن صبح کی گاڑی پر جالندھر جا پہنچو۔ اور حضرت مدنی رہ کے ڈبے میں سوار ہو جاؤ۔ تو جب گاڑی امرتسر پہنچے تو تم معہ اپنے دو تین شاگردوں کے حضرت مولانا کے لئے ڈھال بن جاؤ۔ جو کچھ پھینکا جائے تم اپنے بدن پر سہنا۔ خبردار! حضرت مولانا کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اگرچہ ان کا اور ہمارا اختلاف قیام پاکستان کے متعلق ہے لیکن وہ ہمارے اکابر میں سے ہیں۔ سیاست میں ان کا مطمع نظر خواہ کچھ ہی ہو۔ تم کوشش کرنا کہ کوئی اینٹ۔ روڑا۔ پتھر یا گندا انڈا ان کو نہ چھوئے۔

چنانچہ میں اس دن اپنے تین چار چہیتے اور قابل اعتماد شاگردوں کے ساتھ جالندھر پہنچا اور اسی ڈبہ میں مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ امرتسر تک آیا۔ امرتسر اسٹیشن پر چند بدقماش طلبا نے گندے انڈے پھینکنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ وہ مجھے ڈبے میں دیکھ کر بہت ہی حیران ہوئے۔ اور کہا کہ "تم مسلم لیگی ہو کر کیوں مولوی مدنی سے انتقام لینے کو منع کرتے ہو!" میں نے کہا۔ میں اپنے جیتے جی مولانا مدنی کو کوئی روڑا۔ اینٹ۔ گندا انڈا۔ یا کوئی اور چیز لگنے نہیں دوں گا"

اس جواب پر آدھے شریر طلباء تو چلے گئے مگر باقی بدذاتوں نے گندے انڈوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ تمام میں نے اپنے بازوؤں۔ لباس اور منہ پر لی۔ میرا حلیہ عجیب بن چکا تھا میرے کٹر مسلم لیگی ہونے کے باوجود انہوں نے مجھ پر بہت سے انڈے پھینکے تھے۔ وہ مجھے گالیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن الحمد للہ کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ البتہ میں معمولی سا زخمی ہو گیا۔ دو روڑے میرے گھٹنوں پر لگے تھے۔ جب میں اس حال میں حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا۔

"احسان! تم نے جنت میں اپنے لئے جگہ بنالی"

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ بانی تبلیغی جماعت۔

"حضرت مدنی رہ کی سیاست میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آجاتی تو میں ان کے پیچھے دوڑا دوڑا

پھرتا ۔ تاہم اللہ پاک کے نزدیک آپ کا جو درجہ و مقام ہے میں جانتا ہوں ۔ آپ سے سیاست میں اختلاف کر کے میں دوزخ کی آگ نہیں خریدنا چاہتا ۔"

مولانا مدنیؒ واقعات کے آئینے میں

میں سب کو معاف کر چکا ہوں

بنگال کے سفر میں ایک جگہ لوگ حضرتؒ کے ساتھ سخت گستاخی سے پیش آئے اور اخبارات میں اس کا چرچا ہوا ۔ تو چوہدری مقبول الرحمٰن خان سیوہاروی نے ان کی ہجو میں ایک نظم لکھی اور ان کے لئے کچھ بددعائیں بھی دیں ۔ اس نظم میں انہوں نے مجھ سے بھی مشورہ لیا ۔ غرض اس کو صاف کر کے میں نے بجنور کے مشہور اخبار " مدینہ " کو برائے اشاعت بھیج دیا ۔ جب وہ شائع نہ ہوئی تو میں نے مولوی مجید حسن مالک اخبار کو بطور شکایت خط لکھا ۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ وہ نظم یہاں پہنچی تو حضرت یہاں دفتر میں تشریف فرما تھے ۔ ان کو علم ہو گیا اور انہوں نے سختی سے شائع کرنے سے روک دیا ۔ اگلے مہینے حضرتؒ سیوہارہ تشریف لائے تو میں نے کہا ۔ آپ نے ہماری نظم کو شائع ہونے سے کیوں روک دیا ۔ فرمایا کہ ۔

" میرے بھائی ! میرے ساتھ جس کسی نے جو کچھ کیا ہے یا کوئی آئندہ کرے گا ۔ میں سب کو معاف کر چکا ہوں ۔ آپ میری وجہ سے کسی کو برا بھلا نہ کہیں نہ کسی کے لئے بددعا کریں ۔"

(از قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی)

لا الفضل ربی و لا الیسی

۱۹۴۵ء کا ذکر ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ کے ساتھ مشرقی پنجاب کے ایک ریلوے اسٹیشن پر ایک مخالف مجمع نے جس کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا ۔ حضرتؒ پر سنگ باری شروع کر دی ۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے حضرت شیخ کو آڑ میں لے لیا اور خود کو مجمع کے سامنے پیش کر دیا ۔ اور اب مولانا پر بلا تامل پتھر برسنے لگے ۔ حتیٰ کہ ایک پتھر نازک جگہ پر آ کر لگا ۔ مولانا حفظ الرحمٰن فرماتے تھے کہ میں تہیہ کر چکا تھا کہ جب تک حفظ الرحمٰن کے بدن میں جان موجود ہے حضرت شیخ پر آنچ نہیں آنے دوں گا ۔

اس سنگ باری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جو مجھ سے حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ۔ کہ پاکستان میں ایک مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا ۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنائی ۔ کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے اور جس مجمع نے حضرت شیخ پر سنگ باری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا ۔ اس نے بتلایا کہ اس مظاہرے کے موقعہ پر تشفی غیظ کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہو کر حضرت شیخ کے سامنے ناچنے لگا ۔ واقعہ رفت گزشت ہو گیا ۔ لیکن " لا الفضل ربی ولا ینسیٰ " کچھ عرصہ بعد

جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے تو سکھوں نے اس کے ساتھ یہ طریقہ برتا کہ اس کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بہو بیٹیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں۔ اس نے کہا کہ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے جو حضرت مدنی کی اہانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔
(مفتی جمیل الرحمٰن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

وہ بریلی سے رام پور تک مجھے دباتے رہے

میں نہ مولانا کا شاگرد ہوں۔ نہ مرید۔ نہ پیر بھائی۔ ان کے مجاہدانہ کارناموں سے مجھے ان سے محبت و عقیدت ہو گئی تھی میں ایک مرتبہ لکھنؤ سے گاڑی پر سوار ہوا میری طبیعت خراب تھی چادر اوڑھ کر سیٹ پر لیٹ گیا۔ بخار تھا۔ اعضا شکنی تھی۔ اس لئے کراہتا بھی تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون سا اسٹیشن آیا اور کون مسافر سوار ہوا۔ بریلی کے اسٹیشن کے بعد ایک شخص نے میرے پاؤں اور کمر دبانا شروع کی۔ مجھے بہت راحت ہوئی۔ چپکا لیٹا رہا اور وہ دباتا رہا۔ مجھے پیاس لگی پانی مانگا تو اس نے اپنی صراحی سے گلاس پانی کا دیا۔ اور کہا لیجئے۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو مولانا مدنی تھے۔ مجھے ندامت ہوئی اور معذرت کی۔ لیکن انہوں نے اس درجہ مجبور کیا کہ میں پھر لیٹ گیا اور وہ رامپور تک برابر مجھ کو دباتے رہے۔ پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
(قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی)

یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رہ سے روایت ہے کہ جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ آخری حج سے تشریف لا رہے تھے تو ہم لوگ اسٹیشن پر شرف زیارت کے لئے گئے۔ حضرت کے متوسلین میں سے ایک صاحب زادہ محمد عارف ضلع جھنگ۔ دیوبند تک ساتھ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ۔ ٹرین میں ایک ہندو جنٹلمین بھی تھے۔ جن کو ضرورت فراغت لاحق ہوئی۔ وہ رفع حاجت کے لئے گئے اور الٹے پاؤں بادل ناخواستہ واپس ہوئے۔ حضرت مولانا مدنی رہ سمجھ گئے۔ فوراً چند سگریٹ کی ڈبیاں اِدھر اُدھر سے اکٹھی کیں اور لوٹا لے کر پاخانہ میں گئے اور اچھی طرح صاف کر دیا۔ اور ہندو دوست سے فرمانے لگے کہ جائیے پاخانہ بالکل صاف ہے۔ نوجوان نے کہا کہ مولانا میں نے دیکھا ہے پاخانہ بالکل بھرا ہوا ہے۔ قصہ مختصر وہ اٹھا اور جا کر دیکھا تو پاخانہ بالکل صاف تھا۔ بہت متاثر ہوا۔ اور بھرپور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا۔ یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔

راقم الحروف کو یہ بات بھی پہنچی ہے کہ اسی واقعہ کو دیکھنے پر یا اس طرح کے کسی دوسرے موقعہ پر اسی ڈبہ میں خواجہ نظام الدین تونسوی مرحوم نے اسی ڈبہ میں ایک ساتھی سے پوچھا کہ یہ کھدر پوش کون ہے؟ جواب ملا کہ یہ مولانا حسین احمد مدنی رہ ہیں۔ تو خواجہ صاحب مرحوم بے اختیار ہو کر حضرت مدنی رہ کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے حضرت نے جلد پاؤں چھڑا لئے اور پوچھا کیا بات ہے؟۔ تو خواجہ صاحب نے کہا۔ سیاسی اختلافات کی وجہ سے

میں نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور برا بھلا کہا۔ اگر آج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا تو شاید سیدھا جہنم میں جاتا۔

حضرت نے فرمایا۔ میرے بھائی میں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا ہے۔ اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک یہودی مہمان نے بستر پر پاخانہ کر دیا تھا صبح جلدی اٹھ کر چلا گیا جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے واپس آیا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے دست مبارک سے بستر کو دھو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو کہ برسوں تک مسجد نبوی میں درس حدیث دیتے رہے) دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ کسی گستاخ نے ایک رقعہ بھیجا۔ جس کا جواب حضرت نے دوسری نشست میں نہایت نرم و شائستگی سے دیا اور فرمایا کسی دوست نے مجھ کو یہ رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے۔ تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اور ہر طالب علم غیظ و غضب میں بھر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ خبردار! کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرا حق ہے کہ میں اس کی تسلی کر دوں۔

فرمایا۔ میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ محلہ اللہ داد پور کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر یا جا کر سمجھ لیا جائے"۔ العظمۃ للہ۔

بردباری کی انتہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "پہلوان وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے۔ بلکہ بہادر وہ ہے کہ غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے اور اپنے نفس کو مغلوب کر دے"۔

(او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے

مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یو۔پی ایک جگہ میری تقریر تھی۔ رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا بین الیقظۃ و النوم مجھ کو محسوس ہوا کہ کوئی میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ لوگ اس طرح دباتے رہتے ہیں کوئی مخلص ہو گا مگر اس کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے۔ باوجود راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی تھی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں۔ فوراً پھڑک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا حضرت کیا ہم نے اپنے لئے جہنم جانے کا تھوڑا سامان پہلے سے کم کر رکھا ہے کہ آپ بھی ہم کو دھکا دے کر جہنم بھیج رہے ہیں۔

شیخ نے جواباً فرمایا آپ نے دیر تک تقریر کی تھی۔ آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی

اور مجھ کو سعادت کی ضرورت۔ ساتھ ہی نماز کا وقت قریب تھا۔ میں نے خیال کیا آپ کی نماز نہ چلی جائے تو بتایئے حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے۔ سچ فرمایا ہے ؎

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے

مولانا عبداللہ فاروقی رحمۃ حضرت رائے پوری سے بیعت تھے لاہور دہلی مسلم ہوٹل میں برہا برس خطیب رہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ اور مولانا مدنی کے پاس قیام کیا۔ ایک روز جب مولانا کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گیا۔ تو میں نے مولانا کا جوتا اٹھا لیا۔ مولانا اس وقت تو خاموش رہے۔ دوسرے وقت جب ہم نماز پڑھنے کے لئے گئے تو مولانا نے میرا جوتا اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ میں پیچھے بھاگا۔ مولانا نے تیز چلنا شروع کر دیا۔ میں نے کوشش کی کہ جوتا لے لوں لیکن نہیں لینے دیا۔ میں نے کہا خدا کے لئے سر پر تو نہ رکھئے۔ فرمایا کہ عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے۔ میں نے عہد کر لیا۔ تب جوتا سر پر سے اتار کر نیچے رکھا۔

جگہ جگہ صلیب نما نشان ہے

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ملتان تشریف لائے۔ میں نے دعوت کی۔ گھر والوں نے گدا بچھا کر اور دوتہی بچھا دی۔ دوتہی چوخانی تھی مگر اس طرح کہ جمع کی شکل + اس کے خانوں میں بن جاتی تھی۔ حضرت کی نظر پڑی تو گدے پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ فرمایا اس میں جگہ جگہ صلیب نما نشان ہے میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔　　(مولانا خدا بخش ملتان)

اس کا سوت انگریزی مشین کا کتا ہوا ہے

مولانا خدا بخش ہی راوی ہیں کہ حضرت رحمۃ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے میں نے کھدر لے کر کھرڈ بکا۔ ضلع ملتان سے بہت عمدہ چھپوایا اور حضرت کو پیش فرمانے کے لئے دونوں ہاتھوں پر رکھا۔ دیکھا تو فرمایا یہ کیا ہے! میں نے کہا حضرت رومال پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا۔ اس کا سوت انگریزی مشین کا کتا ہوا ہے۔ میں ایسی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ میں ایسا کھدر استعمال کرتا ہوں جس کے دونوں سوت ہاتھ سے کتے ہوئے ہوں۔ حضرت کی اس تصریح کے بعد دیسی کھدر کا مفہوم متعین ہوا۔

وہ کھدر نہیں تھا

میاں چنوں ضلع ملتان میں مولانا ہدایت اللہ کا سالانہ تبلیغی جلسہ تھا۔ حضرت تشریف لائے۔ رات کو تقریر کے لئے سٹیج پر آئے اور بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے کچھ غنودگی آگئی۔ پان کی پیک ہاتھ پر گر گئی۔ حضرت فوراً چونک گئے۔ پیک صاف کرنا چاہی۔ خدام نے مختلف رومال پیش کئے مگر اتفاق سے جس کے پاس جو کچھ کپڑا تھا وہ کھدر نہیں تھا۔ حضرت نے قبول نہیں فرمایا۔ اور اس وقت اتفاق سے حضرت کے پاس اپنا رومال

نہیں تھا۔ اپنی جیب سے کھدر کی جراب نکالی اور اس کے کنارے سے یہ پیک صاف کی۔
یہ ہے صداقت اور قول و عمل میں مطابقت کہ کھدر کے استعمال کا عہد ہے تو ہر موقعہ پر کھدر ہی کا استعمال کیا۔

دیوبند سے ملتان کا کرایہ تھرڈ کا

ملتان کانگریس کے جلسہ پر ۱۹۴۱ء میں تشریف لائے اور واپسی پر اپنا ٹکٹ خود خرید لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا ٹکٹ خریدا اور ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے ایک معقول رقم جو منتظمین جلسہ نے پیش خدمت کرنے کے لئے دی تھی۔ پیش کی تو چونک کر فرمایا یہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ منتظمین نے یہ مصارف سفر دیئے ہیں۔ فرمایا کہ میری اجازت کے بغیر لئے کیوں! جب میں نے کافی معذرت کی اور اصرار کیا تو فرمایا۔ میں دیوبند سے چلا ہوں وہاں سے یہاں تک کا تھرڈ کا کرایہ آمد و رفت لے لو۔ باقی واپس کردو۔ اس کے بعد مجھے بیٹھا ہوا دیکھ کر کہا کہ اب تم جاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ دوستوں نے اصرار کیا ہے کہ ساتھ جاؤں۔ اس پر اور زیادہ بگڑے اور فرمایا ٹکٹ واپس کردو۔ دام ان کے ادا کردو۔ میرے ساتھ کسی کے جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تعمیل ارشاد کرنا پڑی۔ اور حضرت اللہ کی حفاظت میں اس پر آشوب دور میں تنہا واپس ہوئے۔

(مولانا خدا بخش ملتان)

اللہ محافظ ہے

حضرت سیالدہ ایکسپریس سے مراد آباد وارد ہوئے اسی وقت پسنجر گاڑی کے ذریعے سہارنپور کا قصد تھا ایکسپریس سے ڈبے کٹ کر پسنجر کو لگ جاتے تھے۔ نماز عصر کا وقت آگیا پلیٹ فارم پر جماعت ہونے لگی تو ایک خادم جو ڈبے میں تھا حضرت نے اس کو بھی بلوا لیا۔ میں نے عرض کیا سامان کی حفاظت کون کریگا۔ فرمایا اللہ محافظ ہے۔

(مولانا انصار الحق شیخ التفسیر جامعہ قاسمیہ مراد آباد)

اپنے ذبح کرنے کے لئے اپنا ہتھیار تمہیں دوں

۱۹۳۲ء میں جمعیت علمائے ہند کی طرف سے آپ ڈکٹیٹر بنائے گئے۔ ہر ایک ڈکٹیٹر کو دہلی جا کر سول نافرمانی کرنا اور گرفتار ہونا تھا۔ آپ کی طبیعت سخت علیل تھی۔ ٹانگوں میں زخم تھا۔ چلنا پھرنا دشوار تھا۔ مولانا انور شاہ محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو مقصد روانگی کا علم ہوا تو کہلا کر بھیجا کہ اس حالت میں سفر نہ کریں۔ تاریخ بدل دیجئے۔ حضرت نے گوارا نہ فرمایا۔ اسی حالت میں روانہ ہوگئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے وارنٹ گرفتاری جاری ہوچکا تھا۔ دیوبند اسٹیشن پر کثرت ہجوم کے باعث پولیس کو جرأت نہ ہوئی۔ دیوبند سے اگلے اسٹیشن پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے وہ نوٹس پیش کیا۔ آپ نے فرمایا میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس نے کہا قلم دیجئے تاکہ اردو میں ترجمہ کردوں۔

حضرت نے فرمایا کیا خوب! اپنے ذبح کرنے کے لئے اپنا ہتھیار تمہیں دے دوں! وہ خاموش ہوگیا۔ اور گاڑی چل پڑی۔ مظفر نگر اسٹیشن پر ترجمہ کرکے لایا۔ اس میں لکھا تھا کہ حاکم سہارنپور کی طرف سے آپ کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ آپ آگے نہ جائیں ورنہ آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیں۔ فرمایا اب میں سہارنپور کی حدود سے آگے ہوں یہ نوٹس

قابلِ تعمیل نہیں۔ افسران یہ جواب سن کر حیران ہوئے۔ بعد میں مجسٹریٹ نے جو ساتھ تھا کہ آپ کو اپنے خصوصی اختیارات کی بنا پر نوٹس دوں گا۔ چنانچہ اس نے اسی اسٹیشن پر دوسرا تحریری نوٹس پیش کیا۔ اور گرفتاری عمل میں آئی۔ حضرت کی یہ حالت تھی کہ گاڑی سے اتر کر دو قدم بھی چلنا دشوار تھا۔ اسی جگہ تھوڑی دیر کے لئے کرسی بچھا دی گئی۔ اس پر حضرت بیٹھ گئے۔ اس تمام تکلیف کے باوجود فریضۂ جہاد آزادی کو چھوڑنا یا ملتوی کرنا گوارا نہیں فرمایا

(مولانا انصار الحق جامعہ قاسمیہ مراد آباد)

خداوند تعالےٰ کو کیا جواب دوں گا

خشیت اللہ کی یہ کیفیت تھی کہ بسا اوقات نماز میں جب آیات عذاب کی قرأت فرماتے تو بے اختیار رونے لگتے تھے۔ وفات سے ایک روز قبل حضرت مولانا سید فخر الدین احمد (حال صدر مدرس دار العلوم) کو بلایا اور فرمایا کہ چند روز سے نماز بیٹھ کر تیمم سے پڑھ رہا ہوں بڑی کوتاہی ہو رہی ہے۔ خداوند تعالےٰ کو کیا جواب دوں گا۔ یہ فرما کر بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ اور اس قدر روئے کہ اس سے پیشتر کبھی اتنا روتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

بہرحال اللہ تعالےٰ حافظ و ناصر ہے

مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رح پر جس زمانہ میں سر سکندر حیات کی حکومت نے ایک مقدمہ چلا رکھا تھا جس میں پھانسی کی سزا کا اندیشہ تھا اور لوگ سخت پریشان تھے۔ اس وقت کچھ لوگ نہایت متفکرانہ انداز میں حضرت رح کی خدمت میں دعا کے لئے پیش ہوئے۔ حضرت سب کی سنتے رہے آخر میں کچھ فرمایا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ۔

"راہِ حق میں قربان ہونا تو بہت بڑی سعادت ہے اس میں فکر کی کون سی بات ہے۔" بہرحال اللہ تعالےٰ حافظ و ناصر ہے"

ان الفاظ سے بخوبی حضرت کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے کہ راہِ حق میں یہ خوفناک سزا بھی حضرت کے لئے ایک مرغوب شے ہے۔ بہرحال کچھ ہی دنوں بعد حضرت رح کی یہ اجمالی پیشین گوئی پوری ہوئی اور شاہ صاحب موصوف بری ہو گئے۔

آپ اطمینان سے اچھی طرح کھائیے

"چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست" کے مصداق آپ کا خوان کرم اپنے۔ پرائے ہر ایک کے لئے کشادہ رہتا تھا۔ مہمانوں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا اور لطف یہ کہ چھوٹا۔ بڑا امیر، غریب۔ حاکم و محکوم۔ بلا امتیاز بندہ و آقا سب ایک دسترخوان پر حلقہ کی شکل میں، بیٹھے ساتھ ساتھ کھاتے نظر آتے تھے۔ حضرت کی عجیب شان ہوتی تھی۔ سنت کے مطابق نماز کی شکل میں بیٹھے بیٹھے کھانا تناول فرماتے رہتے تھے اور نگاہیں چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں۔ جس مہمان کے سامنے روٹی ختم ہونے لگتی تھی فوراً اپنے پاس سے گرم روٹی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ مہمان نوازی کے سنت کے مطابق اور

اس خیال سے کہ کوئی مہمان بھوکا نہ رہ جائے۔ کھانا آخر تک کھاتے رہتے تھے۔ حالانکہ سب سے کم کھاتے تھے۔
ایک مرتبہ کھانے کے موقعہ پر ایک صاحب جو بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس بیٹھے تھے دوسرے حضرات کے سفید پوش اور معزز ہونے کی وجہ سے مرعوب ہو کر کھانے کے حلقے سے پیچھے بیٹھ گئے۔ حضرت نے دیکھا تو ساتھ کھانے کے لئے فرمایا۔ اتفاق سے وہ ایسے صاحب کے پاس آبیٹھے جو بہت معزز اور سفید پوش تھے۔ اور ان کے ساتھ بیٹھنے سے کچھ کبیدہ سے معلوم ہوتے تھے۔ اول الذکر اس چیز کو محسوس کر کے کچھ پریشانی کے ساتھ مرعوب ہو کر کھاتے رہے۔ حضرت نے اس کو بھانپ لیا اور ان سے فرمایا کہ آپ اٹھئے۔ وہ نہ اٹھے۔ تو دوبارہ فرمایا۔ کہ اٹھئے۔ آپ اٹھئے۔ اب وہ اٹھے تو حضرت نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ اور فرمایا۔ آپ اطمینان سے اچھی طرح کھائیے۔ پھر فرمایا کسی کو کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان بوسیدہ حال لوگوں کا کتنا اونچا درجہ ہوگا۔ سفید پوشوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ نہایت شرمندہ ہوئے اور لبعد میں ان صاحب سے معافی مانگی۔

پچاس روپے ماہوار بھیجتے رہے

مہمان نوازی کی اس وسعت پر ہی معاملہ ختم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ بہت سے حاجت مندوں۔ یتیموں۔ اور بیواؤں کی امداد کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی رہ جب تک حجاز میں رہے حضرت ہمیشہ ان کو پچاس روپے ماہوار ارسال فرماتے رہے۔ جود وسخا کا یہ سلسلہ اس قدر پوشیدہ رہتا تھا کہ بہت سے قریبی حضرات کو بھی اطلاع نہ ہوتی تھی۔

یہی کھانا کافی ہو جائے گا

حضرت مولانا عبد السمیع صاحب مدرس دارالعلوم نے مشکوٰۃ شریف کے درس کے دوران "کتاب المعجزات" کے ضمن میں حضرت کا ایک واقعہ قسم کھا کر سنایا۔ اس موقعہ پر سو سے زیادہ طالب علم موجود تھے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ۔

میں نے ایک روز حضرت کی دعوت کی۔ اتفاق سے اس وقت مہمان تھوڑے سے تھے۔ حضرت شیخ رہ نے دعوت قبول فرمائی۔ جب کھانے کا وقت آیا تو مہمان زیادہ آگئے۔ حضرت شیخ تمام مہمانوں کو لے کر تشریف لے آئے مہمانوں کی کثرت دیکھ کر میں پریشان ہوا۔ حضرت نے محسوس فرمالیا۔ مجھے علیحدہ لے گئے۔ میں نے عرض کیا تھوڑی دیر ٹھہریں میں اور انتظام کر لوں۔ حضرت نے فرمایا۔ یہی کھانا کافی ہو جائے گا۔ اور آپ کے ارشاد کے مطابق تمام روٹی اور ترکاری آپ کے پاس لاکر رکھ دی۔ روٹیوں پر کپڑا ڈھک دیا گیا۔ اب حضرت شیخ رہ اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیتے رہے۔

"مولانا عبد السمیع صاحب قسم کھا کر فرماتے تھے کہ وہ ہی کھانا سب کو کافی ہو گیا۔ گھر والوں نے بھی کھالیا اور کچھ باقی بچ رہا۔" ——— (مولانا قاری حافظ سید طاہر حسن صاحب مدرس مدرسہ امداد الاسلام، (میرٹھ)

میں تنہا نہیں کھا سکتا

تقسیم ہند کے بعد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سلہٹ کی بجائے ٹانڈہ میں مقیم تھے۔ یہی اور جون کا رمضان تھا۔ گرمی شباب پر تھی۔ لو چل رہی تھی۔ اوسطاً ستر مہمان روزانہ آتے تھے۔ اہلِ خانہ نے آپ کی پیرانہ سالی اور موسم کے تقاضا کے بموجب یہ مطالبہ کیا کہ آپ سحر کے وقت کوئی میٹھی چیز نوش فرمالیا کریں۔ تاکہ تشنگی کا غلبہ نہ ہو۔ مگر پیکرِ سنت نے برجستہ فرمایا کہ میرے مہمان صرف روٹی اور سالن کھائیں اور میٹھی چیزیں میں کھاؤں۔ اگر مہمانوں کے لئے انتظام ہو سکتا ہے تو میں بھی کھا سکتا ہوں ورنہ میں تنہا نہیں کھا سکتا۔ بدرجہ مجبوری گھر والوں نے سب کے لئے کبھی میٹھے چاول، کسی دن شیرا اور کسی دن سوتوں کا انتظام کیا۔

اور سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ بخار اور کسی مرض میں مبتلاء ہونے پر حکیم یا ڈاکٹر نے پرہیز بتلایا۔ تیمم بار پر چند دنوں پرہیزی کھانا کھا لیتے۔ چند دن بعد اگر پرہیزی کھانا دسترخوان پر آتا تو اس کو دوسرے کھانوں میں ملا دیتے اور وہی کھانا نوش فرماتے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں بالکل انوکھی ہے۔ اتباعِ سنت اگر ولایت ہے تو حضرت مدنیؒ اس دور کے سب سے بڑے ولی تھے۔

ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی

استاد العرب والعجمؒ کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد سے بارہ بجے تک حدیث کی سب سے بڑی مہتم بالشان کتاب بخاری شریف کا درس دیتے تھے مولانا فیض اللہ حضرت مرحوم کو لالٹین دکھانے پر مامور تھے۔ ان کا بیان ہے۔ ایک رات حضرت نصف شب کو سردی کے موسم میں مہمان خانہ میں تشریف لائے۔ دیکھا کہ ایک خستہ حال بوسیدہ کپڑے میں ملبوس چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ان سے پوچھو کہ کیوں بیٹھے ہو۔ اور پھر خود ہی جا کر پوچھا۔ تو اس مہمان نے جواب دیا کہ کسی صاحب نے مجھے دسترخوان سے اٹھا دیا اور میرے پاس لحاف بھی نہیں ہے۔ حضرت پر بڑا اثر ہوا۔ بار بار ان کا نام پوچھا مگر پتہ نہ چلا۔ فوراً اندر تشریف لے گئے اور کھانا لے کر خود باہر تشریف لائے۔ اور جب تک مہمان نے کھانا نہیں کھایا آپ باہر ہی بیٹھے رہے۔ سارے مہمان اور اہلِ خانہ سو چکے تھے۔ حضرت اندر گئے اور اپنا بستر اٹھا لائے اور اس کو بچھا دیا۔ اور خود ساری رات عبا اوڑھ کر گزار دی۔ مولانا فیض اللہؒ جو حضرت کے شاگرد ہیں۔ کا بیان ہے کہ میں نے بہت اصرار کیا اور چاہا کہ اپنا بستر لے آؤں اور حضرت آرام فرمائیں مگر اس پیکرِ سنت نے گوارا نہ کیا۔

مرا د ما نصیحت بود و گفتیم

آپ ایک دفعہ بریلی تشریف لائے کہ جلسہ سے خطاب کریں۔ موتی پارک میں بعد مغرب تقریر تھی۔ پنڈال بھر چکا تھا صرف حضرت کی انتظار تھی۔ مولانا تشریف لائے معززینِ شہر ساتھ تھے۔ پارک سے باہر معاندین کا زبردست ہجوم تھا۔ جو اپنے مخالفانہ فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا اور حضرت کو روکنا چاہا۔ مگر حضرت برابر بڑھتے رہے اور جلسہ گاہ میں بعد تلاوت قرآن کریم وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن الخ پڑھ کر تقریر شروع کی۔ مخالفین کنستر اور تارکول کے خالی ڈرم پوری

قوت سے بجانے لگے ۔ اور کیلوں کے ڈنٹھل پھینکنے شروع کئے۔ تقریر پھر بھی جاری رہی۔ حضرت نے مجمع کو کوئی دفاعی کارروائی کرنے سے قطعاً روک دیا ۔ بالآخر پتھر برسنے لگے ۔ پتھروں کی کوئی کمی نہیں تھی کہ سڑک بن رہی تھی۔ ضلع کا افسر اعلیٰ مسلم لیگی تھا۔ لہذا پولیس بجائے اس کے کہ ان کی سرکوبی کرتی ۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ۔ جانبازوں نے چاہا کہ حضرت کے گرد ہو کر سایہ کریں ۔ مگر واہ رے صبر و استقامت کے پتلے حسین احمدؒ ایسا کرنے سے روک دیا ۔ اور انتہائی محبت و شفقت سے فرمایا کہ حسین احمد کا سر آپ کے سروں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے ۔ آخرکار مخالفین نے روشنی کے قمقموں کو پتھروں کا نشانہ بنایا ۔ اور فضا تاریک ہو گئی اور اپنے خیال میں جلسہ کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا ۔ حضرت اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور قبل اس کے کہ بریلی سے واپس ہوں آپ کی جانب سے ایک ہینڈ بل شائع ہو کر تقسیم ہوا ۔ جو دعاؤں اور نصیحتوں سے پُر تھا ۔ اور جس کا مضمون اس شعر پر ختم ہوا تھا ؎

مراد ما نصیحت بود و گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

میں کافی احتیاط اور خیال رکھتا ہوں

درس میں بعض دفعہ ذاتی نوعیت کے سوال پوچھتے تھے ۔ جن کا لہجہ سخت ہوتا تھا ۔ ایک دفعہ پرچی آئی کہ " حضرت آپ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتے ہیں ۔ یہ تو از روئے حدیث حرام اور ممنوع ہے "۔ حضرت جی نے یہ پرچی سنائی اور فوراً کھڑے ہو گئے ۔ اور پائچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ۔ حضور کون کہتا ہے کہ میں ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتا ہوں ۔ دیکھئے میرا پاجامہ کہاں ٹخنوں سے نیچے ہے ؛ ہو سکتا ہے کہ کبھی غیر شعوری طور پر توند کی وجہ سے نیچے چلا جاتا ہو ۔ پھر بھی کافی احتیاط اور خیال رکھتا ہوں ۔ بھلا میں اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں جب کہ حدیث میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے ۔

حضرت نے چار روپے دے دیئے

حضرت جمعیۃ کے پروگرام کے سلسلہ میں رنگون گئے جہاں سے بذریعہ بحری جہاز کلکتہ آئے ۔ میزبان نے خادم کو بھی ساتھ کر دیا تاکہ آرام رہے حضرت کا ٹکٹ اول درجہ کا اور خادم کا تیسرے درجہ کا ۔ خادم اول درجہ میں کبھی چلا جاتا جب کہ کمرہ بالکل خالی تھا ۔ تو جہاز کا ملازم جب کبھی دیکھتا تو اعتراض کرتا (شاید مولویانہ وضع قطع سے) چنانچہ حضرت نے یہ کیا کہ خادم کے ساتھ تیسرے درجہ میں اکثر وقت گزارنے لگے ۔ سفر ختم ہونے پر وہ ملازم حضرت کی خدمت میں بخشش اور انعام لینے حاضر ہوا ۔ حالانکہ اس نے راستہ میں تکلیف ہی تکلیف پہنچائی تھی آرام بہم نہیں پہنچایا تھا ۔ خادم نے کہا کہ اس کو کچھ نہ دیجئے ۔ حضرت نے فرمایا نہیں ۔ اس کا حق اس کو دیا جائے گا ان دنوں بڑے سے بڑا انگریز بھی ایک روپیہ سے زیادہ انعام نہیں دیتا تھا ۔ کہ وہ ایک روپیہ آج کل کے سات آٹھ کے برابر تھا ۔ چنانچہ حضرت شیخ نے چار روپے گن کر اس کو دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ۔ حضرت نے اس کی پشیمانی اور ندامت محسوس کرتے ہوئے فرمایا ۔ تو یہ تمہارے ہی ہیں ۔ چنانچہ

اس لئے لے لئے۔ خادم نے اس کے بعد کہا یہ کیا کیا۔

حضرت نے فرمایا۔ بھائی اصل بات یہ ہے کہ یہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ انعام و بخشش ہمیں صاحب بہادروں اور انگریزوں سے ملتی ہے۔ ہماری جیسی مولویانہ صورتوں سے شاید اسے انعام کی توقع نہ تھی۔ اس لئے اس نے ہم سے یہ برتاؤ کیا۔ ہمارا سفر تو ختم ہو گیا لیکن میں نے اسے یہ روپے اس لئے دیئے ہیں کہ اسے معلوم ہو جائے کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زیادہ دے سکتے ہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندے کو انشاء اللہ آئندہ نہیں ستائے گا۔ بلکہ اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اس واقعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عالی ظرفی اور مزاجِ ایمانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ)

چالیس ہزار روپیہ نقد اور پانچ صد ماہوار

ایک سلسلہ میں فرمایا کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے ترکِ تعلق نہ ہونا چاہیئے اور اسی مجلس میں فرمایا کہ جب میں کراچی جیل سے ۱۹۲۳ء میں رہا ہو کر آیا تھا تو بنگال کونسل کے ایک ممبر نے کہا کہ چالیس ہزار روپیہ نقد اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں پانچ سو روپیہ ماہوار کی پروفیسری آپ کے لئے ہے۔ اس کو منظور فرمالیں۔ میں نے کہا کام کیا کرنا ہوگا۔ ممبر صاحب نے فرمایا کہ کچھ نہیں صرف تحریکات میں خاموش رہیں۔

میں نے کہا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جس راستہ پر لگا گئے ہیں اس سے نہیں ہٹ سکتا۔ حضرت شیخ نے اس واقعہ کو بیان کر کے فرمایا کہ آپ صاحبان اس کام میں لگے رہیں تعلقات خراب کریں۔ (یہ بات نظرانداز نہ ہونی چاہیئے کہ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ اس وقت حضرت کے لئے ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد سلہٹ تشریف لے جانے پر مشاہرہ ڈیڑھ صد روپیہ تھا۔

(مولانا مقصود علی۔ مدرس مدرسہ تعلیم الدین آنند ضلع کھیڑا)

مخدوم خود خادم بنا ہوا تھا

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے "نقوش و تاثرات" میں خوب لکھا ہے۔

"مخدوم خادم بنا ہوا تھا اور جس کا منصب آمر ہونے کو تھا وہ فخر و مسرت اپنی ماموریت میں محسوس کر رہا تھا۔ دیوبند جا پہنچے تو مولانا اسٹیشن پر پیشوائی کے لئے موجود۔ چلنے لگے تو اسٹیشن تک مشایعت پر آمادہ۔ کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو وہ لوٹا لئے ہاتھ دھلانے کو کھڑے۔ پانی مانگئے تو گلاس لئے حاضر۔ سفر میں ساتھ ہو تو تانگہ کا کرایہ اپنے پاس سے دے دیں۔ ریل کا ٹکٹ وہ دوڑ کر لے آئیں۔ ہوٹل میں کھائیں تو بل وہ خود ادا کریں آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں ہاتھ ٹٹولتا ہی رہ جائے۔ بستر بھی وہ کھول کر بچھا دیں۔ غرض یہ کہ مالی اور بدنی چھوٹی بڑی خدمت کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی تھیں ان سب میں آپ کو پیش پیش دیکھا۔ مولانا محمد علی جوہرؔ

سے شعر کہا تو تھا اپنے شیخ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رہ کے حق میں۔ مگر صادق مولانا دیوبندی رہ پر بھی لفظ بہ لفظ آرہا تھا ؎

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے ورنہ یہاں
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی

آپ کے لوٹے میں پانی لے آئیں۔ آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں۔ تین دن قیام دیوبند میں روائتیں مشاہدہ بن کر رہیں۔ اور شنیدہ دیدہ میں تبدیل ہوگئیں۔ تکلفات اور خاطر میں مہمان نوازیاں کھانے پر کھانے چائے پر چائے۔ دوسروں کو شاید کام لینے میں لطف آتا تھا جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دوسروں کا کام کرنے میں آتا تھا۔

آپ میری طرف سے معافی چاہ لیں

ایک مرتبہ ایک بنگالی طالب علم صاحب کو ایک ضرورت سے احقر نے ٹانڈہ حضرت کے پاس بھیجا۔ حضرت جلسہ میں جارہے تھے وہ راستہ میں ملا۔ فرمایا آپ گھر چلیں میں جلسہ سے ہوکر آؤں گا۔ وہ طالب علم گھر نہ پہنچ سکے کسی مسجد میں سو رہے۔ حضرت نے بہت تلاش کروائی جلسہ سے واپسی پر مگر وہ نہ ملے۔ جب صبح کو حاضر خدمت ہوئے تو حضرت نے بہت افسوس ظاہر فرمایا۔ اور معذرت کی۔ دوسرے دن طالب علم واپس ہوئے اور ساتھ ہی ڈاک سے حضرت کا گرامی نامہ پہنچا کہ کہ ان بنگالی طالب علم کو تکلیف پہنچی۔ آپ میری طرف سے معافی چاہ لیں۔

(مولانا شمس الدین نائب ناظم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور)

غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا

حضرت کے ساتھ بارہا کھانے کا اتفاق ہوا حضرت ہمیشہ کھانا بعد میں ختم فرماتے۔ اور جب میں کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا تو ارشاد ہوتا کہ آپ مرغن کھانے کے عادی ہوگئے ہیں۔ غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ ایک دفعہ میں نے طے کیا کہ کچھ بھی ہو آج کھاتا رہوں گا یہاں تک حضرت فارغ ہوں۔ بس میں نے شروع ہی سے بہت آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ سب لوگ اٹھ گئے میں کھاتا رہا حضرت بھی کھاتے رہے یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ حضرت اب خفا ہوجائیں گے کہ مجھے پریشان کر رہا ہے تب میں نے کھانا بند کیا تو حضرت نے اب بھی مسکراکر یہی فرمایا کہ۔

"غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا"۔ اور ہاتھ کھینچ لیا۔ (بحوالہ مذکورہ)

رمضان المبارک

رمضان شریف کا مہینہ قیام اللیل کا مہینہ ہے۔ آپ ساری رات یاد الٰہی میں کھڑے ہوکر گزار دیتے تھے۔ جب کوئی آیت تہدید وعید کی آتی تو لرز جاتے اور دعا کی آیت کو بار بار لوٹاتے۔ ایک ختم تراویح میں فرماتے اور ایک تہجد میں۔ آپ کے ساتھ سلوک وطریقت کے منازل طے کرنے والوں کا ایک جم غفیر رہتا۔ ذکر الٰہی سے وہ جگہ گونجتی رہتی تھی رمضان المبارک میں تعداد ہزار ڈیڑھ ہزار تک پہنچ جاتی۔ جس میں پانچ یا چھ سو

ذاکرین ہوتے تھے۔ تقسیم سے قبل رمضان المبارک سلہٹ میں عموماً گزرتا تھا۔

عیدی جوں ہی عید کا چاند نظر آیا خوشی کی لہر روئے مبارک پر دوڑ گئی۔ لیکن وہ رات خاص اہتمام سے یادِ الٰہی میں بسر کرتے اور صبح کو تمام چھوٹے بڑے رشتہ داروں میں عیدی تقسیم کرتے اور انبساط سے عید کی مبارک بادی دیتے۔

اجازت و بیعت تقسیم سے ایک سال قبل سلہٹ میں بعد رمضان المبارک چھ ہزار افراد نے بیعت کی۔ آواز نہیں پہنچ رہی تھی لاؤڈ سپیکر کا انتظام کیا گیا۔ یہ وہی حضرات تھے جو آپ کے دشمن اور نام سن کر جلتے تھے لیکن آج گرویدہ ہو کر حلقۂ حسینیہ میں داخل ہو رہے تھے۔

وظائف آپ ہمیشہ صلہ رحمی اور رشتہ داری کی نگہداشت فرماتے۔ اعزاء و اقرباء کی نگہداشت آپ کی خاص شان تھی۔ رشتہ داروں میں سے جو کوئی آجاتا یا دارالعلوم میں طالب علم ہوتا تو اسے کبھی اجازت نہ تھی کہ اس گھر کے علاوہ کہیں اور قیام کرے اور کھانا کھائے۔ سبھوں کو خاص طور سے تاکید تھی کہ گھر پر کھایا کریں اور اگر پیسہ کی کمی ہو مجھ سے لے لیا کریں۔ یہاں تک کہ ضروریات مختلفہ وقتاً فوقتاً پوری کرتے رہتے۔ نادار رشتہ داروں، بیوگان، اور پڑوسیوں کو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار امداد فرماتے اور ہر گھر میں ہر چھوٹے بڑے کے لئے جیب خرچ ماہانہ مقرر کر دیا تھا۔ جسے وقت پر خود تقسیم فرماتے۔ اکثر و بیشتر علمائے کرام جن کی تنگی معلوم ہوتی انہیں تنہائی میں لیجا کر ایک خطیر رقم سے امداد فرماتے اور منی آرڈر کر کے سرپرستی اور غمگساری فرماتے۔

وہ فروخت کرنے میں جھوٹ بولے گا! حضرت رہ دہلی جمعیۃ کے دفتر میں قیام فرماتے تھے۔ خدام نے جماعت کے لئے چٹائیاں بچھا دیں۔ حضرت نے دیکھا تو فرمایا۔ ناظم اعلیٰ (مولانا حفظ الرحمٰن) کا انتظام بہت اچھا ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے جواب دیا۔ یہ ناظم اعلیٰ کا انتظام نہیں بلکہ آپ کے خادم چوہدری عبد الرحمٰن کی عقیدت ہے وہ چٹائیاں فروخت کرتے ہیں۔ اس وقت نماز کے لئے بچھا دی ہیں۔ حضرت نے جوں ہی یہ سنا فوراً رنگ بدل گیا۔ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ اور فرمایا نہیں ان کو اٹھا دو۔ خدام نے عرض کیا کہ عبد الرحمٰن نے اپنی خوشی سے بچھائی ہیں۔ فرمایا۔ نہیں وہ انہیں غیر مستعمل بنا کر فروخت کرے گا حالانکہ وہ استعمال میں آچکی ہوں گی۔ وہ فروخت کرنے میں جھوٹ بولے گا۔ یہ کب درست ہے؟ اس کے بعد دفتر کی چٹائیوں پر نماز پڑھی۔　　(رحمت اللہ جان رفیق خاص دفتر جمعیۃ علماء ہند)

یہ خرچ جماعت کے مالیہ پر نہیں پڑ سکتا قیام کرنے کے بارے میں معمول یہ تھا کہ جہاں آمد و رفت بار بار ہوتی۔ ایک جگہ متعین کر لیتے تھے اور سیدھے وہیں پہنچتے تھے۔ مرادآباد میں ہمیشہ سے مولانا محمد صدیق مرحوم کا گھر معین رہا۔ مختلف لوگوں نے بار بار کوشش کی۔ مگر آخر وقت تک وہیں جاتے

رہے ۱۹۳۶ء میں مراد آباد میں مجلس عاملہ کا اجلاس و قیام اور جگہ تھے۔ اور حضرت کا قیام اپنی جگہ پر۔ اجلاس کے موقعہ پر تانگہ میں مقام اجلاس پر تشریف لائے تو ناظم جمعیۃ نے تانگہ کے مصارف ادا کرنا چاہے تو فرمایا۔ میرا وہاں قیام اپنی رائے سے ذاتی طور پر ہوتا ہے۔ اصولی طور پر مجھے دفتر میں رہنا چاہئے۔ اگر نہیں رہتا تو دفتر آنے کے مصارف میرے ذمہ ہوں گے نہ کہ جماعت کے۔ یہ خرچ جماعت کے مالیہ پر نہیں پڑ سکتا۔ نیز ناظم مولانا محمد میاں صاحب کو ہدایت فرمائی کہ جماعتی اور غیر جماعتی خرچ میں ہمیشہ امتیاز رکھا جائے۔ اللہ تعالے سب کو یہ توفیق بخشے۔ مگر یہ کام درحقیقت بہت مشکل ہے۔ لیٹر فارم ایک عام چیز ہے۔ بارہا درخواست کی گئی کہ حضرت جمعیۃ کا لیٹر فارم استعمال کریں۔ بحیثیت صدر آپ کو حق حاصل ہے اور یہی بات موزوں بھی ہے۔ مگر بہت کم ہی اتفاق ہوا ہوگا کہ جماعتی کام کے لئے بھی جمعیۃ کا لیٹر فارم استعمال کیا ہو۔ ورنہ اپنے پیڈ پر جو اعلیٰ قسم کے کاغذ پر ان کے اپنے خرچ سے تیار ہوتا تھا۔ اپنے کام کے لئے بھی اور جمعیۃ کے کام کے لئے بھی۔

(مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند)

لاش نہیں ملے گی

واقعہ کے راوی جالندھر کے ایک نوجوان مولوی محمد اکرام قریشی ہیں جو حمید نظامی مرحوم (مدیر نوائے وقت) کے جگری دوست مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کے دست و بازو۔ اسلامیہ کالج کے فارغ التحصیل اور لیگ کے آغاز سے آج تک حامی چلے آتے ہیں۔ وہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مدرسۂ فکر کے کبھی ہم خیال نہیں رہے۔ بلکہ ان نوجوانوں میں سے تھے جنہیں مسلم لیگ کا ہراول دستہ کہا جاتا تھا۔ اور جن کا کام لیگ سے اختلاف رکھنے والے عناصر کی ہر لحاظ سے مدافعت و مزاحمت تھا بلکہ نوجوانوں کا یہ طائفہ "احرار" اور "جمعیۃ" کے جلسوں پر لیفار کیا کرتا تھا۔

اس واقعہ کے راوی یہی محمد اکرام قریشی ہیں جنہیں لاہور کے احباب ڈاکٹر بھی کہتے ہیں۔ اور آج کل میڈن روڈ لاہور میں رہ رہے ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق اس واقعہ کے کئی راوی اب بھی بقید حیات ہیں اور یہ واقعہ انہوں نے کافی ہاؤس میں بارہا بیان کیا ہے۔

"ابھی پاکستان نہیں بنا تھا۔ اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات کا زمانہ تھا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی پنجاب یا سرحد کے سفر سے واپس جا رہے تھے۔ جالندھر کے اسٹیشن پر یہی نوجوان مسٹر شمس الحق کی ہمراہی میں اپنے رہنماؤں کے استقبال کے لئے گئے ہوئے تھے راہنما کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ شمس الحق کی نظریں مولانا مدنی رہ پر پڑ گئیں۔ وہ اپنے ساتھ کے نوجوانوں کو لے کر ان کے ڈبے پر چڑھا۔ نعرے لگائے۔ سب وشتم کیا۔ حتیٰ کہ ان کی داڑھی کو پکڑ کر کھینچا۔ ایک بیان کے مطابق رخسار پر طمانچہ مارا۔ مولانا صبر کی تصویر بنے آنکھ نہ

کی۔ اس کارنامے کے بعد شمس الحق یا ان کے کسی ساتھی نے یہ واقعہ مولانا عظامی (جانشین گرامی علامہ اقبالؒ کے جگری دوست تھے) سے بیان کیا جو جالندھر مسلم لیگ کے نائب صدر اور تحریک پاکستان کے مقامی طور پر معاون رہنما تھے۔ انہوں نے سنتے ہی کانپ کر پوچھا۔

"کیا یہ صحیح ہے! جب تصدیق کی گئی تو ان پر ایک رعشہ سا طاری ہوگیا۔ اکرام قریشی کہتے ہیں۔ وہ کانپ رہے تھے۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

" اگر یہ سچ ہے تو جس نے حضرت مدنیؒ کی داڑھی پر ہاتھ ڈالا ہے اس کی لاش نہیں ملے گی۔ اس کو زمین نہیں جگہ دے گی"

عظامی کانپ رہے ان کا چہرہ اشکبار تھا ان کے دیدے پرنم تھے"

آپ جانتے ہیں یہ شمس الحق کون تھا؟ یہ وہی نوجوان ہے جو فیصل آباد میں قتل و خون کا شکار ہوگیا جس کی نعش کا نہ پتہ چلا۔ اور اس واقعہ کو تقریباً گیارہ بارہ سال ہو چلے ہیں۔ "کفن ملا نہ قبر" روایتوں پر روائتیں آتی رہیں۔ خود لیگ کے زعماء مضطرب ہیں۔ کسی نے بھٹہ میں زندہ جلا دیا گیا۔ کسی نے کہا لاش کے ٹکڑے کر کے دریا برد کر دیئے گئے (کسی نے کہا قیمہ کر کے جانوروں کو کھلا دیا گیا۔ ارشد) جتنے منہ اتنی باتیں۔ پولیس نے انعام بھی رکھا سب کچھ کیا مگر شمس الحق کا سراغ نہ ملا۔

یک حرف کا شکے کہ بصد جا نوشتہ ایم

(شورش کاشمیری" ہفت روزہ چٹان" ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء)

پنجاب کے سب سے کثیر الاشاعت "روزنامہ نوائے وقت لاہور" ۱۸ ستمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں اپنے اداریہ میں" پاکستان دشمنی" کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

" مولانا آزاد۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بھی پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو ان میں سے ہر ایک نے یہ کہا کہ" پاکستانی مسلمانوں کو اپنا نیا وطن مبارک ہو ہم اس کی ترقی کے لئے دعا کرتے ہیں مگر ہم ہندوستان ہی میں رہیں گے اور ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کریں گے۔ (بحوالہ دار العلوم)

○

سالک کو جو واقعات پیش آئیں ان کو نامحرموں سے ہرگز نہ ظاہر کرنا چاہئے اپنے شیخ سے ظاہر کرے۔ یا ایسے شخص سے جو طریقت کا ہمراز اور سالک کا ہمدرد ہو اور بس۔ یہ چیز سالک کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات فیض ربانی کے انقطاع بلکہ کبھی کبھی سلب کا باعث بن جاتی ہے۔ جو راز و نیاز عاشق و معشوق کے درمیان ہو اگر عاشق ان کو ظاہر کر دیتا ہے تو معشوق کے عتاب کا اس قدر ظہور ہوتا ہے کہ بعض اوقات انقطاع کامل کا باعث ہو جاتا ہے۔ جب کہ یہ حال مجازی معشوق کا ہے تو محبوب حقیقی کا کیا حال ہوگا۔ اس لئے ایسے امور سے بچنا چاہئے اور اللہ تعالےٰ سے صدق دل سے توبہ کرنی چاہیئے۔

○

محبوب حقیقی ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ ہر چیز کو سنتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ شدید الغیرت ہے۔ اس کے سامنے بجز خشوع و خضوع اور رازہائے سربستہ کے اخفاء اور اظہار عبودیت کاملہ اور اتباع سید العشاق (علیہ السلام) کوئی چیز کارآمد نہیں ہے۔ (فمن کان یرجوا لقاء ربہٖ فلیعمل عملاً صالحا ولا یشرك بعبادۃ ربہ احدا)۔ جاہ طلبی، مال طلبی، اس کی سخت غضب ناکی کا باعث ہے۔
حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ما اشغلك عن الحق فھو طاغوتك۔
قرآن فرماتا ہے۔ فمن یکفر بالطاغوت و یؤمن باللہ (الآیۃ)

○

معاصی کی بنا پر بھی قبض ہوتا ہے اور کبھی طبعی طور پر بھی ہوتا ہے۔ بہر حال بندہ کا کام عبدیت کا اظہار اور تضرع وزاری ہے۔

○

ذکر کرتے وقت طبیعت پر زور ڈال کر کے معنی اور مذکور کی عظمت اور محبوبیت کا دھیان رکھا کریں۔ اسباب و افکار دنیا دیہ میں حتی الوسع حصہ اور دلچسپی نہ لیا کریں۔ ان امور کا خیال رکھیں۔ اس کا بھی التزام کریں کہ جب کوئی خطرہ آئے اس کو ٹھہرنے نہ دیں۔ اور دلچسپی پیدا ہونے نہ دیں۔ فوراً دفع کریں۔ اگر آپ کو اپنی دعاؤں اور اذکار میں نقصانات نظر آ رہے ہوں ان کو مکمل کرنے کی جد وجہد جاری رکھنی چاہیے۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ ہم کتنی بھی کامل عبادت کریں شان الٰہی کے سامنے وہ نہایت حقیر اور ناقص ہے۔ جب کہ سرور کائنات سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

" ما عبدناك حق عبادتك ولا عرفناك حق معرفتك :

تو ہم، آپ کس قطار میں ہیں۔ اپنے آپ کو ہمیشہ ذلیل و خوار سمجھنا اور اپنے اعمال و اخلاق کو ناقص سمجھنا نہایت ضروری ہے اور اس پر ناز کرنا اور کامل سمجھنا خوفناک ہے۔ لن ينجوا احدكم بعمله الا ان يتغمده الله برحمته (او كما قال عليه السلام) ۔ تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کی بنا پر نجات نہیں پا سکتا۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں چھپا لے۔

○

اگر میں کوتاہی کرنا اور پاس انفاس کو دن رات میں صرف دس پندرہ منٹ انجام دینا انسانی کسالت اور بے توجہی ہے۔ الذين يذكرون الله قياما و قعودا و على جنوبهم کا سماں کس طرح پیدا کریں گے۔ کیا یا ایها الذين امنوا اذكروا الله ذكرا كثيرا و سبحوه بكرة و اصيلا پر اس طرح عمل ہو سکتا ہے؟

○

مراقبہ میں دھیان اور خیال ذات مقدسہ خداوندیہ کی طرف لگانا ہے۔ وہی اسم ذات اللہ کی مسمّٰی ہے۔ وہی تمام عالموں کو پیدا کرنے والی اور سب کو پالنے والی۔ ہر چیز کو جاننے والی اور تمام عالم میں تصرف کرنے والی ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ ہر قسم کے عیبوں سے پاک ہے اور تمام کمالات سے موصوف ہے۔ نور اور نار سب اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ تو ہمیشہ اس تصور اور دھیان کو جمائے رکھئے کہ وہ ذات مقدسہ میرے قلب میں موجود اور جلوہ گر ہے۔ وہ مجھ کو دیکھتی اور جانتی ہے۔ کوئی حالت اور کوئی خطرہ یا خیال یا ادنیٰ کام اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اسی تصور کو دل میں جمائیے۔ دوسری اور چیزیں خواہ روشنی ہو۔ اور نور ہو یا بزرگ ہستیاں وغیرہ ان کی طرف دھیان نہ کیجئے۔ فقط ذات خداوندی جل جلالہ شانہ کی طرف دھیان رکھئے۔

ہست رب الناس را با جان ناس　　اتصالے بے تکیف بے قیاس

○

طریقہ بیعت لینے کا یہ ہے۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ
و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیآت اعمالنا من یھدہ اللہ
فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ
وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ
ورسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا
فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔ ان الذین یبایعونک انما یبایعون
اللہ ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ ومن
اوفی بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجرا عظیما۔

(کہئے!) اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان
سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ۔

گواہی دیتا ہوں میں کہ سوائے اللہ تعالےٰ کے کوئی عبادت کئے جانے کے قابل نہیں۔ اکیلا ہے وہ۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے سردار اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ ایمان لایا میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنی ذات میں اور اپنی صفات میں اور اپنے افعال میں اکیلا ہے اور کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں۔ اور ایمان لایا میں اللہ تعالےٰ کے سب پیغمبروں پر اور اس کے سب فرشتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر۔

داخل ہوا میں دینِ اسلام میں سچے دل سے۔ بری اور بیزار ہوں میں سب دینوں سے۔ سوائے دین اسلام کے۔ بیعت کی میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بواسطہ ان کے خلفاء کے۔ عہد کرتا ہوں کہ شرک نہ کروں گا۔ کفر نہ کروں گا۔ چوری نہ کروں گا۔ زنا نہ کروں گا۔ کسی کو ناحق قتل نہ کروں گا۔ کسی پر بہتان نہ باندھوں گا۔ جہاں تک ہو سکے گا خدا اور اس کے رسول کی ہمیشہ ہمیشہ اطاعت اور فرمانبرداری کرتا رہوں گا۔ اپنی طاقت بھر گناہوں سے بچتا رہوں گا۔ اگر کبھی کوئی گناہ ہو گیا تو بہت جلد توبہ کروں گا۔

توبہ کرتا ہوں میں ان سب گناہوں سے جو اگلے ہوں یا پچھلے۔ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ ظاہر ہوں۔ یا پوشیدہ۔ جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو میں نہیں جانتا۔ اے اللہ تو سب کچھ سنتا ہے۔ تو سب کچھ دیکھتا ہے تو سب کچھ جانتا ہے۔ تجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تو گناہوں کا بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ تو بار بار توبہ

لگا۔ خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اخیر تک بہت رویا کرتے تھے اور بالخصوص ابتدا میں تو اس قدر روتے تھے کہ تمام لحاف پر دھبے پڑ جاتے تھے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں کچھ لکھتا ہوا رہ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے۔ وہ سمجھے کہ کمرہ خالی ہے۔ قرآن شریف کی تلاوت فرمانے لگے۔ اور قرآن شریف کی تلاوت کے درمیان اس قدر بے قراری سے روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں یہ حالت دیکھ کر آہستہ سے وہاں سے اٹھ آیا۔

○

اگر ستر برس کی محنت و ریاضت کے بعد بھی تھوڑی سی توجہ محبوب حقیقی اور بارگاہ لم یزل کی حاصل ہو جائے تو نعمت غیر مترقبہ اور احسان غیر متناہی ہے ؎

اگر بدانم کہ خواہی آمد بتربت من تو گاہے گاہے

ان احترقت بنار عشقك و مت هجرا فلا ابالی

○

معاشی ضروریات اگرچہ باعث تخریب توجہ الی اللہ اور موجب تنغص ہیں مگر ان کے بغیر اس دار فانی میں چارہ بھی نہیں ہے ؎

اگر دنیا نہ باشد دردمندیم!

وگر باشد بمہرش پائے بندیم!

بہتر یہی ہے کہ "دل بیار و تن بکار" کا معاملہ رکھا جائے جہاں تک ہو سکے توجہ قلبی اور شغل لسانی ذکر کے ساتھ اور ہاتھ پیر اور ظاہر ان اشغال دنیاویہ کے ساتھ ہو۔ ؎

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش　　　ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

○

عبادت اور ذکر پر مداومت۔ اتباع سنت و شریعت پر قیام۔ یہی امور ہیں جن کے ہم مکلف ہیں۔ اور جن پر استقلال سے عمل پیرا ہونا۔ اور درجات احسان کا حاصل ہونا کمال ایمان ہے۔ خوف خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں۔

○

وساوس گزرتے رہیں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ سیلاب چلتا ہے اور اس پر خس و خاشاک چھلکے رہتے ہیں کچھ پرواہ نہ کیجئے۔ ہاں نماز میں یہ کوشش کیجئے کہ جو کچھ زبان سے پڑھا جا رہا ہے۔ وہ کیا ہے۔ اس کے معانی کا دھیان رکھتے ہوئے جناب باری عزاسمہٗ کو سامنے سننے والا۔ دیکھنے والا تصور کیجئے۔

قرآن مجید میں ہے۔ وما تکون فی شأن وما تتلوا منہ من قرآن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شهودا اذ تفیضون فیہ (الآیۃ) کے مطابق خیال باندھا کیجئے۔ غیوبت ہوجانے پر بھی بار بار کوشش کیجئے آہستہ آہستہ حالت درست ہوگی۔

○

یہ رضائے الٰہی اگر ہزار برس عبادت کے بعد بھی حاصل ہو تب بھی عظیم الشان کامیابی ہے۔

○

متصوفین پر کنٹرول کرنا اور ان کو قیود شرعیہ اور کتاب وسنت کی حدود میں مقید کردینا ازبس ضروری ہے ورنہ عام مسلمانوں میں سخت گمراہی اور الحاد کے پھیل جانے کا قوی امکان ہے۔ بخصوصاً اس وجہ سے کہ جوشِ عشقِ خداوندی اور غلبۂ سکر میں صوفیہ سے ایسے ایسے افعال واقوال صادر ہوجاتے ہیں جن کی شریعت کے احاطہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی تو انتہائی فتنوں کا سامنا ہوگا۔ علماء کا فریضہ ہے کہ ظاہری شریعت کی مکمل حفاظت کریں

○

جناب باری عزاسمہٗ ہماری عقل وادراک سے نہایت ہی زیادہ بلند اور بالا ہے۔ لیس کمثلہٖ شیٔ۔ ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم وخواندہ ایم

مگر تقریب وتفہیم کے لئے مندرجہ ذیل مثال پیش کرتا ہوں۔

ہر انسان میں ایک مرتبہ ذات کا ہے اس وجہ سے وہ سب سے بے پروا اور غیر متعلق ہے۔ دوسرا درجہ صفات کا ہے جو کہ تمام تعلقات خارجیہ کا سبب ہے۔ اس کا وصف کرم اس کو داد ودہش پر آمادہ کرتا ہے اسی پر وہ غریبوں اور فقراء ارباب حاجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ وصف اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان کی حاجت مندیوں پر بے چین ہوجائے اور اپنے مال وزر کو ان تک پہنچانے میں دریغ نہ کرے۔ وصف شجاعت قتل وقتال قہر وغلبہ پر مجبور کرتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس تمام اوصاف یہی معاملہ رکھتے ہیں۔

تیسرا درجہ جوارح کا ہے۔ جن کے وسیلہ سے وہ مقتضیات صفات کو خارج میں انجام دیتا ہے۔ کریم، شخص میں داد ودہش کی نوبت آتی اور ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شجاع میں قتل وقتال قہر وغلبہ کی عالم خارج میں صورت بنتی ہے۔ اگر یہ جوارح نہ ہوتے تو مقتضیات صفات کے ظہور کی صورت نہ بنتی۔ اسی لئے بلاشبہ تمام ذات باری عزاسمہٗ تمام خلائق سے مستغنی اور غیر متعلق ہے اس کی صفات کا یہ حال ہے جو کہ لا عین اور لا غیر ہیں۔ واسطہ بین القدیم والحادث ہیں۔ وہی تعلقات پیدا کرنے والی ہیں۔ اس کے بعد مرتبہ اسماء کا ہے۔ یہ اسماء عالیہ اپنے اپنے

اقتضاءات کے موافق تمام عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ جیسے کہ انسان کے جوارح اپنی قابلیت کے موافق تصرف کرتے ہیں۔ اسم رزاق مخلوق کو رزق دیتا ہے۔ جیسے کہ انسان کا ہاتھ داد و دہش کا کام انجام دیتا ہے۔ اسم خلاق ماہیات معلومہ بالعلم الازلی کو نعمت وجود بخشتا ہے۔ اور اسی طرح تمام اسماء مقدسہ کے تصرفات میں اسماء باری عز اسمہٗ ہمارے اسماء کی طرح تاثیر و قوت سے خالی نہیں۔ لاعین ولا غیر از ذات مقدسہ ہیں۔ ان میں وہ قدرت جو صفات ذاتیہ میں سے ہے۔ ظہور پذیر ہے جس سے ان کے تصرفات عالم میں جاری ہیں۔ جیسے کہ ہمارے جوارح ہماری صفات کے مظاہر ہیں۔ اسماء باری تعالےٰ کا تعلق ہر انسان کے ساتھ علیحدہ ہے۔ کسی شخص کا مربی اسم علیم ہے۔ کسی کا مربی اسم قدیر ہے۔ کسی کا دوسرا اسم ہے۔ اہل اللہ کا ارشاد ہے۔ طرق الوصول الی اللہ بعدد نفس الخلائق اس کا راز بھی یہی ہے جو اسم کسی کا ... . مربی ہے۔ اس اسم کے ذکر اور تصور دائم سے اس کو جلد ترقی ہو سکتی ہے۔ مگر ان کا تمیز کرنا ماہرین کو بھی مشکل ہے۔ اس لئے اسم جامع لفظ اللہ سالک کو تعلیم دیا جاتا ہے۔ سالک کی ترقی اس کے مربی اسم تک ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

○

غور فرمائیے کہ آیا علم خداوندی کی وجہ سے انسان کا ارادہ اور اختیار چھین جاتا ہے اور وہ اپنے کاروبار میں رعشہ والے اور اوپر سے نیچے گرنے والے کی طرح بے اختیار اور بے قدرت ہو جاتا ہے یا نہیں؛ بلکہ وہ اپنے اندر پورا اختیار رکھتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ مجھ کو قدرت ہے۔ خواہ چراؤں یا نہ چراؤں۔ تو پھر اس کو مجبور اور معذور کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ خداوند کریم کا علم صحیح ہے اور تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے نہیں نکل سکتی۔ اور نہ اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ایسا ہے کہ جیسے ایک اعلیٰ درجہ کا نجومی، جوتشی، کاہن، رمال، یا اعلیٰ کشف والہام والا ولی آنے والی باتوں کو جانتا ہے۔ اور جیسی پیشین گوئی وہ کرتا ہے ویسا ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ تو کیا اس پیشین گوئی کی وجہ سے۔ اس کے علم کی وجہ سے۔ جو کسی چوری، ڈاکہ یا ظلم وغیرہ کے متعلق ہوتی ہے۔ چور یا ڈاکو یا ظالم مجبور ہو جائے گا اور اس کے قدرت و ارادہ میں ذرہ بھر بھی کمی ہو گی؟ ٹائم ٹیبل میں گاڑیوں کے وقت مقرر ہیں۔ ہم اس کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ فلاں گاڑی فلاں وقت اتنے منٹ پر علی گڑھ پہنچ جائے گی تو کیا اس کی وجہ سے انجن ڈرائیور مجبور ہو جائے گا۔ اور اس کی قدرت مسلوب ہو جائے گی؟

نہیں نہیں۔ اگرچہ اس مثال میں کمی ہے مگر علم کی حقیقت سمجھنے میں مؤید ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے علم کی وجہ سے لوگ مجبور نہیں ہوتے۔ ان کا اختیار اور ان کی قدرت پوری طرح باقی رہتی ہے۔ اسی کی بناء پر لوگوں سے مواخذہ ہوتا ہے کہ تم کو ہم نے حکم دیا تھا چوری مت کرو۔ تم نے اپنے ارادہ و اختیار سے چوری کی۔ نیز خدا کے

علم کو نہ تو چور کو چوری سے پہلے علم تھا نہ کسی نافرمان کو۔ بلکہ اس کو چوری اور نافرمانی کے بعد یہ علم ہوگا۔ تو جب کہ اس نے گناہ اور چوری کا ارادہ اور عمل اپنے ارادہ و اختیار سے کیا ہے تو اس پر مواخذہ کرنا بالکل صحیح ہوگا۔

میرے محترم! علم کی حقیقت ذہنی اور قلبی روشنی سے کسی چیز کو جان لینا ہے۔ جیسے کہ البصار کی حقیقت ان آنکھوں کی روشنی سے کسی چیز کو دیکھ لینا ہے۔ چونکہ اللہ تعالےٰ کا علم نہایت قوی ہے اس لئے وہ تمام اشیاء کو حقیقی طور پر جانتا ہے اور اس میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ جیسے قوی بصارت والا چیزوں کو کماحقہ دیکھ لیتا ہے اس میں غلطی نہیں ہوتی۔ علم کی حقیقت یہ نہیں کہ کرنے والوں کے ارادہ اور اختیار کو چھین لے تو چور نے جس طرح چوری کی۔ اس طرح سے خدا نے اپنے قوی علم سے جان لیا کہ چور نے اپنے ارادہ و اختیار اور قدرت سے چوری کی اس لئے اس پر گرفت کرنا صحیح اور ضروری ہے۔

○

الدعاء مخ العبادۃ　صاف طور سے بتا رہا ہے کہ دل لگا کر تضرع وزاری کرنا عبادت ہی نہیں، بلکہ افضل تر ہے اس کو عمل میں لائیے۔ دعا میں دل لگنا ضروری ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ان اللہ لا یقبل الدعا بقلب لاہٍ　لہٰذا دعا میں دل لگنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظلوم کی دعاء بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خلوص دل سے نکلتی ہے۔ تاہم اگر دل نہ لگے تب بھی فائدہ سے خالی نہیں لیکن کوشش کرنا ضروری ہے۔

○

ایمان کو ہمیشہ بین الخوف والرجاء ہونا چاہیئے　ادعوہ خوفا وطمعا　نص قرآنی ہے اور اس معنے میں مختلف آیت صریح موجود ہیں۔ مگر حالت زندگی میں غلبہ خوف کا ہونا چاہیئے اور قرب موت میں غلبہ رجاء کا ہونا چاہیئے

لقولہ علیہ السلام فی الحدیث القدسی ۔ انا عند ظن بی وسبحانہ
وتعالیٰ افامن اھل القری ان یأتیھم بأسنا ضحی وھم یلعبون
افامنوا مکر اللہ فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون ۔
وقال، لا تیئسوا من روح اللہ　(الآیۃ)

○

جس طرح تمام اعضاء وجوارح عطاء خداوندی ہیں۔ اسی طرح ارادہ ومشیت بھی ہے۔ جس بنا پر اس انسان کو صاحب الاعضاء والجوارح کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کو بے زبان و بے عقل اور بے ہاتھ، بے پیر وغیرہ نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح اس کو بے ارادہ۔ اور بلا مشیت کہنا غلط ہوگا۔ مجبور وہ شخص ہوگا جو کہ بلا ارادہ ہے اور

وہی افعال جبری افعال کہے جاسکتے ہیں۔ جن میں تداخل ارادہ کا نہیں ہوتا۔ جیسے مرتعش کی حرکت اور اس پتھر کی حرکت جس کو پھینکنے والے نے پھینکا ہے۔ اور جس طرح جسم انسانی جب بلا ارادہ فوق سے اسفل کو آتا ہے۔ یہ حرکت البتہ جبری اور بلا اختیار ہے۔ خود انسان اپنی حرکت رعشہ اور حرکت جسمانی میں از فوق سے تحت کر، کسی قسم کا ارادہ نہیں محسوس کرتا خود کو مجبور محض پاتا۔ بخلاف افعال اختیاریہ کے کہ وہ ان میں اپنے ارادہ و اختیار کو صدور افعال کا محسوس کرتا رہتا ہے۔ اور یقین کرتا ہے کہ اگر میں چاہوں اس حرکت کو روک دوں۔ اس لئے ان افعال اختیاریہ میں مجبوری کا ادعا محسوس و مشاہدہ کے خلاف ہے۔ ثواب و عتاب ان ہی افعال اختیاریہ میں ہے۔ جن میں انسان کو بھی احساس ہے کہ میرے اختیار و ارادہ سے پائے جا رہے ہیں۔ افعال کو تحقق سے پہلے جب چاہوں روک دوں۔ یہ اختیار جبری۔ جس کو ہر فعل اختیاری جبری کا منشا اور مصدر محسوس کیا جاتا ہے۔ کسب کو کہا جاتا ہے۔ جس کو ماتریدیہ اور دیگر متکلمین اثر قدرت حادثہ کہتے ہیں۔ بہرحال تخلل ارادہ و اختیار ہوتے ہوئے جبر کہنا خلاف مشاہدہ ہے۔

جناب کا ارشاد کہ مشیت تابع مشیت رب ہے۔ خود اس کا اقرار ہے کہ مشیت عبد موجود ہے۔ پھر اس کو منعدم قرار دینا اور جبر سے تعبیر کرنا کیوں کر غلط نہ ہوگا۔ اور جب اختیار جبری موجود مسلم ہے تو ثواب و عقاب یقیناً عدل ہوگا۔

○

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ غلطیاں جن کو آپ امکان بلکہ وقوع کے درجہ میں دکھلا رہے ہیں۔ اگر روایات تاریخیہ اور آحاد سے ثابت ہیں تو وہ ان قطعیات قرآنیہ کے سامنے کسی طرح کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور اگر ان کی کوئی حقیقت ہو بھی تو وہ نیت ہائے فاسدہ سے صادر ہوتی ہیں یا نیت ہائے صالحہ سے۔ کیونکہ بسا اوقات غلط فہمی اور خطا سے کوئی عمل صادر ہوتا ہے۔ مگر وہ قباحت میں، ان اعمال قبیحہ سے بہت گرا ہوا اور خفیف شمار ہوتا ہے۔ جو کہ عمداً اور بہ نیت فاسدہ وقوع میں آئے ہوں۔ قتل عمد اور قتل خطا کی سزاؤں میں کس قدر تفاوت ہے حالانکہ دونوں میں مقتول کی جان ہلاک ہوتی ہے۔

○

ائمہ اہل سنت والجماعت مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خطاء اجتہادی قرار دیتے ہیں۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کے ارتکاب اکل شجرہ کا ارشاد فنسی ولم نجد له عزما ذنب خفیف اور غیر موجب مواخذہ اور داخل فی العصمۃ قرار دیتا ہے تو حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشاجرات کو ان کے مناقب کی آیات اور آیات صحیحہ کیوں نہ ہلکی اور غیر قابل مواخذہ اور داخل فی المحفوظیت قرار دیں گی۔ اور کیوں نہ ان کے دامن کو خطاء اجتہادی قرار دے کر منزہ اور پاک سمجھا جائے گا۔"

○

لفظ معیار حق ایک لغوی لفظ ہے۔ کسی فن کا اصطلاحی لفظ نہیں ہے۔ لغت عربی میں معیار ہر اس شے پر بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی مقدار پہچانی جائے۔ خواہ ناپ وکیل ہو یا وزن وغیرہ۔ اس لئے ہر وہ شخص جس کے فعل، قول، عقیدہ حال پر پورا اعتماد اس طرح ہو جائے کہ اس میں قصداً غلطی اور نافرمانی کی گنجائش نہ ہو وہ معیار حق ہو گا اور اس کے ذریعہ سے حق پہچانا جائے گا۔ خواہ اس پر وحی الٰہی آتی ہو یا نہیں۔

○

اگر رسول یا نبی نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام قطعی اور قدیم میں اس شخص کے متعلق خبر دیتا ہے کہ ہم اس سے راضی ہیں تو یقینی بات ہے کہ اس سے قصداً کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا ورنہ اس کے علم قدیم میں ہو کر لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ کا مصداق ہے۔ خلل لازم آئے گا۔ یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ قصداً گناہ کرنے والے سے بھی راضی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ حق وہ ہی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں۔ قرآن مجید میں ہے لا یرضیٰ لعبادہ الکفر اس لئے کسی ایسے شخص کے معیار حق ہونے پر تامل کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ میں اپنے راضی ہونے کی خبر دی ہو۔ جیسے سابقین اولین مہاجرین اور انصار اور تابعین بالاحسان کے لئے سورہ توبہ میں۔ اور اصحاب حدیبیہ کے لئے سورہ فتح میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

○

تمام اہل سنت والجماعت مسلمان ہمیشہ سے اس امر پر متفق ہیں کہ جو شخص کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صدق دل سے کہے اس کا ایمان اجمالی متحقق ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی تمام یقینی باتوں وحدانیت، رسالت، ملائکہ، کتاب ہائے خداوندیہ، قیامت، تقدیر، ختم نبوت وغیرہ قطعیات کو دل سے مان لے اور اقرار کر لے اس کا تفصیلی ایمان متحقق ہو جاتا ہے۔ اور وہ مسلمان اور ملت اسلامیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اعمال کی کوتاہی سے یہ اسلام اور ایمان ضائع نہیں ہوتا۔ اعمال ضروریہ میں کوتاہی سے صرف فسق آتا ہے، کفر نہیں آتا۔ ہاں اگر ان امور ایمانیہ کا انکار وجود پایا جائے تب بیشک استحقاق کفر ہوتا ہے اعمال خواہ کسی درجہ کے ہوں انکا ترک کرنیوالا کافر نہیں ہوتا البتہ گمراہ فرقے خوارج، معتزلہ وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ اعمال مرضیہ کے ترک کرنے سے یا کبیرہ گناہ کے مرتکب ہونے سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے۔

○

بدا الاسلام غریبا (الحدیث) کا ترجمہ یہ کرنا کہ اسلام غریبوں سے پھیلا۔ اور پھر غریبوں میں لوٹ آئے گا۔ لغت عربی کے خلاف ہے۔ ہماری زبان اردو میں غریب کا ترجمہ مسکین اور فقیر سے کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص

غریب ہے جس کے پاس مال و دولت نہ ہو۔ مگر عربی میں یہ معنی نہیں ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ سب سے پہلے، ایمان لانے والے مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جو مکہ معظمہ میں بہت بڑے تاجروں اور مالداروں میں سے تھے۔

غریب عربی میں اوپرے شخص کو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو کہ مشہور اور معروف نہ ہو۔ لوگ عام طور پر اس کو جانتے اور پہچانتے نہ ہوں۔ خواہ وہ مال دار ہو یا مسکین و نادار۔ اسی وجہ سے مسافر کو غریب کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ بدیسی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی پہچان میں نہیں آتا۔ جو چیز نادر الوقوع ہوتی ہے اس کو بھی غریب کہتے ہیں۔ کیونکہ قلیل الوقوع ہونے کی وجہ سے وہ مشہور و معروف نہیں ہوتی۔ اور اس میں غرابت و ندرت آجاتی ہے لوگ اس سے مانوس نہیں ہوتے۔

نیز اس حدیث میں اسلام کو ذوالحال قرار دیا گیا ہے۔ جو کہ مجموعۂ احکام، عقائد و اقرار و اعمال سے، عبارت ہے۔ یعنی دین اسلام غریب تھا نہ کہ اہل اسلام۔ اگر اہل اسلام کی غربت مراد ہوتی۔ جیسا کہ اردو والے اور آپ کے یہاں کے لوگ کہتے ہیں تو جانب ذوالحال میں لفظ اہل کہا جاتا۔ یا بدا المسلمون کہا جاتا اور جانب حال میں غرباء کہا جاتا۔

○

صبر کا ثواب اور اس کا کمال صدمہ کے اوائل میں ہے۔ زمانۂ دراز گزرنے کے بعد طبعی طور پر صبر آ ہی جاتا ہے۔ لہذا وہ عظیم الشان خلق صبر جس کی تاکید اور تعریف میں قرآن شریف میں تیس سے زیادہ آیات موجود ہیں۔ اس کو اور اس کے ثواب کو ہرگز نہ ضائع ہونے دینا چاہئے۔ والصبر عند الصدمة الاولیٰ۔

○

سجدہ دو قسم کا ہے۔ (۱) سجدۂ عبادت۔ (۲) سجدۂ تحیۃ۔ سجدۂ عبادت بالاتفاق تمام امتوں میں غیر اللہ کے لئے حرام اور ممنوع تھا اور ہے۔ اور سجدۂ تحیۃ امم سابقہ میں مباح۔ اور جائز تھا امت محمدیہ میں اس کو بھی منع کر دیا گیا۔

○

عشاء کے بعد کسی وقت نماز پڑھنا تہجد ہے۔ کیونکہ اس میں ترک نوم ہے۔ اگر مطالعہ سے فراغت پانے کے بعد قبل استراحت دو رکعت پڑھ لیں تو یہ بھی تہجد ہو جائے گی۔

○

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مجاورت مدینہ کو چھوڑ دیا۔ ہزاروں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور کروڑوں اولیاء اللہ غیر عرب میں

ہوئے اور وہیں مرے ۔ کیا ان کو عشق نبویؐ نہ تھا ۔ کیا ان کو ایمان اور غیرت ایمانی نہ تھی ۔ وہاں رہنا فرض نہیں ۔ واجب نہیں ۔ مقصود اصلی رضائے الٰہی ہے جہاں بھی حاصل ہو جائے کار آمد ہے ۔

○

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع کے موقعہ پر منیٰ میں اپنا نہایت جامع اور فصیح خطبہ پڑھا ۔ جس میں اجمالاً تمام شرائع سلامیہ کو ذکر کیا گیا تھا ۔ تو ابو شاہ نے اس کے لکھوا دینے کی استدعا کی ۔ آپ نے فرمایا ۔ اس کو لکھ دو ۔ (بخاری)

زکوٰۃ ، حیوانات ، اور نقود وغیرہ کے متعلق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیلات اپنے عاملوں کو لکھوا کر دیں ۔ جو کہ کتاب ابن حزم وغیرہ کے نام سے مشہور ہے ۔ دیت کی اقسام اور ان میں اونٹوں کی عمریں وغیرہ درج ہیں ۔ جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ کوئی چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے موجود ہے ، فرمایا کہ نہیں ۔ مگر جو کاغذ ہماری تلوار کے میان میں موجود ہے ۔ پوچھا گیا کہ اس میں کیا ہے ؛ کہا ۔ دیت کے اونٹوں کی عمریں اور احکام اہل ذمہ وغیرہ ۔ (بخاری)

○

جناب باری عز اسمہ کی وہ صفات جو کہ مقتضی معبودیت ہیں ان کا مرجع دونوں کی طرف ہوتا ہے ۔ اوّل مالکیت ۔ نفع وضرر ۔ دوئم ۔ محبوبیت ۔ اوّل کو جلال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اور ثانی کو جمال سے مگر یہ تعبیر ناقص ہے ۔ جلال محض مالکیت ضرر پر متفرع ہوتا ہے ۔ جس طرح جمال اسباب محبوبیت میں سے ایک سبب ہے ۔ وجوہ محبوبیت علاوہ جمال کے کمال قرب و احسان بھی ہیں ۔ اوّل یعنی مالکیت نفع وضرر کا اقتضاء معبودیت حدود عقل میں رہ کر ہونا ضروری ہے ۔ اس معبودیت میں عابد کی ذاتی غرض چونکہ باعث عبادت ہے ۔ یعنی طمع یا خوف یا دونوں ۔ اس لئے یہ عبادت اس قدر کامل نہ ہوگی جس قدر وہ عبادت جس میں محض رضائے معبودیت مقصود ہو ۔ ظاہر ہے کہ محبوب کی جو کچھ اطاعت اور فرمانبرداری کی جاتی ہے اس سے محض اس کی رضا مطلوب ہوتی ہے ۔ لہٰذا ضروری تھا کہ دونوں قسموں کی عبادتیں دین کامل میں ملحوظ ہوں ۔

قسم اول کی متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول نماز اور زکوٰۃ ہیں ۔ اور قسم ثانی پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول روزہ اور حج ہیں ۔ روزہ معبودیت کی منزل اول ۔ اور حج منزل ثانی ہے ۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عاشق پر اولین فریضہ یہی ہے کہ اغیار سے قطع تعلق کیا جائے جو کہ روزہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ دن کو اگر صیام کا حکم ہے تو رات کو قیام کا ۔ آخر میں اعتکاف نے آکر رہے سہے تعلقات کا خاتمہ بھی کر دیا ۔ بحکم من شھد منکم الشھر فلیصمہ " اور من قام رمضان ایمانا (حدیث)

اگر استیعاب صوم رمضان کا پتہ چلتا ہے تو بحکم احیٰی لیلۃ ومن صام رمضان (الحدیث) وغیرہ سے استیعاب قیام رمضان کا بھی پتہ چلنا ضروری ہے۔ اور چونکہ کمال صومی کے لئے محض مالوفات ثلثہ کا جو کہ اصل الاصول ہیں۔ ترک مطلوب نہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ معاصی اور شتہیات لفسانیہ کا ترک بھی مقصود ہے۔

من لم یدع قول الزور (الحدیث)، اور رب صائم لیس له من صومه الا الجوع (الحدیث) اس کے شاہد عدل ہیں۔ جب ترک اغیار کا اثبات (جو کہ منزل عشق کی پہلی گھاٹی ہے) ہو گیا۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ دوسری منزل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ یعنی کوچۂ محبوب اور اس کے دار و دیار کی جبہ سائی کا فخر حاصل کیا جائے۔ اس لئے ایام صیام کے ختم ہوتے ہی ایام حج کی ابتداء ہوتی ہے۔ جن کا اختتام ایام نحر (قربانی) پر ہے۔

کوچۂ محبوب کی طرف عاشق کا سفر کرنا۔ جس نے تمام اغیار کو ترک کر دیا ہو۔ اور سچے عشق کا مدعی ہو۔ معمولی طریقے پر نہ ہو گا۔ نہ اس کو سر کی خبر ہو گی نہ پیر کی۔ نہ بدن کی زیب و زینت کا خیال ہو گا۔ نہ لوگوں سے جھگڑا اور نہ لڑنے کا ذکر۔ فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج ۔ کہاں عشق اور کہاں آپس کے جھگڑے اور لڑائیاں۔ کہاں قلبی اضطراب اور کہاں شہوت پرستی اور آرام طلبی۔ نہ سر کی فکر نہ خوشبو اور تیل کا دھیان۔ اس کو آبادی سے نفرت۔ جنگلی جانوروں اور جنگل سے الفت ہونی ضروری ہے۔ وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما سیر و شکار جو کہ کار بے کاراں ہے۔ ایسے عشاق اور مضطر النفوس کے لئے بے حد نفرت کی چیز ہو گی۔ واذا حللتم فاصطادوا ان کی تو دن رات کی سرگرمی معشوق کی یاد۔ اس کے نام کو جپنا۔ اپنے تن بدن کو بھلا دینا۔ دوست، احباب، عزیز و اقارب، راحت و آرام کو ترک کر دینا، نہ نیند آنکھوں میں بھلی معلوم ہو گی۔ نہ لذائذ اطعمہ، اور خوشبو دار اور خوش ذائقہ اشربہ والبسہ کا شوق ہو گا۔ ؎

یداری هواه ثم یکتم سره ویخشع فی کل الامور ویخضع

جوں جوں دیار محبوب اور ایام وصال کی قربت ہوتی جائے گی۔ اسی قدر ولولہ اور فریفتگی اور جوش جنوں میں ترقی ہوتی رہے گی۔ ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

ان دنوں جوش جنوں ہے ترے دیوانے کو لوگ ہر سو سے چلے آتے ہیں سمجھانے کو

نو بہار است جنوں چاک گریباں مدے   آتش افتاد بجاں جنبش داماں مدے
قریب پہنچتے ہیں تو (میقات پر) اپنے رہے سہے میلے کچیلے کپڑوں پھینک دیتے ہیں۔ اس وادی عشق میں گریباں اور دامن سے کیا کام؟ ؎

ہم نے تو آپ اپنا گریباں کیا ہے چاک
اس کو سیا ہے کیا ہے سیا پھر کسی کو کب

اگر غم ہے تو محبوب کا۔ اگر ذکر ہے تو معشوق کا۔ اگر طلب ہے تو پیا کا۔ اگر خیال ہے تو دلبر کا۔ ؎

عشق میں تیرے کوہ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

کوچۂ محبوب میں پہنچتے ہیں تو اس کے در و دیوار کے ارد گرد پوری فریفتگی کے ساتھ چکر لگاتے ہیں سر چوکھٹ پر ہے تو لب دیواروں اور پتھروں پر۔

امر علی الدیار دیار لیلی   اقبل ذالجدار و ذوالجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی   ولکن حب من سکن الدیارا

کسی نے اگر جھوٹی سی خبر دی کہ معشوق کا جلوہ فلاں جگہ نمودار ہونے والا ہے۔ تو بے سرو پیر ہو کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچتے ہیں۔ نہ کانٹوں کا خیال ہے نہ راستہ کے پتھروں کی فکر۔ نہ گڑھوں میں گرنے کا خوف ہے نہ پہاڑوں کی سختیوں کا ڈر ہے۔ مجنون بنی عامر کا سماں بندھا ہوا ہے۔ بدن میں اگر جوں ڈھیروں پڑی ہوئی ہیں تو کیا پرواہ ہے۔ اہل عقل اور اہل زمانہ اگر پھبتیاں اڑاتے ہیں تو کیا شرم آتی ہے۔ ؎

جب پیت بھئی تب لاج کہاں   سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے
دکھ درد پڑے تو کیا چنتا   اور سکھ نہ ہے تو کیا ڈر ہے

اگر ناصح ناداں عشق سے روکتا ہے۔ تو آتش عشق اور بھڑک جاتی ہے۔ ناداں ناصح کو پتھر مارتے ہوئے اپنے آپ کو قربان کر دینے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ؏

ناصحا! مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے

فومن احب لاعصینک فی الھویٰ   قسما بہ و بحسنہ و بھائہ

اے ملامت گر! اپنے محبوب کی ذات اور اس کے حسن و جمال کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہوں کہ سلسلۂ محبت میں ضرور تیرے حکم کی خلاف ورزی کروں گا۔

میرے محترم! یہ تھوڑا سا خاکہ حج اور عمرہ کا ہے۔

○

ترمذی نے اس (حدیث انا مدینۃ العلم و علی بابہا) کی تحسین کی ہے جس میں حسن لغیرہ ہونے کا احتمال بھی ہے۔ اور ممکن ہے کہ کسی نے اس کی تصحیح بھی کی ہو۔ تاہم یہ حدیث ان روایات سے مقابل ہونے کی طاقت نہیں رکھتی جو بالاتفاق صحیح ہوں۔ بس بوقت تعارض ساقط بھی جانے گی۔ اگر اس کے مفہوم میں تعارض نہ ہو، تو البتہ قابل استناد قرار دی جا سکتی ہے۔ مگر جب ہم لفظ مدینہ اور لفظ باب میں غور کرتے ہیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ مدینہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہت سے مکانات مجتمع ہوں۔ ایک مکان بلکہ دس پندرہ مکانات والی آبادی کو مدینہ نہیں کہتے۔ خود لفظ مدینہ کا لغوی معنیٰ بھی اجتماع پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس علمی مدینہ میں بہت سے علمی گھر ہوں گے اور بہت زیادہ آبادی اس کے اندر ہوگی۔ اور دروازہ خواہ مکان کا ہو یا شہر کا ہمیشہ خارج ہوا کرتا ہے۔ شہر کا اندرونی حصہ یا مکان کا اندرونی حصہ شمار نہیں کیا جاتا۔ اور کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ من وجہ خارج ہو۔ اور من وجہ داخل ہو۔ اس بناء پر اور صحابہ کرام بالخصوص ان میں سے خواص رضی اللہ عنہم اس مدینۃ العلم کے اندر والے ہوں گے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بحیثیت باب اندر داخل نہیں ہوں گے۔ لہذا ان کی فضیلت دیگر صحابہؓ پر ثابت نہ ہوگی۔ ہاں باہر سے آنے والوں یعنی غیر صحابہ پر ممکن ہے کہ فضیلت ثابت کی جائے کہ ان کو اس مدینہ میں بغیر توسط حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے اشکال کی وجہ باقی نہیں رہتی۔

○

ہر نص میں بہت سی قیود بوجہ ظہور ملحوظ ہوتی ہیں۔ جن کو بسا اوقات ذکر نہیں کیا جاتا اور وہ بالاتفاق ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً حدیث میں قلبی یقین اور تصدیق کا تذکرہ نہیں ہے۔ فقط یہی کہا گیا ہے کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ تو کیا اگر یہ کلمہ استہزاء اور مذاق کے طور پر۔ یا کسی کلام کی نقل کے طور کہا تو وہ بھی مستحق ہو گا۔ یا کسی نے مسلم جیش کے سامنے جان بچانے کے لئے یہ کلمہ کہا اور قلب میں تصدیق نہیں ہے اور حسب تصریحات، روایات و آیات قید تصدیق قلبی کی ضرور لگانی ہوگی یا عدم انکار کی بھی قید ضروری ہوگی۔ اسی طرح اس روایت میں ایمان بالرسالت کی بھی قید لگانی ضروری ہوگی۔

سورۂ حجرات میں ہے۔

انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولئک ھم الصادقون۔

ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ پھر شبہ نہ لائے اور

جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔ وہ لوگ جو ہیں وہ ہی سچے ہیں"
لفظ انما جو کہ صیغۂ حصر ہے۔ یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لئے حدیث جبرائیل علیہ السلام، میں اور حدیث وفد عبدالقیس میں ایمان کی تفصیل اور تعریف بیان کرتے ہوئے ایمان بالرسل والملائکہ والکتب والقیامت والقدر کو ذکر فرمایا گیا ہے۔

توحید کا دعوٰے تو یہود ونصارٰے، مشرکین عرب اور ہنود ہند سب کرتے ہیں۔ مگر اسی توحید کے ساتھ یہود عزیر علیہ السلام ابن اللہ، یداللہ مغلولۃ اور ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء، اور تجسیم وغیرہ کے قائل ہیں۔ نصارٰی اسی توحید کے ساتھ تثلیث اور ابنؔ اور روحؔ اور زوجہؔ وغیرہ کے قائل ہیں۔ بت پرستان ہند۔ "نرانکار" صرف خدا کے قائل ہوتے ہوئے اوتاروں اور عبادت غیراللہ کے قائل ہیں۔ تجسیم اور حلول وغیرہ ان کے عقائد ہیں۔ کیا ایسی توحید قابل اعتبار ہوگی۔ اس لئے قائل من قال لا الہ الا اللہ سے جو تفسیر توحید منقول ہے وہی موجب نجات ہوگی۔ اور جب اس کی تعلیم کا اعتبار کیا گیا تو تصدیق رسالت لازم آگئی۔ ورنہ توحید حقیقی نہیں لفظی ہے جو کہ قابل اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم۔

اسی روایت میں من قال لا الہ الا اللہ (الحدیث) کے جملہ طرق اگر جمع کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ روایت مختصر واقع ہوئی ہے۔ اس میں کچھ اور بھی زیادتی ہے۔ جو کہ راوی نے بوجہ ظہور یا اختصار یا نسیان یا عدم ضرورت بعض اوقات میں چھوڑی ہے۔ اور بعض اوقات میں ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً مخلصا من قلبہ بخاری شریف وغیرہ میں اسی روایت میں موجود ہے۔ دوسری روایتوں میں وانی رسول اللہ بھی موجود ہے۔ اسی لئے ائمہ فن فرماتے ہیں کہ جب تک کسی روایت کو اس کے تمام طرق سے نہ دیکھا جائے اس کے معنی متعین کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

○

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ افضل ہیں یا معاویہ (رضی اللہ تعالٰے عنہ) تو فرمایا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے نتھنوں کی خاک جس پر سوار ہو کر انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا ہے عمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل ہے۔

○

رفتہ رفتہ اس مروجہ طریقہ ایصال ثواب میں بہت سی غیر مفید اور ناجائز باتیں داخل کر لی گئی ہیں جو کہ ایصال ثواب کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً اس کو تبرک سمجھنا اور خود کھانا۔ احباب میں تقسیم کرنا۔ اغنیاء کو کھلانا۔ اور یہ اعتقاد کرنا کہ کھانا اس بزرگ کا پس خوردہ ہے۔ جس کے نام پر ایصال ثواب کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح دیگر امور مثلاً جگہ کا لیپنا۔ خوشبو کا لگانا۔ پڑھنے والے امام یا مؤذن یا مولوی کا حاضر ہونا۔ اور پڑھنا۔ عوام کے اعتقاد میں یہ امور اگر نہ ہوں تو ایصالِ ثواب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اور عموماً یہ چیزیں نام و نمود اور شہرت کی غرض سے ریاء و سمعہ کی جاتی ہیں۔ یا لوگوں کے لعن طعن سے بچنے کی غرض سے ہوتی ہیں۔ اخلاص ہوتا ہی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

بسا اوقات مال ہی حلال نہیں ہوتا۔ بالخصوص میت کے وصال کے بعد اس کے ترکہ میں سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ عموماً ورثاء سے اجازت نہیں لی جاتی۔ بالخصوص جب کہ وارث بعض یا کل غائب یا نابالغ ہوں۔ مسکینوں اور غریبوں کو یہ مال دیا ہی نہیں جاتا۔ اور اگر دیا جاتا ہے تو بہت ہی کم اور ادنیٰ قسم۔ عمدہ اور اکثر حصہ طعام اغنیاء اور اہل خانہ ہی کھاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کھانے میں کسی ثواب کی امید نہیں ہے۔

○

اصحاب حقوق کے مال کی مقدار میں خیرات کی جائے (یعنی اگر وہ فوت ہو چکے) یا کوئی مانع ہے۔ اور ان کے حق کی وصولی و ادائیگی کی نیت ہو۔ یعنی اس کا ثواب صاحب حق کو پہنچے اور ان لوگوں کے لئے استغفار اور دعا کی جائے کہ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے انعامات ان کو دے کر مجھ سے راضی کرا دے تاکہ وہ اپنے اپنے حقوق معاف کر دیں۔

○

ایسی نمازیں جو کہ شرعی نقطۂ نظر سے صحیح ہوتی ہیں۔ ان کا اعادہ واجب نہیں ہے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ خیالات نہ آئیں۔ اور جب آئیں تو ان کو دفع کر دینا چاہئے۔ اور یہ تصور کرنا چاہئے کہ میں اس شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوں جو دلوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور میرے قلب کی باتوں پر مطلع ہے۔ وہ میری باتوں کو سنتا اور میری حرکات و سکنات کو دیکھتا ہے۔ اس دھیان کو بڑھانا چاہئے۔ آہستہ آہستہ انشاء اللہ خطرات و خیالات کم ہو جائیں گے۔ نیز سورۂ ناس کو شام یا صبح معنی کے خیال کے ساتھ ایک تسبیح روزانہ پڑھ لیا کریں۔

○

جو نمازیں قضا ہیں ان کو پڑھ لینا چاہئے۔ اور صحت نماز کی شرائط کو جہاں تک ممکن ہو ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کر لینا چاہئے۔ قابلیت قبول کی امید پر مؤخر کرنا ہرگز ہرگز نہ چاہئے۔

○

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسےٰ علیہ السلام سے کہا کہ میری ماں کے بیٹے! میری داڑھی اور میرا سر مت پکڑ۔ لا تاخذ بلحیتی ولا برأسی۔

اگر حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی قبضۂ مشت سے چھوٹی ہوتی تو حضرت موسےٰ علیہ السلام کس طرح پکڑ سکتے تھے۔

عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکثر دھن راسہ وتسریح لحیۃ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں تیل کی مالش اور کنگھی سے داڑھی کی آرائش بکثرت کرتے تھے۔ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جس داڑھی میں کنگھی ہوتی ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کو سنوارا جائے اور یہی حال چھوٹی داڑھی کا ہے۔

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشر من الفطرۃ قص الشارب واعفاء اللحیۃ والسواک والاستنشاق بالماء وقص الاظفار وغسل البراجم ونتف الابط وحلق العانۃ وانتقاص الماء یعنی الاستنجاء۔

یعنی دس چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ مونچھوں کا کترانا۔ داڑھی کا بڑھانا اور مسواک کرنا۔ الخ

(ابن ماجہ ص۲۵ ، مسلم ص۱۲۹ ، ابو داؤد ص۸ ۔)

اس حدیث میں جو کہ نہایت قوی روایت ہے۔ دس چیزوں کو جن میں داڑھی کا بڑھانا اور مونچھوں کا کتروانا بھی ہے۔ فطرت بتلایا ہے۔ اور فطرت عرف شرع میں ان امور کو کہا جاتا ہے جو کہ تمام انبیاء اور رسولوں کے، معمول اور متفق علیہ ہیں اور ہم کو ان پر عمل کرنے کا حکم ہے۔

○　◎　○

حضرت مدنی کا زیارت سید دو عالم سے مشرف ہونا

سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے مجھے دیکھا پس وہ یقین کرے کہ اس نے مجھے ہی دیکھا۔ کیوں کہ شیطان میری صورت مثالی کبھی نہیں بنا سکتا۔" شیخ الاسلام حضرت مدنی کو زیارت امام الانبیاء خواب میں بھی تو کئی بار ہوئی اور جاگتے بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" میں ارقام فرمایا "ایک روز ایک کتب اشعار کی دیکھ رہا تھا۔ اس میں ایک مصرعہ تھا۔ ع ▪ ہاں سے حبیبؐ نہ سے اٹھا دو نقاب کو ▪

▪ یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا۔ میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور مواجہہ شریفہ میں بعد ادائے آداب و کلمات شرعیہ انہیں الفاظ کو پڑھنا اور شوق دیدار میں رونا شروع کیا۔ دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ کا حائل نہیں ہے اور آپ سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کا چہرۂ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے۔" (ص ۱۰۱) ○

نظم

حضرت مولانا سید محمد اسعد مدنی کی نذر

آغا شیرازی

اے حسین احمد کے فرزندِ گرامی السلام
سرزمین ہند میں حق کے پیامی السلام

باپ تیرا دشمن افرنگ جان و دل سے تھا
وہ علمبردار حق جنگ آزما باطل سے تھا

والد مرحوم کے تو نقش پا پر ہے رواں
کیوں نہ چومے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

آہ وہ ہندوستاں جس پر رہے ہم حکمراں
کفر نے ہم کو نکالا ہے وہاں سے بے گماں

کفر نے چھینیں ہماری مائیں بہنیں بیٹیاں
ہاں مگر ہم کو نہیں ہے ابتک یہ احساس زیاں

تین ٹکڑوں میں وہ ہندوستاں آخر بٹ گیا
بھاگ آئے ہم تو باطل کے مقابل ڈٹ گیا

ہم پچاسی لاکھ آئے چھوڑ کر ہندوستاں میں
عظمتِ حق کا ترے ہاتھوں میں ہے لیکن نشاں

بھارتی مسلم کو تو نے جرأتِ احرار دی
ملت اسلامیہ کو وحدتِ افکار دی

پرچم اسلام کو رکھا ہے تو نے سربلند
ہیں مسلمانانِ ہندوستاں ترے احسان مند

تیری چشم مست سے سب لالہ و گل کے باغ
بن گئے ہیں کفر زارِ ہند میں روشن چراغ

تو یقیناً ہے عظیم اے سرزمین دیوبند
جس میں اسعد سے جواں ہیں سربلند و ارجمند

عزیز الحسن صدیقی
ناظم نشر و اشاعت جمعیۃ علماء ہند

خلف الرشید شیخ الاسلام مدنی قدس سرہٗ

سیّد محمّد اسعد مدنی

ایک تاثر گردش لیل و نہار جاری ہے، سورج معمول کے مطابق روز نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے، کل جو تاریخ تھی وہ آج نہیں ہے اور آج کی شام جب سورج غروب ہوگا تو دوسری صبح کا پیغام لیکر آسمان پر نمودار ہوگا۔ دن مقررہ نصاب پورا کر کے مہینہ بنا رہے ہیں اور مہینہ گذر کر سال کی تبدیلی کا پتہ دے رہے ہیں ازل سے یہی سلسلہ قائم ہے۔

۱۹۵۳ء میں مولانا اسعد مدنی کو اس قدر دیکھا تھا جب ان کے والد محترم حیات تھے، باپ کا سایہ سر پر تھا ان کی ذاتی کوئی رائے تھی نہ کوئی مخصوص نظریہ، مدرسہ تھا یا خانقاہ جہاں انھیں پڑھنے پڑھانے میں یا مہمانوں کی خدمت میں مصروف دیکھا جا سکتا تھا۔ والد کا انتقال ہوا تو ساری ذمہ داریاں ایک ساتھ سر پر آگئیں۔ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد انھوں نے متوسلین کے پاس ایک مراسلہ بھیجا تھا جس کو دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں کا مالک بنایا ہے اور مستقبل میں ان کی ذات سے ملت کو بیش بہا فوائد پہنچ سکتے ہیں کل تک وہ صرف ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے اور آج ایک علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بنائے جا چکے ہیں، میٹنگوں اور جلسوں میں ان کا نام آنے لگا ہے۔ اخبارات میں ان کے بیانات اور اپیلیں بھی چھپ رہی ہیں دار العلوم دیوبند کی تدریسی خدمات سے علیحدگی اختیار کر کے پورے طور پر ملت کی تنظیم میں منہمک نظر آرہے ہیں۔

یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ صوبائی جمعیۃ کی ایک میٹنگ میں جو لکھنؤ میں ہوئی یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جمعیۃ کے راہنما مختلف مقامات کا تنظیمی دورہ کریں اور دینی تعلیمی بورڈ کا نظام وسیع کرنے کے لئے اضلاع میں اجتماعات کئے جاویں۔

اس پروگرام میں غازی پور کا نام بھی شامل کیا گیا، تاریخ طے پا گئی اور مولانا محمد قاسم شاہ جہاں پوری کی تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔ پروگرام کی ترتیب کے وقت لکھنؤ میں میرے والد بھی موجود تھے ان کی غازی پور واپسی کے چند ہی دن بعد جلسہ کی تاریخ قریب آگئی۔ غازی پور کا چھوٹا سا اسٹیشن ہے، شام کی گاڑی میں مولانا محمد قاسم صاحب کو آنا ہے۔ رفقاء جماعت ٹرین کے انتظار میں سٹی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جمع ہیں ان میں یہ خادم بھی ہے۔ چند ہی لمحوں بعد ٹرین پلیٹ فارم

پر آگئی۔ مولانا محمد قاسم کو تو بارہا دیکھا تھا، مگر میری نگاہ کسی اور ہی کو تلاش کر رہی تھی، والد مرحوم نے لکھنؤ سے آکر بتایا تھا کہ ممکن ہے مولانا اسعد مدنی ہمراہ ہوں، ان کا آنا یقینی نہیں تھا، مگر خدا جانے کیوں میرے دل میں ان کی دید کا اشتیاق جاگ اٹھا تھا اور نگاہ ان ہی کے چہرہ کو تلاش کر رہی تھی، انجن دندناتا ہوا سامنے سے نکل گیا۔ پھر ڈبے ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے سے گذرنے لگے مگر ابھی تک مولانا محمد قاسم نظر نہ آئے۔ آج ہی شب کو ٹاؤن ہال میں جلسہ ہے۔ ہمارا اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔ اچانک ایک ڈبہ کے دروازہ پر سفید کرتہ میں ملبوس قدرے بھاری جسم کے ایک نوجوان کو کھڑے دیکھا۔ یہ تھے مولانا اسعد مدنی جو آج کے جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے تنہا غازی پور کے لئے چل پڑے تھے۔ حالانکہ ان کی آمد کا پروگرام ضمنی تھا اگر نہ آتے تو شکایت کا موقع نہ تھا۔ ٹرین سے اترتے ہی سب سے مصافحہ کیا اور رکشہ پر سوار ہوئے، رکشہ غازی پور کی تنگ سڑکوں سے ہوتا ہوا مدرسہ دینیہ کی گلی تک آپہنچا۔ رکشہ سے اترتے ہوئے بڑھ کے پیسے نکال کر خود ہی رکشہ کا کرایہ ادا کیا۔ بس ان کی اس ادا نے میرا دل جیت لیا۔ رات کے جلسہ عام میں دینی تعلیم کی اہمیت پر ان کی تقریر ہوئی جو بہت پسند کی گئی۔ ایک نوجوان ہندو وکیل نے کہا کہ دینی تعلیم اگر ایسی ہی چیز ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا خود انتظام کرے۔

یہ تھی میری دوسری ملاقات جس نے عقیدت و احترام کا پاکیزہ احساس میرے دل و دماغ کے ایک ایک گوشہ میں بھر دیا۔ میں ان کی اچانک اور غیر متوقع آمد اور ریل گاڑی کے دروازہ پر کھڑے ہو کر مسکرانے کا منظر جب یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ آج بھی میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

جو راہِ اہلِ خرد کے لئے ہے لامحدود
جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے

کشتیٔ ملت کا ناخدا

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کا دن یقیناً ایک مکمل انقلاب کا دن تھا اور اگر اس دن ہندوستانی عوام نے سوچا کہ اب ان کے دیش میں سکھ چین عام ہوگا اور ان کو دوسرے اور تیسرے انقلاب کا منہ نہیں دیکھنا ہوگا تو انہوں نے کوئی غلط بات نہیں سوچی، بے چارے سادہ لوح عوام کیا جانتے تھے کہ ابھی ہندوستان کو مزید کچھ دنوں تک آزمائش کی بھٹیوں میں تپنا باقی ہے۔

ماہ و سال کی گردش باقی ہے اور انقلاب ہر روز ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں۔ ملک کا مستقبل فرقہ پرست تنظیموں کے ہاتھوں تاریک ہوتا چلا جارہا ہے، مسلمانوں کے مسائل روز بروز الجھتے جارہے ہیں، مسلم جماعتیں اپنے اپنے طریقہ کے مطابق ۱۹۴۷ء سے لگاتار مسلمانوں کی مشکلات اور مسائل حل کرنے کے لئے کوششیں کر رہی ہیں۔ مگر حالات ہیں کہ سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پیچیدہ امراض کے علاج میں معالجین کو جو دقتیں پیش آتی ہیں اور امید و بیم کی جو کیفیات سامنے آتی ہیں بعینہ وہی حالات مسلم رہنماؤں کے سامنے ہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے

کہ مسلم زعما ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں، مفتیٔ اعظمؒ کا انتقال ہوا، شیخ الاسلامؒ اپنے رب سے جا ملے، امام الہندؒ ہم سے روٹھے، سحبان الہندؒ نے ہمیں تنہا چھوڑا۔

ایک غم ہو تو اس کا ذکر کیا جائے، ایک مصیبت ہو تو بیان کی جائے۔ جب پورا جسم زخموں سے بھرا ہو تو پھاہہ کہاں کہاں اور کیسے رکھا جائے۔ ۱۹۴۷ء کے پُرآشوب زمانہ میں جن بزرگوں نے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جمائے تھے اور پامردی کیساتھ حالات کا مقابلہ کرنے اور مستقبل کو سنوارنے کی راہ بتائی تھی وہ سب یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے۔ انگریز کے خلاف اس ملک میں جو جنگ لڑی گئی اور تقسیم ملک پر جس کا اختتام ہوا اس کی بچی کھچی فوج کا ایک بوڑھا سپاہی "حفظ الرحمن" باقی رہ گیا ہے۔ جس کے مجاہدانہ کردار سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی اچھی طرح واقف ہے اور جس کی خدمات کا اعتراف ایک ولی کامل نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"مولانا حفظ الرحمن اپنی صرف ۴۷ء کی خدمات کے عوض مجھ سے میری ساری زندگی کی عبادتیں لے لیں تو میں راضی ہوں"۔

وہی حفظ الرحمن اپنی زندگی کی آخری منزل میں ہے، فوج ہی نہیں حکومت کے تمام ہی شعبوں میں یہ قانون رائج ہے کہ بڑھاپے میں اس کے کارکنوں کو پنشن دے دی جاتی ہے تاکہ بقیہ زندگی آرام سے گذرے مگر قومی خدمتگاروں کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہ ساری زندگی آلام و مصائب سے نبرد آزما رہتے ہیں اور انھیں کبھی سکون و راحت کے لمحات نصیب نہیں ہوتے۔ مولانا حفظ الرحمن جنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑی جانیوالی جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگائی۔ سالہا سال جیلوں میں رہے۔ جب ملک آزاد ہوا تو ان کو ایک دن بھی سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ ادھر آزادی کا سورج طلوع ہوا اور ادھر آگ خون کی ندیاں اُبل پڑیں، لوگ اپنی اپنی قربانیوں کی قیمت وصول کرنے میں لگ گئے، وزارت کی کرسیاں حاصل کرنے لگ گئے اور جو اپنی ان کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے انھوں نے جوڑ توڑ شروع کر دی مگر مولانا حفظ الرحمن اور ان کی جماعت نے مسلمانوں کے دُکھ درد میں شریک ہونے ہی کو اپنا فرض سمجھا۔ اس فرض کی ادائیگی میں انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان کی باعزت زندگی کا تھا۔ کسٹوڈین کی چیرہ دستیاں اور ملازمتوں میں امتیاز اگرچہ تکلیف دہ بات تھی مگر ان سب سے بڑھ کر صبر آزما جو چیز تھی وہ فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ فسادات ہو رہے ہیں اور خوب ہو رہے ہیں۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ مولانا حفظ الرحمن ہیں کہ دوڑتے پھر رہے ہیں۔ فسادیوں کی غضب آلود نگاہوں کے سامنے ہیں مگر بے خوف ہیں، ظالموں کو للکار رہے ہیں اور مسلمانوں کو صبر و شکر کی تلقین بھی کر رہے ہیں، پھر حکومت کو بھی اس کا فرض یاد دلا رہے ہیں۔ اتنے سارے کام کرتے کرتے مولانا بالآخر تھک گئے۔ جبلپور کے فسادات نے انھیں بجھا کر رکھ دیا اور ان کے جسم کی ہڈیاں تک پگھلا دیں، لیکن وہ تھک ہار کر بیٹھے نہیں، دورے اب بھی کر رہے ہیں تقریریں بھی اسی آن بان سے ہو رہی ہیں۔ فرقہ پرستوں کو پوری قوت کیساتھ للکار بھی رہے ہیں مگر ان کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر ہر شخص متفکر ہے۔ یہ سوال بار بار ذہنوں پر دستک دے رہا ہے کہ مجاہد ملت کے بعد کون کشتیٔ ملت کا ناخدا بن سکتا

ہے؟ آزادی کے بعد مسلمانوں کا ایک مسئلہ بھی تو حل نہیں ہوا، گتھیاں سلجھتی کہاں تک کہ ان کی گرہیں اور مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء آج بھی ایک متحرک تنظیم ہے اور اس میں ہزاروں فدا کار موجود ہیں، مگر حفظ الرحمٰن کی جانشینی کا حق کون ادا کرے گا۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ آج بھی ملک میں بڑے بڑے اہلِ علم موجود ہیں کتنے ہی سحر نگار ادیب ہیں، بلند پایہ مصنف بھی ہیں مگر ہندوستانی مسلمانوں کی چارہ گری کے لئے جس انسان کی ضرورت ہے وہ کہاں ہے؟

خدا کی کارسازی پر ایمان لانا پڑتا ہے، اگر اس نے زخم دیا تو مرہم بھی اسی نے بخشا۔ اگر اس نے ۴۷ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کو یہ توفیق بخشی کہ مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔ اور سارے کاموں کو چھوڑ کر صرف اسی کام کے ہو رہیں۔ تو ۶۲ء میں اسی خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لئے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے چہیتے بیٹے مولانا اسعد مدنی کو کھڑا کر دیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن بھی درسگاہ اور مدرسی چھوڑ کر ملک و ملت کی خدمت میں لگے تھے اور مولانا اسعد مدنی بھی جب اس میدان میں کود پڑے تو دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات (جو نام تر اعزازی تھیں) سے علیحدگی اختیار کر کے آئے، تدریس بذاتِ خود کوئی ناپسندیدہ کام نہیں ہے۔ ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ملت کی بہی خواہی میں ایسے موڑ آہی جاتے ہیں جب مدرسہ و خانقاہ کو چھوڑنا پڑتا ہے اور قلم و کتاب کی جگہ شمشیر و سنان کو ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔

اُتر پردیش میں جمعیۃ علماء کا نظام عرصہ سے مضمحل تھا۔ اس لئے مخلصین فکرمند تھے۔ جب مولانا اسعد مدنی مدظلہ صدارت کی مسند پر بیٹھے تو ان کا تردد دور ہوا اور ریاست بھر میں اس انتخاب پر مسرت محسوس کی گئی۔ جماعتی صفوں میں جو انتشار و اضمحلال پایا جاتا تھا وہ دُور ہوا۔ نئے کارکن پیدا ہوئے۔ پوری ریاست میں دینی تعلیمی بورڈ کی تنظیم پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم ہونے لگیں۔

شیخ الاسلام کے وصال کے بعد ان کے متوسلین اور جمعیۃ علماء کے وابستگان کی نگاہیں مولانا اسعد مدنی پر پڑنے لگیں۔ ملک کے مختلف گوشوں سے ان کے پاس خطوط اور دعوت نامے آنے لگے جن میں اس بات کی درخواست ہوتی کہ آپ ہماری بستی میں تشریف لائیں۔ مولانا ان پُرخلوص پیغامات اور دعوتوں کو کب تک ٹالتے بالآخر ان کو وقت دینا پڑا۔ اب ملک میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ان کے مسلسل دورے ہونے لگے۔ کہیں فساد کی خبر سُن کر دوڑے جا رہے ہیں تو کہیں مدرسوں کے جلسے میں یا سیرت پاک کے اجتماعات میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں۔ ان کے مسلسل اور طویل اسفار کو دیکھ کر ایک بار دہلی کے ہفتہ وار "پیام مشرق" نے لکھا تھا "معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ریلوے کی لائنیں شاید مولانا اسعد مدنی ہی کے لئے بچھائی گئی ہیں۔"

کلکتہ اور راوڑکیلا کے فسادات میں

ان دونوں جگہوں پر فسادات ایک ہی نوعیت کے ہوئے تھے۔ ان فسادات نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جیسے ہلا کر رکھ دیا تھا اور و

ایک بار پھر سوچنے لگے تھے کہ آیا ان کو ہندوستان میں رہنا ہے یا بالآخر ترک وطن کرنا ہی پڑے گا، مضبوط سے مضبوط ارادے رکھنے والا مسلمان بھی اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ کلکتہ میں جس وقت فساد زوروں پر ہو رہا تھا اتفاق سے میں دہلی میں تھا جس دن مجھے اپنے وطن کے لئے روانہ ہونا تھا اسی دن شام کے چار بجے "الجمعیۃ" کے چیف ایڈیٹر مولانا عثمان فارقلیط سے ان کے آفس میں ملنے گیا۔ گفتگو کے دوران کلکتہ کے حالات بھی تذکرہ میں آئے تو میں نے دیکھا کہ اسّی سال کا بوڑھا تپا تپایا اور آزمودہ کار صحافی بھی حالات کی نزاکت سے متاثر ہے۔ مجھے سفر بہر حال کرنا تھا مگر راستہ بھر افواہوں اور تشویش کا ماحول میرے گرد چھایا رہا۔ فساد بنگال کی سرزمین پر ہو رہا تھا مگر اس کے اثرات پورے ملک میں پڑ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا اسعد مدنی میرٹھ کے ہنگامہ خیز اجلاس کے بعد جمعیۃ کے جنرل سکریٹری بنائے جا چکے تھے اور اپنی کشتی مخالفوں کے پُرشور سمندر کے حوالے کر چکے تھے جن حالات میں انہوں نے قیادت کا بوجھ اٹھایا تھا وہ اتنے صبر آزما تھے کہ دو چار دن بھی اپنی جگہ پر کھڑا رہنا بظاہر ممکن نہ تھا۔ اندر اور باہر ہر طرف کشمکش تھی، کھینچا تانی تھی، بات کرنا مشکل ہو رہا تھا، بقول مومن ؎

دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

جن پتوں کو تکیہ بنایا تھا وہی ہوا دے رہے تھے۔ باپ کے شاگرد بیٹے کو ٹھکرا رہے تھے جن نگاہوں سے پیار و محبت کی کرنیں پھوٹنی چاہئے تھیں وہ اسعد مدنی پر شعلے برسا رہی تھیں، دوست و احباب بیگانے ہو رہے تھے۔ الغرض حسینؓ کی اولاد کو آزمائش کی بھٹیوں میں تپایا جا رہا تھا۔ خدا کا کرنا کہ مولانا اسعد مدنی اس بھٹی سے کندن بن کر نکلے کلکتہ راورکیلا اور جمشید پور کے فسادات، اس میں شک نہیں کہ مسلمانان ہند کے لئے انتہائی صبر آزما اور ہلاکت خیز ثابت ہوئے، مگر ان کا ایک فائدہ میرے نزدیک یہ ہوا کہ مولانا اسعد مدنی کی پُرشکوہ قیادت ابھر کر ملک کے سامنے آگئی، اور شاید جمعیۃ کی صفوں میں پھیلا ہوا انتشار بھی جلد ختم نہ ہوتا۔ لوگ مولانا کو بحث کا موضوع بنا رہے ہیں اور یہی طے نہیں کر پا رہے ہیں کہ وہ جمعیۃ کی قیادت سنبھالنے کے اہل ہو سکتے ہیں یا نہیں! اور ادھر وہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر فسادات کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھسے جا رہے ہیں۔ راستے مسدود ہیں، فسادی چڑھے چلے آ رہے ہیں، نعرے بلند ہو رہے ہیں، ہزاروں بلوائیوں کا جلوس راستہ میں ملتا ہے جسکو دیکھ کر جیپ کا ڈرائیور گھبرا اٹھتا ہے اور آگے گاڑی لیجانے سے انکار کرتا ہے اور مولانا کہتے ہیں میاں آگے بڑھو، ڈرتے کیوں ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ڈرائیور کہتا ہے راستہ بند ہے۔ تو کہتے ہیں آخر راستہ کھلے گا کیسے؟ چلو آگے بڑھو، فلاں جگہ ہمیں قیام کرنا ہے۔ کلکتہ کا فساد رمضان سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا اور رمضان کا تقریباً پورا مہینہ مولانا اسعد مدنی نے بنگال میں گزارا تھا۔ مولوی سید احمد ہاشمی ان کے ہمراہ ہوتے تھے ان کا بیان ہے کہ افطاری کا کوئی انتظام ہوتا تھا نہ سحری کا، جہاں جو کچھ بھی ملا، جو کچھ میسر آیا کھا لیا ورنہ ویسے ہی چل پڑے۔

مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ بنگال کا فساد ختم ہونے کے بعد وہاں گئے تھے، اپنا سفر پورا کرنے کے بعد

انھوں نے ایک مفصل بیان الجمعیۃ کو دیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ :۔

"مولانا اسعد مدنی نے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی یاد تازہ کر دی۔ اگر ان کی جگہ پر دوسرا کوئی ہوتا تو بنگال میں ریلیف کا کام اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوتا کیونکہ وہ بنگال زبان اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ اس لئے بڑی خوبی کے ساتھ انھوں نے وہاں کے ستم رسیدوں کے مسائل کو سمجھا اور ان کی ترجمانی بھی کی"

الجمعیۃ مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۳ء مولانا اسعد مدنی کا انٹرویو چھپا تھا جس میں انھوں نے بڑے درد اور کسک کے ساتھ کہا تھا۔

"جمعیۃ علماء ہند پر ایک وقت ایسا آیا کہ ہمارے سر سے دو سال کے اندر اندر چار بزرگوں کا سایہ اٹھ گیا۔ وہ تھے مفتی کفایت اللہ، والد صاحب، مولانا آزاد اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن"

یہ چار ستون اچانک گر گئے۔ ان ستونوں کے اٹھ جانے پر ہر طرف مایوسی اور پریشانی کی لہر دوڑ گئی اور مسلمانوں کے دلوں پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ایک اتنا بڑا خلاء پیدا ہو گیا کہ اس کے پار کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خاص خاص حلقوں میں پریشانی، تشویش اور تذبذب کا اظہار ہونے لگا اور آخر کار ایک ایسا دور آیا جس کا تذکرہ بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کا اپنا خاص کردار رہا ہے وہاں عہدوں پر پہنچنے کے لئے پروپیگنڈہ اور کنویسنگ کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ یہ باتیں معیوب سمجھی جاتی رہی ہیں۔ لیکن وہ کردار مجروح ہوتا دیکھا گیا، پوسٹر لگائے گئے، لٹریچر چھاپے گئے، پروپیگنڈہ اور کنویسنگ ہوئی۔ کیا کچھ نہیں ہوا، وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میرٹھ کے اجلاس کی تاریخ اس قسم کی داستان سے بھری پڑی ہے جس کا تذکرہ کم از کم میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے، چند ماہ کے قلیل عرصہ میں جو مناظر دیکھے گئے وہ جمعیت کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے یہی وہ وقت تھا جب جمعیۃ کی ساکھ اور وجود کو قائم رکھنے کے لئے اللہ کا نام لیکر مجھے میدان میں آنا پڑا۔ اس وقت ناقابل بیان مصیبتیں سامنے آئیں جن کا تذکرہ غم و اندوہ سے بھرا ہوا ہے۔ بہر حال اللہ کا احسان ہے کہ وہ سخت امتحان جھیلا، جمعیۃ علماء انتشار و تذبذب اور موت و زیست کی کشمکش سے نکل کر اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو گئی"

اسی انٹرویو کے دوران مولانا نے کلکتہ، راورکیلا اور جمشید پور کے فسادات کا آنکھوں دیکھا حال ان الفاظ میں بیان کیا،

"۱۹۶۴ء میں کلکتہ کا فساد ہوا، میں خود ایسے وقت پہنچا جب آگ پوری طرح بجھی نہیں تھی اور لاشیں دفن نہیں ہو پائی تھیں، میں نے اپنی آنکھوں سے لاشوں کو دیکھا، ایسے کوئیں دیکھے جو لاشوں سے پٹے ہوئے تھے، میں نے جلتے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو دیکھا ہے۔ لاکھوں مسلمان اکھڑ کر خوفزدہ ہو کر پاکستان بھاگ جانا چاہتے تھے، اس وقت جمعیۃ علماء ہند نے ان اکھڑے ہوئے قدموں کو دوبارہ جمایا۔ ہم نے ۲۹۷ دیہاتوں میں امن قائم کرایا اور ان دیہاتوں میں ریلیف کمیٹیاں قائم کرائیں، جمعیۃ ریلیف فنڈ سے ۷۰۰ مکانات بنوائے، کھیتی کرنے کے لئے بیج دیا گیا اور گورنمنٹ

سے قرضے دلوائے، جن مسجدوں کو نقصان پہنچا تھا ان کی مرمت کرائی۔ ان سارے کاموں کیلئے ۲۵ سیکٹر قائم کئے گئے جہاں نو ماہ تک ریلیف ورک ہوتا رہا۔ راوڑکیلا، جمشید پور کے فساد اس کے چند ماہ بعد ہوئے۔ فساد کے دوسرے ہی دن سنداجی دوزیرداخلہ) کو وہاں روانہ کیا، اور میں بھی وہاں پہنچا۔ وہاں کے گردا نامی گاؤں میں شہید ہونے والوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی۔ گاؤں میں صرف ۲۲ نفوس بچے تھے وہاں ۲۲ مکانات بنوا کر ۲۲ فیملی بنوا کر ان کو آباد کیا۔ گورنمنٹ پر دباؤ ڈال کر پورے گاؤں کی زمین کو ۲۲ خاندانوں میں تقسیم کیا، خدا کا شکر ہے کہ آج وہ گاؤں آباد ہے اور ہر طرح ترقی کر رہا ہے۔

انڈین پارلیمنٹ میں مولانا حفظ الرحمن کی خصوصیت یہ تھی کہ پارلیمنٹ میں مسلم مسائل پر بے لاگ تقریریں کرتے تھے اور کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے تھے۔ اگرچہ وہ کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر ایوان پارلیمنٹ میں داخل ہوئے تھے مگر کبھی انھوں نے بیجا دباؤ قبول نہیں جبکہ اکثر ممبران کا یہ حال کہ پارٹی کی وفاداری میں سب کچھ فراموش کر جاتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمن کے انتقال کے بعد پارلیمنٹ کے ایوان میں یوں تو مسلمان ممبران کئی ایک تھے مگر حفظ الرحمن جیسا کوئی نہیں تھا۔ سیاسی حلقے اس خلاء کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے بعد جہاں شہروں اور دور دراز دیہاتوں میں مسلمانوں کی جان و مال ہی نہیں، عزت و آبرو اور دین بھی بچانے کے لئے جد و جہد کی وہیں اس نے ایوان حکومت میں ایسے نمائندے بھجوائے جنھوں نے اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دیا اور جبین اقتدار کی شکنیں ان کے ارادوں کو کبھی متزلزل کر سکیں نہ مصلحت وقت کے کانٹوں سے ان کا دامن الجھا۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جمعیۃ علماء ہند ۱۹۴۷ء سے قبل پارلیمنٹ سیاست میں کھل کر حصہ لیا کرتی تھی، مگر حصول آزادی کے بعد جب حکومت نے سیکولر جمہوریت کو اپنانے اور اسی کے مطابق نظام حکومت کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا، اسی وقت جمعیۃ علماء ہند نے جماعتی حیثیت سے پارلیمانی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی، مگر مسلمانوں کی نمائندگی کا ایک بہترین فارمولا یہ اختیار کیا کہ اپنے آزمودہ کار افراد کو مرکزی و صوبائی حکومت کے ایوان نمائندگان (پارلیمنٹ و دھان سبھا) میں سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے بھیجتی رہی، کوئی کانگریس کا ممبر ہوتا تو کوئی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کا۔ دُنیا جانتی ہے کہ یہ طریقہ اب بھی اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اجلاس گیا میں مولانا سید حمید الدین نے اپنے ایک بلیغ جملہ میں اس پالیسی پر کیسا اچھا تبصرہ کیا تھا، انھوں نے کہا تھا۔

"جمعیۃ علماء کی سب سے بڑی سیاست یہ ہے کہ وہ سیاست میں نہیں ہے"۔

۱۹۶۲ء میں مولانا حفظ الرحمان کا انتقال ہوا اس وقت سے لگاتار ۱۹۶۷ء تک انڈین پارلیمنٹ میں ایک سناٹا سا چھایا رہا اور وہاں مسلم مسائل اور فرقہ وارانہ فسادات پر تنہا مولانا اسحاق سنبھلی آواز اٹھاتے رہے۔ مولانا اسعد مدنی سے جب بھی کہا گیا کہ آپ پارلیمنٹ کی ممبری قبول کرلیں تو انکار کر دیتے۔ ناز انصاری ایڈیٹر "الجمعیۃ" نے روزنامہ الجمعیۃ کے

اجلاس عام مؤرخہ ۵ رمئی ۱۹۷۲ء کے صفحہ نمبر ۲، پر لکھا ہے کہ :-

"مجھے یاد ہے کہ ایک دن وہ (مولانا اسعد مدنی) فخرالدین علی احمد صاحب کی عیادت کے لئے ولنگڈن نرسنگ ہوم جارہے تھے میں بھی ساتھ ہوگیا۔ وہاں سے واپسی کے وقت میں نے از خود اس کا ذکر چھیڑا اور اس کی تصدیق چاہی کہ یہ بات کہاں تک ٹھیک ہے کہ آپ کو مظفر نگر کے پارلیمانی حلقہ سے ٹکٹ دینے کی پیش کش ہے تو مولانا نے بڑی بے نیازی سے یہ کہہ کر بالواسطہ طور پر تصدیق کردی کہ یہ انتخابات وغیرہ کے چکر میں پڑنا ہمارے بزرگوں کی روایات کے خلاف رہا ہے میں نے فوراً عرض کیا کہ آپ کے اور مولانا حفظ الرحمن کے خیالات ایک ہی تھے اور وہ بھی اولاً یہی خیال رکھتے تھے مگر جب سردار پٹیل نے دلی کے فسادات کے دوران مرنے والے مسلمانوں کی تعداد پارلیمنٹ میں غلط بیان کی اور انہیں باہر سے چیلنج کرنا پڑا تو انھیں بھی اس بات کا احساس ہوا کہ پارلیمنٹ میں ہونا کتنا ضروری ہے۔"

____ ناز انصاری نے اس مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ آخر ۱۹۶۸ء میں متعدد حلقوں اور شخصیتوں کے اصرار پر اور حالات کے تقاضوں کے تحت وہ راجیہ سبھا کے الیکشن لڑنے کے لئے تیار ہوئے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے وہ کمی بھی پوری کر دکھائی جو مولانا حفظ الرحمان کے انتقال سے پارلیمنٹ میں پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی تقریریں پارلیمنٹ ریکارڈ کا ایک حصہ ہیں اور کوئی بھی ان کے مطالعہ کے بعد یہ کہے بغیر نہیں رہے گا کہ مولانا اسعد میاں وہاں نہ ہوتے تو ملک کے منتخب نمائندوں کے سامنے جن کے روبرو مرکزی حکومت بھی جوابدہ ہے مسلمانوں کے مسائل کبھی اس طرح سے نہ آتے اور باہر سے وہ لاکھ ڈھول پیٹے اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔"

۱۵ رمارچ ۱۹۷۲ء کو انھوں نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پریذیڈنٹ صاحب نے گذشتہ ایڈریس میں لاء اینڈ آرڈر کے استحکام کی طرف اور کسی تقریر میں قومی سطح پر فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی اور ہماری قومی حکومت کی رہنمائی فرمائی تھی، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے کہ فسادات کا سلسلہ اب بھی ختم نہیں ہورہا ہے اور بدقسمتی سے پرانی روایات اور فرقہ پرستی کی دہشت ناکی جاری ہے اور حکام ضلع غفلت شعاری اختیار کرتے ہیں جس سے غنڈہ عناصر کو اسطرح سے من مانی کرنے کی چھوٹ مل جاتی ہے اور مظلوموں کا خون سستا ہو جاتا ہے۔ اگر پولیس کے خلاف ایکشن لیا جائے اور یہ طے ہو جائے کہ مجرم نہیں چھوڑے جائیں گے اور سسپنڈ کرکے تحقیقات کرائی جائے تو یہ چیز رک سکتی ہے لیکن اگر پولیس کو چھوڑ دیا جائے، سی آئی ڈی والے چھوڑ دیئے جائیں، ان کی رپورٹ نہ آنے کی وجہ سے کچھ نہ ہوا اور مجرموں کو سزا نہ دیجا سکے تو ایسی صورت میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ملک میں راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ نیم فوجی جماعت موجود ہے، اور اس کا خطرناک لٹریچر موجود ہے، اور وہ ٹریننگ دیتے رہیں اور حکومت پابندی نہ لگائے۔

تو ان حالات میں لا اینڈ آرڈر اور امن قائم نہ ہو سکے گا!"

۲۲، فروری ۱۹۶۳ء کو راجیہ سبھا میں صدر کے شکریہ کی قرار داد پر تقریر کرتے ہوئے پھر انھوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ ان الفاظ میں فسادات کے خلاف آواز بلند کی۔

" فرقہ دارانہ جذبات رکھنے والے بھی پولیس میں گھس گئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پولیس اپنے فرائض کو ایمانداری سے ادا نہیں کرتی، بلکہ وہ ایسے کارنامے برابر انجام دے رہی ہے جس سے جانور اور درندے بھی شرما جائیں!"

اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا:۔

"ایک بات میں اپنی ہوم منسٹری سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ بتائے کہ کتنے فسادات میں افسران ذمہ دار ہیں۔ کتنوں کو سزا دی گئی ہے یا کتنے ایسے ہیں جن کے متعلق کچھ کہا گیا ہو کتنے ایسے ہیں جن کی ترقی روکی گئی، کیریکٹر رول ان کے خراب کئے گئے!"

میری یہ درخواست ہے کہ حکومت اس بات پر غور کرے اور اس کے لئے اسپیشل فورس بنے اور اسے ہر طرح کی چیزیں ہیلی کاپٹر وغیرہ دینا چاہئے جس سے وہ منٹوں میں پہنچ کر مقامی افسروں سے، پولیس سے چارج لیکر حالات پر قابو کرے۔ اس کے لئے کانسٹی ٹیوشن میں "امینڈمنٹ" کرنا پڑے، سینٹر کو اختیارات دینے کے لئے تو وہ بھی ہونا چاہئے اس لئے کہ اس ملک کے لوگوں کی جان و مال عزت و آبرو کو بچانا ضروری ہے۔

چند اہم خدمات | مولانا نے مختصر سے زمانہ میں شب و روز منہمک رہ کر جس طرح دین و ملت کی خدمت کی ہے کوئی دوسرا ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقتاً مولانا کی بے شمار خدمات کا احاطہ ممکن بھی نہیں۔

ع۔ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک آدمی میدان سیاست میں ہے تو بس اس کا ہو رہتا ہے، پھر کسی اور طرف اس کا دھیان بھی نہیں جاتا، مگر مولانا مدنی نے جس طرح دینی خدمت کے میدان میں بے مثال جدوجہد کی اسی طرح سیاسی حلقوں میں بھی اپنی سوجھ بوجھ کا سکہ جمایا۔ مولانا جب پارلیمنٹ میں داخل ہوئے تو انھوں نے پہلی فرصت میں ایک ایسی لابی (حلقہ) تیار کی جو فرقہ پرستوں کو دندان شکن جواب دے سکے اور ہندوستان جلد اس سے نجات پائے۔ مولانا اپنے اس ارادے میں کامیاب بھی ہوئے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مولانا کے ممبر ہونے سے قبل پارلیمنٹ میں ایک دو ہی ممبر ایسے تھے جو مسلمانوں کی مظلومیت پر کچھ کہا کرتے تھے مگر اب یہ حال ہے کہ ہاؤس میں ایسے کتنے ہی ممبران ہیں جو کھل کر مسلمانوں کی حمایت کرتے ہیں۔ فسادات کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اردو کے ساتھ انصاف کی اپیل کرتے ہیں۔

مولانا کی گوناگوں خدمات کو دیکھ کر بیرونی ممالک کے ارباب بصیرت رشک کرتے ہیں اور مولانا کی شخصیت کو خراجِ

عقیدت پیش کرتے ہیں مگر افسوس کہ خود مولانا کے وطن میں مولانا کے پیام کو سمجھنے والے کم ہی لوگ ہیں۔

حال ہی میں عراق سے سفیر نے ایک مجلس میں کہا "اگر مولانا مدنی ہمارے ملک میں ہوتے تو ان کی راہ سے صدقہ دل کی جاتی"۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں اور خود اس ملک کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں مدنی خاندان مقیم ہے اور موجودہ دور کے مسلمانوں کو مولانا مدنی جیسا مخلص، مدبر اور فعال رہنما ملا۔ مولانا کی چند اہم بنیادی خدمات کے مختصر تذکرہ پر اس احساس کے ساتھ ہم اس کتاب کو ختم کر رہے ہیں کہ ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

مسجد عبد النبی نئی دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے جہاں مرکزی حکومت کے دفاتر، بیرونی ممالک کے سفارت خانے اور کئی سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں کے مراکز ہیں۔ البتہ یہاں مسلمانوں کی کسی جماعت کا کوئی دفتر ۱۹۶۴ء سے پہلے نہ تھا۔ مولانا نے جمعیۃ کی باگ ڈور سنبھالتے ہی یہ فیصلہ کیا کہ جمعیۃ کا مرکزی دفتر نئی دہلی میں منتقل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں کام کی بہترین صلاحیت دی ہے کہ کسی اجتماع میں انھوں نے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کام کرو، چندہ بازی کی فکر ابھی سے مت کرو، کام کرو گے تو پیسہ خود آئے گا"

حقیقت یہ ہے کہ ان کا ابتداء سے یہی حال رہا ہے، کبھی پیسے کی پرواہ نہیں کی۔ مسجد عبد النبی جس کی تاریخ بڑی شاندار ہے سینکڑوں سال سے غیر آباد پڑی ہوئی تھی اور بڑے بڑے درخت نکل آئے تھے صحن میں گھاس اُگ ہوئی تھی جابجا غار تھے جن میں جانور بسیرا لیتے تھے اور کوئی آدمی اس میں جانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ مولانا نے اس مسجد کو آثار قدیمہ سے حاصل کر کے صفائی و مرمت کرائی۔ حیرت ہوتی ہے کہ چند ہی ہفتوں کے اندر کس طرح مولانا نے اس کی ہیئت بدل ڈالی، آج اس مسجد کو دیکھیں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ چند ہفتوں میں اتنا کام ہوا ہوگا۔ مسجد کے وسیع احاطہ میں دو درویہ کمرے ہیں جن میں جمعیۃ علماء ہند کا مرکزی دفتر اپنے تمام لوازمات کے ساتھ مصروف کار ہے۔

ذرا تصور تو کیجئے اور آج کی مسجد عبد النبی کے گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لیجئے۔ پریس ایریا وہیں ہیں۔ بڑے بڑے انگریزی اخبارات، اردو کا "تیج" اور "ملاپ" وہیں سے شائع ہوتے ہیں۔ سامنے ہی مرکزی انکم ٹیکس کا دفتر ہے تھوڑی ہی دور سپریم کورٹ ہے۔ مولانا آزاد میڈیکل کالج بھی قریب ہی ہے اور اس کے عقب میں حضرت امام الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ابدی آرام گاہ ہے۔ اس پورے ماحول میں ایک بلند ٹیلہ پر قدیم وضع کی مسجد جس کو مُلا عبد النبی نے ۵۰۵ء میں بنوایا تھا اور جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں کبھی نماز نہیں پڑھی گئی آج سر اُٹھائے کھڑی ہے، گویا کہ مسلمانوں کو دعوت دے رہی ہے کہ اپنی تمام وضعداریوں اور تمام روایات کے ساتھ تمہیں بدلتے ہوئے ہندوستان میں اسی طرح سینہ تان کر چلنا ہے۔ آج یہ مسجد زبان حال سے یہ بھی کہہ رہی ہے کہ میں سینکڑوں سال سے غیر آباد پڑی ہوئی تھی اور میری محراب میں

مٹی کا ایک دیا بھی جلانے والا کوئی نہ تھا مگر ایک اللہ والے (مولانا اسعد مدنی) نے میری بے بسی اور بے رونقی پر ترس کھا کر میری حالت بدل دی اور اب میرا حال ماضی سے بہتر ہے بلکہ قابل فخر ہے۔ مسجد عبدالنبی یہ پیغام بھی دے رہی ہے کہ مسلمان اگر چاہیں تو اسی طرح اپنے گذشتہ دور ظلمت کو جدید ترقیات سے ہمکنار کر سکتے ہیں اور ظلمات شب غم کو انوار سحر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

مسلم فنڈ مسلم فنڈ کی تحریک مولانا ہی کے ذہن کی اختراع ہے اس فنڈ نے مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں کام کرنے اور ترقی کرنے کا شعور بخشا ہے۔ سب سے پہلے دیوبند میں مولانا نے اس کام کا آغاز کیا جہاں اب لاکھوں روپے سالانہ جمع ہوتے ہیں اور آسان شرائط پر ضرورتمندوں کو لاکھوں روپے بطور قرض دیئے جاتے ہیں۔ مغربی یو۔ پی میں اس کی شاخیں بہت ہیں۔

جمعیۃ علماء کی کسی مجلس میں "مسلم فنڈ" پر گفتگو ہو رہی تھی، مغربی یوپی ہی کے کسی صاحب نے ایک قصبہ کا قصہ سُنایا کہ وہاں جب سے فنڈ قائم ہوا ہے اور مسلمان بلا سود قرض لے کر اپنی اقتصادی ضروریات پوری کرنے لگے ہیں۔ مقامی بنیوں کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایک سودخوار نے تو حاکم کے پاس درخواست دے رکھی ہے کہ جمعیۃ علماء والوں نے ہماری روزی مار دی"۔

جمہوری کنونشن مولانا نے فرقہ پرست طاقتوں کو کمزور کرنے اور مسلمانوں کو حوصلہ مند بنانے کے لئے ۱۹۶۴ء میں دہلی میں جمہوری کنونشن کے نام پر ایک اجتماع بُلایا تھا۔ اس کنونشن میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں سب کو شرکت کی دعوت دی گئی اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے مندوبین آکر شریک ہوئے۔ اس کنونشن کا انعقاد فرقہ واریت کے لئے ایک چیلنج تھا۔

انگریزی پریس علماء اور دیندار طبقہ کو ہمیشہ مطعون کیا گیا کہ یہ لوگ زمانہ کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے اور قدامت پرستی میں مبتلا رہتے ہیں۔ حالانکہ علماء نے برابر اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ زمانہ کے تقاضوں کو زیادہ سمجھتے ہیں اور جو بھی مفید چیز سامنے آئی اس سے مسلمانوں کو انھوں نے کبھی نہیں روکا بلکہ اس کو اختیار کرنے کی تلقین کی۔

علماء پر جہاں اور بہت سے الزامات لگائے گئے ہیں وہیں ایک الزام یہ بھی رکھا گیا کہ انھوں نے انگریزی زبان کی مخالفت کی، حالانکہ یہ سراسر اتہام ہے۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ نے جنہیں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے عبور دریائے شور کی سزا دی تھی، اپنی تصنیف "کالاپانی" میں لکھا ہے۔

" میں نے وہاں اسقدر انگریزی زبان سیکھ لی تھی کہ عدالتوں میں پیش کرنے کے لئے بلا تکلف انگریزی زبان میں لوگوں کی درخواستیں لکھ دیا کرتا تھا، اور انگریزی کتابوں کا بسہولت مطالعہ کر لیا کرتا تھا"۔

انگریزوں کی آمد کے معاً بعد کا یہ واقعہ ہے اور اس وقت کے ایک ایسے عالم دین کا یہ ذوق بیان کیا جا رہا ہے

جو انگریزوں کے دشمن تھے، پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ علماء انگریزی زبان کے مخالف تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ علماء نے اس وقت یہ اندازہ فرمایا اور صحیح فرمایا کہ مسلمان اب محکوم ہے ایسا نہ ہو کہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا مذہب اور تہذیب بھی اختیار کر لیں، اس لئے انھوں نے احتیاط کی راہ اختیار کی۔ ان ہی مولانا تھانیسری نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے۔

" انگریزی کتابوں کے مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر پڑا کہ نوافل تو نوافل فرائض کی ادائیگی میں بھی مجھ سے کوتاہی ہونے لگی"۔

ایک عالم اور مجاہد پر جب اس زبان کا یہ اثر ہو سکتا ہے تو ہما شما کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ اسکا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے اگر ہم مان بھی لیں کہ علماء نے اس زمانہ میں انگریزی سے روک کر غلطی کی مگر آج جب وہ کہتے ہیں کہ مسلمان انگریزی اخبار نکالیں تو مسلمان ان کی یہ بات کیوں نہیں مانتا۔ اب سے تقریباً بارہ سال قبل مولانا اسعد مدنی نے ملک کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت دی اور کہا کہ آؤ مل جل کر ایک انگریزی اخبار کی بنیاد ڈالیں۔ لوگ جمع ہوئے، بڑے بڑے ماہر تعلیم، صنعت کار اور صاحبان ثروت بیٹھے، مشورہ ہوا۔ ہمایوں کبیر مرحوم نے دلچسپی لی۔ اسوقت ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ آپ اپنے حلقہ اثر سے پہلے کچھ رقم حاصل کر کے جمع کریں، پھر ہم لوگ باقی کی پوری کر لیں گے۔

مولانا کی ایک عادت مجھے بہت پسند ہے وہ یہ کہ ٹال مٹول کسی کام میں انھیں پسند نہیں، جو کام کرنا ہے فوراً کریں گے۔ میں بلا جھجک عرض کر دوں گا کہ مجھے کام کا جو حوصلہ اور امنگ ملی وہ سب مولانا ہی کی دین ہے، مجھے گوشۂ گمنامی سے نکال کر عمل کی شاہراہ پر انھیں نے ڈالا ہے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ وہ ملت کی فلاح و بہبود کا ہر چھوٹا بڑا کام کرنے کیلئے بلا پس و پیش تیار رہیں تو میں ان کے پیچھے ہو لیا اور اب ان کے زیر سایہ رہ کر کام کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھا ہوں جہاں آفتاب کی تمازت آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے۔

بہر حال مولانا نے اس اجتماعی فیصلہ کے مطابق جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے ہندوستان کے صوبوں کا دورہ کیا اور ایک لاکھ سے زائد رقم لا کر جمع کر دی لیکن افسوس کہ روشن خیال اور بالغ نظر افراد کو آج تک توفیق نہیں ہوئی کہ ملت کی اتنی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قدم آگے بڑھاتے۔ مولانا کا یہ دورہ واقعی ایک طوفانی دورہ تھا۔ ایک ایک دن میں پانچ پانچ، چھ چھ جلسوں میں تقریر کرنا آسان نہیں ہے۔ اسکو وزیروں کے دورہ پر قیاس نہ کیجئے کہ ان کو ایسے دوروں میں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ مولانا نے اس دورہ میں کئی ہزار میل کا سفر کیا، میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اسی ملک میں ایسی قومیں بھی موجود ہیں جن کا ایک فرد اپنے پیشوا کو لاکھوں کی رقم اٹھا کر دے دیتے ہیں اور پلٹ کر پوچھتا بھی نہیں کہ وہ کہاں گئی۔ مگر ہماری بھی ایک ملت ہے جو دیتی کم ہے مگر احتساب زیادہ کرتی ہے۔

رویت ہلال کانفرنس: مولانا نے ہندوستان کے مسلمانوں کو متحدہ کرنے اور اختلافات کی دلدل سے نکالنے کے لئے جہاں دوسری بہت سی تجاویز کو بروئے کار لانے کی کوشش کی وہیں ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء

کو تاوان غالب" دہلی میں کل ہند پیمانہ پر دینی تعلیمی کانفرنس کر کے ملک بھر کے علماء کو ایک نقطہ پر جمع کر دیا اور مسلمانوں کو مشکل سے بچانے کی سعی کی۔

مباحثِ فقہیہ

فقہی مسائل کو اجتماعی ڈھنگ پر حل کرنے کے لئے جمعیۃ علماء ہند کے زیر انتظام ۱۹۷۰ء میں ایک ادارہ "ادارۃ المباحث الفقہیہ" کے نام سے قائم کیا، جو برابر کام کر رہا ہے۔

عرب حمایت کنونشن

عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر عربوں کی حمایت میں ۲۵ نومبر ۶۷ء کو عرب حمایت کنونشن بلایا۔ اس کنونشن میں عرب ملکوں کے نمائندے بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے جنہوں نے مولانا کا ان کوششوں کے لئے شکریہ ادا کیا، جو انہوں نے عربوں کی تائید کے سلسلہ میں کیں:

عازمین حج کی امداد

سعودی حکومت نے ۱۹۷۵ء میں عازمین حج پر کرنسی کی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان کے عازمین حج بڑی الجھن محسوس کر رہے تھے۔ ان رکاوٹوں اور پابندیوں میں نرمی لانے کا مطالبہ حکومت ہند نے بھی کیا تھا، مگر سعودی حکومت اپنے فیصلوں پر اڑی رہی۔ بالآخر حضرت مولانا اسعد مدنی حجاز تشریف لے گئے اور سعودی حکومت کے ذمہ داروں سے مل کر عازمین حج کی دشواریاں بیان کیں۔ سعودی حکومت نے مولانا کی تجویز کے مطابق فوری طور پر فیصلہ کیا کہ ۳۰ ریال یومیہ خرچ کرنے کی شرط واپس لی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ حاجی صاحبان جہاں چاہیں قیام کریں پہلے ان کے لئے سیکٹر قائم کئے گئے تھے جو پریشانی کا باعث تھے۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ مقررہ ایام سے زیادہ کوئی رک نہیں سکتا، اس میں بھی نرمی پیدا کی گئی۔ اس طرح اللہ کے فضل سے مولانا کی مداخلت اور مساعی سے ہندوستان کے ہزاروں عازمین حج کو راحت ملی۔

مدارس اسلامیہ کی سرپرستی

ہندوستان میں مدارس عربیہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ مدارس سے مولانا کا قلبی تعلق ہے۔ ان کے مسائل سے انہیں گہری دلچسپی ہے۔ ان کی بقا و ترقی کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

چند سال قبل حکومت ہند نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عربی مدارس کے طلبہ کو ریلوے کے رعایتی ٹکٹ کی سہولت دینا موقوف کر دیا جائے گا، بہت سے لوگوں کو اس کی کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی لیکن ادھر مولانا نے وزیر اعظم سے ملاقات کر کے کہا کہ "یہ مدارس وہ ہیں جنہوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے لہٰذا ان کو اس سہولت سے محروم نہ کیا جائے"۔ چنانچہ وزیر اعظم نے یہ رعایت بحال رکھی اور مدارس کے غریب طلبہ برابر اس رعایت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ
رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

متّحدہ قومیّت اور اسلام

پیش لفظ ———————— مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

تقریباً ایک سال تک "متحدہ قومیت اور اسلام" اور "معاہدۂ یہود علمی نقطہ نظر سے" کے عنوان سے شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کے درمیان "برہان" کے صفحات میں ایک طویل سلسلۂ بحث جاری رہا۔ اس بحث کا آغاز چونکہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے رسالہ پر ایک تنقیدی نظر سے ہوا تھا اسلئے ناظرین کرام کو یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اول اول جب مولانا موصوف نے دہلی کے ایک جلسے میں "متحدہ قومیت" کا ذکر کیا اور ایک اخبار میں اس کی غلط سلط رپورٹ شائع ہوئی تو سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے تلخ لہجہ میں کیا کہ جو ان جیسے شائستہ اور سنجیدہ انسان کے شایان شان نہ تھا۔ اقبال مرحوم کی اس تحریر کا اخبارات میں شائع ہونا تھا کہ دونوں طرف سے مضامین، نظم و نثر کا تانتا بندھ گیا۔ لیکن اسی ہنگامہ میں جب مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے اپنا ایک بیان شائع کیا اور اس میں یہ واضح کر دیا کہ انہوں نے تقریر میں کیا الفاظ کہے تھے اور ان سے ان کی کیا مراد تھی تو اگرچہ بعض خودغرض لوگوں نے پھر بھی جناب موصوف پر زبان طعن و تشنیع اور سب وشتم میں کوتاہی نہیں کی۔ مگر جہاں تک مرحوم ڈاکٹر اقبال کی ذات کا تعلق تھا ان کا دل مولانا کی طرف سے صاف ہو گیا اور اس کا اظہار انہوں نے ایک معذرت نامہ لکھ کر کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ "متحدہ قومیت" کا لفظ ایک حد تک مغالطہ میں ڈالنے والا ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ اس کا اعلان ان لوگوں کی طرف سے ہو جو مذہب و ملت کی تفریق کو بالکل ناقابل اعتنا قرار دیتے ہوں اور وطنی اشتراک پر ہی تمام تحریکوں کی بنیاد رکھتے ہوں، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ایک مبہم کلام کی اصل مراد کا تعین متکلم کی خود اپنی تفصیل و تشریح سے اس کی زندگی کے واضح احوال و کوائف سے اور اس کے ذاتی رجحانات و معتقدات کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے تو ایک مومن صادق کا فرض ہے کہ وہ محض کسی ایک مبہم لفظ کو سن کر اپنی طرف سے کوئی خاص مفہوم مراد لے بلکہ خود متکلم کے بیان سے اس کا مطلب متعین کرنے کی کوشش کرے۔ مولانا حسین احمد صاحب قبلہ "متحدہ قومیت"

سے کیا مُراد لیتے ہیں؟ اس کی توضیح وہ متعدد بیانات میں کرچکے
ہیں ہم ذیل میں ایک اقتباس درج کرتے ہیں جو مولانا کے
خطبۂ صدارت سے ماخوذ ہے۔ آپ نے یہ خطبہ جو بزرگ کے
اجلاس جمعیۃ العلماء میں پڑھا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

"ہم باشندگان ہندوستان بحیثیت ہندوستانی
ہونے کے ایک اشتراک رکھتے ہیں جو کہ اختلافِ
مذاہب اور اختلاف تہذیب کیساتھ ہر حال میں
باقی رہتا ہے جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات
ذاتوں اور صنفوں کے تباین، رنگتوں اور قامتوں
کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں
فرق نہیں آتا اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی
اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز
نہیں ہیں۔ ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی
ہیں۔ اور وطنی منافع کے حصول اور مضرات کے
ازالہ کا فکر اور اس کے لئے جدوجہد مسلمانوں کا
بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری
قوموں اور غیر مسلم قوموں کا اس کیلئے سب کو
مل کر پوری طرح کوشش کرنی ازبس ضروری ہے
اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے
آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت تمام
گاؤں کے بسنے والے بند نہ باندھیں گے تو تمام
گاؤں برباد ہو جائیگا اور سبھی کے لئے زندگی
وبال ہو جائیگی اسی طرح ایک ملک کے باشندوں
کا فرض ہے خواہ وہ ہندو، ہوں یا مسلمان،
سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام
مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کو
دور کرنے کی جدوجہد کریں۔ اس اشتراک وطنی
کے سب پر یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔
مذاہب کے اختلاف سے اسمیں کوئی رکاوٹ
یا کمزوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک مذہب پر پوری
طرح قائم رہ کر اپنے فرائض انجام دے سکتا ہے
یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں
کونسلوں اور اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے اور مختلف اقوام
ہر فرائض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے
اور اسکو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ
"متحدہ قومیت" کے ہیں۔ اس کے علاوہ
دوسرے معنی جو لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط اور
ناجائز ہیں۔ یورپین لوگ قومیت متحدہ کے جو
معنی مراد لیتے ہیں اور جو کانگریسی اشخاص انفرادی
طور پر معانی بیان کرتے ہیں اُن سے یقیناً
جمعیۃ علماء بیزار اور تبری کرنیوالی ہے۔" ص۲۲۵

اس کے بعد کسی مسلمان کو یہ اشتباہ نہ رہنا چاہیئے کہ مولانا
نے "متحدہ قومیت" سے کوئی ایسا مفہوم مراد لیا ہے جو شریعت اسلام
کے منشاء یا مسلمانان سلف کے کسی عمل کے خلاف ہے زیادہ سے
زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی مراد کو ظاہر کرنے کے لئے مولانا نے
جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس میں شائبہ مجاز پیدا ہو جانے کی
وجہ سے مسامحت ہوگئی ہے لیکن منطق کا مسلّم اصول لا مشاحۃ
فی الاصطلاح اس مسامحت کیلئے وجہ اعتذار ہو سکتا ہے۔

"متحدہ قومیت سے مُراد" کے متعلق جو بحث ہو رہی تھی اس کا فیصلہ

ہو جانے کے بعد اصولاً یا ضمناً جو دوسرے مباحث پیدا ہو گئے تھے یعنی یہ کہ یہود مدینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ہوا تھا یا نہیں؟ اور اگر ہوا تھا تو اسمیں کون کونسے قبائل شریک تھے! قرآن کریم میں جنکو بنو اسرائیل فرمایا گیا ہے اُن سے کون لوگ مراد ہیں! نیز یہ کہ ان روایات سے "متحدہ قومیت" کے لئے استدلال درست ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب علمی مباحث تھے جن کے متعلق قارئین برہان کو اعتراف ہوگا کہ دونوں جانب سے بکمال سنجیدگی و متانت دادِ تحقیق دی گئی ہے البتہ کہیں کہیں کچھ تلخی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کی معذرت میں غالب کا یہ شعر خفیف سے تغیر کے ساتھ بے تکلف پڑھا جا سکتا ہے۔

ے مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے مقطع محبت نہیں مگر

رہی یہ بات کہ فیصلہ کیا ہوا! محض گفت و شنید سے کسی مسئلہ کا آج تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو۔ پس اس بحث کا یہی فائدہ کیا کم ہے کہ مختلف علمی مباحث بسط و تفصیل کیساتھ آپ کے سامنے آگئے اور اس نوعیت کیساتھ کہ بحث کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

"متحدہ قومیت اور اسلام"

تصویر کا دوسرا رُخ

(از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی)

تمہید

دُنیائے اسلام کے ایک مشہور عالم دین نے جن کا تبحر، تقویٰ و تقدس اور جن کی دیانت و امانت موافق و مخالف دونوں کے نزدیک مسلّم ہے ایک مرتبہ دہلی کے جلسہ میں دوران تقریر میں قومیت اور وطنیت کے متعلق کسی انگریز کا ایک قول نقل کر دیا گیا تھا۔ تقریر چونکہ سیاسی تھی اور آزادیٔ ہند کے مسئلہ سے متعلق، اس لئے مخالف خیالات کے چند مقامی لوگوں اور ایک رسواءِ عالم مقامی اخبار نے اس کے غلط معنی پہنا کر اور انگریز کے اس مقولہ کو خود مولانا کا عقیدہ ظاہر کر کے اس کے خلاف ہنگامہ بپا کر دیا اور یہ سب دُنیائے اسلام کے ایک مایۂ ناز اسلامی شاعر اور مفکر کو غلط اطلاعات دیکر موجودہ سیاسی کشمکش میں ناجائز فائدہ اٹھانے کیلئے اس مقدس بزرگ اور رہنمائے ملّتِ اسلامیہ سے لڑانے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے۔ جانبین کے اتباع و مخلصین نے تحریر و تقریر کے ذریعے تمام ملک میں ہیجان بپا کر دیا اور سیاسی جرائد، علمی رسائل، اور مستقل تصانیف، غرض تحریر کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہ رہا جس نے دونوں جانب کی حمایت میں حصہ نہ لیا ہو۔ مگر خوش قسمتی سے یہ منحوس بحث دونوں رہنماؤں کے باہمی سمجھوتہ سے ختم ہو گئی جس کا حال "متحدہ قومیت اور اسلام" نامی رسالہ کے صفحہ ۵ پر درج ہے۔

اس تمام ہنگامہ سے اگر معترضین کا مقصد اور مسلمانوں کی جماعتی ہمدردی ہوتا تو بحث اس حد پر پہنچ کر ختم ہو جانی چاہیئے

تھی مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا، اور انھوں نے چند اشعار جو شاعرِ اسلام نے غلط فہمی کی بنا پر مذکورۃ الصدر پیشوائے اسلام کے خلاف کہے تھے اور جن کو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ختم بحث کے نام پر واپس لے لیا تھا۔ ان کی آخری یادگار کتاب میں شائع کر دیئے اور اپنی دلی کدورت اور بغض و عداوت کی آگ کو اس طرح سرد کر کے اطمینان حاصل کر لیا مگر ملک میں اپنے اس تیزاب کو پھیلا کر دوسری مرتبہ پھر افتراق و انشقاق اور مضرت رساں بحث کا دروازہ کھول دیا اور اس مرتبہ یورپ کے نظریہ وقومیت کی بجائے ہندوستان میں مختلف اقوام کا متحد ہو کر اجنبی طاقت سے نبرد آزما ہونے اور خالص اسلامی طاقت کے اسباب مہیا ہونے کی صورت میں اصل مقصد کے پورا ہونے تک ملک میں مشترک حکومت کے قیام کو اجنبی اقتدار سے "بہتر" بلکہ اسلامیان ہند اور عالم اسلامی کے مفاد کے پیش نظر "ضروری" قرار دینے کو بھی جس کو خاص اصطلاح کے ماتحت متحدہ قومیت کہا گیا ہے۔ غیر شرعی، غیر اسلامی، کفر و شرک کی حمایت، کفر کا غلبہ جیسے مکروہ عنوانوں سے معنون کر کے سیاسی اور مذہبی دونوں طریقوں سے اس کے خلاف زہر اگلنے لگے۔ تب "متحدہ قومیت اور اسلام" زیرِ تصنیف آئی تاکہ یہ واضح کر دیا جائے کہ موجودہ حالات میں نہ یہ غیر اسلامی ہے اور نہ غیر شرعی، بلکہ ایک مقصد شرعی کو قریب لانے کیلئے بطور مقدمہ ضروری ہے۔ نیز یہ کہ یورپین نظریۂ قومیت اور ہندوستان کی دفاعی قومیت متحدہ یا ایسے مشترک نظام حکومت کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے جس میں دونوں کے مذہبی و تہذیبی، معاشرتی اور ہر قسم کی ملی امتیازات محفوظ اور جُدا جُدا قائم رہتے ہوئے خاص سیاسی اور انتظامی امور میں شرکت رکھی ہو۔ بہرحال اس کتاب کے شائع ہونے پر موافق و مخالف تقریروں اور تحریروں کے بعد یہ دور بھی ختم ہو گیا اور سیاسین وغیر سیاسیین کے افکار آذر کا رُخ اس معاملہ سے ہٹ کر دوسرے امور کی جانب پھر گیا۔

تعجب اور صد حیرت ہے جناب شمس العلماء پروفیسر صاحب کے اس طرزِ عمل پر کہ انھوں نے اس بحث کو خوامخواہ اب تیسری مرتبہ تازہ کرنے کی سعی فرمائی ہے جو کسی طرح بھی سعی مشکور نہیں کہی جا سکتی۔ چونکہ گذشتہ ڈھائی سال میں اس مسئلہ پر علمی، مذہبی اور سیاسی ہر حیثیت سے جسقدر مضامین شائع ہو چکے ہیں ان میں قریب قریب وہ سب باتیں مختلف طریقوں سے آ چکی ہیں جن کو پروفیسر صاحب کی محققانہ کاوش نے بساط پر جمع کر دیا ہے اور اسی طرح ان کے جوابات بھی شرح و بسط کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ معارف اعظمگڈھ، ترجمان القرآن لاہور، الاصلاح سرائے میر، طلوعِ اسلام دہلی جیسے مذہبی و علمی رسالے بحث کے دونوں گوشوں پر کافی اور سیر حاصل بحث کر چکے ہیں تو اب اس فتنۂ آب دیدہ کو بیدار کرنا کسطرح دینی یا علمی خدمت کہلایا جا سکتا ہے؟ نیز پروفیسر صاحب کے مضمون کو پڑھنے سے یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ان کے اس ارادہ کے باوجود کہ وہ اس مسئلہ کو سیاسی الجھنوں سے محفوظ رکھیں گے، وہ اپنے ارادہ میں قطعاً ناکام رہے ہیں اور بحث کا رُخ معاہدہ کے علمی پہلو سے ہٹ کر زیادہ تر موجودہ سیاسی رجحانات سے متعلق ہو گیا ہے یا متعلق کر دیا گیا ہے۔

میں سیاسی مسلک میں اگرچہ حضرت مصنّف رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کا ہمنوا ہوں۔ تاہم اس بحث کو "متحدہ قومیّت" کے نام سے زیر بحث لانے کا شرع سے اس لئے مؤید نہیں ہوں کہ اس مرکب لفظ کی آڑ میں مخالف

خیال حضرات بآسانی اس رائے کے مؤیدین کے خلاف عام مسلمانوں کو دھوکہ دیتے اور زیادہ سے زیادہ مشتعل کر دیتے ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نظریہ کے حامی مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹا کر ہندوستان میں یورپین نظریہ کے مطابق ایک مستقل قوم بنا کر ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم کر دینا اور ملی امتیازات کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پناہ بخدا اس تصور کا شائبہ بھی ایک لمحہ کے لئے مسلمان کے دل میں نہیں گذر سکتا۔ اور نہ اس وطنی قومیت کے نظریہ سے یہ سب کچھ لازم آتا ہے بلکہ بلاشبہ اس کے ذریعہ سے اسلامی اعمال کے اختیار کرنے میں اور زیادہ وسعت پیدا ہونے کی صورت نکلتی ہے اسلئے بعض سیاسی اغراض کے ماتحت مخالف خیال مسلمانوں کا ہم پر اتہام بلکہ سخت بہتان ہے سبحٰنک ھٰذا بہتان عظیم ۰ بلکہ مقصد حقیقی وہ ہے جو ابھی مذکور ہوا۔

علاوہ ازیں یہ دیکھ کر سخت افسوس اور رنج ہوا کہ محترم پروفیسر صاحب باوجود اس دعوے کے کہ "وہ سیاسی بحث سے الگ ہو کر محض علمی نقطہ نظر سے معاہدہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالیں گے"۔ اپنے مضمون کی ابتداء اسی سیاسی طعن وتشنیع سے فرماتے ہیں جس کے ذریعہ دوسرے سیاسی بہادروں نے ناانصافی کے ساتھ حضرت مصنف رسالہ پر تیر بازی کی ہے ۔۔۔۔ اس لئے کہ اگر ہجو ملیح، طعن وتشنیع، بددیانتی کا الزام اور سیاست سے غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف کسی بے جا الزام قائم کرنا یہ سب امور علمی مباحث میں "سنجیدگی" شمار کئے جا سکتے ہیں تو پھر ہر عقلمند کے نزدیک پروفیسر صاحب کے اس طریقہ سے بہتر اُن بہادروں کا طریقہ ہی قابل ستائش ہے جنہوں نے تاؤل کے مفہوم میں تحریف کر کے اپنے مزعومہ اعتقاد کی بنا پر جو کچھ زبان پر آیا کہا اور جو کچھ لکھا جا سکا لکھا۔

یہ ہے وہ مردہ بحث جسمیں پروفیسر صاحب پھر ایکبار جان ڈالنے کی سعی فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ اقرار فرماتے جاتے ہیں کہ وہ ان حالات ومباحث سے ابتک قطعاً بے خبر ہیں جن حالات میں یہ رسالہ زیر تصنیف آیا' اور اس لئے ۳۶، ۳۰ صفحے پوری طرح سمجھ میں بھی نہ آئے' یا للعجب!

مسئلہ کی اصل حقیقت!

بہر حال مسئلہ زیر بحث کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام روحانیت کے ساتھ ساتھ حکومت کو بھی مذہب کا ایک اہم جزو قرار دیتا ہے اور یہ جزو ہندوستان کے اندر صحیح معنی میں قریباً ڈیڑھ صدی سے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس حالت میں اسلام ہم پر کیا فرض عائد کرتا ہے۔ جہاد بالسیف؟ ہجرت؟ موجودہ غلامی پر قناعت؟ یا کوئی ایسی راہ جو اصل مقصد سے قریب کر دے؟ یا کم از کم موجودہ حالت سے بہتر اور مفید ہو؟ — یہ ایک سوال ہے جس کا جواب اہلِ علم پر فرض ہے۔

اسلامی ادلہ' قرآن عزیز' احادیث رسول اور اجماع امت اس تعلیم سے پُر ہیں کہ افراد اور اُن کی مجبوریوں سے قطع نظر کسی اسلامی جماعت کو جو ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں نفوس پر مشتمل ہو۔ غیر اسلامی اقتدار کی غلامی پر قانع ہونا ہرگز جائز نہیں ہے اسی طرح حالات وواقعات کے اعتبار سے نہ اسقدر عظیم الشان آبادی کو ہجرت کا حکم دیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ بھی اسلامی حکم ہے کہ جہاں مسلمانوں کی ثقافت، آثار اسلامی' اوقاف، مساجد اور اسلامی ضروریات کے تمام نقوش موجود ہوں ان کو تباہ و برباد چھوڑ کر ایک بڑے ملک کی زبردست آبادی وہاں سے

ہجرت کر جائے یہ کسی طرح جائز و درست نہیں اور جہاد بالسیف کے لئے نہ تو مناسب حالات ہیں اور نہ بصورت حال موجودہ زندگی میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ ہر مسلمان ادنیٰ توجہ سے معلوم کر سکتا ہے کہ یہ قدرت فی الحال نہ ہم میں موجود ہے اور نہ غلامی کی موجودہ حالت میں اس کے وجود پذیر ہونے کی کسی حالت میں بھی توقع ہے تو اب اسلام العیاذ باللہ ہم کو ان مجبوریوں میں چھوڑ کر تاریکی میں رکھتا ہے یا ان حالات میں بھی کوئی روشنی دیتا ہے؟ — اسکے لئے چند علماء اور مفکرین اسلام نے اسلامی احکام کی روشنی ہی میں ایک راہ طے کی اور مسلمانوں کی عملی رہنمائی فرمائی۔ یہ وہ نامور ہستیاں ہیں جن کی زندگیاں اسلامی گفتار ہی کی نہیں بلکہ اسلامی کردار کی بھی روشن مثالیں ہیں جنہوں نے عملی طور پر بھی ہندوستان میں اسلامی حکومت کا غلبہ قائم کرنے کی سعی کی ہے۔ ان میں سے شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہٗ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے اسماء گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

وہ راہ یہ ہے کہ اول ہندوستان کی موجودہ حالت میں انقلاب کرنا ضروری ہے اور وہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مختلف اقوام ہند اجنبی طاقت کے مقابلہ میں یہ نہ طے کر لیں کہ وہ اپنے مذہبی اور دوسرے تمام خصوصی امتیازات میں جدا جدا قوم ہوتے ہوئے ملکی انتظام و انصرام میں ایک قوم یعنی "ہندوستانی" سمجھے جائیں گے تاکہ متفقہ سعی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو اور ہم اصل مقصد کے حصول میں جو ابتدائی رکاوٹ پا رہے ہیں وہ آہستہ آہستہ دور ہو کر ہم کو مقصد سے قریب کر دے یا کم از کم موجودہ حالت سے زیادہ ہم احکام اسلامی کے اختیار ہی میں آزاد ہو جائیں۔

جن حضرات کے نزدیک موجودہ حالت پر قناعت شرعاً حرام ہے اور بحالات موجودہ جہاد بالسیف کیلئے راہ مسدود اور ہجرت سے خود شرعی معذوری موجود ہے ان کے نزدیک یہ طریق کار ہی اصل مقصد کیلئے مدد و معاون ہو سکتا ہے اور جبکہ حصول مقصد اسلامی فریضہ ہے تو عام اصول اسلامی مقدمۃ الواجب واجبۃ (جس شے پر کسی فرض کا انحصار ہو وہ شے بھی فرض ہے) کی بنا پر اس طریق کار کو اختیار کرنا بھی ضروری اور واجب ہے۔ نیز اگر یہ طریق کار "اہون البلیتین" دو مصیبتوں میں سے اسلامی نقطہ نظر سے ہلکی مصیبت ہے تب بھی اس کا اختیار کرنا اسلامی احکام کی رُو سے از بس ضروری ہے۔ مقصد کی تکمیل کیلئے اس سیاسی اتحاد کا نام ہی حضرت مصنف کے نزدیک قومیت متحدہ ہے۔ مگر مسلم سیاست دانوں نے جماس سے قبل تحریر و تقریر میں خود اس قسم کی قومیت متحدہ کا بارہا اعلان کر چکے ہیں اور جنہوں نے سرکاری شہادتوں میں بھی اسکو ہندوستان کیلئے لازمی و ضروری بتایا ہے اپنی خاص اغراض کی بنا پر ان باعمل ہستیوں کے اس طریق کار یا نظریہ پر اب مذہبی اعتراضات کے نام سے حملے کرنا اور ان کو مورد طعن بنانا پسند کر لیا ہے۔ منجملہ اور مختلف اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ ہندوؤں کے ساتھ بوجہ مشرک ہونے کے اس قسم کا اشتراک بھی ناجائز اور حرام ہے۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر خیر القرون تک کسی وقت بھی غیر مسلم کے ساتھ اس قسم کے اتحاد کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا اور اس قسم کی سیاسی متحدہ قومیت بھی حرام ہے۔

حضرت مصنف "متحدہ قومیت اور اسلام" نے

انقلاب کے وجوب کے لئے "ہندوستان کے لئے راہ عمل" کے
عنوان تک بحث فرمائی ہے اور اس کا حاصل وہی ہے جو
اوپر کی سطروں میں بیان ہو چکا ہے جس کو مقدمہ واجب سمجھ کر
واجب کہا گیا ہے اور صفحہ ۴۲ کے عنوان "متحدہ قوم اور اُمت
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے
بنائی" سے صرف اس اعتراض کا جواب دینا ہے کہ تاریخ
اسلامی میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان کسی قسم کا سیاسی اتحاد یا
اشتراک پایا ہی نہیں جاتا جسکو متحدہ قوم یا متحدہ اُمت کہا گیا ہو
پس اگر یہ ثبوت حسب اتفاق قطعاً نہ پایا جاتا تب
بھی مسئلہ کا وجوب اپنی جگہ اسی طرح باقی رہتا اور اس کے دلائل
بھی اپنی جگہ اسی طرح صحیح اور مضبوط رہتے لیکن خوش قسمتی ہے کہ
مسلمانوں کی ایک ایسی کٹھن منزل میں عملی طور پر بھی ایک تاریخی
ثبوت موجود ہے جو خود زمانہ نبوت کا ثبوت ہے اسلئے
مجھے سخت حیرت ہے کہ پروفیسر صاحب مسئلہ کی اصل حقیقت
اور اس کے دلائل سے قطع نظر فرما کر ایک اسلامی تاریخی نقل کو
مصنف کی جانب سے اس مسئلہ کا خود ہی شرعی محور بتاتے اور
قومیت متحدہ کے وجوب کی دلیل ظاہر کرتے ہیں اور پھر خود
ہی اس پر تنقید فرما کر یہ ثابت کرنے کی سعی فرماتے ہیں کہ چونکہ
اس روایت کی سند منقطع ہے لہٰذا احادیث صحیحہ کے
اصول پر اس سے استناد نادرست ہے۔ نہ معلوم علمی دیانت
کا یہ کس قسم کا مظاہرہ ہے جو دوسروں کی دیانت پر ناجائز
حرف گیری کی اجازت دیتے ہوئے خود کو اس عمل کی اجازت
دیتا ہے۔

یہ روایت جس کو ابن اسحٰق جیسے امام سیرت
نے بیان کیا ہے اور جس کا سیرت میں وہی رتبہ ہے جو
امام احمد اور امام بخاری کا حدیث میں ہے، بلاشبہ اسطرح
صحیح اور مقبول ہے جس طرح سیرت کی دوسری صحیح اور مقبول
روایات مستند سمجھی جاتی ہیں اور اسی لئے محدث یگانہ
امام جرح و تعدیل حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ "البدایہ
والنہایہ" میں، قاسم بن سلّام جیسے محدث نے کتاب الاموال
میں، اور ابن ہشام نے اسکو اپنی سیرت میں روایت کیا اور
مشہور ناقد سیرت و تاریخ محدث سہیلی نے روض الانف
میں اسکو صحیح تسلیم کیا اور اس پر حسب عادت کسی قسم کی جرح
نہیں کی البتہ اس قسم کی روایات سیرت سے وجوب و
حرمت کے احکام نہیں بیان کئے جا سکتے، اور نہ حضرت
مصنف "متحدہ قومیت اور اسلام" نے اسکو اس غرض کے لئے
پیش کیا ہے اور جس غرض کے لئے پیش کیا ہے اس کے
لئے پیش کرنا ہر طرح موزوں اور اسلامی اصول کے مطابق ہے
اور جس غرض کے لئے پروفیسر صاحب نے پیش کرنا بتایا ہے
وہ حضرت مصنف پر غلط الزام اور بے جا تہمت ہے۔
اسلئے کہ مصنف علام نے معاہدہ کا ذکر کرنے کے بعد
صاف اور صراحت کیساتھ یہ تحریر فرمایا ہے۔

> "مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہے
> کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر
> ایک قوم بننا یا بنانا نہ تو ان کے نفس دین
> میں خلل انداز ہے اور نہ یہ امر فی نفسہ
> اسلامی قوانین اجتماعیہ کے خلاف ہے۔"

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ اس تحریر کا
لب و لہجہ کیا یہ ثابت نہیں کرتا اور اس کی سادہ عبارت کیا
اسکو واضح نہیں کرتی کہ مصنف کے نزدیک مسئلہ کا یہ شرعی

محدود نہیں ہے۔ بلکہ شرعی ضرورت کے لئے اسلامی واقعات کی شہادتوں میں سے ایک شہادت کے طور پر اسکو پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ پروفیسر صاحب علمی سنجیدگی کے ادعا کے باوجود مصنف رسالہ پر اس لئے علمی بددیانتی کا الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے پروفیسر صاحب کی طرح معاہدہ کی تمام عبارت کو کیوں نقل نہیں کیا، اور صرف اپنے مقصد کی دفعات کیوں نقل کیں۔ آپ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ معاہدہ کو اگر پورا پڑھا جائے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ میں بالفرض اگر قومیت متحدہ بنی تو اس میں اسلام کو غلبہ رہا اور یہود مدینہ کو امة من المسلمین "یعنی مسلمانوں ہی کی اُمت شمار ہوں گے" کہا گیا لہٰذا اس سے کسی ایسی متحدہ قومیت کا ثبوت نہیں نکلتا جو مسلمانوں کو مغلوبانہ یا مساویانہ حیثیت میں حاصل ہوتی ہو، اور اس لئے مصنف رسالہ نے ان دفعات کو ظاہر نہیں کیا جو علمی دیانت کے خلاف ہے۔

میں سخت حیرت میں ہوں کہ اس رکیک اور دانستہ تہمت تراشی کا جواب کیا دوں۔ کیا پروفیسر صاحب علمی استدلال کے اس طریقے سے بالکل ناواقف ہیں؟ کہ کسی طویل عبارت میں سے ہمیشہ اسی قدر نقل کی جاتی ہے جو اپنے دعوے کے ثبوت کی شہادت بہم پہنچاتی ہو۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس موضوع پر اگر کوئی رسالہ یا کتاب لکھی گئی ہو تو جبتک اس کا ایک ایک لفظ از اول تا آخر نقل نہ کر دیا جائے ناقل بددیانت ہی کہلائے گا۔ البتہ باقی ماندہ عبارت میں کوئی ایسا مضمون نہ ہونا چاہیئے جو مدعی کی پیش کردہ شہادت کے خلاف ثبوت مہیا کرتا ہو یا اس کو مضمحل کرتا ہو اور یہاں بحمد اللہ ایسا نہیں ہے۔

کیونکہ علامہ موصوف کا مرکز استدلال صرف یہ ہے کہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلم اور غیر مسلم کیلئے بعض حالات میں امت واحدہ یا قوم متحدہ کا ثبوت ملتا ہے باقی جزئیات کا نفس مسئلہ کے ثبوت سے ایسا نہیں ہے کہ اگر نفس مسئلہ کو اختیار کیا جائے تو جبتک اس کی تمام جزئیات کو بھی اختیار نہ کیا جائے نفس مسئلہ بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا تعلق کیوں نہیں ہے اس کی وجہ اہل علم کی نگاہ سے کسی طرح پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ یہ کہ جب اسلامی مقصد کے لئے قوت، طاقت، شوکت اور حکومت کے تمام لوازمات کے باوجود حدیبیہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مشہور صلح کی جس کی ظاہری سطح مسلمانوں کے حق میں اس قدر مغلوبانہ تھی کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر اور صاحب تدبیر و سیاست سے بھی برداشت نہ ہو سکا اور وہ عرض کرنے پر مجبور ہوئے کہ یا رسول اللہ جب ہم حق پر ہیں اور دشمن باطل پر تو ہم ہرگز اپنے دین کو ذلیل نہ ہونے دیں گے۔ اور انتہائی مغلوبیت کی وہ دفعہ جس پر سب کچھ ہوا حسب ذیل ہے:۔

"انہ لا یاتیک منا احد وان کان علی دینک الا رددتہ الینا فخلیت بیننا وبینہ وکرہ المؤمنون ذلک"

"اور یہ شرط کہ تمہارے پاس ہمارا جو شخص بھی جائے خواہ وہ تمہارے دین ہی کو قبول کر چکا ہو اسکو ہمارے پاس لوٹا دینا ہو گا اور اس کے اور ہمارے درمیان مسلمان حائل نہ ہوں گے بس یہ شرط مسلمانوں کو بے حد ناگوار ہوئی" (بیہقی جلد ۹ ص ۲۲۲)

اور بعض روایات میں ہے کہ ہمارے پاس اگر تمہارا

کوئی آدمی مرتد ہو کر آگیا تو ہم واپس نہ کریں گے۔ یعنی ایک مسلم کو اس معاہدہ کے مطابق مشرکوں کے حوالہ اس لئے کر دینا ضروری تھا کہ وہ اس معاہدہ کے بعد مشرکوں کے گروہ میں سے مسلمان ہو کر کیوں دارالاسلام چلا آیا ہے نیز اسلام کے اس دور میں جب کہ مکی زندگی میں مسلمان مغلوب تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو امر فرمایا کہ وہ نجاشی کی غیر مسلم حکومت کی پناہ میں چلے جائیں اس لئے کہ اگرچہ وہ وہاں بھی مغلوب زندگی بسر کریں گے تاہم مکہ کی موجودہ مغلوبانہ زندگی کے مقابلہ میں مذہبی امور اور امن عامہ کے اعتبار سے زیادہ آزاد رہیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ مکہ میں مغلوبانہ زندگی غیر اختیاری تھی اور حبشہ کے غیر مسلم اقتدار میں مغلوبانہ زندگی اختیاری تھی مگر چونکہ دوسری زندگی سابق سے فی الجملہ بہتر اور اصل مقصد سے قریب تر کرنیوالی تھی اس لئے اس کو پسند فرمایا پس حالات و واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے جس زمانہ میں بھی اسلامی مقصد کیلئے ایسی صورت پیش آجائے تو خلیفہ اور امیر کو اجازت ہے کہ وہ مغلوبانہ صلح بھی کر سکتے ہیں اور فقہ اسلامی کی تمام کتابوں میں یہ بھی مسلم ہے کہ اگر کسی وقت خلیفہ یا امیر المسلمین نہ ہو تو علماء حق کی جماعت اور اہل حل وعقد کا گروہ بھی اسی طرح کر سکتا ہے۔ پس اگر اسلامی مفاد کی خاطر شوکت و طاقت کے باوجود مغلوبانہ صلح ہو سکتی ہے تو مساویانہ دفاعی قومیت متحدہ بھی بن سکتی ہے اور اگر ضرورت کے لئے غیر اسلامی غلبہ کے ماتحت چند بے باختیار خود رہا جاسکتا ہے تو مساویانہ متحدہ قومیت بھی بنائی جاسکتی ہے۔

اور اگر مدینہ کے حالات و واقعات کے اعتبار سے مغلوبانہ یا مساویانہ اتحاد عمل کی ضرورت پیش نہ آئی بلکہ مسلمانوں کے غلبہ کے ساتھ مسلم و کافر کے درمیان امت واحدہ جائز قرار پائی تو اگر موجودہ حالت میں مسلمانوں کو یہ صورت بھی میسر نہ ہو اور وہ مساویانہ طور پر یہی معاملہ ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے کرلیں تو کیا شرعی اعتراض کا موقع ہو سکتا ہے۔ رہا یہ امر کہ مسلمان مدینہ میں اس وقت مغلوب تھے تو یہ پروفیسر صاحب کی تاریخی معلومات کے زیر نظر ہو تو ہو، ورنہ تمام سیر و تاریخ اسلامی کی کتابیں اور روایات اس امر کی شہادت دے رہی ہیں کہ جب آپ مدینہ میں تشریف لے آئے اور مہاجرین کی بھی بہت بڑی تعداد آگئی تو مدینہ میں مسلمان ہی مسلمان تھے، اور باقی شرذمہ قلیلہ چنانچہ علامہ خضری بک یہ کہتے ہیں ا۔

ثم تلاحق المهاجرون	"آپ کے بعد پھر مہاجرین بھی آگئے
فلم يبق بمكة منهم	اور مکہ میں چند قیدی اور مبتلا مسلمانوں
احد الا مفتون او محبوس	کے علاوہ اور کوئی باقی نہ رہا، رہا مدینہ
اما المدينة فعم اهلها	کا معاملہ تو اس کی عام آبادی مسلمان ہو
اسلام الا قليلا منهم۔	چکی تھی البتہ تھوڑے لوگ غیر مسلم تھے"

(تاریخ العالم اسلامیہ ج ا ص ۹۴)

اور اس پر تمام ارباب سیر کا اتفاق ہے نیز اگر مدینہ میں کفار اور مشرکین کا غلبہ ہوتا کہ جس میں یہود بھی شامل ہیں اور جن کا اسلامی حسد مشہور ہے تو ایسے معاہدہ کو وہ کیسے قبول کر لیتے جنمیں ان کو مغلوبیت اور مسلمانوں کا غلبہ واضح اور ظاہر تھا۔

علاوہ ازیں اس دفاعی متحدہ قومیت کے متعلق یہ دعویٰ کہ مسلمان اس میں مغلوب اور ضم ہو کر رہیں گے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کو حقائق و واقعات کی روشنی میں کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس طریق کار کو درست سمجھنے والوں کا یقین ہے کہ یہ طریقہ اصل مقصد سے قریب کرتا اور موجودہ غلامی کے دور

کے مقابلہ میں آنیوالے انقلابی دور میں اسلامی احکام کی بجاآوری میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر آنے کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ اس لئے استشہاد اپنی جگہ قطعاً صحیح اور درست ہے بہرحال اس معاہدہ کی عام دفعات کو قطع نظر کرکے صرف ان دفعات کو پیش کرنا جو زیر غور مسئلہ سے متعلق ہیں علمی دیانت کے خلاف نہیں ہے بلکہ علمی طریق استدلال کیلئے بہت موزوں اور مبنی بر صداقت ہے اور بددیانتی کے غلط الزام لگانیوالوں کی دیانت پر ماتم کناں۔ پس بہتر ہوتا کہ معاہدہ کی اس طویل عبارت کو پیش کرنے میں پروفیسر صاحب علمی نمذ کار کو اپنا مقصد بناتے نہ کہ ایک مقدس عالم پر بددیانتی کے الزام کو۔ یہاں پہنچ کر اصل مسئلہ کی بحث ختم ہوجاتی ہے لیکن ضروری ہے کہ پروفیسر صاحب کے ان چند علمی مغالطوں کو رفع کردیا جائے جو اس ذیل میں آپ کو پیش آگئے ہیں۔

محترم پروفیسر صاحب نے ایک سوال بشکل اشکال پیش فرمایا ہے کہ بالفرض اگر ایسا معاہدہ ہوا بھی ہے تو وہ آیت جہاد سے منسوخ ہوچکا، اور اس کے بعد اس کو دلیل بنانا عام اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو معلوم نہیں کہ آپ کے اس "عام اصول مسلمہ" سے کیا مراد ہے۔ یہ کہ اصول کا یہ مسئلہ ہے کہ جب نسخ آجائے تو وہ دائمی ہوتا ہے اور منسوخ کی کوئی ایسی جزو باقی نہیں رہتی جس کو کسی وقت اور کسی حال میں بھی قابل عمل قرار دیا جاسکے۔ اگر یہ مطلب ہے تو پروفیسر صاحب کا یہ علمی مغالطہ ہے اس لئے کہ علماء اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر میں سے محققین کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی آیت یا حدیث کے منسوخ ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس حکم کی سرے سے جنس ہی منسوخ ہوجاتی ہے بلکہ احکام کی پانچ جنسوں واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح میں سے کسی نہ کسی ایک قسم کا حکم ضرور ہی باقی رہتا ہے اور نسخ صرف اسی قسم پر واقع ہوتا ہے جس کیلئے ناسخ وارد ہوا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شئے واجب تھی تو اس کے نسخ کے معنی یہ ہوں گے کہ اسکا وجوب ختم ہوگیا مگر کم سے کم درجہ اباحت و جواز بہرحال باقی رہتا ہے۔

نیز احکام میں نسخ اس لئے وارد ہوتا ہے کہ ضروریات و حاجات کا تقاضاء مصلحت یہی ہے پس اب جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور دین کے احکام میں ضروریات و حالات کے مصالح کو اسلام نے کامل و مکمل کردیا تو اب پیش آنے والے حالات و حاجات کے تغیرات کے پیش نظر ناسخ و منسوخ کے اثرات کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جس وقت بھی اسی قسم کے حالات امت میں پیش آئیں گے وہ حکم اسی طرح اثر انداز ہوگا۔ البتہ اس حالت میں ناسخ کی فرضیت یا حرمت استحباب یا کراہت یا اباحت جو بھی وحی الٰہی یا ارشاد نبویؐ سے قائم ہوچکی ہے وہ اب بحالہ قائم رہے گی اور تبدیلی حالات کے بعد اس کے استعمال کے لئے جدید حکم کی ضرورت نہ پڑے گی۔

مثلاً جہاد سے قبل مکہ کی زندگی میں صبر کا حکم تھا اور جہاد کی مطلق اجازت نہ تھی لیکن جب جہاد فرض ہوگیا تو اب ضبط و صبر کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کسی بعد کے زمانہ میں مسلمانوں پر ایسا ہی وقت آجائے کہ شرعی نقطہ نظر سے جہاد بالسیف نہ کرسکیں تو وہ مکی زندگی کو اختیار کرسکتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان تمام مساعی میں برابر مشغول رہیں جن کی بدولت آگے چل کر یہ حالت بدل جائے گی اور ساتھ ہی تا قیامت تک قائم رہنے والے جہاد

کا حکم آج بھی اسی طرح قائم رہیگا جس طرح کل قائم تھا اور جب بھی اس کے اسباب مہیا ہو جائیں گے اسکا عمل بھی اسی طرح فرض رہے گا جس طرح سابق میں رہا ہے اسی نے یہ نہیں کہا جائیگا کہ شراب کے پینے کا حکم منسوخ ہوگیا اسلئے کہ اس کی عملی اباحت اسلام سے قبل رائج تھی اور اسلام نے ایک مدت کے بعد اپنے احکام میں اس کے لئے حرمت کو جگہ دی ہے۔

اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جائیگا کہ ابتدائے اسلام میں نماز میں بات چیت مباح تھی اور اب فلاں حدیث کی رو سے یہ اباحت منسوخ ہوگئی اس لئے کہ یہ ابتدائی اباحت کسی شرعی حکم کے ماتحت نہ تھی بلکہ اسلام سے قبل کی ایک عام حالت کے ماتحت تھی کچھ عرصہ کے بعد اسلام کا حکم یہ ہوگیا کہ نماز میں بات چیت مفسد نماز ہے اور جن علماء نے ان جزئیات کو نسخ سے تعبیر کیا ہے۔ علماءِ محققین نے تصریح کر دی ہے کہ ان کی مُراد نسخ لغوی ہے، اصطلاحی نسخ مراد نہیں ہے چنانچہ علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث اور اصول فقہ کے امام ہیں۔ نسخ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

القواعد الکلیۃ من الضروریات	"ضروریات حاجات اور
والحاجات والتحسینات	اخلاقیات کے بارہ میں جو
لم یقع فیہا نسخ وانما وقع	قواعد کلی ہیں ان میں نسخ
النسخ فی امور جزئیۃ	نہیں ہوتا بلکہ ان کی جزئیات

کے بارہ میں نسخ واقع ہوتا ہے" اور آگے چل کر دلیل ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

وکذلک الحاجات فانا نعلم	اور اسی طرح حاجات ضروریات
انہم لم یکلفوا بما لا یطاق ھذا	کا حال ہے ہم یہ بخوبی جانتے
ولان کان قد کلفوا بامور شاقۃ	ہیں کہ انسانوں کو خدا نے امور
فذلک لا یرفع اصل لاعتبار	شاقہ کا تو مکلف بنایا ہے لیکن
الحاجات ومثل	ناقابل برداشت تکالیف کا مکلف نہیں
ذلک التحسینات[1]	بنایا پس اس سے نسخ حاجات و ضروریات

کے لحاظ و اعتبار کی بنیاد کو منسوخ نہیں کرتا اور یہی حال اخلاقیات کا ہے

علامہ آمدی نے کتاب الاحکام میں اور محدث ابن حزم نے الاحکام فی اصول الاحکام میں بھی نسخ پر مفصل بحث کرتے ہوئے اسی کو اختیار کیا ہے اس لئے پروفیسر صاحب کا ہجو کے انداز میں اصول مسلمہ کا حوالہ دے کر نسخ کے یہ معنی سمجھنا کہ "اس حکم کا ازالہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ حاجت و ضرورت کے وقت میں بھی اس حکم کی کوئی جزئی معمول بہ نہیں بن سکتی" خود اصول مسلمہ کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم پروفیسر صاحب کے اصول مسلمہ کو مان بھی لیں تب بھی شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فوز الکبیر میں اور امام شاطبی نے موافقات میں اس کی تصریح کی ہے کہ متقدمین کے یہاں نسخ کے معنٰی بہت عام ہیں اور وہ عام حکم کی تخصیص، مجمل کی تفصیل و بیان، متشابہ کی تشریح و توضیح جیسے امور میں بھی ناسخ و منسوخ کہہ دیتے ہیں۔ لیکن نسخ کے یہ معنی کہ "سابق حکم کی جگہ جدید حکم مراد شرعی اور معمول بہ قرار پا جائے" احکام میں بہت ہی شاذ و نادر ہیں۔ اور قرآن عزیز میں سے ان کی شمار بھی کرائی ہے جن میں معاہدات جیسے امور کو قطعاً اس میں داخل نہیں کیا۔

امام شاطبی مکی اور مدنی احکام میں ناسخ و منسوخ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فلو اجتمعت ھذہ	پس جبکہ یہ تمام امور جمع ہوں اور کتاب
الامور ونظرت الی	سُنت کے دلائل پر نظر کرے تو تیرے
الادلۃ من الکتاب	ہاتھ میں منسوخ احکام میں سے شاذ و نادر
والسنۃ لم یتخلص	احکام کے علاوہ کچھ نہیں رہے گا۔

[1] الموافقات فی اصول الشریعۃ ج ۳ ص ۱۱۰، ۱۱۱

فی یدیک من منسوخها الاما هو نادر ط

(موافقات ج ۳ ص ۱۰۷، ۱۰۸)

اور شاہ ولی اللہ رح نسخ پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قلت وعلی ما حررنا لا یتعین النسخ الا فی خمس آیات	میں کہتا ہوں اور جس طریقہ پر ہم نے تحریر کیا ہے اس کے اعتبار سے نسخ صرف پانچ آیتوں کے اندر محدود ہو جاتا ہے

(فوز الکبیر ص ۲۰)

اور بعض محقق علماء اصول نے تصریح کی ہے کہ صاحب جلالین یا دوسرے بعض مفسرین اکثر صبر و عفو کی آیات اور مسالمت کی آیات کے بارہ میں جو لکھتے جاتے ہیں " انها نسخت بآیة القتال (اس آیت کا حکم جہاد کی آیت سے منسوخ ہوگیا) یہ ان کا تسامح ہے کیونکہ جہاد کی فرضیت کے بعد بھی حالات واقعات کے اعتبار سے یہ احکام اپنے مناسب مواقع میں قابل عمل ہیں' لہذا ابی عبید کا جو مطلب پروفیسر صاحب نے سمجھا ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ یہ معاہدہ اپنی ان خصوصیات کے ساتھ جو ہجرت کے شروع میں مدینہ میں ہوا مصلحت و ضرورت وقت ختم ہو جانے پر آیت جہاد ہی کے بعد غیر معمول بہ ہو گیا۔

پس اگر اس معاہدہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مذہب والوں کی ایک پارٹی مصالح کے پیش نظر بنادی تھی تو حالات و واقعات کی مجبوریوں کے پیش نظر آج بھی کوئی عالم اس کی اجازت دے " خصوصاً جب کہ اس کی ضرورت کے دواعی خود اسلامی امور ہوں " تو کیوں قابل لعن وطعن قرار دیا جائے اور خواہ مخواہ اس مسئلہ کو باطل کرنے کے لئے مناظرانہ شقوق پیدا کر کے ذکاوت طبع کا ثبوت کس لئے بہم پہنچایا جائے۔ پروفیسر صاحب کے تمام بیان کردہ درجات و شقوق میں سے حقیقی شق وہی ہے جس کو ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں بحث کا محور بھی صرف اسی کو ہونا چاہیئے اور بس۔

پروفیسر صاحب کا ایک بہت بڑا علمی مغالطہ یہ ہے کہ مدینہ کا یہ معاہدہ " جس میں مسلمانوں اور کافروں کی مدینہ کی حفاظت اور دیگر مصالح کی بنا پر " امۃ واحدہ " بتایا گیا ہے اسرائیلی یہودیوں یعنی بنی قریظہ، بنی نضیر و قینقاع کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس لئے اس کو " معاہدہ مسلمانان یا یہود " نہیں کہنا چاہیئے البتہ اس کو یثرب کے قبائل اوس خزرج کے مسلمان اور ان ہی کی نسل کے یہودی مذہب رکھنے والے کافروں کا معاہدہ کہنا چاہیئے' کاش کہ پروفیسر صاحب اپنی بحث کے رخ کو صرف اس مسئلہ تک محدود رکھتے اور ایک علمی مذاکرہ کی طرح اس پر تبصرہ فرماتے تو بہت بہتر ہوتا۔ مگر افسوس کہ ان کی علمی دیانت کے ادعاء نے یہ نہ ہونے دیا۔ بہرحال اس معاہدہ کی نوعیت اسقدر صاف اور واضح ہے کہ اسکو دیکھتے ہوئے پروفیسر صاحب کے مغالطہ پر سخت حیرت و تعجب کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

یہ معاہدہ بلاشبہ یثرب کے تمام یہود سے ہوا ہے جن میں بنی قریظہ، بنی نضیر، اور بنی قینقاع سب ہی شامل ہیں اور بلاشک و ریب پروفیسر صاحب کا ان ہر سہ قبائل کو اسرائیلی بتانا اور اس کو معاہدہ سے جدا سمجھنا یہ دونوں باتیں قطعاً غلط اور حقیقت ثابتہ کے خلاف ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ عام مورخین کا یہ بیان ہے کہ یثرب کے یہ تین یہودی قبائل یہودی النسل تھے تاہم محققین کی رائے اس کے خلاف ہے اور ان کا

یہ دعویٰ ہے کہ بجز غیر معروف دو تین خاندانوں کے یثرب کے تمام یہود جن میں خصوصیت کے ساتھ بنی قریظہ بنی نضیر بنی قینقاع بھی شامل ہیں یہودی المذہب تو ہیں مگر یہودی النسل (اسرائیلی) نہیں ہیں بلکہ عربی النسل اور قحطانی عرب ہیں چنانچہ یعقوبی مشہور مؤرخ لکھتا ہے ا

ثم کانت وقعة بنی النضیر وهم فخذمن جذام الا انهم تهودوا وکذلك قریظه	پھر بنی نضیر کا واقعہ پیش آیا یہ قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ جذام کی شاخ ہے مگر انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اور اسی طرح قریظہ کا حال ہے۔

(یعقوبی جلد ۲ ص ۹)

اور قبیلہ جذام باتفاق علماء انساب قحطانی عرب ہیں ا۔

اسی طرح مسعودی جیسے مشہور مؤرخ نے لکھا ہے کہ بنی قریظہ عرب کے قبیلہ بنی جذام کی شاخ ہیں اور یہ عمالقہ کی بت پرستی سے ناراض ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے اور شام سے نقل مکانی کر کے حجاز میں بس گئے تھے علاوہ ازیں قریظہ، نضیر، قینقاع خاص عربی نام ہیں اور اسرائیلی ناموں سے بالکل جدا ہیں لہٰذا ان کے اجداد کا عربی النسل ہونا یقینی ہے۔ پس یہ حوالجات تصریح کرتے ہیں کہ یہ تینوں قبائل اسرائیلی نہ تھے بلکہ قحطانی عربی النسل تھے۔

لہٰذا اب پروفیسر صاحب کے دعوے کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر ان تاریخی حقائق پر غور کیجئے خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم کا مصداق ہے یا نہیں اور پروفیسر صاحب کا متعدد صفحات پر یہود و یثرب کے قبائل کی تقسیم و تحقیق کرنا یہاں لاحاصل رہا یا نہیں۔

پروفیسر صاحب کے مغالطہ کا دوسرا جز یہ ہے کہ اس معاہدہ میں تینوں قبائل شامل نہیں ہیں اور دلیل یہ ہے کہ ان میں سے کسی قبیلہ کا ذکر معاہدہ میں نہیں ہے حالانکہ اوس و خزرج کی شاخوں اور نسلوں کے یہودیوں کا تذکرہ ان کے قبائل کے نام سے موجود ہے۔ سو اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ترجیح اقوال کی بنا پر یہ تینوں قبائل اسرائیلی یہودی تھے تب بھی یہ مغالطہ علمی تحقیق کے قطعاً خلاف ہے اور تمام علماء سیر متقدمین و متاخرین کا بلا خلاف اس پر اتفاق ہے کہ یہ معاہدہ یثرب (مدینہ) کے تمام یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے جن میں یہ تینوں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر جو حدیث، تفسیر اور تاریخ میں بہت ہی بلند پایہ اور محققانہ نظر رکھتے ہیں انہوں نے اس معاہدہ کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے ا۔

فصل فی عقد علیه السلام الالفة بین المهاجرین والانصار بالکتاب الذی امر به فکتب بینهم والمواخاة التی امرهم بها وقررهم علیها وموادعة الیهود الذین کانوا بالمدینة	یہ فصل اس عقد الفت کے بارے میں ہے جو مہاجرین و انصار کے درمیان اس تحریر کے ذریعہ سے عمل میں آئی جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے حکم فرمایا اور اس بھائی چارہ کے ذکر میں ہے جس کے لئے آپ نے ان کو حکم فرمایا اور ان پر لازم کیا اور اس معاہدہ کے ذکر میں ہے جو آپ نے ان یہودیوں سے کیا جو مدینہ میں آباد تھے۔
تاریخ ابن کثیر البدایة والنهایة ج ۳ ص ۲۲۴	

اور اس عنوان کے بعد اس فصل کی پہلی ہی سطر کو

اس طرح شروع فرمایا ہے۔

وکان بہا من احیاء الیہود بنو قینقاع وبنو نضیر وبنو قریظہ وکان نزولہم بالحجاز قبل الانصار	اور اس وقت مدینہ میں جو یہود قبائل تھے ان میں بنی قینقاع بنی نضیر اور بنی قریظہ قبائل بھی شامل ہیں اور یہ حجاز میں انصار سے پہلے آباد ہو چکے تھے۔

(تاریخ ابن کثیر البدایۃ النہایۃ ج ۳ ص ۲۲۴)

اور سہیلی جو سیرت کے نقد و تبصرہ میں امام ہیں وہ بھی سیرت ابن ہشام کے بیان کردہ اس معاہدہ کا عنوان اس طرح قائم کرتے ہیں۔

کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما بین وبین الیہود۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تحریر جو آپ کے اور یہود کے درمیان لکھی گئی۔

(روض الانف ج ۱ ص ۱۶)

اور اس کے بعد ہی عنوان سے ربط کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ آپ کے اس معاہدہ میں ان

شرط لہم وشرط علیہم وامنہم فیہ علی انفسہم واھلیہم واموالہم وکانت ارض یثرب لہم قبل نزول الانصار بہا الخ	کے لئے اور ان کے ذمہ شرائط مقرر فرمائیں اور اس میں ان کی جان مال اور اہل وعیال کی امان کا ذکر کیا اور سرزمین یثرب انصار سے پہلے ان کا وطن بن چکی تھی۔

(روض الانف ج ۱ ص ۱۶)

اور علامہ ابن اثیر جزری اپنی مشہور تاریخ کامل میں غزوہ بنی قینقاع کے ذکر میں تصریح کرتے ہیں۔

لما عاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بدر اظہرت یہود لہ الحسد بما فتح اللہ علیہ وبغوا ونقضوا العہد وکان قد وادعہم حین قدم المدینۃ مہاجرا فلما بلغہ حسدھم جمعہم بسوق بنی قینقاع فقال لہم احذروا ما انزل بقریش واسلموا۔	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے فارغ ہو گئے تو یہودیوں کو آپ کی کامیابی پر بے حد حسد ہوا اور انہوں نے بغاوت کر دی اور اس معاہدہ کو توڑ ڈالا جس کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت کرنے کے فوراً بعد ہی ان کے ساتھ کیا تھا۔ جب آپ کو ان کے حسد کا علم ہوا تو ان سب کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور پھر فرمایا قریش کا جو حشر ہوا اس سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔

(کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۵۲)

ان عبارتوں میں کس قدر واضح ہے کہ ہجرت کے متصل جو معاہدہ یہود سے ہوا تھا اس میں بنی قینقاع اور ان کے ہم عصر بنی قریظہ و بنی نضیر بھی شامل تھے۔ یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ غزوۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال پیش آیا ہے اور بدر اور اس مشہور معاہدہ کے درمیان حدیث و سیرت کی کسی روایت میں بھی کسی اور معاہدہ کا ثبوت نہیں ملتا اور ان یہودی قبائل کو انصار کا حلیف مان کر اس کو معاہدہ کی تعبیر سمجھنا دلائل اور قرائن دونوں اعتبار سے غلط ہے اور ابن جریر طبری کی مشہور تاریخ میں بھی غزوہ بنی قینقاع کے واقعہ میں اسی طرح کی روایت موجود ہے۔ (تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۹۷)

اور ابوعبیدہ بنی قریظہ کے نقض عہد کے متعلق لکھتے ہیں۔

قال ابوعبیدہ وانما استحل	ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دماء بنی قریظہ لمظاہرتهم الاحزاب علیہ وکانوا فی عہد منہ فرأی ذلک نکثا لعهدهم	علیہ وسلم نے بنی قریظہ کا خون حلال کر دیا۔ اس لئے کہ انہوں نے غزوہ احزاب میں مسلمانوں کے خلاف مظاہرہ کیا، حالانکہ وہ آپ کے معاہدہ میں شامل تھے پس آپ نے ان کے اس عمل کو نقض عہد باور کیا۔

(کتاب الاموال ص ۱۶۷)

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بنی قریظہ نے دومرتبہ عہد شکنی کی تھی تب بھی ان کے لئے یہ سخت حکم دیا گیا، ایک تو اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی جو یہاں زیر بحث ہے اور دوسرے اس معاہدے کی جو بطور تنبیہ جب کیا گیا کہ بنی نضیر جلاوطن کئے جا رہے تھے اور بنی قریظہ نے آپ کی شرائط منظور کرلی تھیں مگر جب متصل ہی احزاب میں دوبارہ شیطنت کر بیٹھے تو غزوہ بنی قریظہ پیش آیا اور ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ بنی قریظہ کے اس دوسرے معاہدے کا ذکر بیہقی نے سنن کبریٰ میں بھی کیا ہے پس اگر اجلاء بنی نضیر کے وقت جو معاہدہ ہوا تھا اس کے پہلے زیر بحث معاہدہ کے علاوہ کوئی اور معاہدہ ان تینوں سے کیا گیا ہے تو حدیث و سیرت کی کتابیں تو اس سے بالکل خالی ہیں ممکن ہے پروفیسر صاحب کے علم میں ہو۔ ان تمام امور کے علاوہ مفسرین اس آیت کی شان نزول میں

واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیهم علی سواء۔ (احزاب)	اور اگر کسی قوم سے خیانت عہد کا آپ کو خوف ہے تو ان پر ان کا عہد برابر سرابر ڈال دو۔

یہ تصریح کرتے ہیں کہ ان کا مصداق بنی قینقاع اور بنی قریظہ ہیں الا یہ واضح ہے کہ خیانت نقض عہد کے بعد ہی ہوا کرتی ہے لہذا ان واضح اور یقینی ثبوت و قرائن کے بعد پروفیسر صاحب کا یہ حتمی دعویٰ کہ اس عہد نامہ میں یہ قبائل ہرگز شریک نہ تھے بلکہ یہ محض اوس و خزرج "قبائل انصار کے حلیف ہونے کی وجہ ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی حلیف تھے" نہ معلوم کس دلیل پر مبنی ہے۔ علامہ خضری بک مصری بھی اپنی مشہور کتاب "تاریخ الامم الاسلامیہ" میں اسی کی موید معلوم ہوتے ہیں کہ یہ معاہدہ تمام یہود مدینہ کے ساتھ ہوا ہے۔

(تاریخ الامم الاسلامیہ ج ۱ ص ۱۴۹)

علامہ شبلی مرحوم نے ابن ہشام کے اس معاہدہ کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ اس معاہدہ میں یہود کے یہ تینوں قبائل شامل ہیں اور وہ اس انداز میں اس کی تصریح فرماتے ہیں کہ ان کی نظر میں گویا قدیم و جدید علماء سیر و تاریخ کے نزدیک یہ مسئلہ اختلافی نہیں ہے بلکہ متفقہ ہے اور انھوں نے تو یہ غضب کیا ہے کہ ابن ہشام سے معاہدہ کی صرف وہی دفعات نقل کی ہیں جو "متحدہ قومیت اور اسلام" کے مصنف علام نے نقل کی ہیں۔ اور باقی دفعات کو ترک کر دیا ہے، حالانکہ وہ سیرت لکھ رہے ہیں اور اس لئے ان کا زیادہ فرض تھا کہ وہ پورے معاہدہ کی نقل فرمائیں۔ علامہ شبلیؒ اس معاہدہ کا سبب حسب ذیل بیان فرماتے ہیں:۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس، خزرج
ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا (جنگ بعاث)
اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا۔ یہود
اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار

باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں، ان اسباب کی بناء پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات منضبط ہو جائیں آپؐ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے خلاصہ یہ ہے۔ الخ (سیرت النبیؐ ج ا ص ۲۰۵، ۲۰۳)

خلاصہ میں جن دفعات کا ذکر انہوں نے کیا ہے وہ اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ علماء سیر کے نزدیک اس معاہدہ کی دوسری جزئیات وقتی خصوصیت کے ماتحت تھیں اور اس معاہدہ کا محور یہی دفعات ہیں جن کی رو سے مفاد اسلامی کے پیش نظر وقت ضرورت مسلم و کافر مذہبی و ملی امتیازات کو جُدا رکھتے ہوئے سیاسی و ملکی امور میں یا حفاظت وطن کی خاطر ایک قوم کہلانے جا سکتے ہیں یہ تمام نقول جو قدیم و جدید علماء سیرت و تاریخ سے منقول ہیں اس بات کی روشن شہادت ہیں کہ معاہدہ زیر بحث میں بلاشبہ تمام یہود داخل ہیں اور اس میں علمی حیثیت سے مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اسکی تقویت و تائید کیلئے میرے پاس اور بھی نقول موجود ہیں مگر خوف طوالت سے ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں، اور پھر ایک مرتبہ توجہ دلاتا ہوں کہ یہود کے یہ تینوں مشہور قبائل اسرائیلی نہیں ہیں بلکہ قحطانی عرب ہیں اور اگر مؤرخین عرب کے ان مرجوح اور غیر مدلل اقوال کو بھی تسلیم کر لیا جائے جو قطعی سطحی ہیں مگر پروفیسر صاحب کا مرکزی استدلال ہیں تو بھی اور قحطانی مانا جائے تب بھی بلاشبہ یہ معاہدہ زیر بحث میں اسی طرح شامل ہیں جس طرح انصار کے بطون سے کے یہودی شامل ہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خیانت والی آیت کا مصداق بنی قینقاع اور بنی قریظہ ہیں اور مسند احمد وغیرہ کتب حدیث میں صحیح روایات کے مطابق جس معاہدہ کا اجمالی پتہ چلتا ہے وہ یہی معاہدہ ہے جو ہجرت کے متصل مہاجرین و انصار کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے اور سیرت کی مستند کتابوں میں اس کی تفصیل اس طرح درج ہے جو گذشتہ اور موجودہ مہینہ کے برہان میں ذکر ہو چکی اور معاہدہ کی تفصیلات میں کوئی ایسی چیز بھی مذکور نہیں جو اس پیش آئندہ صورتحال کے اعتبار سے اسلامی اصول کے خلاف ہو تو اس حد پر پہنچ کر اگر کوئی شخص اصول استدلال کے مطابق اس معاہدہ کو دلیل شرعی کی حیثیت بھی دیدے تو کیا اس کا یہ فعل غیر صحیح اور نادرست ہے؟ البتہ یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ آخر جس طرح اس معاہدہ میں قبائل انصار کے یہودیوں کا قبائل وار ذکر ہے تو ان تینوں کا صراحت کیساتھ ذکر کیوں نہیں؟

سو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ اس کی وجہ صاف ہے جو معمولی غور کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے وہ یہ کہ جس اسلامی مصلحت کی خاطر یہ معاہدہ کیا گیا اور جس کی طرف علامہ شبلیؒ نے بھی سیرت النبیؐ میں اشارہ کیا ہے۔ اس کے لحاظ سے معاہدہ کا حقیقی رُخ ان ہی تینوں قبائل کی جانب ہے۔ جو یثرب میں یہودیت کے امام اور عرب میں نمایاں شہرت کے مالک تھے اور یہودیت کی مخالفانہ قوت کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ لہٰذا معاہدہ میں " وانہ من تبعنا من یہود فان لہ النصر" اور ان الیہود

ینفقون مع المؤمنین ماداموا محاربین
جیسے عام جملے لکھے گئے کیونکہ ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا تھا کہ
اس سے وہی یہودی مراد ہیں جو یہودیت میں ہیشر رہیں۔
البتہ جبکہ کچھ ایسے یہودی بھی تھے جو ان کی قربت کی وجہ سے
انصار کے قبائل میں سے یہودی المذاہب ہو گئے تھے، تو
یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید اس معاہدہ کا رُخ براہِ راست
ان یہودیوں کی جانب قطعی نہیں ہے بلکہ انصار کے ہم قبیلہ
اور حلیف ہونے کی وجہ سے ضمناً وہ خود بخود شریک ہیں
حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس آپ کو یہ واضح کرنا
تھا کہ اوس و خزرج کے مختلف بطون کے یہ یہودی بھی اسی
طرح معاہدہ میں براہِ راست شامل ہیں جس طرح مشہور یہودی
قبائل، لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ معاہدہ میں قبیلے کی حیثیت
کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ یہودیت کا لحاظ پیش نظر رکھا جائے
اسی لئے ان تینوں قبائل کی تفصیل کی گئی اور اولی مراد میں یہ تینوں
قبائل لفظِ یہود کے عموم میں رکھے گئے اور بیان کردہ شبہ کو
دور کرنے کے لئے انصاری قبائل کے یہود کی قبائل وار تفصیل
دی گئی تاکہ جب معاہدہ میں انصار کا لفظ آئے تو اس سے فقط
یثرب کا مسلمان مراد ہوں کیونکہ یہ اصطلاح ان ہی کے حق میں اسلام
نے رائج کی اور جب ان کے قبائل سے یہود کا ذکر آئے تو
قبائل کی تفصیل کے ساتھ آئے اس کا زبردست قرینہ یہ بھی
ہے کہ معاہدہ میں مہاجرین کے قبائل کی تفصیل بجز قریش کے
ذکر کے نہیں ہے لیکن انصار کے قبائل کا تفصیل کے ساتھ ذکر
ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی
مدینے کو ناپسند فرمایا اور جس کے متعلق پروفیسر صاحب نے
تحریر فرمایا ہے۔

زہری سے روایت ہے کہ بعض انصار نے
حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف
یہود (بنی نضیر اور قریظہ) کو نہ بلالیں وہ آکر ہماری
مدد کریں گے۔ آپ نے فرمایا لا حاجۃ
لنا فیھم الخ"
سو اس کا جواب تو صاف اور واضح ہے اور میرے خیال
میں کسی طرح بھی اس سے وہ مدعا حاصل نہیں ہوتا جو پروفیسر
صاحب حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی اس
ناپسندیدگی کی وجہ اُحد سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے جو یہود
بنی قینقاع کی غداری کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا، نیز بدر میں
مسلمانوں کی کامیابی پر جو حسد یہود کو پیدا ہو گیا تھا ان دونوں اہم
حالات کا تقاضا تھا کہ یہود کی امداد اس موقع پر ہرگز نہ لی
جائے ورنہ جسطرح منافقین نے نقصان پہنچانے کی ہر
ممکن کوشش کی اس سے زیادہ یہود باعث مضر ثابت
ہوں گے چہ جائیکہ امداد کریں لہٰذا حقیقی اور تاریخی وجہ یہی ہے
نہ کہ پروفیسر صاحب کی قیاسی وجہ۔
پروفیسر صاحب کے لئے اس مقام پر دو باتوں کی جانب
توجہ کرنا ضروری ہے اول یہ کہ سیر کی کتابوں میں اس جگہ
یہ الفاظ درج ہیں۔

ان الانصار استاذنوا حینئذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الاستعانۃ بحلفائھم من یھود المدینۃ فقال لا حاجۃ لنا فیھم	جب انصار نے یہ اجازت چاہی کہ ہم اپنے حلی یہودی حلیفوں سے مدد حاصل کریں تو آپ نے فرمایا ہمیں ان کی حاجت نہیں۔

"یہود المدینہ" مذکور ہے۔ پس اگر پروفیسر صاحب

کے نزدیک لفظ یہود کے عموم میں بغیر تفصیل کے بنی نضیر و بنی قریظہ شامل ہی نہیں ہو سکتے تو یہاں انہوں نے اس لفظ سے ان قبائل کی تخصیص بریکٹ میں کیوں فرمائی جبکہ دوسرے یہودی بھی اسی طرح کے حلیف تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ مصنف رسالہ "متحدہ قومیت" پر سخت ناراض ہیں کہ یہ دیانت کے خلاف ہے کہ منشاء کے مطابق دفعات کو ذکر کر دیا جائے اور خلاف منشاء کو ترک کر دیا جائے۔ تو کیا پروفیسر صاحب ازراہ انصاف فرمائیں گے کہ دیانت کی یہ کونسی قسم ہے کہ اگر ایک جگہ عام لفظ مذکور ہو اور اپنی منشاء کے خلاف ہو تو اپنی طرف سے تخصیص کر کے اس میں اضافہ کر دیا جائے اور اگر ارباب سیر کی منشاء پروفیسر صاحب کی منشاء کے عین مطابق ہے تو پھر اس کا کیا جواب ہے کہ اگر ان تینوں قبائل سے امداد ناپسند تھی تو پھر انصاری قبائل کے یہود المذاہب افراد سے مدد کیوں نہ لی گئی۔ حالانکہ نسلی اتحاد اس کا متقاضی تھا، اور اگر دونوں سے مدد نہیں لی گئی جو کہ واقعہ ہے تو پھر جس دعوے کی دلیل میں یہ اضافہ کیا گیا ہے وہ لاحاصل ہے بلکہ استعانت سے انکار کی اصل وجہ وہی ہے جو ہم نے بیان کی۔

اس تفصیل بحث کے بعد اب پروفیسر صاحب کی ان نکتہ چینیوں کو ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے رسالہ کے مصنف علام پر علمی اصول کے خلاف لفظی گرفت کی شکل میں اس لئے فرمائی ہے تاکہ ان کے ناوک تنقید کا صید کسی حال بچنے نہ پائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی موافق نہیں ہے تب ہی تو تیر ہدف پر نہیں بیٹھتا۔ اس ذیل میں آپ کی نکتہ چینی کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) "متحدہ قومیت اور اسلام" میں اس معاہدہ کو تمام یہود مدینہ سے متعلق کیا گیا ہے۔

(۲) طرہ یہ کہ اوس و خزرج کے ان بطون (شاخوں) کو جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کا خطاب دیتے ہیں یہودیوں کے قبائل مختلفہ قرار دیا ہے۔

(۳) اگر یوں کہا جائے کہ جس طرح یہ انصار اور مسلمانوں کے قبائل تھے اسی طرح یہود کے بھی یہ قبائل تھے تو یہ مناظرانہ نکتہ آفرینی ہے اور اس رسالہ کے پڑھنے والوں میں سے مصنف کا یہ مطلب نہ میں سمجھ سکا اور میں نے جن حضرات سے دریافت کیا انھوں نے بھی یہ نہیں سمجھا۔ یہ خدا جانے پلکھنے والے کہ لکھنے کے وقت ان کا کیا خیال تھا، کتاب میں مجھے یہ مفہوم کہیں نہ ملا۔

(۴) مصنف رسالہ نے عہد نامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ عہد نامہ بہت طویل ہے جس میں مسلمانوں کے قبائل مہاجرین و انصار کا ذکر کیا گیا ہے"

حالانکہ اس نامہ میں نہ قبائل مہاجرین کا ذکر ہے نہ یہودیوں کے قبائل مختلفہ کا۔

ان اعتراضات کے متعلق ترتیب وار حسب ذیل گذارش قابل لحاظ ہے۔

(۱) پہلے اعتراض کا جواب مفصل ذکر ہو چکا کہ غلطی پروفیسر صاحب کی ہے، حضرت مصنف کی نہیں ہے۔ انھوں نے جو کچھ سمجھا تمام علماء سیر و تاریخ یہی سمجھتے آئے ہیں

(۲) دوسرے کے متعلق گذارش ہے کہ اول انصار کے بیان کردہ قبائل کو عمومی حیثیت سے آپ کا انصار کہنا

غلط ہے۔ اس لئے کہ انصار کی اصطلاح صرف یثربی مسلمانوں
کیلئے مخصوص ہے قبائل یثرب کی صفت نہیں ہے۔ دوم
مصنف علام نے اگر ایسا لکھ دیا تو یہ زیادہ سے زیادہ لفظی
لغزش کہی جا سکتی ہے جس سے معنی و مفہوم میں مطلق فرق
نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ قبائل انصار کے یہودی بھی بہرحال
یہودی ہی تھے اور زیر بحث مسئلہ کے اعتبار سے
اسرائیلی یہودی اور قحطانی یہودی میں کوئی امتیاز نہیں ہے
جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

(۳) تیسرے کے متعلق یہ عرض ہے کہ انصار
اور یہود کے امتیازی لفظ کے اعتبار سے ان یہود کو بھی
مختلف قبائل یہود کہہ دیا جائے تو مناظرانہ نکتہ آفرینی کیوں
ہے' واقعہ کا اظہار کیوں نہیں۔

(۴) اور چوتھے کے متعلق یہ التماس ہے کہ یہ صحیح
ہے کہ عہدنامہ میں مہاجرین کے قبائل کی تفصیل مذکور نہیں
ہے لیکن جبکہ معاہدہ کے الفاظ میں مہاجرین اور قریش دونوں
موجود ہیں اور قریش مہاجرین ہی کے قبیلہ کا نام ہے تو پھر
مصنف علام کے صیغہ جمع پر اعتراض کرنا محض ایک لفظی
گرفت کے مترادف ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے علماء
کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر معنی مفہوم میں فرق نہ آتا ہو تو لفظی گرفت
اہل علم کا کام نہیں۔

الحاصل ان تمام مباحث کے نکھر جانے کے
بعد جناب پروفیسر صاحب سے یہ امر بھی قابل گذارش ہے
کہ حضرت مصنف کا مقصد جب کہ یہ ہے کہ رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی
امور کو مستثنیٰ کر کے قومیت متحدہ بنائی تو بالفرض اگر اس معاہدہ
میں مہاجرین کے قبائل مختلفہ اور یہود کے قبائل مختلفہ کا ذکر' یا
اسرائیلی یہودیوں کا ذکر قطعاً موجود نہیں۔ مگر مسلمانوں اور یہودیوں
کا ذکر موجود ہے۔ خواہ ایک ہی قبیلہ کے مسلمان اور یہودی ہوں تو
حضرت مصنف کے مقصد پر اس عدم ذکر سے کیا زد پڑتی ہے۔
اور مسئلہ کی نوعیت میں کیا فرق آجاتا ہے؟ میں نے خود بھی بہت
غور کیا اور دوسرے اہل علم سے بھی دریافت کیا مگر سب نے
یہی کہا کہ مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تسلیم کر امت واحدہ کہنے
کے مصالح وہی تھے جو آپ نے ذکر فرمائے تب بھی حاصل
یہی نکلتا ہے کہ صحیح علم و دیانت کیساتھ جو جماعت اہل حق
اسلامی مصالح کے لئے کسی وقت بھی اس طریق کار کو مفید
سمجھے اسکو اس سے استشہاد کرنا درست و صحیح ہے البتہ
اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ اس معاہدہ کی روشنی میں راجپوت،
ٹھاکر، برہمن وغیرہ ہندی قوموں اور نسلوں کے ہندو اور
مسلمان امت واحدہ اسلامی مصالح کی خاطر بنا سکتے ہیں لیکن
سادات، صدیقی، فاروقی، قریشی انصاری مسلمانوں کو یہ حق حاصل
نہیں ہے کہ وہ اس قومیت متحدہ میں شامل ہو سکیں"۔ تو
یہ امر دیگر ہے اور اس کے لئے دلیل کی ضرورت۔

پروفیسر صاحب کا ایک فرض ابھی باقی ہے وہ یہ کہ ان کے
بقول قومیت کے دو معنی ایک مطلق جماعت اور دوسرے
جماعت بہ صفات مخصوصہ مثلاً اتحاد نسل و مذہب' اتحاد وطن'
اتحاد زبان، اخلاق و اطوار، تمدن و تہذیب کی یکرنگی، رسوم کی
مماثلت' موت و زندگی، شادی و غمی، ملنے جلنے، رہنے
سہنے' میں افراد قوم کی باہمی ہم آہنگی وغیرہ اور اس پر تبصرہ
فرماتے ہوئے جو نتیجہ نکلا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ
پہلے معنی تو رسالہ کے مقصد کے کام ہی کے نہیں اور دوسرے

معنی کے اعتبار سے اس لئے صحیح نہیں کہ رسالہ کی متحدہ قومیت صرف اتحاد وطنیت کے لحاظ سے بنائی جاتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی امت واحدہ میں باشتثناء مذہب مذکورہ بالا ساری صفات موجود ہیں، لہذا مصنف رسالہ کا اس سے استدلال غلط ہے۔

مگر یہاں بھی گذشتہ باتوں کی طرح غلط کہنے والے ہی غلطی میں مبتلا ہیں، اول تو اس لئے کہ قوم کے جو دوسرے معنی پروفیسر صاحب نے بیان فرمائے ہیں وہ لیڈرین اصطلاح کے مطابق ہیں اور اس کا تعلق جو مدینہ کے معاہدہ سے کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے اسلئے کہ یہود اور مسلمانان مدینہ، مذہب، اخلاق واطوار، رسوم کی مماثلت تہذیب کی یکرنگی، موت وزندگی اور شادی وغمی کے طرز وطریق میں بھی بہت زیادہ مختلف اور بعض جزئیات کی مماثلت کے سوا ایک دوسرے کی ضد تھے البتہ اتحاد نسل ووطن کا انکار نہیں ہو سکتا نیز جزوی خصوصیات معاہدہ کا اصل مسئلہ پر مطلق اثر نہیں پڑتا۔

علاوہ ازیں ہندوستان میں جس قومیت کا قیام مصنف علام چاہتے ہیں اور جو سابق میں بیان ہو چکی ہے وہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مصداق ایک خاص اصطلاحی قوم ہے جو مذہب، اخلاق اور دوسرے ملی امتیازات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ صرف ملک و وطن کی مشترک ضروریات و قوانین میں متحد ہوگی، اور اس سے زیادہ دوسری کوئی غرض نہیں ہے اور یہ اسلامی مصالح کی بناء پر ہندوستان کی موجودہ حالت کے مقابلہ میں از بس ضروری ہے۔

"آخری گذارش"

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ مذہبی و سیاسی حیثیت "جو صدیوں کی غفلت کا نتیجہ" ایسی خاص شکل میں متشکل ہو گئی ہے کہ اسکا پورا خاکہ اسلام کے کسی دور خصوصاً خیر القرون میں تلاش کرنا سخت غلطی ہے۔ اس لئے اسلام کے قوانین کلیہ اور اسلامی سیرت کے عملی جزئیات کی روشنی میں اہل حل وعقد ہی دیانت کے ساتھ کوئی عملی پروگرام طے کر سکتے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کی خدمت کا یہ طریقہ جو عوام کی شورش کے بل پر طعنہ ہائے دلخراش اور تحریر و تقریر میں بے جا الزامات کی شکل میں اختیار کیا جا رہا ہے قطعاً غیر اسلامی اور انتہائی مہلک ہے۔ اگر صحیح درد اسلامی ہے تو ایسی فضا پیدا کرنی چاہیئے کہ بعد المشرقین خیالات رکھنے کے باوجود خوش اعتقادی، رواداری، لحاظ و مروت کے عام اخلاقی اصول کو عمل میں لاتے ہوئے مل جل کر کوئی راہ پیدا کریں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ سمجھ کر کہ جانبین میں ایماندار بھی ہیں اور بد دیانت بھی فرق و مراتب کا لحاظ کئے بغیر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی سعی نہ کریں۔

اللھم اھدنا سواء السبیل وثبت اقدامنا بك نستعین ط

(نوٹ) حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" پر شمس العلماء مولانا عبد الرحمن صاحب کا ایک تنقیدی مضمون ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں رسالہ "برہان" دہلی اور پھر رسالہ "طلوع اسلام" دہلی میں شائع ہوا تھا جسکے جواب میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کا یہ گرانقدر تحقیقی مقالہ رسالہ برہان دہلی ماہ نومبر ۱۹۳۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اب ہم اس مقالہ کو اسکی مستقل افادی حیثیت کے پیش نظر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی کی اجازت خصوصی سے آں موصوف اور حضرت مصنف موصوف کے شکریہ کیساتھ علیحدہ صورت میں شائع کر رہے ہیں ——— ناظم "بستانِ ادب"

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا
حسین احمد المدنی

رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ !

اس مضمون میں بجواب " فتنہ متحدہ قومیت " مختلف امور آرہے ہیں ۔ اور " ایڈیٹر نوائے وقت " کے افسوسناک سکوت کی بنار پر ہم اس تحریر کے لئے دوسرے ذرائع استعمال کر رہے ۔ یہ مضمون اور اس کا خلاصہ دونوں ہی مدیر نوائے وقت کے پاس سرد خانے میں پڑے ہیں ۔ ان کی خواہش ہے کہ صحیح بات ان کی زبانی، لوگوں تک نہ پہنچے ۔

بہرحال پیش نظر مضمون میں نوائے وقت اور درباری حضرات کے بیانات و مطبوعات کی روشنی میں حسب ذیل امور زیر بحث آئے ہیں ۔

۱ :۔ حضرت اقدس مولانا السید حسین احمد مدنی رح کی الزام " نظریہ کفریہ متحدہ قومیت " سے تبری اور اس کی تردید ۔

۲ :۔ بریلوی حضرات کون ہوتے ہیں ؟ وہ کتنے ہیں ؟ کیا کام انجام دیتے آئے ہیں ، انکا محبوب مشغلہ کیا ہے ؟

۳ :۔ " متحدہ قومیت کے منظریہ کا فرانہ " کا الزام اور اس کی سعی ناشکور پر بحث ۔

۴ :۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور چند بزرگان عصر ۔

۵ :۔ حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاکستان میں اثرات ۔

۶ :۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی علماء اور عوام میں سیاسی اختلافات کے باوجود بے مثل مقبولیت ۔

۷ :۔ ۱۹۴۵ء میں مسلمانوں کی فلاحی مملکت کے بارے میں آپ کے افکار ۔

۸ :۔ حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلم لیگ سے رشتہ ۔

۹ :۔ فتوے مولوی احمد رضا خاں درباره جواز شرکت کانگریس ۔

حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہٗ

مسئلہ قومیت اور اسلام

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے حوالے سے فیصلہ کن بحث

روزنامہ "نوائے وقت" مورخہ ۱۸ فروری ۳۸ء کی اشاعت میں "متحدہ قومیت اور اسلام" ایک دیرینہ بحث" کے زیرِ عنوان ایک مضمون کا آغاز ہوا ہے۔ اس میں آپ نے ۲۰ سطری ایک تمہیدی نوٹ دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدیر نوائے وقت نے مولانا مدنیؒ کی کتاب کا از خود مطالعہ نہیں کیا اور فقط اس نام سے ہی ایک سادہ لوح مسلمان کی طرح مشتعل ہو گئے۔ اور اپنے اخبار میں رازی صاحب کا جذباتی اور افسانوی رنگ میں لکھا ہوا مضمون شائع کر دیا ہم نے بھی یہ مضمون پڑھا حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ صاحب مضمون کا لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر تبصرہ کیا جائے۔

علامہ اقبال مرحوم فرماتے تھے کہ قومیت کے ایک معنیٰ ہیں ہم وطن ہونا، وہ اپنی جگہ درست اور حق ہے اور اسے وہ فطری امر بتلاتے ہیں۔ قومیت کے دوسرے معنیٰ وہ ہیں جو یورپ کی ایجاد تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ ایک ملک میں بسنے والے ایک تہذیب تمدن اور مذہب ایسی طرح اپنالیں اور مختلف العقائد مذاہب آپس میں ایسے مل جائیں کہ کوئی تفریق نہ رہے، ظاہر ہے کہ یہ بالکل حرام ہے اور اسلام کے لئے مہلک ہے جیسے کہ آج کل زمانہ روس اور چین میں ہے حوالہ کے لئے مارچ ۳۸ء کی علامہ کی حسب ذیل تحریر دیکھئے جو ہم نقوش اقبال سے دے رہے ہیں۔

قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں ہم سب ہندی اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں الخ۔

نقوش اقبال ملک مولانا عبدالحسن ندوی۔

شائع کردہ مجلس نشریات اسلام اے کے ۳ ناظم آباد
کراچی ۱۸

کتاب کے مستند ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ نقوش اقبال کے سرورق پر جسٹس جاوید اقبال کی تعارفی تحریر ہے اس کے صفحہ ۲۷ سے خاص طور پر وضاحت ہوتی ہے کہ وہ کونسی قومیت کے خلاف تھے وہ اسی قومیت کے خلاف تھے اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ تحریک خلافت میں اس کے خلاف کام کرتے رہے تھے۔ یہی کمیونزم کی بنیاد بنتی ہے۔ ذرا بھی تامل سے کام لیں تو دونوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ مولانا کی مراد بھی "متحدہ قومیت" سے خاص حد تک تعاون ہی تھا جیسا کہ انھوں نے صفحہ ۲ پر اسی کتاب متحدہ قومیت میں تحریر فرمایا ہے کہ "اور ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو اس قسم کی متحدہ قومیت سے ممانعت" معلوم ہوا کہ ان کی مراد وہ ہے ہی نہیں جو از راہ شرارت و تفرقہ اندازی ان کی طرف منسوب کی جارہی ہے

علامہ اقبال نے اس یورپین سیاست کا مطالعہ دور سے کیا تھا اور حضرت مدنی نے بہت نزدیک سے کیا تھا، مولانا اسی قسم کی انقلابی لیڈرشپ میں رہ چکے تھے۔ مالٹہ میں جنگی قیدی بنا کر ڈال دیئے گئے تھے (مولانا کے والد ماجد اور دیگر اہل میں بحالت قید وفات پاگئے اور سات اہل خانہ افراد اس دوران وفات پاگئے رحمہم اللہ)

متحدہ قومیت سے مولانا مدنی کی مراد

آپ غور کریں اور حضرت مولانا کی کتاب متحدہ قومیت کی عبارت پڑھیں اس کے صفحہ ۹ پر خلاصۂ کلام سے آخر کتاب تک جو کچھ مولانا کی مراد متحدہ قومیت سے ہے وہ یہی ہے جسے خود علامہ اقبال نے اس بیان میں درست اور اسلام کے مطابق کہا ہے اور فطری امر قرار دیا ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ کا نقطۂ نظر بعینہٖ یہی تھا۔ اشتراکیت جیسا ہرگز نہ تھا۔ علامہ اقبال مرحوم نے کسی اخبار کا مضمون سنا جس میں مولانا مدنی کا بیان "طلوع اسلام" کے ایڈیٹر رازی صاحب کے ہم جنس لوگوں نے غلط رنگ میں پیش کیا تھا جس سے یہ سمجھ میں آتا تھا کہ مولانا نے مسلمانانِ ہند کو یورپ کی ایجاد کردہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس لئے انھوں نے سخت اشعار کہہ دیئے لیکن خط و کتابت سے جب بات صاف ہو گئی تو انھوں نے صاف دل سے رجوع بھی فرما لیا۔

ہمیں یہ رسالہ رازی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سازشی لوگ پھر بھی اپنی مخصوص اغراض کی خاطر اس مسئلہ کو اچھالتے رہے۔ مولانا کی تقریر میں "اتحاد ملت" یا متحدہ قومیت کا لفظ کہیں تھا ہی نہیں لیکن اخباری نام یہ رکھ دیا گیا تاکہ خوب بدنام کیا جا سکے۔ مجبوراً کتاب کا نام "متحدہ قومیت اور اسلام" رکھ کر مولانا نے ایسے معترضین کے لیے تشریحی مضمون بڑھایا۔ اس مضمون میں بھی بات تو صرف اتنی سی ہے جو اوپر درج کی گئی۔ وضاحت کے لئے آیات و احادیث زیادہ بیان فرمائی گئی ہیں۔

اس زمانہ میں زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ شریعت مطہرہ کی رو سے کسی دشمن کو دفع کرنے کے لئے ہم وطن غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے یا ناجائز۔ جائز ہے تو کس حد تک؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے یا نہیں؟

غرض شرارت پسند لوگ مولانا کی اس مزید وضاحتی تحریر کا باعث بنے لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا جب ایک شخص عمداً تحریف کرنے پر لگا رہے تو وہ صاف صاف بات کو معلق اور تفصیل کو الجھن کے روپ میں بدل سکتا ہے۔ "مدیر طلوع اسلام" نے اس مضمون کو اسی طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جیسے بھی ان سے ہو سکا انہوں نے یہ کام انجام دیا اور ایک مقالہ لکھ ڈالا جس میں مولانا پر اتنی بہتان تراشی کی کہ انہیں معاذ اللہ کفار ہند کا ہمنوا بنا کر کھڑا کر دیا۔

ہم نے اس کتابچہ کو دیکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے رسالہ پر جو اڑتیس صفحات پر مشتمل ہے، تبصرہ کر دیا جائے۔ یہ مضمون جذباتی اور افسانوی رنگ میں لکھا گیا ہے حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لوگوں کو مشتعل کرنے کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔

ص ۳ پر ایک تحریف یہ کی گئی ہے کہ حضرت مدنی اور علامہ اقبال کے مضامین کی ترتیب میں ردو بدل کر دیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت مدنی نے جب اپنی تقریر دہلی کی تشریح کی تو علامہ اس پر رونے لگے اور اخبارات میں ایسا جامع اور بسیط بیان دیا کہ جس کے بعد حضرت مدنی لاجواب ہو گئے اور مولانا کو کہنا پڑا کہ میرا مقصد دہلی کے بیان میں اخبار تھا انشار نہ تھا۔

اصل واقعہ کیا تھا

حقیقتاً واقعہ یہ ہے کہ وہ تقریر اخبارات میں چھپی، انصاری تیج، احسان، الامان، وحدت، انقلاب اور زمیندار میں۔ انقلاب اور زمیندار نے الامان اور وحدت سے لیا تھا انھوں نے مولانا کے الفاظ بدل کر مسخ کر دیے تھے۔ مدیر نوائے وقت خوب جانتے ہیں کہ بعض اخبارات کو بیان مسخ کرنے کا مرض ہوتا ہے جبکہ دوسرے اخبارات میں مولانا کے وہی الفاظ تھے جو آپ نے تقریر میں کہے تھے اور احسان میں اس کے قریب تھے یہ اخبارات کا اپنے اپنے نظریے اور اغراض کی بنا پر تصرف تھا علامہ کو تحریف شدہ تحریر پہنچی تو وہ یہ سمجھے کہ مولانا نے جدید نظریہ قومیت اپنانے کا مشورہ دیا ہے اس پر وہ برہم ہوئے اور سخت تنقید کر ڈالی۔ حضرت مدنی اور علامہ اقبال دونوں ہی کے مخلص علامہ طالوت صاحب نے حضرت مدنی اور علامہ صاحب سے خط و کتابت کی۔ وہ حضرت مولانا کا جواب علامہ کو اور علامہ کا جواب حضرت مولانا کو پہنچاتے رہے۔ حضرت مولانا کی اس خط و کتابت میں وہی دلائل ہیں جو مولانا کی کتاب میں ہیں اور علامہ اقبال کی اپنی تنقید سے رجوع کے بیان میں صاف طور پر یہ وضاحت تحریر ہے کہ میں نے جو تبصرہ حسین احمد مدنی کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے الخ۔ اس بیان کا آخری پیرہ یہ ہے۔

> خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریہ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔" اس بیان کے آخری جملے یہ ہیں۔ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔ (محمد اقبال)

علامہ کے الفاظ سے صاف واضح ہے کہ ان کا بیان مولانا کی خط و کتابت کے بعد کا ہے اور علامہ کی وفات کے بعد پھر وضاحتی تحریر کی ضرورت رازی جیسے جعلی ناموں سے فتنہ برپا کرنے والے لوگوں کی چہ میگوئیوں کی وجہ سے ہی پیش آئی۔ علامہ اقبال مرحوم سے بالذات اس کا کوئی تعلق نہیں۔

متحدہ قومیت کے نام سے علامہ اقبال مرحوم کی پریشانی کی وجہ

حالات اقبال پر مشتمل کتبیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری بحث صرف خطرات اور خدشات کے تحت چلی تھی۔ مولانا کو خدشہ

تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل نہ کرنے سے اسلام کو نقصان پہنچے گا اور ہندوستان آزاد نہ ہو سکے گا۔ اشتراکِ عمل محدود چیز ہے شرعاً منع نہیں ہے۔ ان کا علم دین، سیاسی اور تاریخی بصیرت ہندوستان میں اس اشتراکِ عمل کو درست قرار دے رہی تھی اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی بصیرت اور معلومات میں یورپ کی سیاست تاریخ اور اس کے جدید نظریات بھی تھے وہ سیاست میں ساری عمر عملی حصہ بھی لیتے رہے تھے۔ علمی اور روحانی دونوں مشائخ سے حضرت شاہ ولی اللہ سے مسلسل اور متواتر بلا انقطاع ایک لکڑی سلسلہ چلا آرہا تھا۔ اس دور میں جمعیۃ علماء ہند اور درسگاہ دیوبند دونوں ہی اس کے امین اور صحیح وارث تھے۔

علامہ اقبال مرحوم کا اکابر دیوبند سے انفرادی تعلق رہا تھا لیکن تحریک ولی اللہی اور اس طبقہ سے گھلنے ملنے اور ساتھ رہنے کا اتفاق نہ ہو سکا تھا۔ ان کی اپنی زندگی کی الگ مصروفیات تھیں۔ انہیں حضرت شیخ الہند اور مولانا انور شاہ وغیرہ ہما سے عقیدت تھی مگر تاریخ علماء ہند اور ان کے سیاسی یا اقتصادی نظریات سے تعارف حاصل نہ تھا اس لئے وہ یہ بھی ڈرتے تھے کہ علماء شاید تاریخ سے واقف نہیں کیونکہ اسی دوران ایک دن انہوں نے کہا "مولانا حسین احمد اس سادہ سی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔"

اقبال کے حضور ص ۱۹۷

معلوم ہوتا ہے یہی خدشہ انہیں پریشان کئے ہوئے تھا اور ان کی بے چینی کا باعث تھا۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ان حضرات کی تاریخی بصیرت بہت گہری تھی چہ جائیکہ تاریخ سے صرف واقفیت ہو۔

حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کی کتاب "کشف حقیقت" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے اس میں تحریر فرمایا ہے کہ صوبۂ آسام کے شمال میں پہاڑی علاقہ ہندوستان اور چین کے مابین متنازعہ چلا آرہا ہے یہاں امکان ہے کہ جھگڑے ہوتی رہیں اور پوری طرح دفاع کی نوبت آئے۔ آسام کا پورا صوبہ بدقسمتی سے پاکستان میں نہیں آیا تو انہی دروں پر چواین لائی کے زمانہ میں ہندوستان اور چین کی لڑائی ہوئی۔ اس کے چین سے تعلقات آج تک کشیدہ چلے آرہے ہیں۔ یہ مولانا مدنی کی روحانی بصیرت وفراست تھی یا سیاسی دقت نظر۔ ان کی اس تحریر کے بعد کسی کا دھیان ۱۹۵۰ء کے پہلے کی حالت کی طرف نہیں گیا۔ تمام سیاسی اذہان کا یہ حال تھا۔ اس رسالہ کی تقریباً گیارہ چیزیں تو ویسے ہی پوری ہوئیں جیسے انہوں نے لکھی ہیں بلکہ سب ہی خدشات درست رہے ہیں وہ دشواریاں ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں کو پیش آئیں۔

اسی طرح ۱۹۴۶ء کا ایک رسالہ "آنے والے انقلاب کی تصویر" مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس میں خصوصیت سے اقتصادی، اصلاحی پروگرام اور آئندہ پیش آنے والے امکانی حوادث کا جائزہ لیا گیا ہے اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے حالات کو جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ ان رسائل میں قیمتی مضامین ہیں، نامعقول بات کوئی نہیں ہے نہ بغیر علمی اختلاف رائے الگ بات ہے۔ بات بڑھنے کی صرف یہ وجہ لگتی ہے کہ علامہ کا ان حضرات سے اختلاط نہ تھا پھر بات بھی غلط الفاظ میں پہنچی تھی۔ ایک دن ان سے کہا گیا کہ

مولانا حسین احمد کے طرفدار کہتے ہیں کہ مولانا سے زیادہ "بعد طفے بر سال خویش" پر عمل کس کا ہوگا۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں کہا ہے تو یہ کہ جو لوگ کسی وطن میں بسنے والے ہیں اپنے آپ کو ایک قوم ہی کہا کرتے ہیں، حضرت علامہ نے فرمایا "تو یونہی سہی ہمیں ان سے کوئی ذاتی پرخاش تو ہے نہیں وہ ایک بیان شائع کر دیں اور صاف صاف فرما دیں کہ اسلام کی رو سے وطن بنائے قومیت نہیں وہ ایسا کریں تو ہم ان کی جرأت ایمانی کے اعتراف میں تمین کے بجائے چھ شعر کہہ دیں گے۔" اقبال کے حضور ص۱۱۰

آسان لفظوں میں نقطۂ اختلاف تو یہی تھا کہ اگر مولانا کا نظریہ یہ ہے کہ قومیت اسلام پر مقدم ہے اس طرح کہ پہلے ہم ہندی ہیں پھر مسلمان۔ تو یہ بالکل غلط ہے اور اگر مولانا کا یہ نظریہ نہیں ہے ان کے نزدیک اسلام مقدم ہے بعد میں قومیت ہے کہ پہلے ہم مسلمان ہیں بعد میں ہندی ہیں تو یہ ٹھیک ہے۔ اس کا صحیح علاج تو یہ تھا کہ علامہ تنقید سے پہلے مولانا سے رجوع فرما لیتے تو بات ہی صاف ہو جاتی۔ یا ان کے گرد و پیش کے لوگ صحیح معلومات فراہم کر سکتے تو بھی بہتر ہوتا۔ ان کے حالات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی قوم اور ملت کے لفظوں پر غور نہیں کیا تھا۔ البتہ طالب علمی کی شان ان میں آخر تک رہی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں اپنے ایک نیاز مند سید نذیر نیازی صاحب رجوع فرمایا۔ وہ لکھتے ہیں۔

پھر جیسے کوئی خیال آیا، اُٹھ کر بیٹھ گئے اور تکیے سے ٹیک لگا کر مجھ سے سوال کیا، "قوم اور ملت کے امتیاز پر اصرار کیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا"؟ میں نے عرض کیا "یہی کہ اس امتیاز کی کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن پاک سے دو الگ الگ اجتماعی نظامات کی موجودگی ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک قومی ہو دوسرا ملی" ارشاد ہوا "یہ بحث کا نہایت اچھا پہلو ہے" پھر فرمایا "تاریخی اعتبار سے کیا اس سلسلے میں تم کوئی مواد جمع کر سکتے ہو" میں نے کہا "بہت کافی اجازت ہو تو اس سلسلہ میں کچھ حوالے پیش کر دوں" فرمایا "مثلاً" "مثلاً میثاق مدینہ۔ یعنی اس معاہدے کا جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری پر مہاجرین و انصار اور یہود مدینہ سے کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں محفوظ ہے۔" ارشاد ہوا "اس میں خاص بات کیا ہے"؟ میں نے کہا "یہی کہ حضورؐ نے مدینہ منورہ میں جس ریاست کی بنا ڈالی اس میں یہود کو شریک تو کر لیا لیکن اس کے باوجود انہیں ایک الگ قوم ٹھہرایا" فرمایا اس معاہدے کی پوری نقل حاصل کرو۔

ص ۱۱۱، ۱۱۲ اقبال کے حضور

میثاق مدینہ کی پوری نقل حضرت علامہ کی خدمت میں پیش کر دی گئی، فرمایا "ترجمہ بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔۔۔۔ آدھ پون گھنٹہ بعد حضرت علامہ اٹھ گئے۔ علی بخش نے چلم بھری، ترجمہ ہو چکا تھا میں نے کاغذات تپائی پر رکھ دیے۔ ارشاد ہوا "مولانا حسین احمد یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ میثاق مدینہ ان کی نظر سے نہیں گزرا، تعجب ہے

انہوں نے اس پر غور نہیں کیا اور
ایک غلط بات کہہ دی" ۔ پھر ذرا
سنبھل کر بیان کے بارے میں گفتگو
شروع کر دی اور طرح طرح سے اظہار
خیالات کرتے رہے ۔ یہی کہ اسلام
بنائے قومیت ہے اور اس کا سرچشمہ
ہے رسالت ۔ لہٰذا اسلام ایک سیاسی
اجتماعی معاشرہ ہے میں نے عرض کیا ۔
اس سیاسی اجتماعی معاشرے کو قرآن مجید
نے امت سے تعبیر کیا ہے ص ۲۱۳ ۔
اقبال کے حضور ۔

میں نے یہ بات اس لئے بھی کہی
کہ میثاق مدینہ میں لفظ امت استعمال
ہوا ہے ۔ حضرت علامہ نے فرمایا " مولانا
عالم دین ہیں ۔ اصطلاحات دینی سے
کیسے بے خبر نہیں ہو سکتے ۔ وہ خوب سمجھتے
ہیں امت کے معنی کیا ہیں " ۔
پھر فرمایا " عجیب بات ہے انہوں
نے قوم اور ملت میں امتیاز پیدا کرتے
ہوئے ایک نئی بحث چھیڑ دی
ہے " ص ۲۱۴ ۔ اقبال کے حضور ۔

علامہ اقبال کے قریبی لوگوں کو کیا کرنا چاہئے تھا

ضرورت تھی کہ علامہ اقبال مرحوم کو جمعیت کے
اغراض و مقاصد اس کے نصب العین اور ماضی سے
واقف کرا دیا جاتا ۔ ماضی سے تاریخ اور رخ معین ہو جاتا
ہے لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔ ان کے گرد و پیش کے لوگ معلوم
ہوتا ہے ۔ خود بھی واقف نہ تھے تاکہ ان کے خدشات جاتے
رہتے اور پریشانی خاطر رفع ہو جاتی ۔

دفتر جمعیت علماء ہند سے اس کے اغراض و مقاصد
پر مشتمل رسائل طبع ہوتے رہے ہیں ۔ مثلاً ایک رسالہ ہے
جس کا نام "جمعیت علماء ہند کی شرعی حیثیت" ہے ۔
اس میں بیان فرماتے ہیں :

اس کے سالانہ اجلاسوں کے صدر ہندوستان
بھر کے ممتاز علماء ہوتے ہیں جن کا علم
تقویٰ، ایثار و صداقت نہ صرف ہندوستان

لہ اس پر حاشیہ "اقبال کے حضور" میں تحریر ہے ۔ انهم امة واحدة من دون الناس ۔ یعنی مسلمان دوسرے انسانوں
سے الگ ایک امت ہیں لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہے ۔ مترجم کو لغزش ہوئی ہے ۔ صحیح ترجمہ نہ ہونے کی بناء پر علامہ کا ذہن کیسے
صاف ہو سکتا تھا ۔ معاہدہ اور اس کا ترجمہ مولانا مدنیؒ کے رسالہ میں آیا ہے ۔ اسی معاہدہ میں یہ عبارت آئی ہے ۔
وان الیہود بنی عوف ومواليهم وانفسهم امة من المؤمنين لليهود دينهم وللمؤمنين دينهم ۔
اور بنی عوف کے یہودی اور ان کے اعوان و انصار مومنین ہی کی ایک امت شمار ہوں گے ۔ یہود اپنے دین پر مسلمان
اپنے دین پر قائم رہیں گے ۔

ہیں بلکہ دنیائے اسلام میں ممتاز شان
رکھتا ہے۔

ذیل میں ان حضرات کے اسماء گرامی
درج ہیں جنہوں نے جمعیت علماء ہند
کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت فرمائی۔

(۱) حضرت علامہ مولانا عبدالباری صاحبؒ
فرنگی محلی، صدر اجلاس اول منعقدہ
امرتسر ۱۹۱۹ء

(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ
(اسیر مالٹا) صدر اجلاس دوم منعقدہ
دہلی ۱۹۲۰ء۔

(۳) مولانا ابوالکلام صاحبؒ آزاد صدر
اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۲۱ء۔

(۴) فخر العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمن
صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر اجلاس
گیا منعقدہ ۱۹۲۲ء۔

(۵) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد
صاحبؒ مدنی صدر اجلاس کوکناڈا ۱۹۲۳ء
و اجلاس جونپور ۱۹۴۰ء و صدر اجلاس
لاہور ۱۹۴۲ء و اجلاس سہارنپور ۱۹۴۵ء

(۶) حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ
نائب امیر شریعت صوبہ بہار صدر اجلاس
مرادآباد ۱۹۲۵ء۔

(۷) حضرت مولانا سید سلیمان صاحبؒ
ندوی صدر اجلاس کلکتہ ۱۹۲۶ء۔

(۸) رئیس المحدثین بقیۃ السلف استاذ العلماء
حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری
شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (قدس اللہ سرہما)
صدر اجلاس پشاور ۱۹۲۷ء۔

(۹) حضرت علامہ مولانا شاہ معین الدین صاحبؒ
اجمیری صدر اجلاس امروہہ ۱۹۳۰ء۔

(۱۰) حضرت علامہ الحاج مولانا عبدالحق صاحبؒ
مدنی شیخ التفسیر و مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ
شاہی مرادآباد۔

اس کے بعد جمعیت کے اغراض و
مقاصد اس طرح نقل کئے گئے ہیں۔ ذیل
میں چند اغراض و مقاصد درج کیے جاتے
ہیں جو ہر محب دین و ملت کو جمعیت علماء ہند
کے مذہبی احترام پر مجبور کر دیتے ہیں۔

اغراض و مقاصد جمعیت علماء ہند

دفعہ ۳: اسلامی نقطۂ نظر سے ملت اسلامیہ
کی حسب ذیل امور میں رہنمائی اور جد و جہد کرنا

(الف) اسلام مرکز اسلام (حجاز جزیرۃ العرب)
اور شعائر اسلام کی حفاظت اور اسلامی قومیت
کو نقصان پہنچانے والے اثرات کی مدافعت

(ب) مسلمانوں کے مذہبی اور وطنی حقوق
اور ضروریات کی تحصیل و حفاظت۔

(ج) علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا۔

(د) ملت اسلامیہ کی شرعی تنظیم اور محاکم
شرعیہ کا قیام۔

(ھ) شرعی النصب العین کے موافق قوم اور
ملک کی کامل آزادی۔
(و) مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاق
معاشرتی، اقتصادی اصلاح اور اندرون
ملک حسب استطاعت اسلامی تبلیغ
واشاعت۔
(ز) ممالک اسلامیہ و دیگر ممالک کے
مسلمانوں سے اسلامی اخوت واتحاد کے
روابط کا قیام و استحکام۔
(ح) شرعی حدود کے مطابق غیر مسلم
برادران وطن کے ساتھ ہمدردی و اتفاق
کے تعلقات کا قیام"۔ ص ۹، ۱۰، ۱۱ جمعیت
علماء ہند کی شرعی اہمیت" شائع کردہ
وحید الدین قاسمی از دفتر مرکزیہ جمعیت علماء
ہند دہلی۔
مطبوعہ کمال پرنٹنگ پریس دہلی۔

یہ اغراض و مقاصد تو بہت پہلے سے
چلے آرہے ہیں بعد میں جو دستور العمل ۲۷
۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۳۹ء مطابق ۷، ۸، ۹
ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ کو بمقام مراد آباد کے
اجلاس میں جو دستور العمل تیار کیا گیا اس
کے آغاز میں یہی لکھے گئے ہیں۔ دستور العمل
کی ایک کاپی ہمارے پاس بھی ہے۔ یہ
۱۳۶۴ھ کی طبع شدہ ہے۔ یعنی ۱۹۴۴ء
کی۔ لیکن اس کے اغراض و مقاصد روز
اوّل سے یہی چلے آئے ہیں۔

یہی اغراض و مقاصد جمعیت کے پہلے دستور العمل
میں اور خطبات صدارت میں بیان ہوتے چلے آئے ہیں اور
اسی پر مدتوں بیشتر سے ان حضرات کے اسلاف کرام اور ان
حضرات کا عمل چلا آرہا تھا۔ چند باتیں اور بھی پیش نظر رکھنی چاہئیں
(الف) ۲۸ مارچ کو علامہ اقبال کا تردیدی بیان شائع ہوا ہے
اور ۲۱ اپریل کو ان کی وفات ہوگئی ہے اگر وہ حیات رہتے
تو ضرور ان اکابر سے ملاقات ہو جاتی اور قرب بڑھ جاتا۔ وہ
یقیناً ملاقات کے بعد ان کے افکار سے متاثر ہوتے۔
سید سلیمان ندوی سے انہیں بہت تعلق تھا اور وہ ان حضرات
میں سے تھے جو اجلاس جمعیت کی صدارت بھی کر چکے
تھے اور ان کا بیان بھی حضرت مدنی کی تائید میں
الجمعیت میں آگیا تھا اگر علامہ اقبال کی تشفی نہ ہوئی
ہوتی تو وہ علامہ سید سلیمان ندوی سے مکاتبت کرتے جن
سے کہ وہ مانوس بھی تھے اور قرب بڑھ جاتا۔
(ب) اس مسئلہ قومیت پر مولانا کی تحریر میں قرآن و حدیث
سے باہر کی بات نہیں ہے۔
(ج) ان کی زندگی تبلیغ واشاعت دین اور اسلامی تشخص
کا نمونہ تھی۔ اور اسی کیلئے وہ تمام عمر جد وجہد کرتے رہے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد مشرقی پنجاب کے تباہ حال
مسلمانوں کی اسلام پر ثابت قدمی کی کوشش ان ہی حضرات
نے کی اور ان حالات میں کی جب مشرقی پنجاب میں داخل
ہونا موت کے منہ میں جانا تھا۔ وہاں انتہائی بے سہارا
مسلمانوں سے ملے، حوصلہ افزائی کی وہ ہندوؤں کے لباس
میں رہنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ترک کرایا۔ ان کی دینی

تعلیم کا بندوبست کیا۔ ان کے لئے سہل نصاب تعلیم
دین بنایا۔ شبینہ مکاتب حتی الامکان قائم کئے مساجد
و مزارات کو واگذار کرایا اور معلوم ہوا کہ وہاں لاکھوں کی
تعداد میں مسلمان رہ گئے تھے خصوصاً جو چھوٹی قومیں
کہلاتی تھیں وہ جہاں نمایاں نہ تھیں وہیں رہ گئی تھیں مثلاً
دھوبی، بڑھئی وغیرہ۔ جنرل سیکریٹری جمعیت علماء مولانا
حفظ الرحمٰن صاحب خود ان اطراف میں آتے رہے، سب سے
پہلے باقاعدہ کھل کر سنہ ۴۸، سنہ ۴۹ میں پانی پت
حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی ایک
سالانہ تقریب سے ان حضرات نے کام شروع کر دیا۔ اور پھر
پنجاب کے دور دراز علاقوں میں آتے رہے یہی حضرات تھے
جو اس طرح اور تبلیغی جماعتوں کی شکل میں ان بچے کھچے مسلمانوں
کی طرف بلاشبہ سر دھڑ کی بازی لگا کر متوجہ ہوئے۔
ان کے ایمان و تہذیب کی بقاء ہر حال میں بہر قیمت
ضروری جانی اور کامیاب ہے، خود ان کی زندگیاں اسلامی
وضع قطع بلکہ سنت نبوی کا نمونہ تھیں اور تفسیر و حدیث
ان کا مشغلہ تھا نہ کہ اس متحدہ قومیت کی کہ جس کا
پہلا اہم خدشہ ظاہر کیا گیا تھا۔

طلوع اسلام والے صاحب نے جس گمان میں مضمون
لکھا تھا ان حضرات کے عمل نے اس گمان کو فضول کی
بدگمانی ثابت کر دکھایا۔ پاکستان آنے والے پاکستان
چلے آئے انہیں ان کارناموں کی خبر ہوئی اس لئے شاید
پڑھنے والے آج پھر متحدہ قومیت کے لفظ سے یہی
خیال کرتے ہوں گے کہ اس کے وہی معنی ہیں جس پر
علامہ اقبال نے اعتراض کیا تھا۔ حالانکہ علامہ نے تو ان کی
تحریرات کے بعد اعتراض سے رجوع کر لیا تھا اور
مطلب سمجھ گئے تھے۔ بعد میں پاکستان بن جانے پر جو
لوگ یہاں آگئے انہیں ان کے کارناموں کا کیا علم؟
اس لئے اس مضمون کو آج بھی ناشر صاحبان اسی
طرح صحیح سمجھتے ہوں گے۔ جیسے پہلے دن جب وہ
بدگمانیوں کے دور میں لکھا گیا تھا اور یہ عظیم الزام ہے جس
سے اخلاقاً بھی باز آنا ضروری ہے اور مذہباً بھی کہ سب کو
خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہاں کی جواب دہی بھی
سامنے رکھنی فرض ہے (د) ہم پھر یہ بات یاد دلانی ضروری
سمجھتے ہیں کہ کتاب کا نام "متحدہ قومیت اور اسلام" ہے جو
اس زمانہ میں اس مسئلہ کے عنوان کی حیثیت کی بناء پر
رکھا گیا تھا اور درحقیقت اس میں مسلمانوں کے غیر
مسلموں سے معاملات کی ابحاث ہیں جس میں معاہدے
بھی آتے ہیں کیونکہ غیر مسلم رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے
پڑوسی بھی، ہم وطن بھی۔ اور اسلام ہمہ گیر مذہب ہے۔
اور دنیوی معاشرت میں غیر مسلموں سے تعلق ناگزیر ہے۔

(ه) علامہ اقبال کے ان تنقیدی اشعار کی اشاعت کے بعد
ہر طرف سے جوابی اشعار کی بھرمار ہو گئی ان دنوں انہیں کتابی
شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ ان میں معنویت بھی تھی اور جوابی
سختی و تلخی بھی۔ یہ جوابات سیاسی اور غیر سیاسی معروف
علماء وغیرہم سب کی طرف سے لکھے گئے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے مسئلہ کی وضاحت کرتے
ہوئے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی تائید فرمائی اگر اختلاف
پھر بھی چلتا رہتا تو ان کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ علامہ اقبال
اور حضرت مدنی دونوں کے نزدیک تھے۔ وہ مداخلت فرماتے۔

علامہ اقبال سہیل کے اشعار معروف ہیں۔

ایک اور بزرگ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے بھی حضرت مدنی کی تائید میں اشعار لکھے جو اس وقت متعدد اخبارات میں چھپے تھے۔ مولانا کا مختصر اتعارف یہ ہے کہ آپ کا تعلق بیعت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے ہے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے شیخ التفسیر اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث تھے۔ پھر ریاستہائے متحدہ بلوچستان میں وزیر معارف شرعیہ رہے اور چند سال جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ التفسیر رہے۔ نظر بھی وسیع و دقیق ہے۔ دیوبند میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فتاوے پر نظر ثانی کی۔ اہم ذمہ داری بھی کچھ عرصہ کے لئے آپ کو تفویض کی گئی تھی۔ تحریر، تقریر، تدریس سب میں اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں۔ ادام اللہ برکاتہم۔ ان اشعار میں سے شعر یہ ہیں۔

نظام قوم بدو گونہ می شود پیدا۔ اگر ہنوز ندانی کمال بولہبی ست
نظام ملت واحد باختلاف بلاد۔ قوام گیر ز جلب محمد عربی ست
نظام دوم کہ تمام مباں سلالت۔ نظام وحدت ملکی ست ابن چہ بوالعجبی ست

مولانا ہی کے الفاظ میں ان کی تشریح یہ ہے کہ قومیت کی دو قسمیں ہیں اول یہ کہ افراد کا دین ایک ہو اگرچہ اوطان مختلف ہوں جیسے کہ اسلامی قومیت کے تحت تمام مسلمان ایک قوم ہیں اگرچہ وطن مختلف ہیں۔ دوسرا یہ کہ وطن اور وطنی مفاد ایک ہو اگرچہ دین مختلف ہوں۔ جیسے مکہ معظمہ میں قریش کی قوم ایک تھی اگرچہ دین مختلف تھا اور مدینہ منورہ میں مہاجرین انصار اور یہود کا وطن ایک تھا اگرچہ ان کا دین ایک تھا

اسی بناء پر حضور علیہ السلام نے یہود کیساتھ وطنی مدافعت کے تحت ایک معاہدہ کیا تھا کہ جب مدینہ پر کوئی حملہ آور ہو تو سب مل کر مقابلہ کریں

حضرت مولانا مدنیؒ نے اگر دہلی والی تقریر میں قسم دوم کا ذکر کیا تو اس سے قسم اول کا انکار لازم نہیں آتا اور اقبال مرحوم نے اگر اپنے اشعار میں قسم اول کا ذکر کیا تو اس سے قسم دوم کی تردید لازم نہیں آتی۔ اس بناء پر انکشاف حقیقت کے بعد اقبال مرحوم نے رجوع کیا۔ مولانا نے اشعار در مکتوب مورخہ ۱۸ شوال ۱۳۷۸ھ و شرح در مکتوب ۲۸ ذی القعدہ ۸ ۷ھ ارسال فرمائی۔

(۹) پوری جمعیت علماء ہند کا مؤقف بھی یہی تھا جیسے کہ علامہ کی ۸ مارچ کی مجلس کی روداد میں نذیر نیازی نے لکھا ہے۔

حضرت علامہ نے جیسے ان کی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا جمعیت علماء کیا کر رہی ہے۔ جمعیت العلماء کی رائے کہاں تک مولانا حسین احمد کے حق میں ہے۔

میں نے عرض کیا بظاہر تو مولانا حسین احمد کو اس کی پوری تائید حاصل ہے لیکن در پردہ اس کی خواہش شاید یہی ہے کہ قوم اور وطن کی بحث آگے نہ بڑھے۔ مولانا کے طرفدار بات کو نباہ رہے ہیں۔

اقبال کے حضور ص۲۹۹۔

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ علماء کی بات ایک تھی۔ جمعیت کے ہوں یا دارالعلوم دیوبند کے کیونکہ حضرت مدنی کا فرمانا وہ تھا جس کی تشریح گزری وہ نہ تھا جس کا علامہ اقبال کو خدشہ تھا جو شرعاً ممنوع ہے نیز حقیقت یہ تھی کہ حضرت مدنیؒ نے خود بھی لوگوں کو آگے بڑھنے سے منع فرما دیا۔ ایک صاحب نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کا الجمعیت میں شائع شدہ مضمون

اور دیگر علماء کے مضامین کو جو مولانا کی تائید میں تھے۔ ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا تھا مگر آپ نے بالکل منع فرما دیا۔ مولانا زاہد الحسینی مدظلہم اس کے شاہد ہیں۔

(ز) حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کے اجداد کرام کی فیض آباد کے اس علاقہ میں آمد ۸۰۰ھ یا ۸۵۰ھ ہوئی ہے۔ آپ کے جد امجد شاہ نور الحق صاحب قدس سرہ کا دسویں صدی ہجری میں قوم کے ہندو راجاؤں سے مقابلہ رہا تھا۔ ضلع فیض آباد ہی میں اجودھیا ہے جو ہندوں کی بڑی تیرتھ گاہ ہے اس جگہ ایک قبر ہے جسے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر مبارک کہا جاتا ہے اور وہاں کے بارے میں ہندوؤں کی اپنی مذہبی روایات الگ ہیں۔ آپ نے انہیں دعوت اسلام دی نہ ماننے پر مقابلہ ہوا۔ آپ نے ان کو بذریعہ کرامت شکست دی اور اس کا نام اللہ داد پور رکھ دیا۔ (ملخصاً از نقش حیات صفحہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ ص ۱۰۰)۔

آپ کے خاندان کی جائیداد کافی تھی کم ہوتے ہوتے ۱۸۵۷ء میں ۱۲ گاؤں رہ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ایک ہندو راجہ نے جس سے پہلے سے عداوت چلی آ رہی تھی سب قبضہ کر لیا اور اللہ داد پور لوٹ لیا۔ مکتوبات کی جلد اول میں پہلے ہی مکتوب میں خاندانی حالات میں یہ مزید تحریر ہے۔ کہ ہمارے قدیمی کاغذات وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا بے شمار خزانے اور غلہ اور سامان اس نے لوٹ جس کو وہ ایک مہینہ تک گاڑیوں میں منتقل کرتا رہا۔ اس کے ہمارے زنانہ میں عورتیں اپنے بھیس بدل کر رشتہ داروں کے یہاں شہر ٹانڈہ کے بعض محلوں میں جو کہ امراء تھے پناہ گزین ہو گئے تھے اور دوسرے لوگ بھی نوکروں اور رعایا کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تھے۔ آگے تحریر فرماتے ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد صرف دو گاؤں ہمارے خاندان کے پاس رہ گئے تھے ...... والد صاحب مرحوم کا ...... ایک آنہ آٹھ پائی تھا جس کو فروخت کر کے والد مرحوم نے تجارت کا قصد کیا تھا۔ (ملخصاً از مکتوب یا شیخ الاسلام جلد اول ص ۱)

مختصراً مولانا مدنی مرحوم کے یہ خاندانی حالات تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ صدیوں سے ہندو قوم اور اس کی ذہنیت کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس متحدہ قومیت کی بات بھی کریں جو کفر ہے۔

(ح) حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اجلاس جونپور کے خطبہ صدارت میں بہت زیادہ وضاحت فرما دی تھی کہ

> یورپین لوگ قومیت متحدہ کے جو معنے مراد لیتے ہوں یا ہندو کانگریسی افراد انفرادی طور پر کانگریس کے فنڈامینٹل کے مفہوم کے خلاف معانی بیان کرتے ہوں ان سے یقیناً جمعیت العلماء بیزار ہے۔ اور نفرت کرنے والی ہے دوسرے لوگ جو معانی سمجھتے ہیں وہ غلط اور ناجائز ہیں۔ اس معنی کی بناء پر کانگریس نے فنڈامینٹل میں ہر مذہب، ہر تہذیب ہر زبان، ہر رسم و رواج کے تحفظ کا التزام کیا ہے۔

(بحوالہ پاکستان کیا ہے۔ حصہ دوم صفحہ ۴ پر ہے

مصنفہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ
ناظم جمعیت علماء ہند مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ ناشر
ناظم جمعیت علماء ہند دہلی)

یہی بات علامہ اقبال مرحوم بھی کہتے تھے جیسے کہ "اقبال
کے حضور میں" صفحہ ۲۱۴ پر ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا:

مولانا حسین احمد کا فرض ہے کہ اسی
اصول کی بناء پر جو میثاق مدینہ میں قائم
کیا گیا کانگریس سے مفاہمت کا مطالبہ
کریں۔ بجائے یہ کہنے کے کہ قومیں اوطان
سے بنتی ہیں۔

"اقبال کے حضور" میں صفحہ ۲۲۴ پر علامہ اقبال فرماتے ہیں:

کہ اسلام نے جو شرائط قائم کی ہیں ان
پر غیر مسلم اقوام سے تعاون کیا جائیگا۔

اس اعتبار سے مولانا کے اور اقبال کے نظریہ
میں صرف آپس میں متعارف نہ ہونے کا حجاب
ہی نظر آتا ہے ورنہ کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا
نظریہ ایک ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنرل
سیکرٹری جمعیت علماء ہند نے بھی ایک مضمون میں
اس مذموم نظریہ کی نفی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں سیاسی مسلک میں اگرچہ حضرت
مصنف رسالہ "متحدہ قومیت اور
اسلام" کا ہمنوا ہوں تاہم اس
بحث کو "متحدہ قومیت" کے نام سے
زیر بحث لانے کا شروع سے اس
لئے مؤید نہیں ہوں کہ اس مرکب
لفظ کی آڑ میں مخالف خیال حضرات
بآسانی اس رائے کے مؤیدین کے خلاف
عام مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور
زیادہ سے زیادہ مشتعل کر دیتے
ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس
نظریہ کے حامی مسلمانوں کی امتیازی
خصوصیات مٹا کر اور ہندوستان میں
یورپین نظریہ کے مطابق ایک مستقل
قوم بنا کر ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو
ہندوؤں میں ضم کر دینا اور ملی امتیازات
کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پناہ بخدا
اس تصور کا شائبہ بھی ایک لمحہ کیلئے
کسی مسلمان کے دل میں نہیں گزر سکتا تا آخر

(متحدہ قومیت اور اسلام از مولانا
حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم ص ۵ ناشر ناظم
بستان ادب دیوبند۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ
ورکس دہلی)

اس تمہیدی کے بعد کچھ اور ضروری باتیں ملاحظہ ہوں۔

مدیر نوائے وقت نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ جامعہ مدینہ
لاہور کی طرف سے طبع کر کے ملک میں تقسیم کیا جا رہا ہے اس
سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مفت تقسیم کیا جا رہا ہے۔ یہ بات
خلاف واقعہ ہے نیز وہ تحریر فرماتے ہیں کہ: یہ جوابی مقالہ
مکتبہ حبیبیہ بازار داتا گنج بخش لاہور نے دوبارہ شائع کیا
ہے تو ایک روپیہ کی قیمت پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

گویا آپ نے ان کے اشتہار کا کام بھی انجام دیا۔

رسالہ میں تحریر ہے کہ علامہ اقبال نے جب یہ بیان پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے الخ۔ ... یہ سب قصہ یا تو اس وقت کا ہے جب علامہ نے مولانا مدنی کی پہلی تقریر پڑھی ہوگی جو تحریف شدہ تھی۔ ورنہ یہ قصہ من گھڑت ہے کیونکہ علامہ کی خط و کتابت شائع ہو رہی ہے اور علامہ کے قریب رہنے والے معتمد حضرات اور شارحین کلام اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور جناب سید نذیر نیازی سب ہی اس سے واقف ہیں۔ پروفیسر صاحب کا مضمون تو ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا پھر سب سے پہلے میثاق لاہور میں پھر خدام الدین وغیرہ میں چھپ چکا ہے۔ سید نذیر نیازی صاحب بتلاتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے فرمایا تھا کہ "میری طبیعت ناساز ہے ورنہ میں ان کی تعریف میں اشعار لکھ دیتا"۔ معاملہ کی کچھ تفصیل "اقبال کے ممدوح علماء" نامی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

مضمون رازی کی تازہ اشاعت کے ذمہ داروں کا حال

مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ بازار دربار کے اس مکتبہ کو علامہ اقبال سے کیوں ہمدردی ہوئی کیونکہ ان کے بزرگوں نے تو خود علامہ اقبال پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ماضی پر ان کے مسلک اور تاریخ جاننے کے لئے وضاحت سے روشنی ڈالی جائے اس کے بعد مضمون رازی کے بارے میں وضاحت کی جائے۔ ان کے مسلک کی کتابوں میں کیا کیا بھرا پڑا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔

ایک کتاب مقدس "تجانب اہل السنۃ" میں ص ۳۳۷ سطر ۳ پر علامہ کا حال لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں "آہ، آہ، آہ اللہ عزوجل کی بارگاہ بے نیاز میں ایسی بدگوئی و دشنام بازی، مسلمانو! اللہ انصاف یہ ترجمان حقیقت ہے یا ترجمان ابلیسیت" پھر اسی کتاب میں ص ۲۴۰ کی سطر ۳ پر تحریر ہے "یعنی ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ابلیس بول رہا ہے" الخ ... پھر ص ۲۴۷ سطر ۷ پر تحریر ہے۔ "یہ ہیں ترجمان حقیقت۔ جناب ڈاکٹر اقبال صاحب جن کے نام پر اقبال ڈے منائے جاتے ہیں، اقبال ہوٹل کھولے جاتے ہیں۔ اقبال اخبار جاری کئے جاتے ہیں"۔ فرماتے ہیں کہ مسلمانان اہلسنت خود ہی انصاف کرلیں کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دین اسلام سے کیا تعلق ہے۔ ص ۲۴۱۔

یہ کتاب مستطاب علامہ کی وفات سے تقریباً چار سال بعد لکھی گئی ہے

تجانب اہل السنۃ جس پر بہت سے مفتیوں اور شیخ بیشہ حضرات کے دستخط ہیں اور یہ کتاب پوری جماعت ہند کی ترجمان مانی گئی ہے۔ بریلی الیکٹرک پریس میں طبع ہوئی ہے اس میں آخری دستخطوں کے ساتھ ۲۴ جمادی الآخرہ ۱۳۶۰ھ تحریر ہے۔ مولانا مدنی

کے آخری گرامی نامہ پر ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ تحریر ہے اس حساب سے ظاہر ہے کہ یہ علامہ مرحوم و مغفور کی وفات سے تین سال بعد لکھی گئی ہے اور طباعت ہوتے ہوتے چار سال ہو گئے ہوں گے۔ درباری حضرات کے نزدیک تو معاذ اللہ جس طرح کے مولانا مدنی ہیں ان سے بہت بدتر علامہ اقبال ہیں تعجب ہے انہیں علامہ سے کس تاریخ سے ہمدردی ہوئی اور تجانب اہل السنۃ کب سے ساقط الاعتبار ہو گئی کیونکہ اسے صحیح مانا جائے تو علامہ اقبال کو ترجمان اہلبیت ماننا پڑے گا اور علامہ کو مانا جائے تو اس کتاب کو غلط قرار دینا ہو گا۔

اسی عظیم المرتبت حزب تکفیر میں قائد اعظم کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

بحکم شریعت مسٹر جینا اپنے ان عقائد
کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد
اور خارج از اسلام ہے اور جو شخص ان
کے ان کفروں پر مطلع ہونے کے بعد
اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے
یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک
رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف
کرے وہ بھی کافر مرتد شر اللئام اور بے
توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز غلام" صہ ۱۲۲
سطر ۵ سے سطر ۸ تک تجانب اہل السنۃ۔

اسی طرح کی عبارت چودہ جماعتوں کے نام لے کر ان کے بارے میں اس کتاب کے صہ ۵۳ پر ہے جن میں لیگ غالیہ بھی ہے (اس کتاب کی کچھ عبارتیں ہم آگے بھی دیں گے)

اگر آپ ان اہل اہواء سے یہ سوال کریں کہ وہ مسٹر جناح اور غالی (پکے) مسلم لیگیوں کو کافر کہتے ہیں یا نہیں؟ تو وہ یقیناً جواب میں جان چرائیں گے لہٰذا اس طرح خود بھی کافر کہنے میں توقف کرنے کی بنا پر وہ کافر مرتد اور شر اللئام (بدترین کمینہ) ٹھہریں گے اور امید ہے کہ مریں گے بھی بے توبہ ہی، اس لئے مستحق لعنت بھی بنیں گے (یعنی اپنی اس کتاب کی رو سے) ہمارا خیال ہے کہ آپ کے اس ایک ہی سوال سے یہ لوگ ہوا ہو جائیں گے اور ان کی سب باتیں ہوا در ہوا ثابت ہوں گی۔

عبد المجید سالک اپنی کتاب ذکر اقبال میں لکھتے ہیں:

استفتا بابت علامہ اقبال

یہ وہ زمانہ تھا جب ترک موالات کے بعد ہندوؤں میں شدھی اور سنگٹھن کا جوش و خروش برپا تھا۔ اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کے ادارات منظم کر رہے تھے۔ پھر سلطان ابن سعود کی تطہیر حجاز کے غلغلے نے ہندوستان کو دو مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں میں سخت کشمکش ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کے علماء نے تکفیر کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ علامہ اقبال سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے چکے تھے اور بدعتی علماء ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی اس نے ایک استفتاء مرتب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ خطیب مسجد وزیر خاں لاہور کو بھیج دیا۔ یہ صاحب اپنے شوق تکفیر کے لئے بے حد مشہور تھے چنانچہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے۔ اس خوش طبع مسلمان نے

اپنا نام پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری تجویز کیا اور یہ استفتا لکھا،

کیا فرماتے ہیں علمارِ دین اور حامیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزار کرے، علمائے کرام اور پیرانِ عظام پر آوازے کسے اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے۔ ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں۔ "امام" اور "چراغِ ہدایت" کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست و برخاست اور ہر طرح کا تعلق کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔ اشعار حسب ذیل ہیں۔

آفتاب

(۱) اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تیری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تیری
(درمرحوم تیری ملت)

(۲) کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

(۳) خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تیری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

(۴) غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں خدا تیری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

(۵) رام کی تعریف میں فرماتے ہیں:
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا
(المستفتی، پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری)

فتویٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسم پروردگار اور یزدان عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں اندریں صورت یزدان اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگانِ دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے

اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کردیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔

ابو محمد دیدار علی[1] الخطیب فی مسجد وزیر خان المرحوم

اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا۔ مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے "زمیندار" میں اس جاہلانہ فتوے کی دھجیاں اڑا دیں۔ خود "زمیندار" نے فتوے پر تبصرہ کیا ایک گمنام مقالہ نگار (غالباً چودھری محمد حسین ایم اے) نے ایک مدلل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا۔ یعنی اشعار منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علماء اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا کیونکہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان، عاشق رسولؐ، دردمند ملت حامی دین اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟ (ذکر اقبال از ص ۱۲۷ تا ۔ ۱۳۰)

شائع کردہ، بزم اقبال لاہور

ایک اور کتاب ہے الجوابات السنیۃ زہاء السوالات اللیگیہ۔ اس میں صفحہ ۱۴ سطر ۱۲ پر ایک سوال ہے:

سوال نہم ۱۔ کیا بایں امید کہ عوام کی شرکت سے کانگریس کو ضرر پہنچے گا عوام مسلمین کو شرکت لیگ کی ممانعت سے متنافل علماء کے لئے جائز ہے؟

فتوائے حضرت تاج العلماء دامت برکاتہم القدسیہ: یہ امید باطل ہے اور صحیح بھی ہو تو خود لیگ میں شرکت عوام کی سب سے زیادہ گرانمایہ متاع دین و ایمان کے لئے کانگریس سے زیادہ قوی اور سریع الاثر قاتل ہے جس سے علماء ربانی کو تغافل اب ہرگز جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس رسالہ کے آخر میں فتوائے مبارکہ مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند لاہور ہے جس پر دستخط ہیں "فقیر

---

[1] مولوی دیدار علی صاحب الور کے رہنے والے تھے اسی مناسبت سے حضرت علامہ نے الور پر یہ چار شعر لکھے جو "روزگار فقیر جلد دوم" میں شامل ہیں۔ ؎

گر فلک در الور انداز ترا | اے کہ داری تمیز خوب و زشت
گو بہت در منبرو برجستہ | آنکہ بر قرطاس دل باید نوشت
آدمیت در زمین او مجو | آسماں ایں دانہ در الور نکشت
کشت اگر آب و ہوا خر زناست | زآنکہ خاکش را خوے آمد سرشت

(ص ۲۲۲، ۲۲۳)

درماندہ از نفس شریر ابوالبرکات سید احمد غفر لہ ناظم
دارالعلوم مرکزی انجمن حزب احناف ہند" اور دو مہریں
ثبت ہیں، ایک دارالعلوم کی اور ایک دارالافتار کی اور
تائید ہے فاضل حزب الاحناف محمد طیب صدیقی کی۔
"تجانب اہل السنۃ" کے مصنف ہیں۔ یہ تحریر ص۲۱ سے
شروع ہوئی ہے۔ ص۲۲ پر آپ تحریر فرماتے ہیں؛
تو لیگ کی جو حکومت جمہوریہ ان
کفریات ملعونہ کی تبلیغ واشاعت
کو ترقی دے گی۔ تبلیغ کفر و شرک کی
حفا[illegible] ۔۔۔ گی۔ وہ اسلامی حکومت
ہو گی یا کفری سلطنت۔ والعیاذ باللہ
تعالیٰ اگر آپ اس سے زیادہ مسلم لیگ
کی خباثتیں دیکھنا چاہیں تو جماعت
مبارکہ اہل سنت مارہرہ ضلع ایٹہ
سے مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری اور
"احکام نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ" منگوا کر
ملاحظہ فرمائیں۔
اسی صفحہ کی سطر ۹ پر نمبر (۲) میں فرماتے ہیں:
لیگ کی حمایت کرنا اور اس میں
چندے دینا اس کا ممبر بننا اس کی
تبلیغ و اشاعت کرنا منافقین و مرتدین
کی جماعت کو فروغ دینا اور دین اسلام
کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ پھر سطر گیارہ
میں نمبر (۳) ملاحظہ ہو۔ لیگی لیڈروں
کے افعال و اقوال سے اُن کی گمراہی
مہر نیم روز سے زائد روشن ہے، مرتد
تھانوی کو لیگیوں کی تقریروں میں
شیخ الاسلام اور حکیم الامت کہا جاتا
ہے۔ اشرف علی زندہ باد کے نعرے
لگائے جاتے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح الخ۔۔۔
پھر سطر اکیس نمبر (۶) میں ارشاد ہوتا ہے:
اس شخص پر واجب ہوتا ہے فوراً توبہ
کر کے سچا پکا مسلمان بن جائے۔ اگر
رافضی کی تعریف حلال اور جناح کو اس
کا اہل سمجھ کر کرتا ہے۔ تو وہ مرتد ہو گیا۔
اس کی بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی۔
مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس سے کلی
مقاطعہ کریں یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے۔"
الجوابات السنیہ۔ مطبع سلطانی واقع
پیر ولین ص۱۱ بمبئی نمبر ۹۔
"مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری" میں ص۱۳ سطر ۱۶ پر مسٹر
جناح کی برائیاں ذکر کرنے کے بعد تحریر ہے
"کیا کوئی سچا ایماندار مسلمان کسی کتے
اور وہ بھی دوزخیوں کے کتے کو اپنا قائد
اعظم سب سے بڑا پیشوا اور سردار بنانا پسند
کرے گا۔ حاشا وکلا۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔
اس صفحہ کے نصف سے ص۱۴ تک مسلم لیگ
کی بری خصلت یہ ذکر کی گئی ہے کہ اس میں دیوبندی اور
تھانوی علماء ہیں۔ تحریر کی زبان وہی سوقیانہ اور شدید
تکفیری ہے جو بریلوی عالم کے مستند ہونے کی دلیل ہے۔

شیخ الہند محمود حسن اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
سب ہی کو ننگے ہاتھوں لیا ہے۔ دیکھئے مسلم لیگ کی
زریں بخیہ دری۔ شائع کردہ دفتر جماعت اہلسنت۔
خانقاہ برکاتیہ مارہرہ ضلع ایٹہ۔

ان رسائل میں سب سے زیادہ پلی پلائی، اینٹھی ہوئی تنومند
جلیل القدر کتاب ان ہی مذکورہ فاضل حزب الاحناف
موید الجوابات السنیہ محمد طیب کی تصنیف "تجانب
اہل السنۃ" ہے جو ۴۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔
اس میں زبان فیض ترجمان برائے اصلاح وارشاد کا نمونہ
ملاحظہ ہو۔ ص۴۲۱ پر سطر ۷ سے تحریر ہے۔

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہارے
دھرم میں تمہاری جورو۔ دادرا ماں نوں
ایک تمہارا باپ اور بیٹا دونوں ایک
گوبر اور حلوہ دونوں ایک شیرینی اور
پاخانہ دونوں ایک تمہارا منہ اور
پاخانہ پھرنے کی جگہ دونوں ایک...
اس سے آگے بالکل ہی ننگی گالیاں ہیں
جنھیں ہم نقل بھی نہیں کر سکتے پھر
آگے دسویں لائن میں تحریر ہے حلوے
کے بدلے پاخانہ کھاؤ شربت کے
بدلے پیشاب نوش فرماؤ...

پھر کھلی گالیاں شروع ہو گئی ہیں۔ یہ صفحہ اور اس
سے اگلا نصف صفحہ فوٹو سٹیٹ کر کے چھاپہ جا سکتا ہے
نقل نہیں کیا جا سکتا۔

اس کتاب کے مویدین مارہرہ ضلع ایٹہ اور پیلی بھیت

پیالہ کے ماما ہیں۔ کاٹھیاواڑ کے لوگوں کی خواہش
پر بریلی سے چھپی ہے۔ اس کتاب میں پورا بریلوی دھرم
ہے۔ کتاب کیا ہے۔ اعلیحضرت کا نقش قدم ہے۔
ص۵۰ پر لوگوں کے ایمان ناپنے کا پیمانہ بھی دیا ہے۔ وہ
اعلیحضرت احمد رضا خان کی وصیت کے یہ جملے ہیں:

"اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے
ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا
ہر فرض سے اہم فرض ہے۔" (تجانب
اہل السنۃ ص۵۰ سطر ۱۲-۲)

اس سے ان لوگوں کے نام نہاد "حنفی" اور "اہلسنت"
ہونے کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نہ یہ لوگ
حنفی ہیں نہ اہلسنت بلکہ احمد رضا خاں کے پیروکار ہیں۔
ورنہ حنفی مسلک کے طے شدہ مسائل ایجاد کر لیتے تھے وہ
درحقیقت غیر مقلد تھے ورنہ اپنے اس دین و مذہب
کے ذکر کی کیا ضرورت تھی جو ان کی کتابوں سے ثابت
ہو۔ قابل غور ایک عجیب بات یہ ہے کہ دیوبندی اور
بریلوی مکاتب فکر کے مدارس میں شروع سے آخر
تک ابجد سے لے کر آخری سال تک ہر طالب علم
دیوبندی اور بریلوی ہر مدرسہ میں عقائد کی کتابیں ہوں
یا فقہ اور اصول فقہ کی، حدیث و اصول حدیث کی ہوں
یا تفسیر و اصول تفسیر کی، صرف و نحو کی ہوں یا بلاغت
منطق، فلسفہ، ہیئت وغیرہ کی سب کی سب کتابیں
تو بالکل ایک ہیں۔ فتاوی میں قاضی خاں البحر الرائق
شامی عالمگیری وغیرہ بھی سب کی ما بہ الاتفاق ہیں۔
اور جھگڑا پھر بھی ہو جاتا ہے۔ تو اس کی وجہ در اصل القول

نورانی صاحب مذکورہ بالا وصیت کا مبلغ ہے۔ بریلی کی درسگاہ تو بہت چھوٹی سی ہے لیکن اس کی شہرت ان ہی ظالمانہ افکار کی بنا پر ہے۔ نورانی صاحب کا ارشاد صحافت کے شمارہ ۱۵ بابت فروری ۸۴ء میں ص ۲۹ کالم ۳ پر طبع ہوا ہے۔

اللہ کا شکر ہے وہ تھرما میٹر، بیرومیٹر ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا۔ اس پیمانے سے ہم ناپ لیتے ہیں اور الحمد للہ اس دور میں بھی اپنے ایمان کی سلامتی اور تحفظ کا انتظام کر لیتے ہیں۔ بحوالہ ترجمان اہلسنت، دسمبر ۱۹۷۷ء

یہ لوگ یہی تلقین کرتے ہیں کہ دیوبندیوں کے پاس نہ جانا۔ کیونکہ وہاں جانے والا پھر حنفی ہو جاتا ہے رضاخانی نہیں رہتا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے سرپھروں کی تعداد بہت کم ہے۔ شاید ایک لاکھ میں ایک ہوتا ہو لیکن مجسم شرارت ہوتا ہے۔ لوگوں کو گمراہ کر کے لطف اندوز ہوتا ہے کافر بنا کر خوش ہوتا ہے اور لڑا کر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ یہ بھی انگریز کے خود کاشتہ پودے کا ثمر تلخ ہے۔ اصول فتویٰ تو وہ ہیں جن پر اکابر دیوبند قائم چلے آ رہے ہیں کہ مسلمان کو جس طرح بھی ہو سکے کافر قرار نہ دیا جائے لیکن یہ دشمنان امت محمدیہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح کوئی خون نظر آئے تو اس مسلمان کو جو مقبول ہو کافر کہا جائے۔ یہ امت محمدیہ کا اقبال ہے۔ لے امت پر رحم نہیں آتا۔ یہ دل کا نام لیتا ہے اور کل بروز قیامت ان سے ملنے پر ایمان

نہیں رکھتا ورنہ کچھ تو شرم ہوتی کہ وہاں کیا جواب دے گا۔

مزید معلومات مختصر انداز میں الدلائل القاہرہ کے مقدمہ میں دیکھیں۔ یہ سارا رسالہ مع مقدمہ اڑتالیس صفحات کا ہے۔ اردو بازار لاہور میں دستیاب ہے۔

اگر ایسے لوگ زیادہ ہوتے تو پاکستان کبھی نہ بن سکتا اور مسلم لیگ کو کوئی ووٹ نہ دیتا کیونکہ ان لوگوں کے فتوے دسمبر ۱۹۴۵ء تک ایسے ہی شائع ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً "اجمل الانوار رضا" یہ کتاب بھی دسمبر ۴۵ء میں انتظامی پریس کانپور سے شائع ہوئی (مقدمہ الدلائل القاہرہ ص ۵) یہ کتاب "اجمل الانوار رضا" اعلیٰحضرت احمد رضا خان صاحب کے بڑے اعلیٰ خلیفہ کی ہے) یہ لوگ عبدالماجد صاحب دریا آبادی کو "مرتد بلکہ اخبث الکفار و انجس المرتدین" لکھتے ہیں ــــ تجانب ص ۱۳۵۔ اس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو آنجہانی لکھا گیا ہے کیونکہ معاذ اللہ وہ بھی مسلمان نہ تھے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے تو پاکستان بن جانے کے بعد اسے مسجد سے تشبیہ دی۔ انہوں نے فرمایا "مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے"۔ شیخ الاسلام نمبر الجمعیت ص ۱۷۱ کالم ۱ خصوصی شمارہ، جلد ۴۲ و واقعات ص ۱۴۷ مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند۔ اور الحمد للہ ان کے ماننے والے اسے اسی طرح مقدس سرزمین مانتے ہیں۔ لیکن درباری حضرات کے اکابر نے قائداعظم کی مخالفت سے کب رجوع کیا اور کب انہیں اور ڈاکٹر اقبال کو مسلمان کہا اس کا ثبوت اب کے بعد تیار کر نا شروع کیا جا سکتا

ہے۔ اب تک تو کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے۔ البتہ تکفیر کے شدید ترین فتوے جو متعدد رسائل میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ وہ دستاویزی ثبوت کے لئے موجود ہیں اور لوگوں کے پاس محفوظ ہیں۔ (دسمبر ۴۵ء تک "اجمل" جیسے رسائل چھپتے رہے ہیں)

مضمون رازی کی اشاعت کا پس منظر

بریلوی حضرات نے اس وقت اپنی تاریخ سازی کی مہم شروع کر رکھی ہے اس کیلئے عجیب و غریب حکایات گھڑی جارہی ہیں۔ وہ دوسروں پر کیچڑ اچھالے بغیر نہیں بن سکتی۔ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد بھی یہی ہے اور صحیح حقیقت حال کا خاکہ آپکے سامنے آگیا ہے۔ آمدم برسر مطلب غرض علامہ اقبال اور مولانا مدنی کی یہ بحث ۲۸ مارچ کو ختم ہو گئی تھی اور بالیقین خوبی کے ساتھ ختم ہوئی تھی۔ اس قصہ کو ہر باخبر سوانح نگار اسی طرح بیان کرے گا جیسے ہم نے لکھا ہے

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں۔

۱۹۳۸ء کے آغاز میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں کہہ دیا کہ اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس کی تفصیل جو یو پی کے بعض اخباروں میں شائع ہوئی۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریہ وطنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے چونکہ علامہ اقبال عمر بھر وطنیت کے اس تصور کے خلاف جہاد کرتے رہے اس لئے انہیں مولانا حسین احمد کے اقتباس سے بے حد ملال ہوا اور انہوں نے وہ تین اشعار لکھ دیئے جو زبان زد عام ہیں لیکن اس کے بعد جب مولانا حسین احمد نے ایک اخباری مضمون میں اپنا موقف واضح کر دیا تو علامہ نے بھی اس ضرر کی تلافی کر دی جو ان کے طنز سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔ (ذکر اقبال ص۲۱۷ شائع کردہ بزم اقبال لاہور۔)

اس سے کافی زیادہ تفصیل حیات اقبال میں ہے۔ مصنفہ ایم۔ ایس۔ ناز مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز بار اول ۱۹۶۸ء از ص ۱۲۲ تا ۱۲۸۔

علامہ رازی کے مضمون پر ہمارا تبصرہ

محمد رازی

صاحب (صاحب مضمون) کی خیانتیں ملاحظہ ہوں۔ انہوں نے اسے اپنے منشا کی طرف گھمانے کے لئے ص۵ پر "متحدہ قومیت کا مفہوم" کا عنوان قائم کر کے از سر نو لکھنا شروع کیا ہے کہ "متحدہ قومیت دور حاضرہ کی ایک سیاسی اصطلاح ہے"۔ اس بحث میں مختلف زہریلے عنوانات "اسلام دشمنی کی انتہا" "جداگانہ اسلامی تنظیم سے عداوت" قائم کئے ہیں۔ حالانکہ خود ڈاکٹر اقبال مرحوم کے الفاظ میں اور مولانا کی شائع شدہ تحریرات میں یہ بات بصراحت آکر صاف ہو چکی تھی۔ مگر مقالہ نگار اس سے بچ کر اپنی بات پھر وہیں سے شروع کر رہے ہیں تاکہ اعتراض تشکیل دیا جا سکے۔

جواہر لال نہرو کی ۲۶ء کی تحریر گاندھی کی تحریر ڈاکٹر اشرف کمیونسٹ ڈاکٹر محمد محمود کے ایم منشی ڈاکٹر بی پتا بھی سیتا رامیا مسٹر توس ٹرینون ایک نامعلوم

مسلم قومیت پرست کی تقریروں، بیانات یا تحریرات کے حوالے۔ نیز مشہور نیشنلسٹ لیڈر پنڈت نہرو کی کتاب میری کہانی، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کی تحریرات، حضرت مولانا کے بیان کا ایک تراشہ بطور ضمیمہ۔ پھر پنڈت نہرو کی میری کہانی کے اقتباسات لاکر حضرت مدنی کو ان کا بالکل ہم خیال ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی ہے اور ص۱۵۰ پر بعنوان "خلاصہ بحث" ان ہندوؤں کے بیانات کی روشنی میں متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی ذکر کئے ہیں اور اقتباسات کا انبار لگا دیا ہے۔

وہ عنوان "خلاصہ بحث" کے تحت لکھتے ہیں۔

تفصیلات بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ متحدہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہونے ضروری ہیں۔ چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ متحدہ قومیت میں

(۱) مختلف قوموں کی تہذیب کو ملاکر ایک جدید تہذیب میں منتقل کر دیا جائے گا۔

(۲) مختلف جماعتوں کے جداگانہ مذاہب کی تعلیمات سے ایک مرکب مذہب تیار کیا جائے گا اور جب تک وہ تیار نہ ہوگا اس وقت تک مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ سمجھا جائے گا۔

(۳) مختلف قوموں کا الگ الگ نام بھی باقی نہ رہے گا بلکہ ایک مشترک نام کی بناء پر وحدت اختیار کیا جائے گا۔

(۴) مختلف جماعتوں کی زبان بھی جداگانہ نہیں ہوگی بلکہ اکثریت کی زبان متحدہ زبان قرار پائے گی

(۵) متحدہ قومیت کا نظام ایک ایسی جمہوریت سے مرتب ہوگا جو تمام قوموں کے امتزاج سے قائم ہوگا اور جس کی رو سے اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بن کر رہیں گے۔ (ص۱۵۱)

اور ص۱۵۲ پر لکھ دیا کہ:

متحدہ قومیت میں مسلمانوں کو اپنا الگ تشخص قائم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ لہٰذا متحدہ قومیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کو بنام وطنیت اس طرح آپس میں ملا دیا جائے کہ ان کی جداگانہ تہذیب، تمدن، نام، زبان، مذہب باقی نہ رہے بلکہ ان کے امتزاج سے ایک مشترکہ اور متحدہ تہذیب، تمدن، نام، زبان اور مذہب کو وجود عمل میں لایا جائے اور وہ سب مل کر ایسے دستور العمل کے تحت زندگی بسر کریں جسے اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چاہے۔

رازی صاحب نے یہ اہتمام زرنگاری کی مدد سے ص۱۵۰ تک ذہن کو مولانا کی مخالفت میں پوری شدت سے ابھارنے کی کوشش کی ہے تاکہ حضرت مولانا پر موثر انداز میں بہتان طرازی کی جا سکے۔ حالانکہ ان نظریات کے کفر ہونے میں خود حضرت مدنی ہی کو کب کلام تھا۔

اس کے بعد اس متحدہ قومیت کے گھناؤنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی ترکیب میری کہانی سے لے کر لکھی ہے۔ ظاہر ہے مولانا کی طرف ان کفریات کی نسبت فقط مقالہ نگار کی اپنی فکری اختراع ہے۔ انہیں یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اسلامی عقیدہ یہ بھی ہے کہ خدا کے سامنے ہر ایک کو پیش ہونا ہے اور کسی کی طرف کفریات کی نسبت کرنا نہایت خطیر ہے

اور حقوق العباد میں داخل ہے۔ مقالہ نگار نے منڈوں کے بیانات کو اور ان سے اخذ کردہ نتائج کو مولانا پر الزام لگانے کیلئے غلط جان بوجھ کر بے دھڑک استعمال کیا ہے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ مولانا مدنی جمعیت علماء ہند کے سربرآوردہ تھے۔ علم و عمل کے پیکر اور سنت نبویہ کے عامل اسلام کے مجاہد متقی اور عبادت گزار تھے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یوذون	وہ لوگ جو مومن
المؤمنین والمومنات	مردوں یا عورتوں
بغیر ما اکتسبوا	کو ایذا پہنچاتے ہیں بغیر
فقد احتملوا بہتانا	اسکے کہ انہوں نے وہ کام کیا
واثما مبینا۔پ۲۲ رکوع ۳	تو انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ سر لیا

ہم نے آیت اس لئے لکھی ہے کہ صاحب مضمون جہاں تک سنا گیا ہے۔ خود غلام احمد پرویز ہیں (جو اس زمانہ میں سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے علامہ رازی کے فرضی نام سے ایڈیٹر طلوع اسلام بنے ہوئے تھے) شاید انہیں قرآنی آیت اپیل کرے۔ وہ آگے چل کر صفحہ ۸ پر بعنوان "قرآن فہمی کا یاس انگیز مظاہرہ" مولانا کے دلائل ذکر کرنے کے بعد یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ "اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مختلف انبیاء کرام کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے"۔ مگر کچھ ہی آگے "فرقہ پرستی کی فضیلت" یوں بیان کرتے ہیں کہ انبیاء کے ماننے والے دو فریق ہوتے ہیں اور سورہ ہود میں

آیا ہے "مثل الفریقین" یہ دور حاضرہ کی سیاست کا ترجمہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے فرقہ پرستی کہا جاتا ہے جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

دوسرا اتہام

مقالہ نگار سے ہمارا سوال ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہاں فرمایا ہے کہ نبی کی قوم میں مسلمان اور کافر کا فرق نہیں ہوتا اور کافروں کا انجام بد نہیں ہوتا۔ آپ نے یہ الزام کیوں لگایا؟ اس لئے آپ نے قوم نوح قوم ہود قوم لوط قوم شعیب قوم موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے سزایاب ہونے کا ذکر جو صفحہ ۸ تک چلایا ہے۔ زائد بحث کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن وہ مولانا پر اس کے انکار کا الزام لگانے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ جس کا انہوں نے بیڑا اٹھایا ہے اور ایسا ہی لگتا ہے کیونکہ اس کے آخر میں پھر یہی بات دہراتے ہیں کہ:

> اب یہ ظاہر ہے کہ ہم اور تم کی تفریق سیاست حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہلاتی ہے اور متحدہ قومیت کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب ہم اور تم کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ ع
>
> ⁝
>
> تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کی کسی تقریر، تحریر یا کسی مجلس میں بھی کبھی یہ بات نہیں کہی گئی۔ مولانا کی زندگی آخری لمحات تک اسلام کا نمونہ رہی۔ وہ اسلام کے لئے کام کرتے رہے۔ اس ہندوستان میں جو قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کے لئے یکسر بدل گیا تھا۔ وہاں آپ نے

لوگوں کو اسلام پر جمائے رکھا جو یقیناً جہاد اکبر تھا۔

فرقہ اور فریق کا قرآن پاک میں ذکر

مقالہ نگار نے اس عنوان کے آخر میں سورۂ ہود کی آیت پیش ہے اور جس میں مومنین اور کفار کے دو گروہ کا عنوان نام گیا ہے اور اس کی رو سے فرقہ پرستی کو واجب قرار دیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ آیت میں دو فریق ذکر کئے گئے ہیں جو ایمان و کفر اور نیک و بد اعمال کے نتیجے میں خود بخود بن جاتے ہیں جن کا کسی بھی مسلمان کو انکار نہیں ہو جائیگا حضرت مدنی جیسے محدث زمانہ کو۔ لیکن اس سے آپس میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی ترغیب اخذ کرنا اور اسلامی تعلیم کا نام لینا ان کا اپنا اجتہاد ہے کیونکہ قرآن پاک میں فریق اس گروہ کے معنے میں بھی آیا ہے جو ایک دوسرے کے مقابل نہ ہو۔ قرآن کریم میں فریق کا لفظ کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ انبیاء کرام کے دو فریق ذکر فرمائے گئے ہیں بنی اسرائیل کو خطاب ہے:

ان انبیاء میں ایک گروہ
کو تم جھٹلاتے ہو اور
ایک گروہ کو شہید کرتے ہو۔

اس آیت میں دو فریق ذکر فرمائے گئے ہیں دونوں ہی انبیاء کرام کے گروہ ہیں۔ آپ ہی بتائیں کہ انبیاء کے فریقوں میں آپس میں کیا فرقہ بندی تھی؟ — ایک اور جگہ کافروں ہی کے دو فریق ذکر فرمائے گئے ہیں اور صحابہ کرام کو خطاب ہو رہا ہے کہ:

اور ان کافروں کے
دلوں میں انہا رعب
ڈالا۔ اور ان میں ایک
گروہ کو تم قتل کرتے
ہو اور ایک گروہ کو قید۔

ان کافر گروہوں میں آپس میں کیا فرقہ بندی تھی۔ یہ تو مسلمانوں کے مقابل متحد اور ایک جماعت تھے بلکہ قرآن کریم میں فرقہ کا لفظ بھی آیا ہے۔

یعنی ایسا کیوں نہ ہو
کہ ان کے ہر گروہ میں
سے ایک جماعت نکلے
کہ دین کی سمجھ حاصل کریں تا

بلکہ فرقہ کا لفظ غیر جاندار پر بھی بولا گیا ہے۔ حدیث میں معجزہ شق القمر کے ذکر میں آتا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے زمانہ میں چاند دو
ٹکڑے ہوا۔ ایک ٹکڑا
پہاڑ کے اوپر تھا اور دوسرا
اس سے نیچے۔

فائدہ:۔ الجمعیۃ دہلی کے حوالے سے الحق اکوڑہ خٹک کے شمارہ ۳، ۴ جلد ۱۳ کے ص ۴۲ پر یہ خبر دی گئی ہے کہ چاند میں جو عظیم دراڑ ہے اس کا نام سائنسدانوں نے "عرب دراڑ" رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق الباز جنہوں نے اپالو ۱۵ کی منصوبہ بندی کی تھی یہ بیان دیا ہے۔

لہٰذا فریق کے لفظ سے مقالہ نگار کا اس مروجہ فرقہ بندی کی فضیلت کے لئے استدلال کرنا ان کی اپنی

اور حقوق العباد میں داخل ہے۔ مقالہ نگار نے ہندوؤں
کے بیانات کو اور ان سے اخذ کردہ نتائج کو مولانا پر
الزام لگانے کیلئے غلط جان بوجھ کر بے دھڑک استعمال
کیا ہے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ مولانا مدنی جمعیت
علماء ہند کے سربرآوردہ تھے۔ علم و عمل کے پیکر اور
سنت نبویہ کے عامل اسلام کے مجاہد متقی اور عبادت
گزار تھے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یوذون	وہ لوگ جو مومن
المؤمنین والمومنات	مردوں یا عورتوں
بغیر ما اکتسبوا	کو ایذا پہنچاتے ہیں بغیر
فقد احتملوا بہتانا	اسکے کہ انہوں نے وہ کام کیا
واثما مبینا پ۲۲ رکوع ۴	ہو انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ سر لیا۔

ہم نے آیت اس لئے لکھی ہے کہ صاحب مضمون
جہاں تک سنا گیا ہے۔ خود غلام احمد پرویز ہیں (جو اس
زمانہ میں سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے علامہ رازی کے
فرضی نام سے ایڈیٹر طلوع اسلام بنے ہوئے تھے) شاید
انہیں قرآنی آیت اپیل کرے۔ وہ آگے چل کر صفحہ ۱ پر
بعنوان "قرآن فہمی کا یاس انگیز مظاہرہ" مولانا کے
دلائل ذکر کرنے کے بعد یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ
"اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مختلف انبیاء کرام
کے نام سے ان اقوام کو منسوب کیا ہے"۔ مگر کچھ ہی آگے
"فرقہ پرستی کی فضیلت" یوں بیان کرتے ہیں کہ انبیاء
کے ماننے والے دو فریق ہوتے ہیں اور سورہ ہود میں
آیا ہے مثل الفریقین ... یہ دور حاضرہ کی بات
کا ترجمہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے فرقہ پرستی
کہا جاتا ہے جو متحدہ قومیت کی بالکل ضد ہے۔

دوسرا اتہام

مقالہ نگار سے ہمارا سوال یہ ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے
کہاں فرمایا ہے کہ نبی کی قوم میں مسلمان اور کافر کا
فرق نہیں ہوتا اور کافروں کا انجام بد نہیں ہوتا۔ آپ
نے یہ الزام کیوں لگایا؟ اس لئے آپ نے قوم نوح قوم
ہود قوم لوط قوم شعیب قوم موسیٰ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ
والسلام کے سزایاب ہونے کا ذکر جو صفحہ ۲۲ تک چلایا
ہے۔ زائد بحث کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن وہ مولانا پر
اس کے انکار کا الزام لگانے کا بندوبست کر رہے ہیں۔
جس کا انہوں نے بیڑا اٹھایا ہے اور ایسا ہی لگتا ہے
کیونکہ اس کے آخر میں پھر یہی بات دہراتے ہیں کہ:

اب یہ ظاہر ہے کہ ہم اور تم کی تفریق
سیاست حاضرہ کی اصطلاح میں فرقہ پرستی
کہلاتی ہے اور متحدہ قومیت کی تشکیل
اس وقت ہوتی ہے جب ہم اور تم کا امتیاز
یوں مٹ جائے کہ ع
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا کی کسی تقریر، تحریر یا نجی
مجلس میں بھی کبھی یہ بات نہیں کہی گئی۔ مولانا کی زندگی
آخری لمحات تک اسلام کا نمونہ رہی۔ وہ اسلام کے لئے
کام کرتے رہے۔ اس ہندوستان میں جو قیام پاکستان
کے بعد مسلمانوں کے لئے یکسر بدل گیا تھا۔ وہاں اپنے

راستہ ہے جو غلط ہے۔ بلکہ حضرت سیدنا موسیٰ و ہارون کے واقعہ سے تو ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ فرقہ بندی میں نجات نہ کیجئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے تو پیچھے قوم مبتلائے شرک ہو گئی۔ واپس آکر آپ حضرت ہارون علیہما السلام پر خفا ہو گئے حضرت ہارون نے جواب دیا۔

اے میرے ماں جائے نہ
میری داڑھی پکڑو اور نہ
سر کے بال مجھے یہ ڈر ہوا
کہ تم کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل
میں تفرقہ ڈال دیا اور تم نے
میری بات کا انتظار نہ
کیا۔ (خیال نہ رکھا)

مقالہ نگار صہ۲۲ پر فرماتے ہیں" اور متحدہ قومیت کی تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب ہم اور تم کا امتیاز یوں مٹ جائے کہ

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

مقالہ نگار کی مصنوعی یک چشمی

فرضی رازی صاحب فرماتے ہیں" ذرا آج ہندوؤں سے کہیئے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کیلئے بغض و عداوت رہے گی تا وقتیکہ ایمان نہ لے آؤ پھر دیکھیئے وہ آپ کو کس طرح متحدہ قومیت کا جز تسلیم کرتے ہیں"۔

حالانکہ آگے کی آیتیں احکام کی وضاحت کے لئے خود موجود ہیں۔ کفار معاندین محاربین اور مصالحین کے احکام میں فرق بیان فرمایا ہے۔ مقالہ نگار کے مضمون کا یہ حصہ اور فراق کی تفسیر پڑھ کر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام ترش روئی سکھاتا ہے علیحدگی پسندی اور چھوت چھات سکھاتا ہے اور بزور ملوار پھیلا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقالہ نگار صرف ایک چیز پر زور دے رہا ہے جو اس وقت اسے پسند تھی اور مذہبی تعلیم پوری نہیں پیش نہ کی۔ اگلی آیات سے بھی یہ چیز واضح طور پر ملتے موجود ہیں۔

پہلے آپ کو اعلیحضرت احمد رضا خاں صاحب کے ترجمہ اور تفسیر سے یہ آیات اور احکام سنواتے دیتے ہیں۔

قریب ہے کہ اللہ تم میں اور
ان میں جو ان میں سے
تمہارے دشمن ہیں دوستی
کر دے اور اللہ قادر ہے
اور بخشنے والا مہربان
ہے

اس کے حاشیہ پر نعیم الدین صاحب مرادآبادی لکھتے ہیں "یعنی کفار مکہ میں سے اس طرح کہ انہیں ایمان کی توفیق دے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ایسا کیا اور بعد فتح مکہ ان میں سے کثیر التعداد لوگ ایمان لے آئے اور مومنین کے دوست اور بھائی بن گئے اور باہمی محبتیں بڑھیں۔

شانِ نزول: جب اوپر کی آیات نازل ہوئیں تو مومنین نے اپنے اہل قرابت کی عداوت میں تشدد کیا۔ ان سے بیزار ہو گئے اور اس معاملہ میں بہت سخت ہو گئے تو اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انہیں امید دلائی

کہ ان کفار کا حال بدلنے والا ہے۔

پھر ارشاد باری ہے:

اللہ تمہیں ان سے منع
نہیں کرتا جو تم سے دین
میں نہ لڑے اور نہیں تمہارے
گھروں سے نکالا کہ ان کیساتھ
احسان کرو اور ان سے انصاف
کا برتاؤ برتو بیشک انصاف
والے اللہ کو محبوب ہیں۔
اللہ تمہیں انہی سے منع کرتا
ہے جو تم سے دین میں لڑے
یا تمہیں تمہارے گھروں سے
نکالا یا تمہارے نکالنے پر
مدد کی کہ ان سے دوستی کرو
اور جو ان سے دوستی کرے
تو وہی ستمگار ہیں۔

اس کے حاشیہ پہ صدر الافاضل نعیم الدین صاحب مرادآبادی لکھتے ہیں:

شانِ نزول:۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت خزاعہ کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے رسول کریم سے اس شرط پر صلح کی تھی کہ نہ آپ سے قتال کریں گے نہ آپ کے مخالف کو مدد دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے کی اجازت دی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نے فرمایا کہ یہ آیت ان کی والدہ اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں نازل ہوئی۔ ان کی والدہ مدینہ طیبہ میں ان کے لئے تحفے لے کر آئی تھیں اور تھیں مشرکہ۔ تو حضرت اسماء نے ان کے ہدایا قبول نہ کئے اور انہیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا حکم ہے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی کہ انہیں گھر میں بلائیں ان کے ہدایا قبول کریں۔ ان کیساتھ اچھا سلوک کریں ۔؎

سلوک رفق و مدارا بجار و ذی القربیٰ۔ عمل بحکم الٰہی و اتباع نبی است

(اقبال سہیل)

آیت قرآنی میں تحریف

مقالہ نگار نے "متحدہ قومیت اور اسوۂ خلیل" کے زیر عنوان ص۲۳ پر ایک آیت پیش کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نقل کرنے میں کتنے غیر محتاط ہیں۔ انہوں نے پہلے آیت نقل کی ہے۔ وہ بھی غلط، پھر ترجمہ میں آیت کے جملے نقل کئے ہیں۔ وہ بھی غلط ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے

مگر فرضی رازی صاحب نے اسے

کر دیا۔

ارشاد باری ہے (جب

انہوں نے اپنی قوم سے کہا) مگر رازی صاحب نے

کر دیا۔ نہ معلوم ایسا کیوں کیا گیا ہے۔

پھر مقالہ نگار نے آیت مبارک کی تفسیر کرتے وقت اپنی دلی خواہش کے اثبات میں سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر پورا زور صرف کر دیا ہے۔ مگر سورت اور پارہ کا حوالہ نہیں دیا تاکہ کوئی مسلمان قرآن پاک میں پورا مسئلہ

نہ دیکھ لے۔ کیونکہ اس سے آگے وہ آیات ہیں جن میں
تفصیلاً احکام بتلائے ہیں جو ابھی گزری ہیں۔ اس سے
ان کے مبلغ علم یا خیانت و تحریف کا اندازہ کیجئے۔

قوم اور ملت کا قرآن و حدیث میں استعمال

اب قوم اور ملت کے بارے میں قرآن پاک کی روشنی
میں غور فرمایئے۔ قوم کا لفظ فی الواقع بہت عام ہے مثلاً
سورہ الروم پ۲۱ رکوع ۴ یہاں دیکھیں۔

ان فی ذلک لآیات — یقیناً اس میں بہت سی
لقوم یتفکرون۔ — کی باتیں ہیں ان کیلئے
جو دھیان کرتے ہیں۔

ان فی ذلک لآیات — یقیناً اسمیں بہت سی
لقوم یسمعون — کی باتیں ہیں ان کیلئے
جو سنتے ہیں۔

ان فی ذلک — یقیناً اس میں بہت سی
لآیات لقوم — کی باتیں ہیں ان کیلئے
یعقلون — جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اسی طرح اٹھائیسویں پارہ میں سورۃ الحجرات کے
دوسرے رکوع میں دیکھیں۔ صرف مردوں پر قوم کا لفظ
بولا گیا ہے:

یا ایھا الذین آمنو — اے ایمان والو! نہ مرد
لا یسخر قوم من — مردوں کا مذاق اڑائیں شاید
قوم عسی ان یکونوا — ان ہنسی اڑانے والوں سے
خیرا منھم ولا نساء — بہتر ہوں اور نہ عورتیں
من نساء عسی ان یکن — دوسری عورتوں سے شاید
خیرا منھن — اور عورتیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔

مضمون نگار نے کہا ہے کہ قوم نوح نہ کہا جاتا تو
کیا کہا جاتا جب اس کو کوئی اور نام ہی نہ تھا۔ لیکن حضرت
موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا تو نام تھا جو بنی اسرائیل کہلاتی تھی
اس میں کافر اور مسلمان سب کو ملا کر ان کی قوم فرمایا
گیا ہے۔

فما آمن لموسیٰ الا — یعنی موسیٰ علیہ السلام
ذریۃ من قومہ علی — پر ان کی قوم کے لوگ
خوف من فرعون — ایمان نہ لائے سوائے
وملائھم ان — کچھ نو عمر لڑکوں کے فرعون
یفتنھم — اور ان کے سرداروں کے
(سورہ یونس پ۱۱ رکوع ۹) خوف سے۔

قوم کی نسبت باوجودیکہ اکثریت غیر مسلم تھی آپ
ہی کی طرف کی گئی ہے۔ ان سب ہی کے لئے آپ
نے فرعون سے مطالبہ بھی فرمایا: ان ارسل معنا بنی
اسرائیل (پ۱۹۔ رکوع ۶) کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل
کو بھیج دے۔

قال ابن ام ان — یعنی ہارون علیہ السلام نے
القوم استضعفونی — کہا کہ میرے ماں جائے قوم
وکادوا یقتلوننی — نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھے
(پ۹۔ رکوع ۵) — کہ مجھے مار ڈالیں۔
ان قارون کان — یقیناً قارون موسیٰ کی
من قوم موسیٰ (پ۲۰ رکوع ۱۱) — قوم سے تھا۔

واعظوں سے آپ نے یہ واقعہ تو بہت ہی سنا ہو
گا کہ اہل طائف نے جب بہت تکلیف دی تھی تب

بھی جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بھی
دعا دی تھی۔

اللّٰھم اھد قومی — اے اللہ میری قوم کو ہدایت
فانھم لا یعلمون — دے کیونکہ وہ نہیں جانتے۔

حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ آپ سے دریافت
کیا کہ کیا آنجناب پر کوئی وقت احد کے دن سے بھی
زیادہ سخت آیا ہے۔ جواب میں ثقیف اور طائف کا
واقعہ ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوا:

فقال لقد لقیت — مجھے تمہاری قوم سے تکلیف
من قومک وکان — پہنچتی رہی ہے ان سے
اشد ما لقیت — زیادہ تکلیف عقبہ والے
منھم یوم العقبۃ — دن پہنچی ہے۔

مشکوٰۃ شریف ص۵۲۵ از بخاری مسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو پیدائشی مسلمان
ہوئی تھیں مگر قوم کی نسبت ان طرف کی گئی

قال عبد اللہ کانی — حضرت عبداللہ بن مسعود
انظر الی من — نے فرمایا کہ گویا میں رسول اللہ
الانبیاء ضربہ قومہ — کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک
فادموہ فھو یمسح — نبی کی نقل فرما رہے ہیں انہیں
الدم عن وجھہ — ان کی قوم نے مار مار کر لہولہان
وھو یقول رب — کر دیا۔ وہ اپنے چہرے سے خون
اغفر لقومی فانھم — پونچھتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے
لا یعلمون۔ — ہیں اے اللہ میری قوم کو معاف
(بخاری شریف ص۱۰۲۴) کر دے کیونکہ یہ نہیں جانتے۔

یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرماتے
بغیر اپنے ہی بارے میں فرماتے تھے۔

احد کے موقع پر ارشاد فرمایا:

کیف یفلح قوم دمّوا — وہ قوم کیسے فلاح پائے
وجہ نبیھم۔ — گی جس نے اپنے نبی کے چہرہ
(بخاری شریف ص۵۸۲) کو خون آلود کیا۔

ایک مرتبہ دسترخوان پر سانڈہ کا گوشت لایا گیا
مگر اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول نہیں فرمایا۔

فقال خالد بن الولید احرام الضب یا رسول
اللہ؟ قال لا ولکن لم یکن بارض قومی
فاجدنی اعافہ۔

بخاری شریف ص۸۱۲۔

بیہقی میں ہے کہ آنجناب نے ایران میں ملکہ
کی تخت نشینی کی خبر سن کر ارشاد فرمایا:

لا یفلح قوم — وہ قوم کامران نہیں ہوگی
تملکھم امراۃ۔ — جس پر عورت حکومت کرتی ہو۔
(البدایہ ص۲۷ ج۴) (یہاں قوم سے ملک فارس
مراد ہے)

حدیث ھرقل میں بخاری شریف میں ہے
کہ ہرقل نے آپ کی باتیں سن کر تصدیق کرتے
ہوئے کہا:

وکذلک الرسل — یعنی اسی طرح انبیاء
تبعث فی نسب — کرام اپنی اپنی قوموں کے
قومھا۔ — بہترین خاندانوں میں
بخاری شریف ص۴ — مبعوث ہوا کرتے ہیں۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی بار

وحی آئی تو حضرت ورقہ ابن نوفل نے جو بوڑھے ہو چکے
تھے آنحضورؐ سے عرض کرنے لگے:

کیا اچھا ہو کہ میں اس وقت
تک زندہ رہوں جب آپ
کو آپکی قوم نکالے گی

یہ بھی دیکھیں

مضمون نگار اس عنوان کے
آخر میں مزید استدلال کرتے
ہیں.
اس نے تمہارا نام مسلمان کہا

اس آیت کا پہلا جملہ ہے
یہاں آیت میں ملت کا لفظ آیا ہے
اس لئے اس جزو کو انہوں نے حذف کر دیا۔ اس سے
ان کی اٹھائی ہوئی بحث پر اثر پڑتا تھا کیونکہ وہ قوم اور
ملت کو ایک چیز قرار دیتے چلے گئے ہیں۔

حقیقتاً کا مطلب یہ ہے
کہ مذہب کے بارے میں پوچھا جائے تو تم اپنے آپ
کو مسلمان کہو۔ تمہارا مذہب اسلام ہے اور بس
لیکن قومیت کے بارے میں سوال ہو تو سید، شیخ
صدیقی، راجپوت، پٹھان وغیرہ کہیں گے۔ قومیت
یعنی نیشنلٹی یعنی وطنیت کے بارے میں سوال
ہوگا تو اس کا ایرانی، پاکستانی وغیرہ جواب ہوگا۔
سرکاری فارموں کی خانہ پری بھی اسی طرح کی جاتی ہے
اسی طرح پاسپورٹ داخلہ فارم وغیرہ بھرے جاتے
ہیں اور فرنگی رازی سمیت سب دن رات بھرتے
ہیں اور کوئی اسے ناجائز یا حرام نہیں کہتا۔
اقبال سہیل مرحوم نے کہا ہے؂

بملت ابراہیمی راست رہا۔ ولے بشوم جانی بنام ملت

اس سے مقالہ نگار کا استدلال بے محل ہے
قوم اور ملت میں فرق کی مثال مذکورہ آیت مبارکہ
کے ساتھ کچھ اور آیتوں میں ملاحظہ فرمائیں کہ لفظ ملت
خاص مذہب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔
حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے
جیل کے ساتھی سے فرمایا:

میں نے اپنے باپ
دادا ابراہیم، اسحٰق
اور یعقوب کے مذہب کی پیروی
اختیار کر لی ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا

کہہ دیں بلکہ ہم ابراہیم کا دین
لیتے ہیں جو باطل سے بچے ہوئے
تھے اور شرک کرنیوالوں
میں نہ تھے۔

تمہارے باپ ابراہیم کا دین
اس (اللہ) نے نام رکھا تھا
مسلمان۔ پہلے سے اور
اس قرآن میں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ

حتیٰ کہ آخری بات جو ابو طالب نے
ان کافر ساتھیوں کے جواب
میں کہی (یہ تھی) کہ وہ عبدالمطلب
کی ملت پر (جان دے رہے ہیں)

اور لاالٰہ الااللہ کہنے
سے انکار کر دیا۔
بلند تر بود از قوم زندہ ملت۔ کہ حبل دین قوی تر ز رشتہ نسبت
(اقبال سہیل)

مسئلہ کی حقیقت

کفر و اسلام کی مل جدائی کے باوجود کفار سے
مناسب حد تک تعلقات کا قیام بھی ثابت ہے
آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو ایک
ریشمی کپڑا عنایت فرمایا مسلمان مردوں کیلئے ریشم
منع ہے مگر خرید و فروخت اور ہبہ جائز ہے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے
وہ اپنے ایک بھائی کو پہننے کیلئے دیدیا جو مکہ میں تھے
مشرک تھے —— حالانکہ آپ
کے مصداق تھے۔ اس کا مطلب آپنے جو اکھڑ پنا اور
کندہ ناتراشی بننا سمجھا ہے وہ درست نہیں۔ اسلام
بزور تلوار نہیں پھیلا بزور اخلاق پھیلا ہے۔
ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ایک
نسبی قرابتدار کے لئے جو ذمی تھا مال کی وصیت فرمائی تھی۔
حضرت ابن عمر فرماتے ہیں
کہ حضرت صفیہؓ نے اپنے
ایک یہودی رشتہ دار کیلئے
وصیت فرمائی
نیز بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کا رہی ہی ...
تعلق ہے یا ملکی معاملات سے۔ ان کے باقاعدہ
احکام حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ترمذی شریف

میں مشرکین کا ہدیہ قبول کرنے کا باب ہے۔ کہ کسریٰ اور
دوسرے بادشاہوں نے آپ کے پاس تحائف بھیجے
آپ نے قبول فرمائے۔ ترمذی ص۱۹۱ باب

جس طرح آج اسٹیشنوں پر اسٹالوں پر چائے
وغیرہ ہوتی ہے یا ہمارے وفد یورپ، چین، امریکہ جاتے
ہیں۔ وہاں مہمان ہوں یا مشرکوں کے جہازوں میں سفر
کریں۔ کیا ان کے ہاتھ کی وہ چیزیں جو حلال ہیں کھا
سکتے ہیں یا نہیں؟ ترمذی شریف میں ایک باب ہے۔
(ص۱۸۹) جس میں
جواز کی روایت دی گئی ہے۔ اسی طرح ان کے برتنوں
کے بارے میں ایک باب ہے کہ وہ دھو کر استعمال کر سکتے
ہیں۔ ص۱۸۹۔ ترمذی شریف۔
ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ لڑائی
میں مسلمانوں کی مدد کریں اس کا بھی ایک باب ہے

اس باب کی حدیثوں میں یہ مسئلہ بتلایا
ہے کہ ایسی صورت میں امام (محاذ کا کمانڈر) انہیں جو کچھ
مناسب سمجھے (انعام) دے گا۔ ان کا مجاہدین مسلمین کی طرح
حصہ نہیں ہوگا۔
غرض ایسے بہت سے مسائل ہے اور دوسری
تمام آیات و احادیث سے صرف نظر کر کے یہ کہنا کہ
اسلام نے کافروں سے فقط دشمنی اور سختی ہی سکھائی
ہے، مدبر طلوع اسلام کی دین سے ناواقفیت پر مبنی
ہے۔

شریعت میں لفظ امت کا استعمال

مضمون نگار نے ص۲۴ سے "متحدہ قومیت کا غیر قرآنی تصور" کے زیر عنوان معاہدہ نبویہ سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ کے استدلال کی تردید کی ہے لیکن مولانا کی تحریر اور معاہدہ سرور کائنات علیہ السلام کے الفاظ مبارکہ حضرت مدنی کی کتاب کے ص۶۴ اور ص۶۶ کا مطالعہ فرمالیں۔ اس میں

ان سب دفعات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک امت فرمایا ہے۔

امت کا لفظ کافروں پر قرآن کریم میں بھی بولا گیا ہے جیسے اس آیت میں ہے۔

اور جب ان میں سے
ایک گروہ نے کہا کہ ان
لوگوں کو کیوں نصیحت
کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک
کرنے والا ہے یا انہیں سخت
عذاب دینے والا ہے۔ کہنے
لگے تمہارے رب کے
سامنے الزام اتارنے کیلئے
اور اسلئے کہ شاید وہ ڈریں۔
اور کچھ گروہ ہیں جنہیں
ہم دنیا کا فائدہ پہنچائیں
گے پھر انہیں ہماری طرف
سے دردناک عذاب پہنچے گا۔

اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے کافر مراد ہیں

انسانوں کے سوا اور حیوانات پر بھی قرآن کریم میں امت کا لفظ آیا ہے:

اور نہیں ہے کوئی زمین
میں چلنے والا اور نہ کوئی پرندہ
جو اپنے دو بازوؤں پر اڑتا
ہے مگر تم جیسی امتیں۔

خلاصہ بہتان

غرض حضرت مولانا نے تو ص۲۷ پر "مسلمان اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے" کے الفاظ صاف لکھے ہیں مگر مضمون نگار صاحب نے انہیں پھر بھی شدت سے مطعون کر کے الزام تراشی کا گناہ اپنے سر لیا ہے۔

ایک اور بہتان

اسی طرح اس سے آگے ص۲۷ پر غیر مسلموں سے موالات کا عنوان قائم کر کے موالات کے معنی کی وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کے کافروں کے ساتھ "قلبی تعلقات، ایک دوسرے پر کامل اعتماد، پورا پورا دلی بھروسہ ایسے تعلقات جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہوں جن میں قلب کو اتنا اطمینان حاصل ہو کہ حاضر و غائب دوسرے پر کامل بھروسہ کیا جا سکے اور یہ یقین ہو کہ میرے تمام مفاد دوسرے کے ہاتھوں میں محفوظ ہیں۔"

موالات کے یہ معنی مقالہ نگار نے اپنی طرف سے گھڑ لئے ہیں۔ موالاۃ لفظ ولی سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں قریب ہونا۔ قاموس میں ہے

اسی سے لفظ ولی بنا ہے۔ محب دوست اور مددگار۔ اسی سے لفظ مولیٰ بنا ہے جس کے کم از کم اتنے معنے تو یقینا ہیں۔ مالک، غلام آزاد کرنے والا آزاد کردہ۔ ساتھی قریبی رشتہ دار جیسے چچا زاد بھائی اور اس جیسا اور کوئی رشتہ دار، پڑوسی، حلیف (جس سے پکا معاہدہ ہوا ہو) بھانجا، بیٹا، چچا، مہمان شریک، مربی، مددگار، انعام واحسان کرنے والا اور جس پر انعام واحسان کیا گیا ہو محب، تابع، سسرال کا رشتہ غرضیکہ اس کے ایک دو نہیں بہت سے معنی ہیں اور جتنے معنی مولیٰ کے ہیں اتنے ہی موالاۃ کے ہیں یہ علمی خیانت کے ذریعہ بہتان طرازی ہے کہ حضرت مدنی کی طرف اس لفظ کا حرام ہی مطلب لکھ کر منسوب کیا ہے۔

مولانا نے کبھی اسے جائز نہیں سمجھا۔ بات معاہدہ کی ہی حد تک تھی جو شروع سے آج تک جائز چلا آرہا ہے۔ آپ اس معاہدہ کو جدا قومیت کی بناء پر کہنا چاہتے ہیں اور مولانا جدا ملت کی بناء پر فرماتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ خود سرور کائنات ؐ نے جن جن سے معاہدہ ہوا انہیں امۃ واحدۃ فرمایا ہے۔

بس جس قسم کا یہ معاہدہ تھا اور جس حد تک شریعت اجازت دیتی ہے مولانا مدنی اسی حد تک معاہدہ اور تعلق رکھنے کے قائل تھے اس سے زیادہ نہیں۔

سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دہی

آگے چل کر ص۲۲ پر مقالہ نگار نے "عہد وپیمان کے تعلقات" کے زیر عنوان خود بھی اسے جائز لکھا ہے۔ پھر ص۲۳ پر "اسلامی جماعت سے علیحدگی کفر ہے"۔ کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:۔

"اسلام کا نظام اجتماعی یہ ہے کہ تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے کتاب اللہ بحیثیت قانون قیامت تک کیلئے موجود ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے امامت کبریٰ کے مرکز اولین جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ ان کے بعد یہ منصب امامت حضورؐ کے جانشینوںؓ کی طرف منتقل ہوگیا۔ لہٰذا آج مسلمان کے لئے اسلامی نظام زندگی یہ ہوگا کہ ان کی اپنی جماعت ہو۔ اس جماعت کے منتخب افراد پر مشتمل ایک مجلس شاورت ہو اور ان میں اتقیٰ (سب سے زیادہ متقی) ان کا امیر ہو اور مسلمانوں کے تمام امور اس نظام کے تحت سرانجام پائیں"۔

اس سے مولانا مدنی کو کب اختلاف ہوا؟ ان کی ساری جدوجہد خود ان کی یا ان کے اکابر کی تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو اسی نظام اسلامی کے لئے تھی اور ان کے بعد ان کے متوسلین کی بھی بحمداللہ یہی خواہش ہے اور اسی کے لئے وہ جان و دل سے پاکستان میں کوشاں ہیں۔

مضمون نگار نے ص۳۳ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے اسلامی

اجتماعی زندگی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ یہ حوالہ "الخلافۃ وجزیرۃ العرب" سے ماخوذ ہے۔ دوسرا حوالہ مولانا کے خطبۂ صدارت لاہور کا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"مسلمانوں کی قومیت صادقہ کا مدار صرف شریعت پر ہے"۔

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس حوالے کے لکھنے سے کیا فائدہ مقصود ہے کیونکہ مولانا مرحوم اول سے آخر تک کبھی بھی مسلمانوں میں تفریق کے خواہاں نہیں رہے۔ مولانا کے دشمن جو مولانا پر الزام تراشی کی حد تک آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہی کہتے ہیں کہ ان میں ایک بڑی خامی یہی مذہب پرستی کی ہے۔ وہ مسلمانوں کے کام جواہر لال سے لیتے ہی رہتے تھے۔ ان کا عمل ان کے قول کے خلاف نہیں ہوا۔ البتہ آپ کی مرضی کیخلاف ضرور ہوا ہو گا جس کے واقعی وہ پابند نہ تھے۔

پھر دھوکہ دہی

مضمون نگار نے صـ۳۸ پر مذکورہ عنوان کے تحت لکھا ہے:

"کانگریس جس قسم کی مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے وہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ میں سمٹ کر رہ جاتا ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے والا مذہب تو مسلمانوں کیلئے اپنے الگ نظام اور اپنی الگ جماعت کے قیام کا مقتضی ہو جاتا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جو انتہائی "فرقہ پرستی" پر دلالت کرتی ہیں"۔

یہی باتیں کر کے اور پوری قوم نے خدا سے عہد کر کے پاکستان لیا تھا لیکن یہ باتیں اور اس رسالہ میں لکھی ہوئی آیات و مسائل اور سارے پُر جوش مضامین اسی ساعت تک کے لئے تھے جب تک پاکستان نہ ملا تھا۔ اس کے بعد آپ کی لکھی ہوئی کونسی بات یہاں پوری ہوئی۔ کس دن اسلامی قانون نافذ ہوا؟ اب تک کب وہ مبارک ساعت آئی ہے جس میں کہا جائے کہ ایک گھنٹہ کے لئے بھی اسلامی نظام نافذ ہوا ہو۔

آخر میں صاحب مضمون نے یہ آیت لکھی ہے اور کہا ہے کہ اسلام تو ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض مسلمانوں کی اپنی حکومت قرار دیتا ہے۔

اللہ تم میں سے ان لوگوں
سے جو ایمان لائے اور وہ
اعمال صالحہ کرتے ہیں یہ وعدہ
کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اس
دنیا میں حکومت عطا فرمائیگا۔

لیکن یہ باتیں صرف ووٹ کیلئے تھیں عمل صالح نہ انفرادی طور پر کیا نہ اجتماعی طور پر نہ حکومتی سطح پر۔ آخر کار یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہماری دعاؤں اور وعدوں پر ہی حکومت بخش دی تو ہم اسے سنبھال بھی نہ سکے۔ (چہ جائیکہ مزید ترقی کرتے) اور ملک دولخت کر کے بیٹھ گئے اور اب بھی یہی شعار بنا رکھا ہے بس باتیں بنانی آسان ہیں اور عمل مشکل کام ہے۔

مقالہ نگار اور ان کے ہم طبع لوگ اس آیت سے غافل ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خود اس آیت کے مصداق ہوں۔

ہرگز یہ نہ سمجھو کہ جو لوگ
اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں

اور چاہتے ہیں کہ بغیر کیے
انکی تعریف ہو تو ایسوں کو
ہرگز نہ سمجھو کہ عذاب سے
چھوٹ گئے۔ اور ان کے
لئے دردناک عذاب ہے۔

مولانا مدنی اور علامہ مرحوم کا معاملہ تو صاف ہوگیا تھا مگر شر پسند پھر ابھارتے رہے۔ یہ رسالہ کیا ہے۔ خدا اور روز قیامت اس کے سامنے پیش ہونے سے بےخوفی کا اعلیٰ مظاہرہ ہے۔ جھوٹ اور اتہام کا ایک پلندہ ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اسے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی میں کوئی کمی نظر نہیں آئی اور سچی بات گرفت کرنے کیلئے نہیں مل سکی تو مجبوراً اتہامات کی بوچھاڑ کردی۔

متحدہ قومیت کا انتہائی ناپاک خاکہ جس کے ذیل میں اکبر کے دین الٰہی کا بھی ذکر ہے۔ اسلام دشمنی کی انتہا۔ جداگانہ اسلامی تعلیم کی عداوت۔ قرآن فہمی کا یاس انگیز مظاہرہ۔ متحدہ قومیت اور اسوۂ خلیل (جس میں مولانا پر اسوۂ خلیل علیہ السلام کی مخالفت کا الزام ہے) متحدہ قومیت کا غیر قرآنی تصور، غیر مسلموں سے موالات کے ذیل میں موالات کی ایسی تشریح جو حرام اور کفر ہے۔ یہ مسموم عنوانات، تشریحات سب کی نسبت حضرت مدنی کی طرف کرنا مقالہ نگار کا کتنا ظلم ہے! یہ حرام باتیں خود ہی لکھ رہا ہے اور نسبت مولانا مدنی کی طرف کر رہا ہے۔

اس کا یہ عمل اس آیت کی وعید کے قریب ہے۔

اور جو کوئی خطا کرے یا گناہ
پھر کسی بے گناہ پر تہمت
لگادے تو اس نے مزور
بہتان اور کھلا گناہ اٹھایا۔

غلط بات سے عظیم نقصان کا احتمال

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا اس کا انکار کیا ہے۔ اجلاس جونپور کے خطبۂ صدارت میں گزر چکا ہے اس سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہونے کا امکان ہے کہ کل کو کوئی خودغرض حضرت مدنی کے نام سے اپنی مقصد برآری کیلئے اسے شرعی مسئلہ اور ایک عالم کی رائے بنا کر نفع اٹھا سکتا ہے جیسے کمیونسٹ حضرت ابوذر غفاریؓ کا نام استعمال کر لیتے ہیں اور اپنے مقصد کی حد تک اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک منظر سامنے ہے۔ اس بات کے انتساب کی نفی ضروری ہے۔ ورنہ کسی بھی ملک کا خودغرض حکمران اپنے اختیارات کے باعث خصوصاً غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مقالہ نگار کو تو اعتراض سے غرض بھی عواقب سے نہیں۔ مگر ہمیں سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً جی ایم سید کا تازہ بیان جو روزنامہ "جسارت" کراچی مورخہ ۳۰ مارچ ۸۷ء میں صہ پر شائع ہوا ہے انہوں نے اسی ناجائز "متحدہ قومیت" پر زور دیا ہے۔

حضرت مدنیؒ نے اکبر کے دین الٰہی کا کسی تقریر و تحریر یا نجی مجلس میں نام بھی نہیں لیا۔ آپ ان پر الزام لگاتے ہیں محض اپنے خیال سے۔ البتہ قائداعظم نے فرمایا ہے اور بہت واضح الفاظ میں آگے بڑھ گئے ہیں۔ طلوع اسلام والے اور درباری حضرات دیکھیں۔

شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کیساتھ
جو خیر سگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا۔
وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کی ابتداء
آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے
رسولؐ نے کردی تھی۔ انہوں نے زبان
سے ہی نہیں بلکہ عمل سے بھی یہود و نصاریٰ
پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا
سلوک کیا۔ ان کیساتھ رواداری برتی
اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمان
جہاں کہیں بھی حکمران رہے ایسے ہی
رہے۔ ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ
ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت
اصولوں کی مثالوں سے بھری پڑی
ہوگی جس کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہیئے۔
مجلس دستور ساز میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
کو لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے
جواب میں۔

نیز انہوں نے اسی تاریخ کو مجلس دستور ساز سے
خطاب کیا۔

آپ آزاد ہیں اپنے مندروں مسجدوں
اور دوسری عبادت گاہوں میں جانے
کیلئے آپ پاکستان کی مملکت میں بالکل
آزاد ہیں۔ آپ کسی مذہب، فرقہ، عقیدہ
سے تعلق رکھیں۔ اس کا کاروبار سلطنت
سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

خطاب قائد اعظم رئیس احمد جعفری مقبول اکیڈمی
چوک انارکلی لاہور ص ۵۴۶ ۔ ۵۰۰

اسلامی تعلیمات میں وسعت کہاں تک ہے

محترما! اسلام کی جامعیت کا تقاضا ہے کہ اس میں
وہ مسائل بھی ہوں جنہیں ایک مسلم اور غیر مسلم کی معاشرت
کے بارے میں وضاحت ہو۔ خود حکومت اسلامیہ میں غیر
مسلم ہوں تو ان کے کیا حقوق شریعت نے بتلائے ہیں
اور اگر غیر مسلم حکومت سے واسطہ پڑے تو کیا معاہدہ ہو
سکتا ہے اور کیا نہیں؟ کیونکہ دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا
تو مختلف النوع کافروں سے معاہدوں کی اجازت ہوگی
اگر یہ کہا جائے کہ اجازت نہیں ہے تو برطانیہ، فرانس،
امریکہ، چین اور سری لنکا کسی سے بھی ہمارے معاہدے
نہیں ہوسکتے اور یہ ناممکن ہے۔ فرانس سے ہمارا ایٹمی
ری ایکٹر کا معاہدہ ہوا ہے۔ سری لنکا سے ہم نے مشرقی
پاکستان کیلئے راستہ لیا تھا۔ یہ بھی معاہدے ہیں۔ اگر
یہ معاہدے شرعاً جائز ہیں تو وہ کہاں لکھے ہیں۔ کہاں تک
ان میں گنجائش ہے اور کہاں تک نہیں۔ یہ چیزیں
بھی حضرت مدنی نے تحریر فرمائی ہیں اور ان کی ضرورت
اہمیت ایک مثال سے سمجھ لیجئے۔ جب آپ ان ملکی
مسائل میں اسلام کی طرف رجوع کریں گے تو حضرت مدنیؒ
کی تحریر کام آئے گی لیکن آپ سب طرف نظر دوڑا لیجئے
کہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر آپ مولانا پر معترض نہ رہیں گے۔
کیونکہ دوسرے حضرات حدود شرعیہ سے بھی آگے
بڑھتے رہے ہیں۔

(الف) مثلاً اگست ۱۹۴۵ء سے قائداعظم کے بیانات
اس قسم کے شائع ہوتے رہے ہیں کہ پاکستان میں
جمہوری حکومت ہوگی، کیونکہ آسام، بنگال اور پنجاب
میں غیر مسلم کم و بیش ۴۵ فیصد تھے۔ انہیں مطمئن کرنا
ضروری تھا۔ ڈان میں یہ شائع ہوتے رہے ہیں۔

(ب) جب انہوں نے پاکستان کی سب سے پہلی کابینہ
بنائی تو ایک وزیر اسی ہندو قوم کا رکھا جس سے شدید
اختلاف تھا۔ اس کا نام مسٹر جوگندر ناتھ منڈل تھا۔ وزیر
خارجہ ظفر اللہ کو بنایا گیا جو ایسے متشدد قادیانی تھے کہ
انہوں نے قائداعظم کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔
پاکستان کے چیف جسٹس ایک عیسائی "کارنیلیس" تھے
نیز فوج تک میں عیسائی کمانڈر انچیف اور ملازم رکھے
جاتے رہے ہیں۔

(ج) انہوں نے ۱۱ اگست کے لئے ایک خطاب ترتیب
دیا جس میں انہوں نے فرمایا۔

اب تم سب آزاد ہو اور پاکستان میں
تمہیں اس بات کی پوری آزادی ہے کہ
اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری
عبادت گاہوں میں جا کر اپنے اپنے
عقیدے کے مطابق عبادت کرو۔ ہمارا
یہ بنیادی اصول ہے کہ ہم سب
ایک مملکت کے شہری اور مساوی
حقوق کے مالک ہیں۔ یہ اصول مذہب
معتقدات اور ذات پات کے امتیاز
سے بالاتر ہے۔ اگر ہم سب اس اصول
کو اپنا معیار بنا لیں تو مجھے یقین ہے
کہ کچھ عرصے بعد نہ ہندو، ہندو رہیں
گے نہ مسلمان، مسلمان۔ اس سے میرا
مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اپنے اپنے
مذہب پر قائم نہ رہیں گے۔ مطلب یہ
ہے کہ سیاسی اعتبار سے اور پاکستان
کے شہری ہونے کی حیثیت سے سب
برابر ہوں گے۔ جہاں تک مذہب کا
تعلق ہے یہ ہر فرد کے ذاتی اعتقاد
کا معاملہ ہے۔"

محمد علی جناح ص ۲۹۶۔ ناشر مرکزی اردو بورڈ لاہور

رازی کے اس جاہلانہ مضمون کی رو سے تو قائداعظم
پر نص قرآنی سے فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ ۱۱ اگست کو ہی
فرقہ بندی کا اعلان کرتے اور اسے خوب ہوا دیتے اور جب
وہ مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے
تھا۔ مضمون نگار نے اس پر زور دینے کیلئے چار ورق سیاہ
کئے ہیں اور اسوۂ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی رو سے
بھی بقول مضمون نگار قائداعظم کا فرض تھا۔ وہ یہ اعلان
کرتے۔ " اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عداوت
اور بغض ظاہر ہے۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔"
مضمون نگار نے جو کچھ حضرت مدنی کے بارے میں
لکھا وہ ہی مذکورہ کارروائیوں پر چسپاں ہوتا ہے۔
مضمون نگار نے اگر قائداعظم کو سمجھایا تھا اور حق تبلیغ
ادا کیا تھا تو ہمیں جان کر خوشی ہوگی۔ قائداعظم کی "ب" کی
کارروائی اور "ج" کی تقریر کے بارے میں جب آپ

شرعی احکام تلاش کرنے چاہیں کہ کونسی کارروائی شرعی ہوئی اور کونسی غیر شرعی تو آپ کو مولانا کے اس رسالہ کی قدر و منزلت معلوم ہوگی ۔ اس میں دارالاسلام اور دارالحرب میں کافروں کیساتھ حدود معاملات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ الفاظ وہی استعمال کئے گئے ہیں جو قرآن پاک اور حدیث میں وارد ہوئے ہیں اور احکام اسلامی سے سر مو تجاوز نہیں کیا گیا ۔

معاملات اور معاہدوں میں زبان کی پابندی کا اسلام میں حکم

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ شریعت مطہرہ کی نظر میں ایک مسلمان اور کافر کی گفتگو کو بھی ذمہ داری سے خالی نہیں جانے دیا گیا ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ تحریر و دستخط شرط ہوں ۔

بخاری شریف میں آتا ہے کہ الخ...

یعنی اگر باقاعدہ معاہدہ یا فتحیابی سے پہلے کوئی مسلمان کسی کافر حربی سے یہ کہتا ہے کہ "ڈرو مت" تو وہ امن میں ہوگا ۔ اسے اب قتل کرنا بدعہدی ہوگا ۔

آجکل ہمارا تصور فقط اس بات کو معاہدہ کا درجہ دیتا ہے ۔ جو تحریر ہوا اور دستخط ہو گئے ہوں، اخلاقی اقدار کے انحطاط نے زبان کی پابندی سے بالکل آزاد کر دیا ہے ۔ حالانکہ وہ مذہباً لازمی ہوتی ہے اور عہد کا درجہ رکھتی ہے ۔ دراصل ہم علم دین سے اس قدر بے بہرہ رہتے ہیں کہ ہمیں دین کی معلومات بھی جب پہنچائی جائیں تو وہ اجنبی لگتی ہیں ۔

حضرت مدنیؒ کا مختصر تعارف

از محترمی ابرار عزیز

پر مبنی مضمون کے خدوخال ظاہر کرنے کے بعد یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خود حضرت مدنی رحمۃ اللہ کی شخصیت کے بارے میں چند باتیں جاننی ضروری ہیں ۔ ان کا علمی مقام یہ تھا کہ اب سے ۷۵ سال پہلے وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور ۵۷ تک ۳۳ سال اسی منصب پر فائز رہے ۔

(۲) دارالعلوم دیوبند مذہبی تعلیمات کا ایشیا بھر میں سب سے بڑا ادارہ تھا اور آج تک بھی وہ سب سے بڑا ادارہ ہے اور اس نقطۂ نظر سے کہ وہاں خالص علم دین ہی کی بصیرت پر دقیق علمی انداز میں تعلیم ہوتی ہے ۔ وہ پوری دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور وہاں طلبہ کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ اور استعداد سب سے اعلیٰ ہوتی ہے ۔ وہاں لایعنی ابحاث سبق میں نہیں آتیں ۔ دیوبندی، بریلوی کی بحث ہم نے وہاں نہیں دیکھی ۔ اسی لئے بریلوی لوگ بھی وہاں پڑھتے رہے ہیں ۔

(۳) حضرت مدنی سے ابتدائی زمانہ میں فیض پانے والے حضرات کی عمر اس وقت تقریباً ۷۲ سال ضرور ہو گی اور آخری دور میں پڑھنے والوں کی عمر چالیس سال ضرور ہوگی ۔ یہ سب تجربہ کار اساتذہ ہوں گے ۔

(۴) پاکستان، ہندوستان، بنگلادیش کے بڑے مدارس میں بہت کم ایسے مدرسے ہوں گے جہاں ان سے پڑھے ہوئے نہ ہوں ۔ بریلوی مدارس میں بھی ان کے شاگرد ملیں گے ۔ دیکھئے جائزہ مدارس عربیہ حافظ نذر احمد ۔

(۵) یہ تو فقط وہ ہیں جنہوں نے ان سے براہِ راست اکتسابِ فیوض کیا اور ان کے شاگردوں کے شاگرد اور ان کے شاگرد چپہ چپہ پر ہیں۔ تینوں ممالک میں یہی حال ہے۔

(۶) ان کے شاگردوں میں ایسے بھی ہیں جو شروع ہی سے مسلم لیگ میں رہے ہیں جیسے مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ کے اخلاص، للّٰہیت اور تقویٰ کے بارے میں دل سے معترف نہ ہو بلکہ زبان سے بھی اظہار نہ کرتا ہو۔

آپ کے اس مضمون سے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جسے دکھ نہ پہنچا ہو۔

(۷) وہ اپنی دینی استقامت و مجاہدات کی وجہ سے ہر شخص کو عزیز تھے اور تمام اکابر وقت کو بھی جنہیں حضرت اقدس مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ بھی ہیں مثلاً انہوں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو تحریر فرمایا:

(۱) کوئی مضمون دینی بدوں ملاحظہ مولانا حسین احمد صاحب کے شائع نہ کیا جائے۔ (حکیم الامت ص۱۰۳)

(۲) ایسی تحقیقات کیلئے مولانا حسین احمد صاحب و مولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں (حکیم الامت ص۱۳۳)

(۳) اقبال سہیل صاحب نے حضرت مدنی کو خوش آمدید کہنے کے لئے ایک نظم لکھی۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اسے پسند فرمایا اور فرمایا "ذاتی نفیس ہے اور لطف یہ کہ سلیس ہے، گویا سہل ممتنع ہے، میں نے نقل کرلی"۔ (حکیم الامت ص۱۴۰)

عبدالماجد دریابادی نے لکھا "صحیح زبان میں اتنی صحیح مدح صحیح موقع پر صحیح شخص کیلئے شاعری کے عالم میں بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ اللہ مادح کو جزائے خیر دے اور ممدوح کی عمر میں برکت نصیب فرمائے"۔ (صدق ۲۰ مئی ۱۹۴۳ء)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظم نقل کردی جائے۔

وہ یہ ہے: ؎

اے سایہ ات بالِ ہما خوش آمدی خوش آمدی
اہلاً و سہلاً مرحبا خوش آمدی خوش آمدی
اے شمعِ ایوانِ حرم، اے سروِ بستانِ حکم
اے خضرِ اربابِ ہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی
اے خازنِ اسرارِ حق، اے مہبطِ انوارِ حق
اے حق پسند و حق نما خوش آمدی خوش آمدی
سرگروہِ اربابِ دیں سردفترِ اہلِ یقین
سرچشمۂ صدق و صفا خوش آمدی خوش آمدی
اے مستشارِ مؤتمن اے مقتدائے ممتحن
اے با دلِ درد آشنا خوش آمدی خوش آمدی
اے قاسمِ فیضِ کہن اے ظلِ محمود الحسن
اے یادگارِ اتقیا خوش آمدی خوش آمدی
اے یوسفِ کنعانِ ما بادا فدایت جانِ ما
ہاں اسیرِ مالٹا خوش آمدی خوش آمدی
اے رایتِ فتحِ مبیں، اے آیتِ علم و یقیں
اے شمعِ جمعِ اصفیا خوش آمدی خوش آمدی

کے بارے میں جس شخص نے کہا ہے ؎

یہی ہیں جنکے سونے کی فضیلت ہے عبادت پر
انہی کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہی کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہی کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزا آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخندانی

بالکل صحیح کہا ہے۔

(موت کی یاد" مرتب ناشر شاہین ٹریڈنگ کمپنی کمرہ نمبر ۱۲ شمس چیمبر - فریدر روڈ کراچی)

یہ نظم مولانا محمد یحییٰ صاحب اعظمی نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق "نوائے حیات" میں "ایک عالم ربانی کی اسارت" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں :

وہ جس کی زندگانی کا شرف ہو اسوۂ یوسف
اسے ہوگی بھلا کیا جنِ زنداں سے پریشانی
پرستارانِ حق گھبرائیں کیوں اس یوسفستاں سے
یہ زنداں نور رہا ہے جلوہ گاہ ماہ کنعانی
مبارک سرفروشانِ عیش کو کاشانۂ راحت
مجاہد کیلئے زیبا نہیں ذوقِ تن آسانی

حقیقت میں یہ شانِ زندگ...
شعار اس کا بزرگانِ سلف...
جہاد اسکا نہیں پابند قید...
جدا ہے رسم و راہ مخالف...
زمانہ سے الگ ہے اس کا آئی...
اس نظم کے یہ اشعار حاش...
صفحہ ۲۴۴ میں ہیں۔
۱۹۳۶ء میں سنبھل ضـ...
اپنا واقعہ سنایا کہ
میں جب کراچی جـ...
آیا تو بنگال کونسل...
مجھ سے کہا کہ چالیس...
نقد اور ڈھاکہ یونیور...
روپے ماہانہ پر دیـ...
ہے۔ آپ اس کو...
نے کہا کہ کام کیا کر...
نے فرمایا "کچھ نہیں...
میں خاموش رہا...
کہ "حضرت شیخ...
لگا گئے ہیں...
نوٹ :- یہ سنہ ۲۳ کی...
کے لئے ملازمت کا کوئی...

اے کنز* اخبار نبی، مقبول سرکار نبی
اے پرتو شمع حرا خوش آمدی خوش آمدی
اے نازش خاک وطن، اے مرجع ارباب فن
اے درد دلہا را دوا خوش آمدی خوش آمدی
آئینۂ فیض ازل، گنجینۂ علم و عمل
تصویر تسلیم و رضا خوش آمدی خوش آمدی
از مقدمت دل شاد شد، ویرانہ ام آباد شد
اے بر تو جان من صد فدا خوش آمدی خوش آمدی
دلہا بہ اقدام تو، در در زبانہا نام تو!
آید ز ہر سو ایں صدا خوش آمدی خوش آمدی
ایں گلشن علم و ہنر شد از قدومت مفتخر
گوید ہمیں نور الہدیٰ خوش آمدی خوش آمدی
(مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم ص۳۰۰)

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق کا وفات تک یہی حال رہا ہے۔ حضرت کی حیات میں آخری بار جب حضرت مدنی جیل گئے تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی طبیعت پر اثر ہوا۔ انہوں نے فرمایا: "مجھے خیال نہیں تھا کہ مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے۔" اور جب حاضرین مجلس میں سے کسی خادم نے عرض کیا کہ مولانا مدنی تو اپنی خوشی سے گرفتار ہوئے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا "آپ مجھے اس جملہ سے تسلی دینا چاہتے ہیں۔ کیا حضرت حسینؓ یزید کے مقابلہ میں اپنی خوشی سے نہیں گئے تھے مگر آج تک کون ایسا شخص ہوگا جس کو اس حادثہ سے رنج نہ ہوا ہو۔" (بروایت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم۔ واقعات ص۲۲۹ و ص۲۳۰)

ایک دفعہ ارشاد فرمایا: "مولانا حسین احمد کی لعنت کرنے والوں کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔" (بروایت ابوالمجالس حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ واقعات ص۲۱۲)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تاحیات ان کی اسی قدر تعظیم کرتے رہے ہیں جس کے وہ اہل تھے۔ دیکھیں مولانا مدنی کی خود نوشت "نقش حیات" ص۱۱۷ جلد اول اور مکتوبات شیخ الاسلام میں متعدد مکاتیب میں خصوصاً ص۳۰۰ مکتوب ۱۱۹ جلد دوم۔

* اشعار پر خیال آیا کہ اس وقت کے سب سے بڑے اور معروف بزرگ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم (مہاجر مدینہ منورہ) تحریر فرماتے ہیں:

> میرے اکابر محض خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقع ہے اور جو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، حضورؐ کے معمولات ارشادات کا واقف ہوگا اور چند روز ان اکابر کی مجالس میں شرکت کر چکا ہو گا۔ وہ خود محسوس کرے گا کہ ان اکابر اہل اللہ مراتبہم کو اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے اتباع سنت کا وافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ ان کے ارشادات بھی جواہر پارے ہوتے ہیں اور ان کا سکوت موجب ترقیات باطنی ہے۔ ان

کے بارے میں جس شخص نے کہا ہے ؎

یہی ہیں جنکے سونے کی عبادت پر
انہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہی کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہی کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزا آئے
اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخندانی

بالکل صحیح کہا ہے :

(موت کی یاد ص۳۲ ناشر شاہین ٹریڈنگ کمپنی کمرہ ۱۲ شمس چیمبر۔ فرید روڈ کراچی)

یہ نظم مولانا محمد یحییٰ صاحب اعظمی نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق "نوائے حیات میں ایک عالم ربانی کی اسارت" کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں :

وہ جس کی زندگانی کا شرف ہو اسوۂ یوسف
اسے ہوگی بھلا کیا حبس و زنداں سے پریشانی
پرستاران حق گھبرائیں کیوں اس یوسفستاں سے
یہ زنداں نور رہا ہے جلوہ گاہ ماہ کنعانی
مبارک سرنوشتان عیش کو کاشانۂ راحت
مجاہد کیلئے زیبا نہیں ذوق تن آسانی
وہ جس کی خلوت شب کی بدولت اب بھی تازہ ہے
گداز بوذر و عشق اویس و سوز سلمانی
صحابہ کی حیات پاک کو اس نے نہیں جانا
حقیقت میں یہ شان زندگی جس نے نہ پہچانی
شعار اس کا بزرگان سلف کا زہد و تقویٰ ہے
جہاد اسکا نہیں پابند قید سبحہ گردانی!
جدا ہے رسم و راہ خانقاہی سے
زمانہ سے الگ ہے اس کا آئین خدا دانی

اس نظم کے یہ اشعار حاشیہ مکتوب شیخ الاسلام جلد اول ص۲۷۷ میں ہیں۔

۱۹۳۶ء میں سنبھل ضلع مراد آباد میں آپ نے اپنا واقعہ سنایا کہ

میں جب کراچی جیل سے رہا ہو کر آیا تو بنگال کونسل کے ایک ممبر نے مجھ سے کہا کہ چالیس ہزار روپے نقد اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں پانچ سو روپے ماہانہ پروفیسری آپ کیلئے ہے۔ آپ اس کو منظور فرمالیں۔ میں نے کہا کہ کام کیا کرنا ہوگا؟ ممبر صاحب نے فرمایا، "کچھ نہیں صرف تحریکات میں خاموش رہیں"۔ میں نے جواب دیا کہ "حضرت شیخ الہند جس راستے پر لگا گئے ہیں میں اس سے ہٹ نہیں سکتا"۔

نوٹ :- یہ ۱۹۲۳ء کی بات تھی۔ اس وقت حضرت کے لئے ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد ڈیڑھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر آپ سلہٹ تشریف لے گئے۔

("واقعات" ص۹۹، ۱۰۱)

(۸) اگر ان میں کسی درجہ میں بھی جاہ طلبی خود غرضی ہوتی تو اسارت مالٹا ہی کے زمانہ میں وہ بڑے مناصب پر لگ سکتے تھے جس زمانہ میں لوگوں کی چار پانچ روپے ماہانہ تنخواہ ہوتی تھی انہیں چالیس ہزار روپے نقد اور پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ کی پیش کش کی گئی۔

اس سے چند سال بعد انہیں جامعۃ الازہر میں شیخ الحدیث بنانے کی حکومت مصر کیطرف سے پیش کش آئی، پندرہ سو روپے تنخواہ، رہائش اور کار بذمہ حکومت ہوگی۔ (واقعات صد۱۲ مرتبہ ابوالحسن بارہ بنکی شائع کردہ مکتبہ دینیہ دیوبند) مگر انہوں نے کوئی پیشکش قبول نہیں کی۔ ان کے پیش نظر اسلام کی سربلندی تھی۔ برطانیہ نے تمام مسلم ممالک پر تسلط جما رکھا تھا اور اس کی طاقت کا سرچشمہ سرزمین ہند تھی۔ وہ اس جگہ سے اسے ہٹانا ضروری سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ اگر انگریز کے یہاں سے قدم اکھڑ گئے تو سب عرب ممالک بھی آزاد ہو جائیں گے۔ جو سب کے سب مسلم ممالک ہیں۔ آپ ان کے مکتوبات جو چار جلدوں میں ہیں اور نقش حیات ملاحظہ فرمائیں جس میں انہوں نے یہ سب کچھ تحریر فرمایا ہے۔

اسی بنیاد پر انہوں نے انگریز کی فوج میں بھرتی کی حرمت کا فتوےٰ دیا جو بغاوت اور بغاوت پر آمادہ کرنے کا درجہ رکھتا تھا۔ کراچی میں مقدمہ چلا اور سزایاب ہوئے اور آپ پڑھتے آئے ہوں گے

(۹) برطانیہ عظمیٰ کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد مولانا کو بھارت کی حکومت نے سب سے بڑا اعزازی خطاب دیا جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بعد میں نہ وزارت لی نہ وزراء ممالک سے ملاقاتیں جاری رکھیں اگرچہ دیوبند میں صدر جمہوریہ اور مرکزی وزراء وغیرہ آتے رہے ہیں لیکن مولانا نے ان سے قطعاً مراسم نہیں بڑھائے۔

یہ سب وہ باتیں ہیں جو ان کی بے لوثی کے روشن اور دستاویزی ثبوت ہیں اور سب جانتے ہیں۔

(۱۰) ان کی زندگی ایک کھلا ورق تھی۔ کثرت عبادت و ریاضت سیاست کے تند بد اور ہنگامی دور میں قائم رہی اور بعد میں بھی۔ غرض اس باب میں وہ ہمیشہ عزیمت پر عمل پیرا رہے۔

(۱۱) ان کے ماننے والوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، حساب نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ ایسی شخصیت کیطرف لوگوں کا رجوع بے حساب ہوتا ہے۔

تاریخ میں ایسی مثال اگر تلاش کریں کہ بیک وقت پانچ ہزار تا آٹھ ہزار لوگ لاؤڈ اسپیکر سے کسی سے بیعت ہوئے ہوں تو شاید ان کی مثال ملے گی اور یہ تاریخ تصوف کا سب سے پہلا واقعہ ہوگا۔ حوالے کیلئے دیکھیں انفاس قدسیہ صد۲۲۸ مؤلفہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب شائع کردہ مدینہ بک ایجنسی بجنور۔

ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ انکی تحریرات کا مطالعہ کریں تو کسی بھی چیز میں غلط نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے۔

(۱۲) بایں ہمہ وہ تمام اہل مسائل میں جو موقف اختیار کرتے تھے وہ شوریٰ سے طے کیا جاتا تھا، اس

لئے وہ انفرادی غلطیوں سے ہمیشہ ہی بچے رہے ہیں۔

حضرت مدنی اور مملکت پاکستان (۱۳) ان کی بے لوثی

کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے اپنے متعلقین کو پاکستان کے استحکام وترقی کیلئے کام کرنے کی تلقین کی ہے حتیٰ کہ انہوں نے پاکستان کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ "مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر جلد ۴۳ بروز ہفتہ ۲۵ رجب ۷۷ھ۔ ۱۵ر فروری ۵۸ ص۷ کالم ۱۔)

مولانا مدنی کا فارمولا اور پاکستان کا فارمولا

(۱۴) لہٰذا اس مسئلہ میں بھی یہ بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ انہوں نے مملکت پاکستان کی مخالفت کی ہے نہ کمزوری چاہی ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت برصغیر آزاد ہو رہا تھا تو مسلمانوں کیلئے فلاحی خاکے ہر ایک نے پیش کئے انہوں نے (جمعیت علماء ہند نے) بھی اپنا فارمولا پبلک کے سامنے پیش کیا اور پاکستانی فارمولا پر ان کا صرف اسی قدر اعتراض تھا کہ یہ پورے ہندوستان میں آباد کل مسلمانوں کا حل نہیں ہے۔ ہندوستان کے باقی صوبوں میں تین کروڑ انتیس لاکھ مسلمان ہندوؤں کی اکثریت کے رحم وکرم پر رہ جائیں گے (یہ تعداد تو اس صورت میں تھی کہ اگر صوبہ آسام پورا بنگال اور کشمیر کے مسلمان ملاکر پانچ کروڑ مسلمان بنتے ہیں جو اکثریت کے رحم وکرم پر ہیں۔)

یہ اعداد وشمار سینسس آف انڈیا ۱۹۴۱ء ص۹۸، ۹۹ حصہ اوّل جلد اوّل مرتبہ ایم۔ ڈبلیو۔ ایم یائیس سی آئی اے۔ آئی۔ سی۔ ایس سینسس کمشنر آف انڈیا سے لے کر انہوں نے تحریر فرمائے ہیں۔

اس وقت عظیم پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ اکیانوے لاکھ بنتی تھیں)

مولانا کی تحریر کشف حقیقت ص۱۸، ۱۹ ملاحظہ فرمائیں یہ رسالہ مرکزی دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ایسا حل تجویز کیا جائے جسمیں سب مسلمانوں کو تحفظ حاصل ہو۔

قائداعظم نے جولائی ۴۴ء کانپور میں اسٹوڈینٹ فیڈریشن کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا "میں مسلم اکثریت کے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی آزادی کی خاطر مسلم اقلیت والے صوبوں کے ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو قربان کر کے ان کے مراسم تجہیز وتکفین ادا کرنے کو تیار ہوں"۔ اس لئے ان حضرات نے قائداعظم کے سامنے مصدقہ اعداد وشمار رکھے کہ اگر جوش تقریر میں یہ اعداد وشمار زبان سے نکل گئے ہیں تب تو اور بات ہے لیکن اگر اعداد وشمار پوری توجہ سے جمع نہیں کئے گئے تو اس طرف توجہ دلائی جانی ضروری ہے۔ (درحقیقت صحیح اعداد یہی تھے جو مولانا نے پیش کئے کیونکہ اب ہندوستان میں تعصب کے باوجود حکومت آٹھ کروڑ تسلیم کرتی ہے اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہم بارہ کروڑ ہیں)

نیز قائدِ اعظم نے ۱۹۴۵ء سے جمہوریت کے حق
میں بیان دینا شروع کیا تھا۔ ماہِ نومبر ۴۵ء میں نمائندہ
نیوز کرانیکل کو بیان دیا کہ پاکستان ایسی جمہوری حکومت
ہوگی کہ اس کی مجلس قانون ساز میں بلا لحاظ مذہب
سب شریک ہوں گے۔

۸ر نومبر کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ
کو جمہوریت ہی کے بارے میں بیان دیا جو بہت مفصل ہے،
اس میں یہ بھی ہے کہ پاکستان کے تمام ہندو مسلم سکھ
عیسائی ایک قوم کے اصول پر ترقی کریں گے۔

یہ بیان ۷ دفعات پر مشتمل ہے۔ ۱۰ر نومبر ۴۵ء کو
ڈان میں طبع ہوا ہے۔ اسی حوالہ سے ۱۷ر نومبر ۴۵ء کو
اردو کے معروف اخبار مدینہ بجنور میں شائع ہوا ہے۔

مذکورہ صورت میں جمہوریت سے پاکستان میں بھی
مسلمان کا نفع کلی طور پر مخدوش ہو جاتا تھا کیونکہ بنگال
آسام اور پورے پنجاب سمیت عظیم پاکستان میں ساڑھے
پچپن فیصد مسلمان تھے اور ساڑھے چوالیس فیصد غیر مسلم
غیر مسلموں کا اتنا بڑا تناسب بیٹھا تھا۔ یہ جب چاہتے
"ڈیڈلاک" کی کیفیت پیدا کر سکتے۔ ادھر ہندوستان
(بھارت) میں مسلمان صرف گیارہ فیصد رہ جاتے تھے
جو بالکل غیر محفوظ غیر مؤثر، نہایت کمزور اقلیت ہوتے۔

مولانا شاہ محمد الفاروقی سجادہ نشین دائرہ حضرت شاہ حجۃ اللہ
صاحب الہ آباد اپنے خطبۂ صدارت میں جو جمعیت علماء صوبہ
آگرہ کے اجلاس میں بمقام مراد آباد ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ر مئی
۱۹۳۹ء بمطابق ۶، ۷، ۸، ۹ر ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ کو
شاہی برقی پریس مراد آباد میں طبع ہو کر پڑھا گیا، لکھتے ہیں

تحریک پاکستان ہمارے درد کا درماں نہیں
یہ تحریک تو پنجاب، سندھ، بلوچستان
اور سرحد کے علاوہ دیگر حصص ہند کو
نظرانداز کرتی ہے حالانکہ اصل مسئلہ
تو ان مسلمانوں کا ہے جو تعداد کے
لحاظ سے اپنے صوبوں میں اقلیت میں
ہیں۔ اکثریت والے صوبے اگر زندہ اور
وفاقِ ہند کے اجزا رہیں تو ہمارے حق
میں مؤثر ہو سکتے ہیں۔ علیحدگی کی صورت
میں تو افغانستان و ایران کی طرح بے
اثر ہوں گے۔

(خطبۂ صدارت ص۱۱۔)

لہٰذا ان حضرات نے ہندوستان کے کل مسلمانوں
کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے ان کی فلاح و بہبود دیا تھا
اس صورت میں سمجھی تھی کہ صوبائی خودمختاری طے ہو اور
مسلم اقلیت والے صوبوں میں مذہبی امور میں مسلمانوں کو
حق استرداد حاصل ہو، وغیرہ۔ ان کی سیاست مثبت بھی
مدلل بھی، منفی اور سلبی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی تحریر
کشف حقیقت میں دونوں فارمولوں پر بحث و تجسس اور
موازنہ کرلے کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی صدر جمعیۃ علماء
اسلام کو لکھا کہ:

اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح طریق کار یہ ہے
کہ مسلمانوں اور مسلم جماعتوں کے نمایاں
اصحاب رائے اور صاحب الرائے حضرات
مجتمع ہوں اور موجودہ صورت حال کا

جائزہ لے کر کھلے دل و دماغ کے
ساتھ یہ سوچیں اور غور کریں کہ ہندوستان
میں مسلمانوں کیلئے باعزت مقام کس
طرح مل سکتا ہے اور اس کے حصول
کیلئے کیا طریق کار ہو؟ بس اگر مسلم لیگ
اس صورت کے لئے آمادہ ہے
تو بسم اللہ ہم سب حاضر ہیں۔ اگر حضرت
مولانا لیگ کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں
تو چشم ما روشن دل ماشاد۔

(کشف حقیقت کا آخری صفحہ)

حضرت مدنیؒ کے متوسلین اور مملکت پاکستان

پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے دیانتاً یہی سمجھا
اور یہی متوسلین کو سمجھایا کہ پاکستان کے استحکام میں
سب کی بھلائی ہے۔ بحمد للہ مولانا مرحوم کے متوسلین میں
سے آپ کو کوئی بھی بھاشانی مجیب اور بھٹو نہیں مل سکتے
اور ایسے لوگ ضرور ملیں گے جو مشعل ہدایت کا کام
دیتے ہیں چاہے وہ سیاسی میدان میں ہوں اور چاہے
وہ علمی اور تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہوں۔

میں یہ بھی گذارش کرنی چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں
یہ الفاظ عام طور پر بولے جانے لگے ہیں۔ ملک دشمن غدار
ملک کی سلامتی خطرہ میں ہے ... ملک دشمن سرگرمیاں
وغیرہ۔ اور یہ الفاظ حکام بھی استعمال کرتے ہیں اور
اخبارات بھی۔ ان کا استعمال ممنوع ہونا چاہیے اور
شاید دنیا کے کسی ملک میں ان الفاظ کا عام استعمال
نہیں ہے، ہمارے یہاں اتنا عام ہے کہ سننے والوں کے
ذہن میں ان کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔

نقطۂ نظر کا بنیادی فرق

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ پورے ہندوستان
میں مسلمانوں کا عمل دخل باقی رکھنے کے قائل تھے۔ وہ
پورے ہندوستان پر پنجہ جمائے رکھنا چاہتے تھے، ان کے
بہت پرانے مضامین میں یہی کچھ ملتا ہے۔ ان کے ایک
مختصر مضمون سے ان کا نقطۂ نظر سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ
تحریر فرماتے ہیں:

ہندوستان کے باشندوں میں صرف مسلمانوں
کا حق ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا قدیمی آبائی
وطن کہیں اور وہ اس میں حق بجانب ہیں۔
ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں صرف
مسلمان ایسی اقوام قدیمہ میں سے ہیں جن کا مذہب
اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی
اولاد ہیں اور انسانی نشو و نما فقط حضرت آدمؑ
سے ہوا ہے یہی قرآن کی تعلیم ہے، باقی اقوام
ہندیہ اس کی قائل نہیں ہیں۔ اسلامی کتابیں
یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان
ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی انہوں نے
سکونت کی اور یہاں ہی سے ان کی نسل دنیا
میں پھیلی۔ اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی
کہا جاتا ہے۔ چنانچہ
میں متعدد روایات اس کے
متعلق مذکور ہیں۔ بائبل میں بھی اس کے متعلق

عہد قدیم میں یہی ذکر کیا گیا ہے۔
تفسیر ابن کثیر جلد اوّل صفحہ ۸ میں ہے:
حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان
میں اترے اور ان کیساتھ
حجر اسود اور ایک مٹھی جنت
کے پتے تھے۔ انہوں نے
اسے بکھیرا تو اس سے خوشبو
کا پودا پیدا ہو گیا تو اصل خوشبو
جو ہندوستان سے لائی جاتی
ہے اسی جنت کے پتوں
کی مٹھی سے پیدا ہوئی ہے
جسے حضرت آدم لے کر اترے تھے۔
یہ انہوں نے جنت چھوڑنے
کے افسوس میں لئے تھے جس
وقت وہ اس سے نکالے
گئے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ
سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام
ہندوستان کی سرزمین دحنا میں
اتارے گئے۔
سبحۃ المرجان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد
کا یہاں پھیلنا اور کھیتی وغیرہ کرنا مذکور ہے۔ بنا بریں
اسلامی روایات اور تعلیمات کیمطابق عہد قدیم سے
ہندوستان مسلمانوں ہی کا آبائی وطن ہو گا۔ جو لوگ
انسانی اور اپنی نسل کو ایسا نہیں مانتے۔ وہ اس طور
کے مستحق نہیں ہیں اور مسلمانوں کیلئے اس کو اپنا

وطن قدیم سمجھنا ضروری ہے۔
بحیثیت مذہب بھی ہندوستان مسلمانوں کا ہی
وطن ہے۔ بسبب تعلیمات اسلامیہ اور تصریحات قرآنیہ
جتنے پیغمبر اور ان کے جانشین دنیا میں ہوئے ہیں۔
سب کا مذہب اسلام ہی تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور
ان کی اولاد بھی اسلام کے پیرو تھے۔
اور لوگ صرف
ایک ہی امت تھے۔
سب لوگ ایک
دین پر تھے۔
اور اس کے بعد جب تفرقے ہوئے تو جہاں بھی
انسانی نسلیں تھیں وہاں پیغمبر اور ان کے سچے جانشین
بھیجے گئے۔
اور ہر قوم کیلئے راہ بتلانے والا ہوا ہے۔
اور کوئی فرقہ نہیں
جسمیں کوئی ڈرسنانے والا نہ گزرا ہو۔ اور سچے پیغمبر اور ان
کے سچے جانشین سب کے سب دینِ اسلام ہی رکھتے تھے
تمھارے لئے دین میں وہی راہ مقرر کر دی جس کا نوح
کو حکم کیا تھا
اللہ کے یہاں دین یہی مسلمانی حکم برادری ہے، وغیرہ
آیات اور احادیث بکثرت اس مضمون پر دلالت کرتی
ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں بھی قبل
زمانہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء آئے
ہوں۔ چنانچہ اولیاء اللہ نے ہندوستان میں مختلف

مقامات پر انبیاء علیہم السلام کی قبریں بطور کشف و الہام اور روحی ملاقات سے معلوم کی ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہما اور دیگر بزرگوں کی تصانیف میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ مگر جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے تحریف وغیرہ کر کے شرک اور کفر وغیرہ اختیار کر لیا۔ اسی طرح ہندوؤں نے بھی اختیار کیا۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاناںؒ اس کی تفصیل اپنے بعض مکتوبات میں پوری طرح فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قدیم زمانہ سے یہ ملک بھی مذہب اسلام کا گہوارہ رہا ہے۔ لہٰذا صحیح اور یقیناً صحیح ہے کہ بحیثیت مذہب ابتداء سے ہی یہ ملک اسلام کا وطن ہے۔

بحیثیت سکونت جسمانی بھی ہندوستان مسلمانوں ہی کا وطن ہے

مسلمانوں کے سوا جو قومیں ہندوستان میں سکونت پذیر چلی آتی ہیں وہ عموماً مُردوں کو جلا ڈالتی ہیں اور ان کی راکھ کو دریا میں بہا دیتی ہیں یا پارسی اپنے مُردوں کو پرندوں کو کھلا دیتے ہیں۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مُردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کی سکونت یہاں ہی رہی زمین میں زندگی میں بھی مثل دیگر اقوام رہی اور مرنے کے بعد بھی ان کی سکونت یہاں ہی رہی۔ ان کی قبریں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت میں ان ہی قبروں سے ان کے مُردے اٹھیں گے اور جو اجزاء جسم کے قبر میں مٹی ہو گئے تھے انہیں اجزاء سے ان کا جسم پھر بنایا جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس سرزمین میں قیامت تک کے لئے ہے۔ بخلاف دوسری جلانے والی یا پرندوں کو کھلانے والی قوموں کے، کہ ان کی سکونت جسمانی صرف دنیاوی زندگی تک کے لئے ہے اور بس۔ اسی وجہ سے ان کے اسلاف کا کوئی نام و نشان کسی جگہ پایا نہیں جاتا اور مسلمانوں کے قبرستان، روضے، قبے، زیارت گاہیں وغیرہ وغیرہ ہر جگہ موجود ہیں اور مسلمان ان کی حفاظت اور عظمت ضروری سمجھتے ہیں۔

بحیثیت تعلقات روحانی ہندوستان مسلمانوں ہی کا وطن ہے

غیر مسلموں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روحیں تناسخ (آواگون) کے ذریعہ سے جزاء اور سزا بھگتتی ہیں، اس لئے وہ کسی دوسرے جون (قالب) میں ڈال دی جاتی ہیں، خواہ وہ انسانی ہو (اگر عمل اچھے تھے) خواہ وہ حیوانی یا نباتاتی یا حشرات الارض وغیرہ کا ہو (اگر عمل خراب تھے) پھر انسان اگر بنایا گیا تو کوئی خصوصیت نہیں کہ وہ ہندوستان ہی میں پھر پیدا ہو۔ افریقہ، امریکہ، یورپ، آسٹریلیا وغیرہ جہاں پر ماتما چاہے اس کو اس کے عمل کے مناسب بھیج دے۔ غرضیکہ مرنے کے ساتھ ہی اس کی روح کا تعلق جسم اور اس کے اجزاء سے بھی بالکلیہ منقطع ہو جاتا ہے۔ نیز اس کے گاؤں، شہر، دیس، قوم، جاتی وغیرہ سب سے منقطع ہو جاتا ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک روح کا تعلق جسم انسانی کے ساتھ صرف ایک دفعہ ہوتا ہے۔ موت کے بعد وہ

برزخ میں محفوظ کر دی جاتی ہے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزا کا کچھ حصہ وہاں بھی حاصل کرتی رہتی ہیں۔ اس کا نہایت ضعیف تعلق اپنے بدن اور اس کے اجزا اور اپنی قبر وطن برادری اولاد وغیرہ سے رہتا ہے۔ یہ تعلق اگرچہ ایک درجہ میں نہیں ہوتا تاہم کسی نہ کسی درجہ میں تفاوت کیساتھ باقی رہتا ہے اور اسی تعلق سے قیامت میں یہ روح اس قبر پر پہنچے گی اور اس کے اجزا سابقہ کا جسم بنے گا اور وہ اس میں حلول کر کے پھر زندگی جسمانی حاصل کر لے گی جس طرح ہم اگر دنیا میں اپنے گھر اور اہل و عیال چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں تو ہمارا تعلق اپنوں اور اپنے گھروں اور بستیوں کیساتھ کچھ نہ کچھ رہتا ہے۔ ایسا ہی یا اس سے زائد تعلق مرنے کے بعد روحوں کو بھی سب سے رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قبروں کی زیارت کرنے اور اصحاب قبور کو سلام کرنے اور ان کو دعا اور ایصال ثواب وغیرہ کرنیکا حکم ہوا۔ نیز حکم ہوا کہ لوگ اپنے اسلاف اور عام مومنین کی قبروں کی زیارت کرتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی پر عبرت کے آنسو بہائیں اور گزرے ہوئے لوگوں کیلئے دعائیں کریں۔

یہ چیز ان مرگھٹوں میں کہاں نصیب ہو سکتی ہے جہاں کی باقیماندہ راکھ کو بھی دریا بہا کر لے گئے اور سمندروں کی نذر کر چکے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر عزیزی پارہ عم میں صفحہ ۵ پر فرماتے ہیں:

فارسی	اردو
نیز در سوختن بآتش تفریق اجزائے بدن میت است	نیز آگ میں جلانے میں میت کے اجزاء کو منتشر کرنا ہے اس
کہ بسبب آں علاقہ روح از	کی وجہ سے روح کا تعلق
بدن انقطاع کلی می پزیرد	بدن سے کلی طور پر منقطع
و آثار ایں عالم بآں کمتر می	ہو جاتا ہے اور اس عالم کے
رسد و کیفیات آں روح	اثرات اس روح تک بہت
بایں عالم کمتر سرایت می کند۔	کم پہنچتے ہیں اور اس روح
و در دفن کردن چوں اجزائے	کی کیفیات اس عالم میں
بدن بتمام یکجا می باشند	بہت کم سرایت کرتی ہیں
علاقہ روح با بدن از راہ	اور دفن کرنے میں چونکہ جسم کے
نظر و عنایت بحال می ماند	اجزاء تمام یکجا رہتے ہیں۔
و توجہ روح بزائرین مستانسین	روح کا تعلق بدن سے خبر گیری
و مستفیدین بسہولت می شود	اور توجہ کا ایک حالت کا رہتا ہے
کہ بسبب تعین مکان بدن	اور روح کی توجہ آنیوالوں انس
گویا مکان روح ہم متعین است	ہونے والوں اور فائدہ حاصل کرنیوالوں
و آثار ایں عالم از صدقات و فاتحہ ہا	کیطرف بسہولت ہو جاتی ہے
و تلاوت قرآن مجید چوں در آں	کیونکہ بدن کی جگہ کے مقرر ہونے کی
بقعہ کہ مدفن بدن اوست	وجہ سے گویا روح کی جگہ بھی مقرر
واقع شود بسہولت نافع می شود	ہوتی ہے اور اس عالم کے اثرات
پس سوختن گویا روح را بے	فاتحہ صدقات اور تلاوت قرآن پاک
مکان کردن است و دفن کردن	جب اس جگہ کہ جو بدن کا مدفن ہے
گویا مسکنے برائے روح ساختن۔	پہنچتے ہیں تو وہ بسہولت نفع
بنا بریں است کہ از اولیاء مدفونین	بخش بن جاتے ہیں لہٰذا جلانا
و دیگر صلحاء مومنین انتفاع و	ایسا ہے جیسے روح کو بے جگہ
استفادہ جاری است و آنہا را	کر دیں اور دفن کرنا ایسا ہے
افادہ و اعانت نیز متصور۔	جیسے روح کا مسکن بنا دینا
بخلاف مردہ ہائے سوختہ کہ ایں	اسی بنا پر اولیاء اور دوسرے

چیزہا اصلا نسبت	مؤمنین صالحین سے انتفاع واستفادہ
بآنہا در اہل مذہب	جاری ہے۔ اور یہ بھی متصور ہے کہ یہ
آنہا نیز واقع	روحیں فائدہ پہنچائیں اور اعانت کریں۔
نیست۔ بالجملہ	بخلاف جلے ہوئے مردوں کے کہ یہ چیزیں
طریق قبر و دفن	بالکل ان کے مذہب میں بھی
نعمتے است عظیم	واقع نہیں ہوتیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ
در حق آدمی۔	قبر بنانے کا طریقہ اور دفن کرنا آدمی
" " "	کے حق میں بڑی نعمت ہے۔

پہلے پیرے کا خلاصہ یہ ہے کہ قبر روحوں اور اہل دنیا کیلئے ریڈیو اور آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے صندوق اور تار ہوائی لاسلکی اور ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کے آفس کیطرح ہے جسمیں ایک درجہ تعلق ہر دو طرف سے رہتا ہے اور اس تعلق ہی کیوجہ سے افادہ واستفادہ ہوتا رہتا ہے۔ اگرچہ وہ تعلق دنیاوی تعلق سے بہت کمزور بھی ہے اور ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے قوی بھی ہو۔

دوسرے پیرے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مرنے کے بعد بھی اس ملک اور اس کی زمینوں کیساتھ روحانی تعلق اس قدر قوی اور باقی رہتا ہے کہ دوسری قوموں اور مذاہب میں نہیں پایا جاتا اور وہ قومیں اپنی مذہبی حیثیت سے اس کی قائل بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا یقیناً مسلمانوں کو ہی حق ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن اور سب سے زیادہ اپنا وطن سمجھیں۔

بحیثیت انتفاع اور احتیاج بجانب اجزار وطن بھی ھندوستان مسلمانوں ہی کا وطن ہے

اسلامی تعلیم اور عقائد کی حیثیت سے ایک وقت آنے والا ہے جبکہ تمام انسان پھر زندہ کیے جائیں گے۔ اور ان کے اجسام کے جو اجزا متفرق ہو کر مٹی وغیرہ میں مل گئے تھے جمع کیے جائیں گے اور جسم بن کر اسی روح کو اس میں داخل کیا جائے گا اور اس جسم کے ساتھ وہ محشر میں اور جنت میں جائیں گے۔ اس لئے وہ وطن جس میں وہ پرورش پاتے تھے جیسے کہ دنیاوی زندگی میں نفع اٹھانے اور ہر قسم کی حاجتوں کا مرکز تھا۔ مرنے کے بعد بھی ایک درجہ تک نفع اٹھانے اور احتیاج کا مرکز رہے گا اور اس کی اس مٹی سے جو کہ بعد از دفن قبرستان میں دوسری مٹی سے مل گئی تھی نفع اٹھائے گا۔ بخلاف دوسرے باشندگان ہند کے کہ وہ ایسا اعتقاد نہیں رکھتے ان کے اعتقاد میں ان کی روحیں دوسری مٹی سے بنے ہوئے جسموں میں داخل ہو کر ان جسموں سے تعلق قائم کرتی ہیں۔ اور ان کی پرورش میں سرگرم ہو کر پہلے اجزا جسمانیہ سے بالکل بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہندوستان میں ہیں کبھی چین میں، کبھی جاپان میں، کبھی انگلینڈ میں، کبھی فرانس میں کبھی انسان ہیں کبھی حیوان ہیں۔

وفاداری مجو از بلبلاں چشم   کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

جس طرح ہندوستان کے دوسرے باشندے بحیثیت سکونت اور انتفاع ملک و زمین ہندوستانی ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہیں

جس طرح آرین سیتھرین یونانی، مصری، منگولین وغیرہ قومیں ہندوستان میں آکر بسیں اور انہوں نے یہاں کھیتیاں کیں، باغ لگائے، باغ بنائے، بود و باش اختیار کی. اسی طرح مسلمانوں نے بھی یہاں پہنچ کر یہ اعمال وطنیہ اختیار کر لئے، کسی کو ہزار برس، کسی کو نوسو، کسی کو آٹھ سو برس یا کم و بیش ہو گئے۔ پشتہا پشت یہاں گزر گئیں اس لئے دنیاوی زندگی اور اس کے لوازم کی حیثیت سے مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ بالخصوص وہ اقوام جو کہ پہلے سے بھی ہندوستان کی باشندہ ہیں۔ مذہب اسلام کی حقانیت دیکھ کر پہلے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی حلقہ بگوش ہوئی ہیں۔ (اور وہی عنصر آج مسلمان ہند میں غالب ہے۔) لہٰذا کسی دوسری قوم کو حق نہیں ہے کہ وہ آج یہ دعویٰ کرے کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن نہیں ہے، صرف ہمارا ہے۔ ہندوستان کی بہبودی میں جسطرح دوسری قوموں کی بہبودی ہے اسی طرح مسلمانانِ ہند کی بھی بہبودی ہے۔ لہٰذا یقیناً اس حیثیت سے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ وطن عزیز اور پیارا ہے۔ نہ مسلمان اس کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ جا سکتے ہیں نہ جائیں گے اور نہ کوئی دوسرا وطن ان کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے۔ نو کروڑ مسلمانوں کو یہاں ہی رہنا اور یہاں ہی اپنی النسل اور طریقہ پھیلانا اور امن و امان کو چلانا ہے۔

رہا یہ امر کہ پھر مسلمان دوسرے مسلمانوں سے کیوں تعلق رکھتے ہیں اور ان کی مصیبتوں پر بلبلا اٹھتے ہیں تو یہ اس روحانی ملی تعلق کی بنا پر ہے جو کہ اتحاد اسلام اور توافق مذہب کی بنا پر دوسری جگہ کے مسلمانوں سے پیدا ہوا ہے اور جس کی تعلیم بھی روحانی ترقی کرتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری قوموں کو ساؤتھ افریقہ، فیجی، ماریشس، ایسٹ افریقہ وغیرہ کے ان ہندوستانیوں سے ہوتا ہے جو کہ ان ملکوں میں بود و باش کئے ہوئے ہیں۔ اگر وہاں پر کسی قسم کے مظالم ان ہندوستانیوں پر ہوتے ہیں۔ تو ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں بے کلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ امر مسلمانانِ ہند کو ہندوستانی وطنیت اور اس سے پیار و محبت سے بیگانہ نہیں بناتا۔

نوٹ:۔ امور مذکورہ بالا کی بنا پر ممکن ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی بہ آسانی ایک وطن سے منتقل ہو کر دوسرے وطن میں چلے جائیں مگر مسلمانانِ ہندوستان کو یہاں سے منتقل ہونا از بس مشکل ہے نہ وہ اپنی مساجد سے بیگانگی اختیار کر سکتے ہیں نہ اپنے مقابر سے۔ نہ اپنی زمینوں سے اور نہ اپنے گھر بار سے اور نہ ان میں اس قدر استطاعت ہے۔

اس مضمون سے ان اکابر کا نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔ یہ پورے ہندوستان کو ایک مورچہ سمجھتے تھے اور آگے ہی بڑھنا چاہتے تھے۔

اس نقطۂ نظر کے ثمرات — اختلافی نقطہ کا حل کیا تھا

حضرت مدنی کا مسلم لیگ کی تجویز سے اسی ایک اہم نکتہ پر اختلاف تھا کہ پاکستان کا فارمولا کل مسلمانانِ ہند کی مشکلات کا حل نہیں ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

اپنے رسالہ "تحریک پاکستان پر ایک نظر" کے آخر میں "پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں جمعیتہ علمار ہند کے اجلاس ۱۹۴۲ء کا فیصلہ اور مئی ۱۹۴۵ء کا تشریحی اضافہ ایسا فارمولا ہے جس سے فارمولائے پاکستان کے تمام فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مزید براں پورے ہندوستان میں ان کا رسوخ اور ان کی قوت باقی رہتی ہے۔ (الف) ہمارا نصب العین آزادی کامل ہے۔ (ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔ (ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالہ کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔ (د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو کر ایک لمحہ کیلئے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

تشریح:۔ اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور ان کا مقصد واضح ہے کہ جمعیت علمار مسلمانوں کی مذہبی

و سیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، وہ بیشک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں مجموعہ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لئے یہی مفید ہے۔ مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کیساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کیلئے حق خود ارادیت تسلیم کر لیا جائیگا۔ اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کر سکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ ہے باہمی افہام و تفہیم سے مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم و غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہو جائے ممکن ہے۔

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵ مسلم ۴۵ دیگر اقلیتیں ۱۰۔

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثرانداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہیں ہو سکے گی۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی ترقی کے تنازعات کے آخری فیصلے کریگا ــــ نیز تجویز

کے ماتحت اگر کسی بل کے مسلمانوں کیخلاف ہونے
نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت مسلم ارکان کی رائے اکثریت
کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ
سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے
طے کریں۔

مجلس عاملہ اجلاس سہارنپور کے منظور کردہ فارمولا کی چند دفعات

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کی کلچر۔ زبان رسم الخط
پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی آزادی، مذہبی
عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں اوقاف آزاد ہوں
گے، حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستور اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت
کے لئے خاص دفعہ رکھی جائے گی جس میں تصریح ہوگی۔
کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اسمیں مداخلت
نہ کی جائے گی اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں
فٹ نوٹ میں درج کیجائیں گی (مثلاً احکام نکاح،
طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین
خلع، عنین و مفقود وغیرہ، نفقہ، زوجیت، حضانت
ولایت نکاح، وصیت، وقف، وراثت، تکفین و
تدفین، قربانی وغیرہ)۔

(۳) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کیلئے
جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے مسلم قاضیوں کا
تقرر کیا جائیگا اور ان کو اختیارات تفویض کئے جائیں گے۔

خادم ملت محمد حفظ الرحمن کان اللہ
ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند دہلی۔

اس فارمولے کے مفادات شیخ الحدیث حضرت
مولانا سید محمد میاں صاحب قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

(الف) اہم پورٹ فولیو (قلمدان وزارت) کی تقسیم
مساوی طور پر ہوگی۔ (ب) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ
بلوچستان اور اگر کشمیر کو صوبہ کی حیثیت دیجائے تو صوبہ کشمیر
مذہبی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی امور میں قطعاً مختار ہونگے
(ج) پورا صوبہ پنجاب راولپنڈی سے لیکر ضلع سہارنپور
کی سرحد تک (د) پورا صوبہ بنگال بشمول کلکتہ جو ایک
عظیم شہر ہے مسلم اکثریت کے زیر اقتدار ہوگا۔ صوبہ دہلی
اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً
مساوی ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۴۴.۲۵
فیصدی ہیں۔ (ھ) ہندوستان کے باقی صوبوں میں
مسلمان کس مپرسی کے عالم میں نہ ہونگے کیونکہ،
ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق
تیس یا پینتیس فی صد ہوگا۔ وزارتوں میں ان کی مؤثر شمولیت
ہوگی۔ مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں ان کو حق استرداد
حاصل ہوگا۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہونگے جس میں ان کی
تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فیصدی ہوگی اور تمام فرقہ وارانہ
امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوگی کیونکہ اسمبلی
پارلیمنٹ یا کیبنیٹ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر
کوئی فیصلہ نہ صادر کر سکے گی۔

۱۶ راپریل ۱۹۴۶ء کو چار بجے شام سے سوا پانچ بجے

تک مشن سے ملاقات ہوئی۔ مذکورہ فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی نصف گھنٹہ سے زائد پینتالیس منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مقاصد کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کر دیئے۔ ۱۶ مئی ۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ ان ہی خطوط پر تھیں اور ان سفارشات کی بنیاد پر ۲ ستمبر ۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں سے پانچ مسلمان تھے یعنی ۱/۳ سے کچھ زیادہ۔ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علیخان کے سپرد کیا گیا تھا۔ (ماخوذ از مجاہد ملت نمبر ص ۵۸ تا ۶۰ مطبوعہ دفتر جمعیت علماء ہند دہلی)

ممکن ہے آپ کو یہ معلومات نئی اور اجنبی لگیں، لیکن ایسا نہیں ہے اس دور کے رسائل لوگوں کے پاس موجود ہیں انہیں دیکھیں گے تو جو ہم نے لکھا ہے اس سے زیادہ بہتر ہی مواد ملے گا۔

یہ معلومات پیش کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ ان بزرگوں سے جو ذہنوں میں بلاوجہ بدگمانی ہے اور ان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ عالمی سیاست پر ان کی نظر نہ تھی اور یہ اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کی بات کرتے تھے۔ ان کی فکر ہندو ذہن کے تابع تھی۔ بے سوچے سمجھے اور مسلمانوں کے نفع نقصان سے قطع نظر کر کے کانگریس کا جزو بن گئے تھے۔ یا یہ کہ پاکستان بن جانے کے بعد اس ملک کی بربادی کے خواہش مند تھے۔ اس قسم کے باطل خیالات کا ازالہ ہو سکے اور ان حضرات کی علمی فکری اور روحانی حیات کا مختصر سا خاکہ سامنے آجائے۔

مسلم لیگ سے حضرت مدنیؒ کا رشتہ

ایک اور معاملہ پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالنی مفید معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلم لیگ سے قوی ترین رشتہ رہ چکا تھا۔ ہوا یوں کہ مسٹر جناح ۲۸ء میں سیاست سے مایوس ہو کر لندن چلے گئے تھے جیسے کہ ان کے سوانح نگاروں نے بھی لکھا ہے۔ پھر اکتوبر ۳۴ء کے بعد وہ واپس آئے۔ اس وقت وہ جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں بلا دعوت ہی ایک بار شریک ہوئے پھر انہیں دعوت دی جانے لگی۔ اس کے بعد آپس میں تعاون اس شرط پر طے ہو گیا کہ انگریز نواز لوگوں کو مسلم لیگ میں نہ رکھا جائے مسٹر جناح بھی انہیں رجعت پسند کہتے تھے۔ انہوں نے کہا "میں ان رجعت پسندوں سے عاجز آگیا ہوں" اور ان کو رفتہ رفتہ لیگ سے خارج کر کے آزاد خیال ترقی پسند لوگوں کی جماعت بنانی چاہتا ہوں۔ آپ لوگ اس جماعت میں آجائیں۔ ان حضرات نے کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو خارج نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟ تو فرمایا کہ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو تم لوگوں میں آجاؤں گا اور لیگ کو چھوڑ دوں گا۔ مولانا شوکت علی صاحب مرحوم اور دیگر حضرات نے اس شرط پر تعاون کیا۔ مسٹر جناح نے جمعیت کا تیار کیا ہوا مینی فسٹو قبول کیا اور اسی کو تبع میں شائع کیا جس کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں اگر کوئی خالص مذہبی مسئلہ پیش ہوگا تو جمعیت علماء ہند کی رائے کو خاص وقعت اور اہمیت دی جائے گی۔ الیکشن کیلئے جدوجہد کی گئی۔ حتیٰ کہ

مسلم لیگ کے بہت نمائندے کامیاب ہوئے، چوہدری
خلیق الزمان نے حضرت مدنی کو لکھا کہ: آپ نے تیس
برس کی مردہ لیگ کو زندہ کیا ہے۔

(ملخصاً از مکتوب شیخ الاسلام جلد اول ص۲۶۲، ۲۶۱)

لیکن وہ لوگ مسلم لیگ میں رہے بلکہ جن جماعتوں سے
مسلم لیگ کا مقابلہ تھا وہ بھی اس میں آگئیں مثلاً
ایگریکلچرسٹ پارٹی وغیرہ کے لوگ مسلم لیگ میں آگئے۔

ایک دفعہ راجہ صاحب محمود آباد نے بہت سی باتیں
کیں۔ باتوں میں ایک دفعہ لہجہ تلخ ہوگیا۔ انہوں نے کہا
مسلم لیگ نے پاکستان نہیں بنایا مسلم لیگ کہاں اتنی
منظم تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی۔ اس ملک کی
تعمیر کے عوامل کچھ اور ہی تھے۔ ہندوؤں کا زور، ظلم
دفاتر کے مسلم عملے کی طلب جاہ و مرتبہ اور مسلم تاجر
کی حرص و ہوا۔

(آواز دوست ص۳۷ کالم ۲ و ص۳۸ کالم ۱۔
شاہکار شمارہ ۱۰، ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

راجہ صاحب کے الفاظ کو شمارہ کے مذکورہ
ماضی سے ملائیں تو یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی مراد
ایسے ہی لوگ ہوں گے جنہوں نے مسلم لیگ میں اور پھر
پاکستان میں آکر ملک کی کوئی خدمت نہیں کی۔ صرف
ذاتی منفعت خوری منتہائے نظر بنا کر وزارتوں پر قابض رہے
ان کا ماضی (باپ دادا سے) خراب
چلا آرہا تھا: پہلے بھی انگریز کے غلام تھے بعد میں بھی
کسی نہ کسی کو مصنوعی خدا بنائے رکھا اور ان خداؤں
(بڑی طاقتوں) کے اشاروں پر چل کر اور ذاتی جاہ طلبی
کی خاطر مسلم لیگ کے ٹکڑے کر دیئے پھر اور ناموں
سے سامنے آئے اور مقصد پاکستان ہی بھلا بیٹھے اور عوام کو بھی
اس سے ہٹا دیا۔ حتیٰ کہ ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ملک ہر
تباہی سے دوچار ہوا اور دو لخت ہوگیا۔

حضرت مدنیؒ کا بڑا قصور یہی نکلے گا کہ انہوں نے ان کی
نشاندہی کی تھی اور ان سے توقعات خیر سے وہ مایوس تھے۔
خدا ان کو ہدایت دے اور ان کی تخریبی صلاحیتوں کو
تعمیری اور اسلامی بنا دے۔ آمین!

اصل میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی انگریز کے پیدا کردہ مفتی تھے۔ جیسے اس نے "پیر اور پیغمبر" پیدا کئے بالکل ویسے ہی ایک مفتی بھی پیدا کئے۔ "پیغمبر قادیانی" نے جہاد کا حکم منسوخ کیا۔ "پیروں" نے فوجی بھرتی کرائے جنرل ڈائر جیسے سفاک تک کو سیاسنامہ پیش کیا۔ دعائیں دیں۔ تو "مفتی بریلوی" نے انگریزوں سے میل جول کی ممانعت (ترک موالات) کی تحریک کا توڑ کیا۔ اور انگریزوں نے ان کی اس سعی بلیغ کی تعریف کی۔ فرانسیسی رائبسن لکھتا ہے۔

"ان کے معمول کا طریق کار حکومت کی حمایت تھی۔ اور جنگ عظیم اول اور ۱۹۲۱ء میں بریلی میں ترک موالات کے مخالف علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ ان کا عوام پر خاطرخواہ اثر تھا۔ لیکن مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ کی حمایت حاصل نہ تھی۔"

(اقبال کے ممدوح علماء۔ ص ۱۸۔
بحوالہ سیپریٹزم امنگ انڈین مسلمز ص ۲۴۴
کیمرج یونیورسٹی پریس۔ ۱۹۷۴ء)

ان کے پردادا نے بھی انگریزوں کی خدمت کی تھی۔ "مولوی احمد رضا خان کے پردادا حافظ کاظم علیخان بریلوی نے انگریزی حکومت کی پولٹیکل خدمات انجام دیں"

(اقبال کے ممدوح علماء۔ بحوالہ حیات اعلیٰحضرت)

اعلیٰ حضرت کا انگریز سے رشتہ اپنے پردادا صاحب کے زمانہ سے قائم ہوا۔ اب پھر اعلیٰ حضرت نے اپنے زمانہ میں ہندوستان کو ہر اعتبار سے دارالاسلام قرار دیا ہے۔ تاکہ انگریز سے جہاد نہ کیا جا سکے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک رسالہ تالیف کیا جس کا نام ہے۔ "اعلام العلام بانّ ہندوستان دارالاسلام"

ان کا انگریزوں سے اتنا قوی رشتہ اور بھائی چارہ تھا کہ اپنے فتوے میں انگریزی حکومت کو بعینہ مسلمانوں کی حکومت قرار دیا۔ اور ہندوؤں کو مسلمانوں کی رعایا (ذمی) قرار دیا۔

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔

"فقیر غفراللہ تعالےٰ لہٗ نے اپنے رسالہ اعلام الاعلام بان ہندستان دارالاسلام بدلائل ساطعہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان دارالاسلام ہے۔ اسے دارالحرب کہنا ہرگز صحیح نہیں۔ اور اس سے پہلے فقیر ایک مدلل فتوے لکھ چکا ہے کہ ہنود زمانہ "اہل ذمہ" ہیں۔ انہیں کافر حربی نہیں کہہ سکتے۔ وتمام تحقیقہ فی فتاونا الملقبۃ بالعطایا النبویۃ فی الفتاوی الرضویۃ اور ظاہر ہے کہ شریعت مطہرہ نے معاملات دنیویہ میں اہل ذمہ کو ہمارے مماثل رکھا ہے۔ لھم مالنا و علیھم ما علینا ان کے خون و مال مثل ہمارے خون و مال کے ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے اس کے قصاص میں وہ مارا جائے گا۔ اور اسلام اور کفر کا تفرقہ مانع نہ آئے گا۔

امام نسفی کافی شرح وافی میں فرماتے ہیں۔ یقتل المسلم بالذمی الخ و ھکذا فی الھدایۃ وغیرھا۔ عامۃ اسفار المذھب۔

یوں ہی ذمی ہمسایہ کے ساتھ بیماری میں عیادت موت میں تعزیت کا برتاؤ شرع مطہرہ نے جائز رکھا۔ خود حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان یہودی کی عیادت فرمائی۔ قدم اکرم کی برکت سے اللہ تعالےٰ نے اسے ہدایت فرمائی کہ اسی وقت اسلام لایا۔ اور انتقال کیا۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

اشباہ میں ہے۔ لا تکرہ عیادۃ جارہ الذمی۔ ہدایہ میں ہے لانہ نوع بر فی حقھم۔ وما نھینا عن ذالک۔ وصح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عاد یھودیا مرض بجوارہ۔ درمختار میں ہے فی النوادر جار یھودی او مجوسی مات ابن لہ او قریب ینبغی لہ ان یعزیہ ویقول اخلف اللہ علیک خیرا منہ واصلحک وکان معناہ اصلحک اللہ بالاسلام یعنی رزقک الاسلام و رزقک ولدا مسلما۔ کفایۃ۔

بالجملہ سوا افعال تعظیم و اجلال کے ذمیوں کے ساتھ نیک برتاؤ چاہیئے۔ اور دنیوی

معاملات ان کے ساتھ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک ان میں معاذ اللہ دین کی توہین یا ان کے رسوم مذہبی کی تائید نہ ہو۔

اللہ جل جلالہٗ فرماتا ہے لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم دیارکم ان تبروا ھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔

غمز العیون والبصائر میں ہے الذمی حکمہ حکم المسلمین یعنی فی غیر ما یوجب تعظیمہ الخ مہود نامہ عند التحقیق ان سب احکام کے مستحق ہیں۔ خصوصاً اس معاملہ میں انہیں شریک کرنا جس میں رفاہِ عام و نفع انام وحفظ حقوق ومراعات مخلوق ہو کہ اس میں خاص انہیں کا فائدہ نہیں۔ بلکہ اپنا اور تمام اہل وطن کا نفع ہے جب کہ مسلمانوں کے اہل تدبیر اور اہل منیر بہ نظر غائر و باریک بین وانجام شناس ووقت گزیں خوب تنقیح تام کرلیں کہ اس سے حالاً یا مآلاً اسلام اور مسلمین پر کوئی ضرر عائد نہیں۔ یہ شرط کہ فقیر نے ذکر کی ضرور قابل لحاظ ہے " الخ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا مذکورہ بالا فتویٰ " نصرۃ الابرار" میں ص ۲۹ سطر نمبر ۱ سے شروع ہوا ہے اور ص ۳۲ تک گیا ہے "

("نصرۃ الابرار" ۔ مطبع صحافی لاہور ایچی سن گنج)

اس میں پورے ہندوستان بھر کے اور مدینہ منورہ اور بغداد کے علماء کے فتاویٰ ہیں کہ کانگریس میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا جائز ہے۔ اور فاضل بریلوی نے پوری قوت سے اس کی تائید کی ہے کیونکہ یہ برطانیہ عظمیٰ نے اپنی اغراض کے لئے قائم کی تھی۔ حریت پسند اس میں بعد میں آئے۔ لیکن اعلیٰ حضرت نیا نکتہ یہ بھی پیدا کر گئے کہ ان کی اور انگریزی حکومت ایک چیز ہے۔ اور سب ہندو رعایا ذمی ہے۔ اور انگریز سے اپنے قدیم قومی رشتہ کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

انگریزوں نے اعلیٰ حضرت کو اس کا صلہ دیا۔ ایک چالاک ومتحرک گورنر یوپی مسٹر مسٹن نے نواب رامپور کو اشارہ کیا اور انہوں نے دو سو روپے ماہانہ جاری کر دیئے۔ اس زمانہ میں دو سو روپے بہت بڑی چیز تھی۔ جن لوگوں کی تنخواہیں صرف چار روپے ماہانہ ہوتی تھی وہ اس میں بفراغت گزارہ کر لیتے تھے۔ یہ تو ایک عطیہ کا حال ہے۔ اسی طرح اور عطایا کا ثبوت بھی لوگ مہیا کر رہے ہیں۔ ؎

نہ تم طعنے ہمیں دیتے نہ ہم فریاد یوں کرتے　　نہ کھلتے راز سربستہ نہ یوں رسوائیاں ہوتیں

نہ بریلوی حضرات تعدی کرتے ۔ نہ دوسرے حضرات ایسی تحقیقات بر سرِ عام لاتے ۔
مسئلہ کے بدلتے ہی نواب رامپور نے عطیہ روک دیا حتیٰ کہ اعلیٰ حضرت نے نواب صاحب کے طبیب
خاص سے مل کر عطیہ جاری کرانے کی کوشش کی ۔ پھر دوبارہ نواب صاحب نے کم رقم جاری کی ۔ مگر یہ بات اور
لوگوں کو بھی معلوم ہوگئی ۔

اعلیٰ حضرت کے پیروکاروں ۔ وارثوں ۔ مداحوں اور کارندوں نے یہ شیوہ بنالیا کہ انہیں ہر کسی سے
بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے ۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ اعلیٰ حضرت کو صلی اللہ علیہ وسلم لکھیں ۔ اس کے لئے انہوں
نے یہ طریقہ نکالا کہ اعلیٰ حضرت کے نام کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے یوں لکھنے لگے
"اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صلی اللہ علیٰ حبیبہٖ وعلیہ وسلم "۔ ان لوگوں نے انہیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ
علیہ سے بڑھا کر ائمہ مجتہدین امام اعظم ابوحنیفہ ۔ امام مالک ۔ امام شافعی ۔ امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے
بھی ۔ بلکہ سب تابعین سے بھی اوپر چڑھا کر صحابہ کرام علیہم الرضوان کی صف میں شامل کرنے کی بھی پوری پوری
کوشش کی ۔

" زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ میں نے بعض مشائخ کرام کو یہ کہتے سنا ہے کہ ان کو دیکھ
کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زیارت کا شوق کم ہوگیا "

(وصایا شریف ۔ ص ۲۴ ۔ س ۱۴ ۔ ناشر
جماعت مبارکہ رضائے مصطفےٰ بریلی ۔ مطبع
الیکٹرک ابوالعلائی پریس ______ آگرہ)

یہ اسی "وصایا شریف" کا پہلا ایڈیشن ہے ۔ جس میں فاضل بریلوی نے انتقال سے دو گھنٹہ سترہ منٹ
پہلے یہ لکھوایا تھا ۔ جب دیگر مسلمانوں نے اس پر گرفت کی تو بعد کے نسخوں میں الفاظ بدلنے شروع کئے ۔ اور
موجودہ نسخوں میں الفاظ کچھ کے کچھ ملیں گے ۔ آپ سب نسخے جمع کریں تو عجیب قلابازیوں کا منظر سامنے آئے گا
مگر وہ خاص عبارت جو بریلوی ہونے نہ ہونے کی کسوٹی ہے ۔ وصایا شریف کے ہر نسخے میں آج تک چلی آرہی
ہے وہ وصایا شریف کے آخری جملے ہیں ۔

" اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر
فرض سے اہم فرض ہے ۔ اللہ توفیق دے ۔ والسلام ۔ ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ ھ
روز جمعہ مبارکہ ۲ بجکر ۲۱ منٹ پر یہ دقتی وصایا قلم بند ہوئے ۔ دستخط فقیر احمد رضا غفرلہٗ
بقلم خود ۔ بحالت صحت و حواس "
(ص ۱۲، وصایا شریف مطبوعہ نوری کتب خانہ ۔ بازار ۔ اسلام گنج ۔ لاہور ۔

مولانا حسین احمد نجیب
رفیق دارالتصنیف دارالعلوم کراچی

مُسلم قومیت کا مسئلہ

اور

شیخ العرب والعجم حضرت مدنی پر سر محمد اقبال کی تنقید

الحمد للہ وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد

اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا یہ ایک افسوسناک باب ہے کہ ہر مشکل اور نازک مرحلہ میں دشمن نے اس کی صفوں میں اختلاف و افتراق کی دراڑیں ڈال کر اس کی ناقابلِ تسخیر قوّتوں کا شیرازہ بکھیر ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کامیدان جنگ ہو یا سقوطِ بغداد کا خونچکاں ڈرامہ، خلافت عثمانیہ کی بیخکنی کے واقعات ہوں یا آزادی ہند کی جدوجہد، دشمن نے امت ہی میں سے ایک گروہ کو دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا، اور پھر افتراق و تشتّت کی شکار ان قوّتوں کے کھنڈرات پر ظلم و بربریّت کے شیطان بن کر وجودِ ملّت کا رہا سہا خون چوسنے کا ڈرامہ رچایا۔

برِّصغیر پاک و ہند پر مغربی استعمار کے تسلّط کے نتیجہ میں اسلامی عقائد و اعمال میں الحاد اور تشکیک و تحریف کا جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے اذہان کو اس طرح مسموم کر ڈالا کہ رفتہ رفتہ یہ بات ایک اختلافی مسئلہ بن کر رہ گئی کہ برِّصغیر کی انسانی آبادی میں مسلمانوں کا "امتیازی تشخص" کیا ہے؟ چونکہ اُمتِ مسلمہ کی گذشتہ تیرہ سو سالہ تاریخ میں "قومی تشخص" ایک مسئلہ بن کر کبھی موضوعِ بحث نہیں بنا تھا اس لئے اس موضوع کی جو بحث اس موجودہ صدی میں چھڑی وہ آج تک فیصلہ کن طریقہ پر طے نہیں ہو سکی کہ مسلمان انسانی آبادی میں اپنے تشخص کو کس نام سے موسوم کریں۔

اس وقت اس مسئلہ کا تفصیلی اور تحقیقی جائزہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف لُغتِ عرب میں اجتماعیت کے مفہوم کو ادا کرنے والے الفاظ کی تشریح اور قرآن و سُنّت میں ان کے استعمال اور مفہوم کی روشنی میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے موقف پر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی تنقید اور تحریک آزادی ہند میں متحدہ قومیت کے مخالفین کے اندازِ فکر کا تاریخی تجزیہ پیش کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ لُغتِ عرب میں "جماعت" یا "اجتماعیت" کا مفہوم ادا کرنے والے الفاظ سے کیا معلوم ہوتا ہے۔

جماعت کا مفہوم ادا کرنیوالے الفاظ اور ان کی تشریح

(۱) مِلّت

امام راغب اصفہانیؒ نے "المفردات" میں لکھا ہے کہ دین کی طرح مِلّت بھی اس دستورِ الٰہی کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے جاری فرماتا ہے تاکہ اس پر چل کر انسان قربِ خداوندی حاصل کر سکے اور یہ دستور انبیاء کی وساطت سے بندوں تک پہنچا ہے [۱] لیکن قرآن مجید میں لفظِ ملت کا اطلاق کم جگہ باطل مذہب پر بھی ہوا جو خود الناس کا تراشیدہ تھا، دستورِ الٰہی پر مبنی نہ تھا۔ دیکھو ۱۲/۵ کی آیت ۳۷ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل خانہ کے قیدیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ وھم بالاٰخرۃ ھم کافرون ۝

"جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے اور آخرت کے منکر ہیں میں ان کی مِلّت (یعنی خود ساختہ دستورِ زندگی) کو چھوڑے ہوئے ہوں۔"

اسی طرح ۲۳/۱ کی آیت ۷ میں اللہ نے قریش کا قول نقل فرمایا ہے۔ قریش نے کہا۔

ماسمعنا بھٰذا فی الملۃ الاٰخرۃ

"ہم نے پچھلے مذہب میں یا اور مذہب میں یہ بات نہیں سُنی۔"

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے "معالم التنزیل [۲]" میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، کلبیؒ اور مقاتلؒ کے نزدیک اس جگہ ملت سے نصرانیت مراد ہے اس لئے کہ نصرانیت توحید سے خالی ہو چکی تھی اور تثلیث پر مبنی تھی، مجاہدؒ اور قتادہؒ کا قول ہے کہ مذہب قریش مراد ہے، بہرحال مذہب قریش مراد ہو یا تثلیثی نصرانیت دونوں دستورِ الٰہی پر مبنی نہیں۔

شاید راغبؒ کی مراد یہ ہو کہ ملت اصل میں تو دستورِ الٰہی کا نام ہے جو انبیاء کی معرفت بھیجا جاتا ہے لیکن اگر انسانی دماغ کبھی اسمیں خرد بُرد کر لیں اور بگاڑ دیں، تب بھی بطور مجاز اس پر لفظ ملت کا اطلاق ہو جاتا ہے کیونکہ خرد بُرد کرنے والے کے دعویٰ میں شکستہ و بریدہ دین یا دستور بھی اللہ کا بھیجا ہوا دین ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

امام راغبؒ نے دین اور ملت کا فرق ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لفظِ ملت کی اضافت صرف انبیاءؑ کی طرف ہوتی ہے کسی غیر نبی کی طرف نہیں ہوتی اور نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اسی لئے مِلّت اللہ یا ملّتہ زید یا ملّتی نہیں کہا جاتا۔ ہاں دین کا استعمال عام ہے، دین اللہ، دین الانبیاء اور دینُ زید۔ ہر طرح صحیح ہے۔

لفظِ ملت کی انبیاءؑ کے ساتھ تخصیص بھی امام کے اسی نظریہ پر مبنی ہے کہ ملت صرف دستورِ الٰہی کا نام ہے

---

[۱] امام راغبؒ؛ المفردات فی غریب القرآن صفحہ ۴۸۸ مطبوعہ کراچی

[۲] غلام حسین ابن مسعود فراد لغویؒ: معالم التنزیل صفحہ ۱۸۲ جلد ۷، بہامش تفسیر ابن کثیرؒ طبع اول ۱۳۴۳ھ

جو انبیاء کی معرفت پہنچا یا جاتا ہے ورنہ خود انبیاء کی طرف اضافت خود ۱۱ آیت ، ۳۰ میں موجود ہے۔[4]
امام راغبؒ نے لفظ ملّت کو استعمال ماخذ أمللت الكتاب کو قرار دیا ہے، اگر کوئی تحریر آپ کسی سے لکھوائیں تو آپ کہیں گے أمللتُ الكتاب تو گویا اللہ کی جاری کردہ یا تحریر کردہ چیز ملت ہوئی لہٰذا دین کا معنی ہے " طاعت " ایک انسانی چیز ہے ، اطاعت کرنے والا بھی ہونا چاہیئے۔ اور جس چیز کی اطاعت کی جائے اس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے دین کی اضافت مبلغ اور مطاع دونوں کی طرف ہوتی ہے۔

مِلّةٌ گرم راکھ ، گرم ریت ، مليلةٌ بخار کی گرمی (قاموس) یا وہ حرارت جو انسان محسوس کرتا ہے۔ (المفردات) مَلالٌ بخار کا پسینہ ، عادت ، اکر کا درد ، بیماری یا غم سے بے چین ہو جانا ، روٹی یا گوشت راکھ پر گرم کرنا ، (نَصَرَ ، سَمِعَ) ملة ملٌ ملالٌ مِلالةٌ (باب سَمِعَ) کسی چیز سے اکتا جانا ، بے آرام کرنا ، مَلْمَلَةٌ جلدی کرنا ، إملالٌ (باب افعال) اکتا دینا ، سفر دراز ہونا ، مضمون بول کر لکھوانا ، تملّلٌ (باب تفعّل) کسی مذہب کو اختیار کرنا ، بخار میں پسینہ آنا ، بیماری یا غم سے بے چین ہو جانا۔ امتلالٌ (افتعال) کوئی مذہب اختیار کرنا ، جلدی جانا استملالٌ (باب استفعال) اکتا جانا تململ (تفعلل) بے چین اور مضطرب ہو جانا۔

پ ۱۲/۱۹ مکسور مضاف ، پ ۴ منصوب ، پ ۱۵/۵ منصوب ، پ ۶ منصوب ، پ ۱۵/۱۲ منصوب ، پ ۲۲/۱۲ منصوب ، پ ۱۲/۳ منصوب ہر جگہ دینِ الٰہی مراد ہے۔ پ ۱۵/۱۲ منصوب میں مذہبِ شرک مراد ہے ، پ ۲۳/۳ مجر ور معرف باللام بر قول ابن عباسؓ و کلبیؒ و مقاتلؒ تثلیثی نصرانیت اور بر قول مجاہدؒ و قتادہؒ مذہب قریش مراد ہے (البغویؒ)

۲ اُمّت

اُمّت ، جماعت ، مدت ، طریقہ ، دین۔

ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ اشتراک موجود ہو اسے اُمّت کہا جاتا ہے۔ خواہ یہ اتحاد مذہبی وحدت کی بناء پر ہو یا جغرافیائی اور عصری وحدت کی وجہ سے اور خواہ اس رابطہ میں اُمّت کے اپنے اختیار کو دخل ہو یا نہ ہو، اخفشؒ نے تصریح کی ہے کہ اُمّت باعتبار لفظ کے واحد ہے اور باعتبار معنی کے جمع نیز حیوان کی ہر جنس ایک اُمّت ہے[5] ابن دستویہ کا بیان ہے کہ جہاں بھی امت کے معنی مدت کے ہوں گے وہاں اس کا مضاف محذوف ہوگا۔ اور مضاف الیہ ، مضاف کے قائم مقام سمجھا جائے گا[6] اس لحاظ سے وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ

---

[4] مولانا سید عبدالدائم الجلالی : لغات القرآن ص ۳۹ تا ۴۴ ج ۵ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۵ء

[5] بہر حال دونوں صورتوں میں مراد "دستور" ہے اس دستور پر عمل پیرا جماعت گروہ یا قوم مراد نہیں لیا گیا ہے۔ ۱۲ مجیب

[5] علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی : عمدۃ القاری ص ۱۹۰ ج ۵ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لانکتب ولا نحسب۔

[6] علامہ محمد بن علی بن محمد الشوکانی : فتح القدیر ص ۲۹ ج ۳ طبع مصر ۱۳۵۰ھ

مَعْدُودَۃ (اور اگر ہم ان سے عذاب کو ایک مدت معلوم تک روکے رکھیں) اور وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ (اور اس کو مدت بعد یاد آیا) میں لفظ زمن یا حین محذوف ہے۔ گویا اصل میں یوں تھا الی زمن امۃ معدودۃ اور بعد حین امۃ۔ زمن اور حین کو حذف کر کے مضاف الیہ یعنی لفظ اُمّت کو اس کا قائم مقام سمجھا گیا۔ اُمّت کے مجازی معنی طریقہ اور دین کے بھی آتے ہیں۔ عرب والے بولتے ہیں فلان لا امۃ لہ یعنی فلاں کا کوئی دین اور طریقہ نہیں [۵]

اُمّت بمعنی جماعت ہے۔ امام اخفشؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ کے اعتبار سے واحد اور معنی کے اعتبار سے جمع ہے اور جاندار کی ہر جنس کو اُمّت کہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ اگر کتے ایک جماعت (اُمّۃ) نہ ہوتے تو میں ان کو قتل کرنے کا حکم دیتا۔ اور اُمّت بمعنی طریقہ اور دین ہے [۶]

(۳) القوم | القوم۔ اسم جمع۔ صرف مردوں کا گروہ۔ ایک شاعر کا قول ہے۔ أقومٌ آل حصن ام نساء یعنی خاندان حصن والے کیا مرد ہیں یا عورتیں۔ عورتوں کی جماعت کو قوم نہیں کہتے۔ (راغب ۱ : ۴۳۰) قرآن مجید میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ آیت میں آیا ہے :۔

لا یسخر قوم من قوم عسیٰ أن یکونوا خیرا منھم ولا نساء من نساء
عسیٰ أن یکن خیرا منھن ؕ ۰

"مرد مردوں سے مذاق نہ کریں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور عورتیں عورتوں سے مذاق نہ بنائیں کہ وہ ان سے بہتر ہوں"

لیکن اگر ذیلی طور پر عورتوں کو قوم میں داخل کر دیا جائے بعض اہلِ لغت نے اس کی اجازت دی ہے آیت مذکورہ میں چونکہ نساء کے مقابلے میں لفظ قوم آیا ہے اس لئے قوم سے مراد مرد ہیں۔ دوسری آیت میں عموماً قرآنی سیاق سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ذیلی طور پر لفظ قوم میں داخل ہیں، ہر پیغمبر نے یا قوم کہہ کر براہِ راست مردوں کو خطاب کیا اور بالواسطہ عورتوں کو، اور نزول عذاب جس طرح نافرمان منکر مردوں پر ہوا اسی طرح عورتوں پر بھی (مولفؒ) جو اسم جمع آدمیوں کی جماعت کے لئے ہو اس کا استعمال بطور تذکیر بھی جائز ہے اور بطور تانیث بھی۔ اس لئے قوم مذکر بھی مستعمل ہے اور مؤنث بھی (قاموس۔ لسان) قرآن مجید میں کَذَّبَ بِہٖ قَوْمُکَ (کذّب فعل مذکر) بھی آیا ہے اور کَذَّبَتْ قَبْلَھُمْ قَوْمُ نوحٍ بھی (مولفؒ)

---

[۵] مولانا عبدالرشید نعمانی :۔ لغات القرآن ص ۲۴۰، ۲۴۱ ج ۱ مطبوعہ ہندوستان ۱۹۶۲ء
[۶] محمد بن ابی بکر الرازی :۔ مختار الصحاح ص ۳، مطبوعہ مصر ۱۹۵۰ء
امام راغب اصفہانی :۔ المفردات فی غریب القرآن ص ۳۱، ۳۲ کراچی ۱۹۶۱ء
لغات القرآن کے مؤلف سید عبدالدائم الجلالی مراد ہیں۔ ۱۲ ان

قوم کی جمع اقوام ہے اور جمع الجمع اقادم، اقائم اور اقادیم ہے۔ (قاموس [9])

قرآن مجید میں قوم کا استعمال دو معنی کے لئے ہوا ہے:۔

(۱) عام گروہ اور جماعت، لوگ، ایک نسل اور وطن سے تعلق رکھنے والی ہو یا نہ ہو۔ عموماً ایسا استعمال اس وقت ہوا ہے جب خطابی طور پر قوم کو لفظاً استعمال کیا گیا ہو۔ یہ استعمال بہت زیادہ ہے

(۲) ایک نسب یا وطن سے تعلق رکھنے والی جماعت۔ ایسا استعمال صرف اس موقع پر ہوا ہے جہاں پیغمبروں نے اپنے ہم وطنوں یا نسلی اشتراک رکھنے والوں کو خطاب کیا ہے یا بغیر حرف ندا کے ان سے کہا مثلاً یا قوم، یا قال لقومہم وغیرہ [10]

(۴) فرقۃ، فریق فرقۃ۔ واحد۔ آدمیوں کا گروہ۔ جماعت۔ جمع فِرَق۔ شعر میں افارقۃ بھی جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اَفْرَاقٌ جمع الجمع، افارِیق جمع الجمع کی جمع۔ (قاموس ص [11])

فریقٌ۔ آدمیوں کی جماعت، گروہ، فرقہ بھی گروہ کو کہتے ہیں لیکن فریق (گروہ) فرقہ (گروہ) سے بڑا ہوتا ہے اس کی جمع اَفْرِقَۃٌ، فُرَقٌ اور فُرُوقٌ ہے (قاموس) [11]

(۵) شعوب دائیں۔ شانیں، شعبٌ کی جمع جس کے معنی قبائل کے اُس مبدا اعلیٰ کے ہیں جہاں سب قبیلے جا کر مل جاتے ہیں۔ یا شعب وہ ایک برادری ہے جو شاخ در شاخ پھیل گئی ہو۔ عرب میں قبیلہ کی تدریجی تقسیم کثرت سے قلت کی طرف حسب ترتیب ذیل ہے۔

پہلے شعب[۱]، پھر قبیلہ[۲]، پھر عمارہ[۳]، پھر بطن[۴]، پھر فخذ[۵]، پھر فصیلہ[۶]،

الراساسہ نے تعریح کی ہے کہ یہ طبقے النسانی ترتیب پر ہیں۔ شعب سب سے عظیم تر ہے۔ شعب الرأس (جہاں دماغ کے چاروں حصے جڑتے ہیں) سے مشتق ہے۔ پھر قبیلہ اپنے اجتماع کی بنا پر قبیلۃ الرأس (کھوپڑی کا وہ حصہ جو شاخ در شاخ ہوتا ہے) سے ہے۔ پھر عمارہ ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں، پھر بطن (پیٹ) ہے۔ پھر فخذ (ران) ہے پھر فصیلہ ہے جس کے معنی پنڈلی کے ہیں [12]

---

[9] سید عبدالدائم الجلالی :۔ لغات القرآن ص ۱۱۹، ۱۲۰ ج ۵

[10] سید عبدالدائم الجلالی :۔ لغات القرآن ص ۱۲۱ ج ۵ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۵ء

[11] ایضاً :۔ ص ۴۸ ج ۵

[12] عبدالرشید نعمانی :۔ لغات القرآن ص ۲۸۴ ج ۳، امام راغب : المفردات ص ۲۶۲

مسئلہ قومیت اور حضرت مدنیؒ کا موقف

آزادی ہند کی تحریک کے مختلف مرحلوں میں متحدہ قومیت کا نظریہ کوئی جدید نظریہ نہیں تھا جسے حضرت مدنیؒ نے پیش کر کے کوئی بڑا جرم کیا تھا۔ بلکہ سرسید، محمد علی جوہر، محمد علی جناح (قائداعظم بننے سے پہلے) اور سر محمد اقبال (علامہ اقبال بننے سے پہلے) سبھی سیاسی لیڈر اس کا پرچار کر رہے تھے۔ آخری دور میں جب تحریک آزادی ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی تو انگریزی ڈپلومیسی نے قدیم فلسفہ پھر دہرایا اور برصغیر کی مختلف نظریاتی جماعتوں کو باہم ٹکرا دینے کا منصوبہ بنایا جس کا اشارہ پروفیسر سیلے کے اس بیان میں واضح طور پر ملتا ہے۔ "آکسپنشن آف انگلینڈ" میں وہ متحدہ قومیت کے بارے میں لکھتا ہے:

"اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح بھی نہ ہو، بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہندوستانیوں کے لئے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائیگا کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور فاتحانہ حکمرانی نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس طرح کی حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔"[۱۴]

ایک طرف انگریز مفکرین اس انداز پر سوچ رہے تھے دوسری جانب برصغیر کے باشندوں کے مذہبی جذبات کو اکسا کر مختلف تنظیمیں تحریک آزادی کی متحدہ جدوجہد کو باہمی سر پھٹول میں تبدیل کر دینے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھیں۔ اس پس منظر میں ۸ جنوری ۱۹۳۸ء کی شب جمعیۃ علماء ہند کے دہلی اجتماع میں حضرت مدنیؒ نے ایک تقریر فرمائی۔ اس واقعہ کا تذکرہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

"اصل واقعہ یہ ہے کہ صدر بازار دہلی متصل پل بنگش زیر صدارت مولانا نورالدین صاحب جلسہ کیا گیا۔ اس محلہ کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا اور اس میں میری ملی اور وطنی خدمات کو سراہا گیا، جلسہ وعظ و نصیحت کا نہ تھا اور نہ اسلامی تعلیم بیان کرنے کا۔ اس روز صبح کو جلسہ مذہبی ہو چکا تھا مولانا نورالدین صاحب نے تین پارٹس میں ترجمہ قرآن شریف ختم کیا تھا اور اس کی خوشی میں جلسہ ہو چکا تھا، اس میں مذہبی تقریر، فضائل قرآن اور اس کی تعلیمات کے متعلق تقریباً دو گھنٹے ہو چکی تھی، نیز جامع مسجد میں تبلیغ کے متعلق مذہبی وعظ اس سے پہلے اسی دن ہو چکا تھا۔ شب کے جلسے کے اعلان میں یہ طبع کیا جا چکا تھا کہ حسین احمد کو ایڈریس پیش کیا جائے گا۔ ایڈریس کے جلسے سے لیگیوں اور بالخصوص مرزائی

---

[۱۴] مولانا حسین احمد مدنیؒ: متحدہ قومیت اور اسلام ص ۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء

منظفر الدین صاحب[۵] اور ان کے ہمنواؤں میں انتہائی غصہ پھیلا ہوا تھا۔ کوشش کی جا رہی تھی کہ جلسہ کو درہم برہم کیا جائے جس کا احساس کر کے جناب صدر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ کہدیا کہ اس جلسے میں کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق کوئی تقریر نہ ہوگی۔ اس کے بعد میں ایڈریس کے جواب دینے کے لئے کھڑا ہوا۔ (صدارتی تقریر کے بعد ایڈریس پیش کیا گیا تھا) میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی حالت، بیرونی ممالک اور غیر اقوام نیز اندرون ملک میں آزادی کا تمہیدی مضمون شروع کیا اور کہا کہ:۔

"موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں، دیکھو انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم شمار کئے جاتے ہیں حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں نصرانی بھی، پروٹسٹنٹ بھی کیتھولک بھی۔ یہی حال امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ کا ہے" [۱۶]

یہ وہ زمانہ ہے جب برصغیر کی تحریک آزادی میں امت مسلمہ علماء حق کی رہنمائی میں بھرپور دینی جذبہ کے تحت جد وجہد کر رہی تھی اور مسلم لیگ جو ہندوستانی عوام کی نظر میں انگریز کے پروردہ جاگیرداروں اور خطاب یافتہ سروں اور نوابوں پر مشتمل انگریزوں کی حلیف پارٹی شمار ہوتی تھی۔ امت مسلمہ کی قیادت علماء حق سے چھین کر مغرب زدگی کے شکار لیڈروں کے ہاتھوں میں تھما دینے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ تقریباً دو صدیوں کی غلامی نے مسلمان عوام کے ذہن سانچوں کو بڑی حد تک تبدیل بھی کر دیا تھا لہٰذا علماء حق سے مسلم عوام کو برگشتہ کرنے کا ایسا بہتر موقع ہاتھ سے کیسے جانے دیا جاتا۔ چنانچہ اس دور ایک کٹر مسلم لیگی رہنما اور علمائے حق کے شدید ترین مخالف پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا بیان ہے:۔

"۸ رجنوری ۱۹۳۸ء کی شب حضرت اقدس مولانا مدنیؒ نے صدر بازار دہلی متصل پل بنگش ایک جلسے میں تقریر فرمائی جس کا بڑا حصہ ۹ رجنوری کے "تیج" اور "الانصاری" دہلی میں شائع ہوا۔ چند روز بعد "الامان" اور "وحدت" دہلی نے اس تقریر کو قطع و برید کے بعد اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ان پرچوں سے "زمیندار" اور "انقلاب لاہور" نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرتؒ کی طرف منسوب کر دیئے کہ حسین احمد دیوبندی نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ اوکما قال۔

---

[۱۵] آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک لیڈر تھے۔

[۱۶] مولانا حسین احمد: متحدہ قومیت اور اسلام ص ۳، ۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء

جب یہ اخباری اطلاع علامہ اقبال کے کان میں پڑی تو انھوں نے حضرت اقدسؒ سے استفسار یا تحقیق کئے بغیر تین اشعار سپردِ قلم کر دیئے:۔

خود حضرت مدنیؒ اس حقیقت کی وضاحت میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، یہ اس زمانہ کی جاری ہونے والی نظریت ہے اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیئے خبر ہے انشاء نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورہ کو ذکر بھی نہیں کیا، نہ امر اور انشاء کا لفظ ذکر کیا ہے، پھر اس مشورہ کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے اور واقعہ اصلی یہ تھا کہ میں تقریر میں ان امور کو گنوا رہا تھا جو کہ ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو انگریزوں سے ہندوستان میں پہنچے ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز ذکر میں ذلت آئی تھی کہ تمام دُنیا میں اس زمانے میں ہم ذلیل شمار کئے جاتے ہیں کیونکہ ساری دنیا کا خیال ہے کہ ہندوستانی (ہندوستان کے باشندے) ایک قوم ہیں اور وہ سب کے سب غلام ہیں اور غلام ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم بیرونی ممالک میں نہایت ذلیل دیکھے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، یہودی وغیرہ کا مذہبی یا نسلی یا صنفی فرق نہیں دیکھتے، اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے متعلق نٹال، ٹرانسوال، کیپ، کالونی، ماریشس، زنجبار، نیروبی، کینیا، فجی، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ وغیرہ نہایت شرمناک اور ذلیل ترین قوانین اپنے یہاں بناتے ہیں اور ہندوستانی باشندوں کو شہری حقوق سے محروم کرتے ہیں اور ہم کوئی امداد وہاں کے ہندوستانی باشندوں کی نہیں کر سکتے۔ کیا ایسا جاپان یا چین یا اطالین یا انگلینڈ یا ڈچ وغیرہ آزاد قوموں کیساتھ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق جو کہ فلسطین، یا سیریا، یا مصر، یا عراق، یا طرابلس، یا الجیریا وغیرہ میں موجود ہیں آوازیں اٹھاتے ہیں مگر کوئی یورپین طاقت ہماری آواز کی طرف توجہ نہیں کرتی اور نہ متاثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ذلت ہے۔

خود برطانیہ کے مقابل ہم اس کے کھلے ہوئے مظالم پر جو کہ ہندوستان اور سرحد وغیرہ میں ہو رہے ہیں برداشت کرتے ہیں اگر وہ کان نہیں دھرتی؛ ہم بیرونی ممالک میں دیگر اقوام کے سامنے اسی غلامی کی وجہ سے ہندوستانی قوم کی تذلیل کرتے ہوئے بارہا مشاہدہ کر چکے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دوسری چیز میں نے ذکر کی تھی " بزدلی اور جبن " اور جنگ سے ناواقفی اور اسکو واضح طور سے ثابت کیا تھا، تیسری چیز " نفاق " چوتھی چیز " فقر و فاقہ "، پانچویں چیز " جہل " چھٹی چیز " کسل اور سستی "، ساتویں چیز " بد خلقی " آٹھویں چیز " بےکاری " وغیرہ۔

مسلمانوں کے لئے خصوصی دارالاسلام کا دارالحرب[1] ہو جانا، عالم اسلام کا اس غلامی کی وجہ سے برباد ہونا، مذہبی امور کا غارت ہونا وغیرہ یہاں کوئی مشورہ بجز اس کے نہیں ذکر کیا گیا تھا کہ اشد ضروری ہے کہ جلد از جلد انتہائی کوشش کر کے ہندوستان کو آزاد کرائیں اگر اس مشورہ کو خلاف دین

---

[1] انگریزی دور اقتدار میں برصغیر ہند کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کی بناء پر تحریک آزادیٔ ہند" مسلمان جماعتوں کا کردار مختلف بلکہ باہم مخاصمت پر مبنی رہا ہے۔ بدایوں اور بریلی کے اہل بدعت کے حلقے جن کی قیادت جناب احمد رضا خاں بریلوی کر رہے تھے اور انگریزی چنگل میں محبوس برصغیر ہند کو " دارالاسلام " قرار دے چکے تھے۔ مسلم لیگ جو درحقیقت انگریز کے لئے سیاسی خدمات کے صلہ میں پیدا ہونے والے جاگیرداروں اور خطاب یافتہ حضرات کے سیاسی مفادات کے تحفظ کی خاطر وجود میں آئی تھی اپنی پیدائش کے وقت سے انگریزوں کی حلیف رہی تھی اور پھر اس کی قیادت انگریزی تہذیب یافتہ اور مذہب سے محض سیاسی لگاؤ رکھتی تھی۔ اس لئے اس کے سامنے " دارالاسلام " اور دارالحرب وغیرہ عنوانات بے معنی سی بات تھی۔ علماء حق کے امام الشاہ عبدالعزیزؒ انگریزی اقتدار کے قیام کے وقت سے ہی ہندوستان کو " دارالحرب " قرار دے چکے تھے۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی جدوجہد اسی حقیقت کی غماز تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اسی حقیقت کی آئینہ دار تھی، ریشمی رومال کی تحریک اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ برصغیر کی شرعی حیثیت کے اسی تعین نے رضاخانی اہل بدعت حضرات کو ہمیشہ ایسے اقدامات پر مجبور کیا جن کے نتیجے میں انگریزی استعمار کے پاؤں مضبوط اور مجاہدین آزادی کی جدوجہد کو نقصان پہنچنے کی بیشمار صورتیں پیدا ہوئیں۔ مسلم لیگ نے ہر اس اقدام کی پیروی کی جس سے انگریزی اقتدار میں جاگیرداروں اور خطاب یافتہ حضرات کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہو مگر علماء حق چونکہ ہندوستان کی شرعی حیثیت میں انقلاب تسلیم کر چکے تھے اس بناء پر ان کی تمامتر جدوجہد کا محور اس منقلبہ حقیقت کو دوبارہ پہلی حالت میں بدلنا رہا ہے۔ مسلم جماعتوں کے اس بنیادی نقطہ نظر اور طرز عمل کے نتیجہ میں وہ عظیم اختلاف سامنے آتا ہے جو برصغیر کی تقسیم کی تجویز پر رونما ہوا۔ یہاں چونکہ اس بحث کی گنجائش نہیں

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

واانت شمار کیا جاتا ہے تو میں باعلان کہتا ہوں کہ میں اسی کو فرض سمجھتا ہوں فذلک ذنب لست منه اتوب دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے اس مشورے کو دوں گا اور میرا اعتقاد ہے کہ اس میں تغیر کرنا مسلمان کے لئے حرام ہے۔ اپنی طاقت کے مطابق اسمیں حصہ لینا ضروری ہے[19]۔

اس وضاحت کے بعد ایک نظر ذرا اس طرز عمل کو دیکھئے جو بزعم خود مسلم قومیت[20] کے علمبرداروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ان کے اسی غیر مسلم رویّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شکوہ برلب ہیں کہ:۔

" قومیت اور وطنیت اور ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے اشعار کے متعلق احباب کے تقاضوں اور استفسارات کی بنا پر میں نے اوائل ذی الحجہ ۵۶ ۱۳ھ میں ایک مفصل بیان شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۱ ذی الحجہ کو مجھے سورت، ہری پور کا دی بنگال، آسام وغیرہ کا سفر درپیش آگیا۔ اس سفر میں ایک ماہ سے کچھ زیادہ صرف ہو گیا اور چونکہ ایک جگہ قیام کرنے کے اسباب بہت کم تھے اس لئے اخبارات کو دیکھنے کی نوبت نہایت کم آئی۔ میرا خیال تھا کہ جو غلط فہمی خود غرض اور برطانیہ پرست اخبار والے اور اشخاص نے پھیلائی تھی وہ اظہار واقعات سے دور ہو جائے گی مگر جب میں ۱۵ محرم ۱۳۵۷ھ کو دیوبند واپس ہوا اور اس مدت کے اخباروں کو دیکھنے کی نوبت آئی تو معلوم ہوا کہ اگرچہ بحیثیت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ | اس لئے محض اتنے اشارہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے تاکہ متجسس نگاہوں کے سامنے تحقیق کا یہ پہلو بھی آجائے اور مستقبل میں آزادئ ہند کی تاریخ لکھنے والے اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھیں۔ ۱۲۔ن۔

[19] مولانا حسین احمد مدنیؒ، متحدہ قومیت اور اسلام ص ۲۰، ۲۱ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء

[20] مسلم لیگ بزعم خود جس مسلم قومیت کی علمبرداری کا دعویٰ کرتی رہی اس کی حقیقت اور نمایاں خدوخال دیکھنے کیلئے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی مشہور کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم ملاحظہ کیجئے۔ ۱۲۔ن۔

[21] اسی صنف کا ایک نمائندہ اخبار "نوائے وقت" آج بھی اسی روش پر چل رہا ہے اور شاید اس کا اب بھی یہی ایمان ہے کہ برصغیر کی آزادی کے نتیجہ میں قائم ہونے والا اسلامی ملک پاکستان ابھی تک انگریزی استعمار کی بالادستی کے نیچے دبا ہوا ہے اور آزادی کی تحریک میں وہ ایک مخصوص ذہن کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ مگر اس کی پالیسی کا دوسرا پہلو انتہائی تعجب خیز ہے کہ وہ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو عیسائیوں، ہنود، پارسیوں، قادیانیوں اور دیگر غیر مسلموں کیساتھ مل کر وطنیت کی بنیاد پر "پاکستانی نزم" کے سانچے میں ڈھل جانے کی ترغیب و ترہیب مسلسل تیس سال سے دے رہا ہے۔ تاریخ کے طالبعلم کے سامنے "آزادئ ہند کے لئے متحدہ قومیت، حرام اور غیر اسلامی اور آزادی کے بعد لقاٹے ملک کے لئے اسی حرام متحدہ قومیت کی تبلیغ" نوائے وقت کی دورخی پالیسی کی عکاسی کرتی ہے پھر اتنا ہی نہیں بلکہ بیک وقت یہ متضاد

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

واقعہ بہت سے اشخاص سے غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا ہے اور ان برطانیہ پرست اخباروں کی افترا پردازی اور جھوٹے پروپیگنڈے کا پردہ اٹھ گیا ہے مگر بحیثیت مشورہ و مطالبہ "قومیت متحدہ" سے الجنیں بڑھ گئی ہیں۔ جناب مدیر "احسان" اور جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بیانات منصۂ نظر سے گزرے اور بہت سے احباب کے خطوط جمع شدہ ڈاک میں دستیاب ہوئے جن میں تقاضا تھا کہ ان بیاناتِ مذکورہ کے متعلق اظہارِ رائے کیا جائے نیز بہت سے احباب نے زبانی بھی تقاضا شدید کیا۔ چونکہ میں عدیم الفرصت بہت زیادہ ہوں، نیز تحریر کی عادت بھی نہیں۔ اس لئے اس امر میں متحیر تھا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ آیا لکھنا اور اظہار رائے کرنا بہتر ہے یا سکوت ہی انسب ہے، ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کا آخری بیان جس میں مرحوم نے اس بحث کو ختم کر دینے کا اعلان فرمایا ہے نظر سے گذرا:۔

"حسین احمد نے اپنے بعض احباب کے خط میں اقرار کیا ہے کہ میرا مقصد دہلی کے بیان میں اخبار (خبر دینا) تھا، انشاء نہ تھا۔ یعنی یہ مقصد تھا کہ فی زمانہ لوگ وطنیت کو قومیت کا ذریعہ بناتے ہیں اس کی خبر دیجائے اور یہ امر واقعی ہے کہ یوریپین اقوام اور ان کے فلاسفر عرصہ سے اس پر گامزن ہیں، اس لئے میں بحث کو ختم کرتا ہوں" (مختصرا)

اس بیان سے اگرچہ دہلی کی تقریر کے متعلق ہیجان رفع ہو گیا مگر نفس مسئلہ اور اس کے لئے اس جدوجہد اور عملی جامہ پہنانے کی سعی کے متعلق جو کہ میرا نہ صرف مشورہ ہی ہے بلکہ میں موجودہ احوال و ادوار میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھتا ہوں، ہیجان اور بڑھ گیا۔ میں نے ۹ ذالحجہ کے بیان میں اس کی طرف توجہ بھی دلائی تھی، اگرچہ دہلی کی تقریر اس کی ترغیب بالکل نہ تھی ملسلئے ضروری معلوم ہوا کہ اس کے متعلق اپنی ناچیز رائے ملک کے سامنے پیش کروں اور ان غلطیوں کا ازالہ کروں جو اس قسم کی متحدہ قومیت سے ممانعت اور خلاف دیانت قرار دینے کے متعلق شائع کی جارہی ہیں۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہلِ ہندوستان سے بنا بر وطنیت اس اتحادِ قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جدوجہد عمل میں لارہی ہے اور اس کی مقابل و مخالف قومیں اس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ | تبلیغ کہ آزادی سے پہلے تحریک آزادی کیلئے ہندوستانی باشندوں کی اجتماعی ہئیت ترتیب دینا تو قابل مواخذہ جرم ہے جو معاف نہیں کیا جاسکتا، مگر اب ملک کی بقا کیلئے ویسی ہی متحدہ قومیت نہ صرف گوارا بلکہ اشد ضروری ہے اور اسکے خلاف ایک لفظ کہنا قابلِ گردن زنی ہے۔ اس گروہ کی تحریک آزادی ہند کے دوران بھی ایسی ہی دو رخی تاریخ کا محفوظ ترین باب ہے۔ (مجیب)

غیر قابلِ قبول ہونے بلکہ ناجائز و حرام ہونے کی انتہائی کوشش عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز خطرناک نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۰۰ء یا اس سے پہلے سے لائی گئی ہے، اور مختلف عنوانوں سے اس کی وحی ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جاتی ہے"۔ ۲۲ے

آزادیٔ ہند کے لئے "متحدہ قومیت" کے مسئلہ پر حضرت مدنیؒ کے نقطۂ نظر اور علامہ اقبال کی تنقید کے بارے میں اس تعارف کے بعد اب ہم اس پہلو کو دیکھتے ہیں کہ حضرت مدنیؒ کے اس نقطۂ نظر کا حقیقی پس منظر کیا ہے؟ اور علامہ اقبال کے حضرت مدنیؒ پر تنقید کرنے کے کیا اسباب تھے؟ نیز قومیت کا مسئلہ کس نے کھڑا کیا؟ تفصیلات کے لئے تو یہاں گنجائش نہیں، اس لئے انتہائی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

"حضرت مدنیؒ کے موقف کا تاریخی پس منظر"

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مدنیؒ نے ہندوستانی مسلمانوں کو تحریک آزادی کی خاطر وطن کی بنیاد پر بننے والی اقوام کی خبر کس بنیاد پر دی تھی، چنانچہ "دشمنانِ اسلام کی پالیسی" کی عنوان سے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے آپؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

> "بانیٔ اسلام (علیہ السلام) کی اس (سے پہلے مذکورہ) تعلیم نے مسلم قوم میں جو اسپرٹ، یگانگت و اتحاد تناصر و تعاون کی پیدا کر دی تھی۔ اس کی کامیابی کو دیکھ کر چھکے چھوٹ گئے اور اس کی انتہائی کوشش کی گئی کہ بانی اسلام کی یہ اسپرٹ جس طرح بھی ہو مسلم قوم سے مٹائی جائے، اسی صورت میں اور صرف اسی صورت میں ہم اس کے عالمگیری حملوں سے بچ سکیں گے اور صرف اسی صورت سے ہم مسلم قوم پر غالب ہو سکیں گے، ہر زمانے میں اس کی کوششیں جاری ہوئیں اور کم و بیش کامیابی ہوئی"۔ ۲۳ے

۲۲ے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ: متحدہ قومیت اور اسلام ص ۲۷ تا ۲۹ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء

۲۳ے "لڑاؤ اور حکومت کرو"، صیہونیت کا یہ قدیم فلسفہ ہے جو مختلف ادوار میں مختلف طریقوں سے روبعمل لایا جاتا رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور نزول وحی کے زمانے میں بھی اس فلسفہ پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی گئی، قرآن مجید نے "مسجد ضرار" کے واقعہ میں اس بارے میں واضح اشارات بیان فرما دیئے ہیں۔ مسجد ضرار کے سایہ میں قائم ہونے والی سازش کے نتائج شہادت فاروق اعظمؓ، شہادتِ عثمانؓ و علیؓ اور واقعہ کربلا کی صورت

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

یورپ چونکہ خلافت عثمانیہ یعنی ترکوں کے ملوں لوہان کے ساتھ مسلم اقوام کے اتحادی اور اتفاقی کا نظارہ کی وجہ سے سخت عاجز و ناتواں ہو چکا تھا اس نے باقاعدہ اور منظم جدوجہد مسلمانوں میں دو قسم کی اسپرٹ پیدا کی۔ ایک نسلی وطنی لسانی امتیاز و افتراق۔ دوم یہ کہ جہاد مذہبی اور روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطان کے لئے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ نکال دی جائے۔

ان دو امور کی مساعی نے خلافت عثمانیہ کو جو کہ سلطان سلیم کے زمانے تک بحر زخار کی طرح موجیں مارتی ہوئی یورپی ممالک میں بڑھتی جا رہی تھی روک دیا۔ اور آہستہ آہستہ گھن کی طرح اسکو اس طرح کمزور کر دیا کہ خود خلافت کی روح سے ترکوں کو بیزاری ہو گئی۔ انہیں وطنی اور نسلی مساعی وغیرہ کی بناء پر رومانیہ، بلگیریا (بلغاریہ) بوسینیا، ہرزگوینیاں، یونان، البانیہ، کریٹ وغیرہ وغیرہ جُدا ہوئے۔ نہ صرف یہاں کی عیسائی قومیں جدا ہو گئیں بلکہ مسلم اقوام کی بھی ہمدردی ترکوں سے مٹائی گئی۔ اور انہی مساعی کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی اقوام اور کُردی برادریوں کو ترکی سے جُدا ہونے کی نوبت آئی اور پھر ان کے جدا کرانے کے بعد انہیں یورپین اقوام نے عراق، شام، فلسطین، طرابلس و عرب وغیرہ میں جس طرح مسلم اقوام کو پیسا ہے اس کی داستان قوت بیان سے باہر ہے۔

افسوس کہ اس وقت مسلمانوں میں کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور ابقاء و وطنیت و نسل و لسان

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ | میں سامنے آئے۔ سقوط بغداد و بیت المقدس کا پیش خیمہ قرار پائے اور آخر کار خلافت عثمانیہ کی معزولی پر منتج ہوئے۔ تحقیقی نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاہ بختی کے اصل ذمہ داروں کو ہی نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ مثال کے طور پر آخری دور میں سید جمال الدین افغانی کو بانی اسلام ازم کا ہیرو قرار دیا جاتا ہے مگر ذرا پس منظر میں جھانک کر دیکھا جائے تو انکی دعالم اسلامی کے اس علمبردار کے ہاتھ ایران کے صفوی اقتدار کے خاتمے اور خلافت عثمانیہ کی تباہی کیلئے ترکی اور عرب علاقوں میں زیر زمین خفیہ وطنی تحریکوں کے قیام کے تانے بانے ملتے نظر آتے ہیں۔ ادیب اسحاق اور سلیم النقاش جیسے کٹر عیسائی ادیب جنکی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ سب سے بڑی حقیقت جو افغانی کے خصوصی شاگرد رشید کے اس اعتراف سے کھلتی ہے کہ وہ فری میسن کے اعلیٰ عہدیدار اور مصر میں فری میسن تنظیم کے بانی تھے، توفیق پاشا وغیرہ حضرات کو فری میسن میں لانیوالے بھی جمال الدین افغانی تھے۔ اس اعتراف کو پڑھنے کے بعد ذہن میں جو یہ خلجان پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ کونسا شخص تھا جو جمال الدین کو ملکوں ملکوں لئے پھرتا تھا جس کی تمام تر اتحادی جدوجہد کے علی الرغم تاریخ میں یوں ثابت ہو گیا کہ خلافت ختم ہو گئی، مسلمانوں کی مرکزیت پارہ پارہ ہو گئی مگر اس جدوجہد کا کوئی مثبت اثر کہیں ظاہر نہ ہو سکا۔ جب تک ہم اپنے ماضی و حال کو مغرب کی عینک

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

وغیرہ کا واعظ کہرانہ ہوا، اور نہ یورپ کے اخبار و رسائل، لکچراروں کی بے حد و بے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانِ اسلام ازم ایک قصۂ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر گیا اور ممالکِ اسلامیہ یورپین اقوام کے لُقمۂ تر بن کر رہ گئے [۱۴]"

اس کے بعد حضرت مدنیؒ مغربی اقوام کی دوسری شاطرانہ چال کا تذکرہ "متحدہ قومیت اور وطنیت سے تنفیر" کے عنوان سے اس طرح بیان فرماتے ہیں ا۔

"اب جبکہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیاء وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم سے کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے کسی غیر مسلم قوم سے اگر مسلمان مل کر وطن یا نسل یا پیشے وغیرہ کے رابطے سے متحدہ قومیت بنائیں تو وہ اسلام کے دشمن، تعلیماتِ اسلامیہ کے مخالف، اسلام کو دوسری اقوام میں منجذب کرنے والے اسلامی ہستی کو مٹا دینے والے، وطنیت کی لعنت کو اختیار کرنے والے ہو جائیں گے۔ شریعت اسلامی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ احکامِ قرآنیہ اس سے اباء کرتے ہیں۔ یہ بعینہٖ وہ قصہ ہے کہ جب تک ہندوستان کی دستکاری اور تجارت زندہ تھی اور ہندوستانی مصنوعات انگلستان اور دور دراز ممالک کے بازاروں پر چھاپہ مارتی تھیں، تو مامون تجارت کے فلسفے کا راگ چاروں طرف گونجایا جاتا تھا۔ تمام تصانیف اور اخبارات، لکچر اور تقریریں اس سے بھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس طرح اس کی تعریف اور مدح سرائی ہوتی تھی کہ گویا یہی چیز عالم انسانیت کیلئے آبِ حیات ہے مگر جب اس کے ذریعے سے ہندوستانی دستکاری اور تجارت کو کمزور کر دیا گیا اور انگلستان کی دستکاری نے زور پکڑ لیا تو آزاد تجارت (فری ٹریڈ) کا وعظ سنایا جانے لگا اور پہلا فلسفہ مامون تجارت کا بالکل غلط کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی دستکاری اور تجارت کو یک قلم فنا کر دیا گیا۔ اسی طرح جب تک مسلمان قوی اور غالب رہے تو یہ فلسفہ پیش کیا جاتا رہا کہ یورپ کا نقشہ بدلا نہیں جا سکتا۔ کوئی فاتح اور غالب کسی زمین کو حاصل کر کے اپنے قبضے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ سے دیکھتے رہیں گے تب تک ہماری تاریخیں یوں ہی سیاہ پردوں میں چھپی رہے گی۔
تفصیلات کیلئے محمد عبدہٗ کی "تاریخ الاستاذ الامام" ص ۴۰، ۴۶ ج ۱ ملاحظہ فرمائیں۔ اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا منہ - ۱۲ ان

[۱۴] مولانا حسین احمد مدنیؒ، متحدہ قومیت اور اسلام" ص ۵۴، ۵۵ مطبوعہ ۱۹۰۵ء

میں نہیں رکھ سکتا اور نہ اپنی مملوکات میں ملا سکتا ہے۔ مگر جبکہ مسلمان مغلوب ہو گئے تو فلسفہ بدل گیا اور چاروں طرف سے یہ آواز آنے لگی کہ کسی فاتح کو اس کے نتائج عمل سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لئے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو کہ ہم نے پروفیسر سیلے کے مقالے سے نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ ضعیف سے ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود نہ بھی ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ انہیں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لئے اشتراک عمل شرمناک امر ہے۔ انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائیگا، پس وہ وطنیت جس کی مغرب منہ بھر بھر کر تعریف کیا کرتا تھا جب تک اسلام اور خلافتِ اسلامیہ باقی تھے نہایت ممدوح اور قابل تعریف امر تھی۔ مگر آج ہندوستان میں خرابی ممالک اسلام کے بعد وہی وطنیت ملعون اور بدترین چیز بن گئی" ان هذا الشیٔ عجیب [۲۵]

اس پس منظر کی روشنی میں تحریک آزادیٔ ہند کے دوران متحدہ قومیت کی ضرورت اور ہندوستانیوں کیلئے متحدہ قومیت کے مخالفین کے فکری سلیقے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد

برصغیر میں "متحدہ قومیت" کے سلسلے میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ علامہ اقبال اور ان کے مقلدین کے روحانی و سیاسی پیشوا و سرپرستِ اعلیٰ جناب سر سیّد احمد خان صاحب ہی تو ہندوستان میں متحدہ قومیت کی بنیاد رکھنے والوں میں شامل ہیں۔ وہ برملا یہ کہا کرتے تھے کہ:

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو! کہ ہندوستان اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو اور مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہئے۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں" [۲۶]

[۲۵] مولانا حسین احمد مدنیؒ : متحدہ قومیت اور اسلام ص ۵۵ تا ۵۷ مطبوعہ ۱۹۶۵ء لاہور۔
[۲۶] مجموعہ لکچرز سر سیّد ص ۱۶۷، روشن مستقبل ص ۲۵ بحوالہ متحدہ قومیت اور اسلام ص ۸۸۔

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں:۔

"جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاتے ہیں ۲۷؎"

وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک اعلان کرتے ہیں کہ:۔

"آپنے جو لفظ (اپنے لئے) ہندو کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ ہندو نہیں سمجھتے" ۲۸؎

سرسیدؒ احمد خان ہندو مسلم اتحاد کا درس اس طرح دیتے ہیں کہ:۔

"ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں، اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر ہیں، اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائیگی ۲۹؎"

یہ سب علامہ اقبال مرحوم کے بھی سامنے تھیں اور بعد کے لوگوں کے بھی، مگر ہمیں تعجب ہے کہ اس کا تذکرہ تک کسی تنقیدی کتاب یا مقالے میں نہیں ملتا اس کے برعکس سرسیدؒ آج تک قومی ہیرو کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں اور حضرت مدنیؒ نے نہ صرف یہ کہ مغرب کے اس تراشیدہ ہتھیار کو خود اسی پر آزمانے کی بات کی بلکہ قرآن و سنت کے واضح دلائل کے ذریعے ثابت بھی کر دیا لیکن بزعمِ خود عقلمند لوگ اس سیاسی و علمی حقیقت کو مغربی تکنیکی پروپیگنڈے کے زور سے ایک گالی بنا کر مسلمانوں کو علماء کے خلاف برانگیختہ کرنے کی مذموم کوشش کو ہی خدمتِ دین قرار دینا چاہتے ہیں۔ جب جدوجہدِ آزادیٔ ہند کی صحیح تاریخ لکھی جائے گی تو اس تلون مزاجی کا یقیناً تجزیہ کیا جائے گا۔

۲۷؎ سرسید کے آخری مضامین ص ۵۵ بحوالہ متحدہ قومیت اور اسلام ص ۸۸

۲۸؎ سفرنامہ پنجاب سرسیدؒ ص ۱۳۹ و روشن مستقبل ص ۲۷۱ بحوالہ متحدہ قومیت اور اسلام ص ۸۸

۲۹؎ سرسید کے آخری مضامین ص ۵۵ بحوالہ متحدہ قومیت اور اسلام ص ۸۹

علامہ اقبال، ان کا فہم دین اور مسئلہ قومیت

علامہ اقبال کا جو تعارف آج تک کرایا جاتا رہا ہے اس سے ایک فلسفی شاعر کا سراپا اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ اعزاز گرچہ اہلِ دُنیا کی نظر میں کسی بڑی شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صرف اس اعزاز پر نازاں افراد کے لئے اس طرح پر ہے کہ اس نے اپنے انتہائی برگزیدہ بندوں اور مقربین یعنی انبیاء علیہ السلام کے لئے صفتِ شعریت متصف ہونے کو مذموم قرار دیتے ہوئے اس کی یوں نفی کر دی ہے، ارشاد ہے۔

وماعلمناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر وقرآن مبین ۰ ؎۱

اور شاعر ہونے کے اعزاز کی مذمت کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان فرمایا کہ۔

والشعرآء یتبعھم الغاون ۰ الم ترانھم فی کل واد یھیمون ۰ وانھم یقولون مالا یفعلون ۰ ؎۲ (شعراء ۲۲۴-۲۲۶)

ان دو ارشادات کی روشنی میں "علامہ اقبال ایک فلسفی شاعر" کا جو مقام و مرتبہ شریعت اسلامیہ میں متعین ہوتا ہے وہ ہر ذی عقل پر عیاں ہے۔ اس حقیقت کے آشکارا ہو جانے سے کم از کم یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ کو فلسفی اور شاعر کا اعزاز دیکر بام عروج تک پہنچایا جا سکتا ہے مگر قرآن و سنت کے مفاہیم متعین کرنے میں ان کے کسی قول یا نظریے کو بطور استدلال اختیار کرنا قرآن کے مذکورہ بالا ارشاد کا کھلا ہوا مصداق قرار پائیگا۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں علامہ اقبال نے جو نقطۂ نظر اپنایا تھا اس پر کئی وجوہ سے بحث ہو سکتی ہے مثلاً:۔

پہلی وجہ علامہ اقبال نے جن اساتذہ سے اعلیٰ دُنیاوی علوم کی تحصیل کی ہے وہ نہ صرف غیر مسلم تھے بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر تاریخ عالم شہادت بیّنہ پیش کرتی ہے۔ پھر ان اساتذہ سے علامہ نے جو علوم حاصل کئے ان کی اصل بنیاد تغیر پذیر مغربی فلسفہ تھا جس میں ایک منزل پر ٹھہراؤ اس کے زوال کا پہلا زینہ بن سکتا تھا، ادھر اسلام سے علامہ اقبال کا لگاؤ تحقیقی ہونے کے بجائے زیادہ تر جذباتی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات و نظریات میں نہ تو ٹھہراؤ نظر آتا ہے اور نہ گہرائی۔ ایک وقت میں وہ وطنیت و متحدہ قومیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں تو دوسرے وقت میں اسی کو مذہب کا کفن اور مردود ٹھہرانے لگتے ہیں۔ جی میں آیا تو خدا سے شکوہ و شکایت کرنے لگے اور طبیعت کی جولانی ہوئی تو خدا کی زبان بن کر (نعوذ باللہ من ذٰلک) انسان کے شکووں کا جواب دینے لگے۔ جس مغربی تہذیب کی آغوش میں پروان چڑھے اسی کے جدید الٰہیات کے فلسفے کو اپنایا اور پھر اسی پر بھرپور تنقید کرنے بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مردود مغربی

؎۱ اور ہم نے آپ کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ یہ ان کی شان کے لائق ہے وہ تو صرف ذکر اور قرآن مبین ہے۔

؎۲ اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں، تونے نہیں دیکھا کہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔ (شیخ الہند)

تہذیب کی آغوش میں نہ صرف اپنی اولاد کو سُلا دیا بلکہ برِّ صغیر کے اسی گروہ کو ان کی ہمدردیاں حاصل ہوئیں جو مغربی تہذیب میں سرتاپا غرق ہو چکا تھا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو فی کل وادٍ یہیمون کی صفات کا حامل ایسا شخص اگر ان لوگوں پر علمی تنقید کرتا ہے جو علوم قرآن وسنّت کے نہ صرف غوّاص ہیں بلکہ ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ قرآن وسُنّت کی ہدایات کے مطابق بسر ہوتا ہے تو ایسے شخص کو کس زمرے میں شمار کیا جانا چاہیے؟ اور پھر جو لوگ اس معاملہ میں اس کی پیروی کریں اور علماءِ رُبانی کے خلاف اس کی باتوں سے استدلال کریں کیا وہ شعراء یتبعھم الغاوٗن کے ارشاد رَبانی کا مصداق قرار نہیں پائیں گے؟!۔

دوسری وجہ علامہ اقبال ایک انتہائی جذباتی انسان تھے۔ اور ایک شاعر کیلئے ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ چنانچہ اسی جذباتیت کے سبب علامہ اقبال کی تنقیدی چیرہ دستی سے قائدِ اعظم جیسے ان کے اپنے محبوب رہنما تک محفوظ نہیں رہ سکے۔ آج نئی نسل شاید علامہ اقبال کے اس قطعہ سے ناآشنا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر ۔ اُترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تُو کہ رہے گی بتا ہمیں ۔ اے جانِ برلب آمدہ تیری کیا صلاح
دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے ۔ مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب ۔ اس دین میں ہے ترک سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ ہست ۔ یعنی حجابِ غیرتِ کبریٰ دریدہ ہست

روزنامہ زمیندار مورخہ ۹ رنومبر ۱۹۲۱ء [۳۲]

جذباتی فیصلے بڑی کم عمری لیکر آتے ہیں، علامہ کی مذکورہ تنقید بھی ایک بُلبلہ ثابت ہوئی اور ان کو اس سے رجوع کرنا پڑا۔ ان کی اسی جذباتیت نے بلاتحقیق ایک غلط اخباری رپورٹ کی بنیاد پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف وہ مشہور قطعہ کہلوا ڈالا جس کا تذکرہ پیچھے گذرا، اور اس کو بھی اپنی کم عمر طبعی کو پہنچنا ہی تھا، چنانچہ علامہ کے حضرتِ طالوت کے نام خطوط، اور پھر روزنامہ "احسان" ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء و "مدینہ" ۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں الکو اپنا غلطی نامہ شائع کرنا پڑا۔[۳۳] لیکن علماء دشمن مغرب زدہ طبقہ اس لاشے کو نئے کفن پہنا کر تابوت میں سجائے پھر رہا ہے۔

تیسری وجہ تلوّن مزاجی ایک ایسا مرض ہے جو انسان کے ذہنی زاویئے تبدیل کرتا رہتا ہے، تلوّن مزاجی کے دو بڑے اسباب ہوتے ہیں، علم کی سطحیت اور کردار وعمل کی پختگی۔ انیسویں صدی کے نصف

---

[۳۲] افضل حق قرشی:۔ اقبال کے ممدوح علماء ص ۱۱۹، مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۷۷ء
[۳۳] " " " " ص ۱۲۲، مولانا مدنیؒ:۔ "متحدہ قومیت اور اسلام" ص ۲۳

آخر میں جب سے اقوامِ مغرب کا اسلامی دنیا پر تسلط ہوا مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس کا شکار ہو گیا، بلکہ بعض ناعاقبت اندیش لیڈروں نے منصوبہ بندی اور پیہم بازی کے ذریعے مسلمانوں کو اس راستے پر گامزن کرنے کی پوری پوری کوششیں صرف کر ڈالیں۔ برِصغیر میں اس کا سہرا سر سید احمد خاں صاحب کے سر پر بندھ چکا ہے۔ ان کی تحریک نے ایک طرف مسلمانوں کو کلیتہً مغرب کی گود میں ڈالنے کی سعی کی تو دوسری طرف دینی و دنیوی علوم میں مسلمانوں کو ایسی سطحیت میں گرفتار کرانے کا کام انجام دیا کہ برِصغیر کے مسلمانوں کو اپنا ملی تشخص برقرار رکھنا بھی ایک سنگین مسئلہ بن گیا۔ نقالی نے کردار و عمل کو مسخ کر کے ملتِ اسلامیہ کو جو کم از کم نقصان پہنچایا وہ اس تلون مزاجی کا شکار ہو جانا تھا۔

علامہ اقبال مرحوم کے افکار و عمل میں یہ تلون مزاجی مغربی علوم کے تربیت یافتہ کسی بڑے آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھی، اقبالیات کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنے والے کے سامنے اس کی ایسی واضح مثالیں آتی ہیں کہ اس سے ایک مستقل مقالہ تیار ہو سکتا ہے چنانچہ یہی تلون مزاجی عملی سیاست میں کبھی اقبال کو ہندوستانی بنا دیتی ہے اور کبھی مسلم لیگ کی مجلسوں میں پہنچا دیتی ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر جذباتی تنقید کا ایک محرک اس تلون مزاجی کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

چوتھی وجہ

دینی علوم کے بارے میں سطحی معلومات بھی علامہ اقبال کے فکر و عمل کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ قرآن و سنت کی زبان اور اس کے علوم سے براہِ راست عدمِ واقفیت اس کا بڑا سبب ہے، چنانچہ علامہ اقبال عربی لغت کے لفظ "ملت" اور "قوم" میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ علامہ کے کلام اور دوسرے خطوط و مضامین سے یہی ثابت ہوتا ہے حالانکہ قرآن و سنت میں ان دونوں کا مفہوم جدا جدا بیان کیا گیا ہے اور پھر علامہ کا "نظریۂ ملت" بھی تو قرآن و سنت اور لغت عرب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ علامہ کے نزدیک "قوم و ملت اور اُمت" وغیرہ الفاظ مترادف معنی میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔[۳۴]

ایک استدراک

گذشتہ سطور میں علامہ اقبال کے بارے میں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ اس بنیاد پر ہے کہ علامہ اقبال کو محض "ایک فلسفی شاعر" کی حیثیت سے دیکھا جائے، مگر ہماری نظر میں علامہ کا اس طرح سے تعارف اِن کی شخصیت کو داغدار کرنے اور گھٹا کر پیش کرنے کی ایک سازش کا حصہ ہے۔

حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اقبال علماءِ حق کی صحبت اختیار کرنے کے بعد "محض فلسفی شاعر" سے ترقی کر کے "مسلمان فلسفی شاعر" ہو گئے تھے اور کوئی سچا مسلمان علماءِ حق کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ علامہ مرحوم کے نزدیک "اسلام نام ہے علماءِ باعمل کی صحبت کا"، یہی وجہ ہے کہ آخری دور میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، سید سلیمان ندویؒ، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ جیسی نادرِ روزگار ہستیوں کے ساتھ علامہ اقبال کے

---

[۳۴] افضل حق قرشی صاحب کی تالیف: "اقبال کے ممدوح علماء" اس موضوع پر اچھی کتاب ہے۔ ۱۲۔ ن۔

گہرے عقیدت مندانہ مراسم قائم ہو گئے تھے اور وہ اب اہل علم سے پوشیدہ نہیں رہے۔ اقبال کی زندگی کا یہ پہلو اتنا وسیع ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے[۳۵]

قومیت کا مسئلہ کس نے کھڑا کیا؟ آزادیٔ ہند کی تحریک کے دوران قومیت کا مسئلہ کس نے کھڑا کیا، اور کیوں کھڑا کیا؟ اس کا واقعی جواب تو تحریک آزادیٔ ہند کا اصل مؤرخ ہی دے گا، البتہ ہم اس ضمن میں علامہ شبلی نعمانی کا یہ ریمارکس نقل کر دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:۔

"وہ پُرزور دست و قلم جس نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جبکہ کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں، اور جو کچھ اس نے ۲۰ آرٹیکلوں میں لکھا کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پُرزور نہیں پیدا کر سکتا، وہ جانباز جو آگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجے پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اور یہ صرف انہی کی بدولت ہے کہ علم و آزادی اور حب وطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہو۔ میں سچ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالیقین ہندوستان کی قوموں کے سرتاج ہیں۔
حالات اور گرد و پیش کے واقعات نے اسکو اس پر مجبور کر دیا کہ اس کے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روکدیا۔ یہ کیوں ہوا، کن اسباب سے ہوا، کس چیز نے دفعتاً یہ اختلاف پیدا کر دیا ان سوالات کا جواب آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ آج اجتہاد اور تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے[۳۶]"

سر سید احمد خانصاحب کے بارے میں علامہ شبلی کا یہ ریمارکس اس وجہ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ علامہ سر سید کے دست راست اور مداح رہے ہیں ہم تو اس وقت یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

حرفِ آخر اس نشست میں مذکورہ مسئلہ کے ہر پہلو کے بارے میں جائزہ لینے کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ ہی اسوقت اسکی ضرورت۔ ان سطور میں ہمارا مقصد مختصر انداز میں اس بات کی وضاحت تھا کہ مسئلہ قومیت کا اصلی پس منظر کیا ہے، علامہ اقبال مرحوم کے حضرت مدنیؒ پر تنقید کی وجہ کیا تھی؟ اپنی دانست کے مطابق ہم نے ایک تجزیہ پیش کر دیا ہے اور اس امید کیساتھ پیش کیا ہے کہ علامہ اقبال کی دوستی کا دم بھرنیوالے بعض نادان دوست علماء حق کے خلاف معاندانہ رویہ رکھنے میں علامہ اقبال کو ملوث کرنیکی روش ترک کر دیں گے کیونکہ اب اس ترکش کے تیر بوسیدہ ہو چکے ہیں۔"

---

[۳۵] افضل حق قرشی کی تالیف "اقبال کے ممدوح علماء" ۱۲ [۳۶] مولانا مدنیؒ:۔ "متحدہ قومیت اور اسلام"

سید نفیس الحسینی

فاعتبروا یا اولی الابصار

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری سفر پنجاب کی رُوح فرسا رُوداد

پندرہ بیس برس پیشتر حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "اسوۂ حسینی" نظر سے گزری۔ یہ کتاب ریحانۃ النبی حضرت سیدنا حسین رضی اللہ تعالے عنہ کے حالات مبارکہ اور واقعات شہادت پر مشتمل ہے۔ آخر میں قاتلان جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے انجام نافرجام کا ذکر کیا ہے۔ امام زہری رہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ۔

"جو لوگ قتل حسین رض میں شریک تھے، ان میں سے ایک بھی نہیں بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو۔"

چند مثالیں پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"ابن جوزی نے سدی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص کی دعوت کی۔ مجلس میں یہ ذکر چلا کہ حسین رض کے قتل میں جو بھی شریک ہوا، اس کو دنیا میں ہی جلد سزا مل گئی۔ اس شخص نے کہا کہ بالکل غلط ہے۔ میں خود ان کے قتل میں شریک تھا۔ میرا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ یہ شخص مجلس سے اٹھ کر گھر گیا۔ جاتے ہی چراغ کی بتی درست کرتے ہوئے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہیں جل بھن کر رہ گیا۔ سدی کہتے ہیں کہ میں نے خود اس کو صبح دیکھا تو کوئلہ ہو چکا تھا!"

(ص ۱۰۱-۱۰۲)

اللہ کے جو بندے اپنی تکلیف پر اپنا معاملہ اپنے اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کے دشمنوں سے شدید انتقام لیتا ہے ؎

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اسکی
ڈر اس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اسکا

ہمارے عہد کو بھی ایک حسین عطا کیا گیا۔ جس کا نسبی و حسبی رشتہ شہید کربلا سیدنا حسین رضؓ سے جسمانی و روحانی طور پر متصل ہے۔ یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ۔

اس حسین ثانی پر مصیبتوں کے بڑے بڑے پہاڑ ٹوٹے۔ لیکن کوہ عزم و استقلال کو جنبش تک نہ ہوئی۔ مخالفوں نے کیسے کیسے تیر ان پر برسائے لیکن ان کا چہرہ متبسم ہی رہا۔ حریفوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ لیکن ان کے لب پر حرف شکایت تک نہ آیا۔

انہوں نے اپنی عمر عزیز استخلاص وطن اور سربلندی اسلام کی جد وجہد میں گزاری۔ انگریز اور اس کے "نمک خوار" ہمیشہ ان کی مخالفت میں زبان دراز رہے۔ لیکن اس مجاہد دین وملت اور غازی سر بکف نے آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ کہ یہ کوتاہ بین وکور باطن کیا کہہ رہے ہیں۔

میدان عزیمت کا یہ شہسوار محمدی علم لہرائے آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ راستے کی تاریکی اس کے انوار شریعت و طریقت سے چھٹ گئی۔ اس کا راستہ روکنے والوں کو غبار کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اور کانٹے بچھانے والوں کو خود اس راستہ سے گزرنا پڑا۔ "چاہ کن را چاہ درپیش"

ایک ہندی دوہا جو غالباً عبدالرحیم خانخاناں کا ہے۔ بحسب حال نظر آتا ہے۔

جو تو کو کانٹ بوئے تاہی بوئے تو پھول
تُو کو پھول کے پھول ہیں واکو ہیں ترسول

ترجمہ:۔ جو تیرے لئے کانٹے بوئے تو اس کے لئے پھول بو۔ تیرے لئے تو پھول کے پھول ہیں۔ اور اس کے لئے تین تین نوک والے کانٹے"

حضرت اقدس مدنی قدس سرہ عفو و درگزر کے پیکر تھے۔ انہوں نے اپنے مخالفوں کے لئے کبھی بد دعا نہیں فرمائی۔ بلکہ دعائے نیم شبی میں سب کے لئے اپنے مالک سے فضل و انعام اور عفو و مغفرت مانگتے تھے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات اکثر و بیشتر سننے میں آتے رہے ہیں۔ راقم سطور نے جناب عطاء الحق و حافظ عبدالرحمٰن جالندھری (حال مقیم محلہ گورونانک پورہ فیصل آباد) جو سیدی و مولائی قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہٗ (م ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء) سے تعلق بیعت رکھتے ہیں۔ کی زبانی ناخوشگوار واقعات کئی دفعہ سنے۔ ان واقعات کے وہ ثقہ راوی ہیں۔ نتائج کے بارے میں ان کی حیثیت عینی گواہوں کی ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ میں ان واقعات کو سپرد قلم کرنے کی نوبت آگئی۔ بھائی عطاء الحق بیان کرتے گئے، میں قلم بند کرتا چلا گیا۔ یہ واقعات حقیقت ہیں، افسانہ نہیں۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ جگر گوشۂ رسولؐ کی توہین کرنے والوں کا حشر کیا ہوا؟

تقسیم برصغیر سے چند ماہ پیشتر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ دیوبند سے پنجاب تشریف لائے۔ مختلف شہروں میں رونق افروز ہوئے۔ مقصد سفر پورا کرنے کے بعد لاہور سے میل پر سوار ہوئے۔ اسی گاڑی سے مشہور مسلم لیگی لیڈر راجہ غضنفر علی خاں کے سفر کا پروگرام تھا۔ اتفاقاً اس کا سفر ملتوی ہو گیا۔ لیکن پروگرام کے مطابق ہر اسٹیشن پر مسلم لیگی کارکن استقبال کے لئے موجود رہتے۔ جب گاڑی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ تو مسلم لیگی کارکن راجہ غضنفر علی کو تلاش کرنے لگے۔ ریلوے گارڈ نے کارکنوں کو بتایا کہ راجہ صاحب کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔ وہ اس گاڑی میں سفر نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس نے شرارتاً بتایا کہ اس گاڑی کے فلاں ڈبے میں مولانا حسین احمد مدنی سفر کر رہے ہیں۔ اس پر وہ تمام مسلم لیگی کارکن اس ڈبے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور حضرت کے خلاف نعرہ بازی اور ہلڑ بازی شروع کر دی۔ ٹماٹر وغیرہ ان پر پھینکنے لگے۔ اتفاقاً امرتسر کا ایک نوجوان عبدالرشید اپنا مال بک کرانے کی غرض سے اسٹیشن پر آیا ہوا تھا اس نے ایک ڈبے کے پاس ہجوم دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ کے ساتھ یہ لوگ نہایت بدتمیزی کر رہے ہیں وہ حضرت مدنی رح کو جانتا بھی نہیں تھا۔

بھائی عطاء الحق صاحب کو یہ واقعہ خود عبدالرشید نے پنڈی میں سنایا۔ عبدالرشید امرتسر میں فروٹ کا کمیشن ایجنٹ تھا۔ وہ تقسیم ملک کے بعد راولپنڈی میں مقیم ہوا۔ یہاں بھی وہ یہی کاروبار کرتا تھا۔ عبدالرشید نہایت صحت مند نوجوان تھا۔ اس نے جان پر کھیل کر حضرت اقدس مدنی رح کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ مجمع ڈبے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ عبدالرشید ڈبے کے دروازے میں پائیدان پر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مسلم لیگی مجمع اس پر ٹوٹ پڑا۔ اور اس کو بے دریغ زد و کوب کیا۔ حتیٰ کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے لیکن مرد مجاہد نے حضرت مدنی رح کی طرف ہجوم کو بڑھنے نہ دیا۔ حتیٰ کہ گاڑی چل پڑی۔ اور وہ پلیٹ فارم پار کرنے کے بعد گاڑی سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔

جب یہ گاڑی جالندھر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ تو یہاں کے مسلم لیگی کارکن بھی راجہ غضنفر علی خاں کے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ گاڑی رکتے ہی گارڈ نے انہیں راجہ صاحب کے پروگرام کے التواء کی خبر دی اور حضرت مدنی رح کی نشاندہی کی۔ جس پر وہ مجمع حضرت کے ڈبے میں جا پہنچا۔ اور وہی طوفان بدتمیزی شروع کر دیا۔ اس مجمع کے سرغنہ تین مسلم لیگی نوجوان شمس الحق عرف شمی۔ فضل محمد اور فتح محمد تھے۔

فضل محمد اور فتح محمد جالندھر کے محلہ پرانی کچہری۔ اور شمس الحق عرف شمی محلہ عالی کا رہنے والا تھا۔ انہوں نے حضرت اقدس مدنی رح کی توہین میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ گالیاں دیں۔ گندی چیزیں پھینکیں۔ حضرت کا تکیہ چھینا، ٹوپی بھی اتار پھینکی۔ ریش مبارک نوچی۔ اور شمی نے دست درازی بھی کی۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ صبر جمیل مجسم صورت بنے،

بیٹھے تھے۔ حضرت کے ساتھ ایک خادم بھی تھا۔ وہ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے مزاحمت کا ارادہ کیا تو حضرت نے اسے منع فرمادیا۔ کہ تم خاموش رہو۔ اگر تم یہ برداشت نہیں کر سکتے تو دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ استنے میں گاڑی چل دی، اور مسلم لیگی کارکن اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

صبح کو ان مسلم لیگی کارکنوں نے فخریہ انداز میں رات کا واقعہ اپنے محلہ پرانی کچہری میں بیان کیا۔ اس محلہ میں خانقاہ عالیہ رائے پور (ضلع سہارنپور) سے تعلق رکھنے والوں کا ایک نہایت با اثر حلقہ تھا۔ یہاں قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری۔ اور حضرت منشی رحمت علی صاحب قدس سرہما کی تشریف آوری ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے جب حضرت اقدس مدنی رح کی توہین کا روح فرسا واقعہ سنا تو ان پر اس کا نہایت شدید اثر ہوا۔ عبدالحق بن چوہدری فضل محمد (حال مقیم گلی نمبر ۳ محلہ گورو نانک پورہ فیصل آباد) نے فتح محمد کی زبانی گستاخانہ کلمات سنے تو وہ برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے موقع پر ہی اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اور کہا کہ اب بتاؤ رات کیا قصہ ہوا تھا۔ اور ساتھ ہی زوردار تھپڑ بھی اسے رسید کر دیئے۔ جس پر فتح محمد جو فخریہ اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا، ساکت ہو گیا۔ اور اسے جرأت نہ ہو سکی کہ وہ کوئی بات کر سکے۔ استنے میں چوہدری امام الدین صاحب (والد بھائی عبدالحق) بھی آگئے۔ انہیں جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنا جوتا اتار لیا۔ اور فتح محمد کی خوب پٹائی کی۔ حتیٰ کہ فتح محمد نے ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگی۔ چوہدری امام الدین صاحب نے تنبیہہ عام کر دی کہ اگر کسی نے ہمارے بزرگوں کے خلاف زبان درازی کی تو اس کا حشر برا ہو گا۔ اور ہم اسے کیفر کردار تک پہنچا کر چھوڑیں گے۔

دوسرے سرغنہ فضل محمد کا حشر یہ ہوا کہ وہ رات کو جب اپنے گھر واپس پہنچا تو اسے بخار ہو گیا۔ صبح جب بیدار ہوا تو اس کی پشت پر دو پھوڑے (دنبل) ظاہر ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہ رہا۔ اور سخت تکلیف میں کراہتا تھا۔ پانچ چھ روز کے بعد چوہدری امام الدین نے اس کی والدہ سے جو دکان پر سودا خریدنے کے لئے آئی تھی، پوچھا کہ فضل کتنی روز سے نظر نہیں آیا؟ اس نے بتایا کہ وہ سخت بیمار ہے۔ اس کی پشت پر پھوڑے نکل آئے ہیں۔

بھائی عطاء الحق صاحب کا بیان ہے کہ پھوڑوں میں کیڑے پڑ گئے اور انہوں نے جسم کو کھانا شروع کر دیا پھوڑے تین انچ قطر سے کم نہیں تھے۔ ڈاکٹروں نے یہ تجویز کیا کہ ان ناسوروں میں روزانہ قیمہ بھر دیا جائے۔ تاکہ کیڑے جسم کو نہ کھائیں۔ چنانچہ روزانہ پاؤ پاؤ بھر قیمہ ان دونوں ناسوروں میں بھر دیا جاتا تھا۔ دن بھر میں کیڑے اس کو کھا جاتے تھے۔ دوسرے روز نئے سرے سے قیمہ بھرا جاتا تھا۔

چند ماہ بعد ملک تقسیم ہو گیا اور آبادیوں کا تبادلہ شروع ہوا۔ محلہ کچہری کے سب لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ریفیوجی کیمپ واقع جالندھر چھاؤنی میں منتقل ہو گئے۔ لیکن خدا کی شان کہ فضل محمد اور فتح محمد اپنے اہل و عیال

سمیت وہیں رہے۔ حالانکہ ان کے رشتہ داروں نے ہر چند اصرار کیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ لیکن انہوں نے کسی کی نہ مانی۔ دوسرے دن فضل محمد اور فتح محمد نکلنے پر مجبور ہوئے۔ فضل محمد ایک ہندو کارخانہ دار بھولا ناتھ کا ملازم تھا۔ وہ مع اہل وعیال اس کے ہاں چلا گیا۔ فتح محمد بھی پناہ حاصل کرنے کی غرض سے گھر سے اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ نکلا۔ لیکن راستے ہی میں ایک سکھ جتھے کے ہاتھوں ریلوے پھاٹک نزد اڈہ ہوشیارپور اہل و عیال سمیت بری طرح قتل کر دیا گیا۔

فضل محمد چھ سات روز کے بعد اپنے مالک بھولا ناتھ کی مدد سے ریفیوجی کیمپ واقع جالندھر چھاؤنی میں، اہل وعیال سمیت پہنچ گیا۔ فضل محمد مرض سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ وہ موت کی دعائیں کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ اسے کوئی مار ڈالے۔ لیکن قدرت تو اسے نمونۂ عبرت بنانا چاہتی تھی۔ وہ زندہ وسلامت لاہور پہنچ گیا۔ محلہ پرانی کچہری جالندھر کے تقریباً تمام افراد انجینئرنگ کالج کے ہوسٹل نزد ریلوے اسٹیشن عقب آسٹریلیا بلڈنگ میں یکے بعد دیگرے آ کر مقیم ہوتے رہے۔ فضل محمد بھی بیوی بچوں سمیت وہاں آ گیا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ دن رات بے چین و بے قرار رہتا تھا اور ہر وقت تکلیف سے کراہتا رہتا تھا۔ اس کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ وہ ننگے بدن صرف ایک تہ بند باندھے رہتا تھا۔ اس حالت میں وہ ایک ماہ لاہور میں مقیم رہا۔ پھر وسط اکتوبر میں وہ فیصل آباد آ گیا۔ اور محلہ گورونانک پورہ گلی نمبر ۳ جہاں محلہ پرانی کچہری جالندھر کے رہنے والے بیشتر لوگ آباد ہو چکے تھے رہنے آ گیا۔ اس کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا۔ یہاں چند ماہ بعد اس کا اسی بیماری کی حالت میں انتقال ہو گیا۔ اس کی میت کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کی لاش ایسی متعفن ہو گئی تھی کہ غسل دینے کو کوئی تیار نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے اپنے ناک و منہ پر کپڑا باندھ کر یوں ہی پانی بہا دیا۔ اور جلد از جلد قبرستان لے جا کر دفن کر دیا۔

٭ ٭ ٭

اب شمس الحق کا حال سنیئے! یہ شخص جالندھر سے فیصل آباد آ کر آباد ہوا۔ یہاں آ کر بھی اس نے مسلم لیگی کارکن کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر کام کرنا شروع کر دیا۔ جلسوں میں بڑے زور وشور سے تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک اخبار "انصاف" بھی جاری کیا۔ لیکن اس شخص کو کبھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ راقم سطور نے بھی اس کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ وہ بڑا بدمزاج اور زبان دراز شخص تھا۔

بھائی عطاء الحق کا بیان ہے کہ میں ڈی سی آفس میں بطور کلرک ملازم تھا۔ میرے پاس پریس سے متعلقہ کام بھی تھا۔ شمس الحق اخبار کے سلسلے میں اکثر میرے پاس آتا جاتا تھا۔ ۱۹۴۹ء کی ابتدا کا یہ واقعہ ہے کہ اخبار کے ڈیکلریشن کے سلسلے میں وہ میرے پاس آیا۔ اور تقریباً آدھ گھنٹہ کا غذات کی تکمیل کے سلسلے میں میرے پاس بیٹھا رہا۔ کاغذات مکمل کرنے کے بعد مجھے دے کر کچہری سے چلا گیا۔ آخری دفعہ کچہری کے گیٹ پر اسے دیکھا گیا۔ اس کے

بعد آج تک اس کا پتہ نہیں مل سکا۔
اس کے اغوا کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی۔ اخبارات میں ضمیمے شائع ہوئے۔ پاکستان بھر میں پوسٹر لگے۔ پتہ دینے والے کے لئے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ انجمن مہاجرین جالندھر نے ملک گیر تحریک چلائی۔ کئی وفد وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملے۔ حکومت کی طرف سے یقین دہانیاں بھی ہوئیں۔ لیکن مقبول بارگاہ رسالت مآب کی توہین کرنے والے شمسی کا نام ونشان نہ مل سکا۔ ؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را		چنداں اماں ندارد کہ شب را سحر کند

٭		٭		٭

میاں عبدالغنی قدیم متوطن محلہ عالی جالندھر مسلم لیگ کا کارکن تھا۔ تقسیم ملک کے بعد، فیصل آباد میں مقیم ہوا۔ شمس الحق عرف شمسی کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اخبار انصاف کا ڈیکلریشن اس کے نام تھا۔ آخر عمر میں اس کا دماغی توازن درست نہیں رہا تھا۔ وہ اکثر وبیشتر یہ کہا کرتا تھا کہ میری جو یہ حالت ہے یہ محض حضرت مدنی رہ کی توہین کرنے کی وجہ سے ہے۔

"فاعتبروا یا ولی الابصار"

٭ ——— ایک روایت! ——— ٭

بروایت حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہ

جناب گرامی علامہ ارشد صاحب نے ۸ نہم ۱۹ء میں ایک مجلس میں بیان فرمایا تھا کہ وہ تقسیم کے بعد ایک مرتبہ کراچی گئے اور انکی ملاقات امرتسر کے ایک مہاجر سے ہوئی یہ صاحب غالباً کپڑے کی دکان کرتے تھے۔ امرتسر میں مسلم لیگ کے سرگرم درکر تھے اور وہاں کی نیشنل گارڈ میں انہیں ایک اچھا مقام حاصل تھا جب گاڑی امرتسر کے پلیٹ فارم پر پہنچی تو نیشنل گارڈ کے رضاکاروں نے حضرت مدنی کے سامنے مظاہرہ کیا اور مذکورالصدر صاحب کے کہنے پر وہ لوگ ننگے ہوکر ناچے۔ وقت گزر گیا۔ فارسی زبان کا شعر ہے ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد		تا دل صاحب دلے نا ید بدرد

چند ماہ بعد ملک تقسیم ہوا اور فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو سکھ غنڈے ان صاحب کے گھر میں گھس آئے اور انکے گھر کی عورتوں کو ننگا کرکے نچوایا اسوقت انکے دل میں خیال آیا کہ آج مجھے اس گناہ کی سزا ملی ہے۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ وہ شخص سخت ندامت کا اظہار کرتا تھا اور کہتا تھا کہ حالات اعتدال پر آجائیں تو میں دیوبند جاکر حضرت مولانا سے معافی مانگوں گا۔"

مولانا حکیم فضل الرحمن سواتی

ڈاکٹر محمد اقبال کی چند تنقیدات و ترجیعات

درحقیقت ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم بڑے جوشیلے اور جذباتی آدمی تھے، جب کبھی اپنے نظریے کے خلاف کسی میں کوئی بات دیکھ لیتے تو فوراً جوش میں آکر اس پر تنقید فرماتے چونکہ وہ صرف جوشیلے اور جذباتی تھے ضدی نہ تھے۔ اس لئے پھر اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ میں غلطی پر ہوں یا یہ معلوم ہو جاتا کہ لوگ ان کی تنقید کو پسند نہیں کرتے تو فوراً اس سے رجوع کرتے اور آئندہ اشاعت سے اس تنقید کو خارج کر دیتے۔ اس موقع پر میں چند تنقیدات و ترجیعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) ڈاکٹر محمد اقبال کی پہلی تصنیف مثنوی کی اسرار خودی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے جب اخبارات میں اس کا ذکر دیکھا تو فوراً اسے منگوالیا اور غور سے دیکھا، اس میں دو تنقیدیں تھیں۔ ایک تو خواجہ حافظ شیراز پر، اور دوسری صوفیائے کرام پر۔ حافظ شیراز پر بہت سخت تنقید تھی۔ پینتیس عدد اشعار اس بارے میں درج تھے، یہ تنقید مجھے سخت ناگوار گزری۔ فوراً ایک خط جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ کتاب اچھی ہے، لیکن خواجہ حافظ پر جو تنقید ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ صوفیائے کرام پر جو تنقید تھی اس کا جواب خواجہ حسن نظامی نے اپنے ماہانہ رسالہ "نظام المشائخ" میں بہت بسط اور شرح کے ساتھ دیا۔ پھر اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اخبار "وکیل" امرتسر میں دیا۔ اسی طرح تین بار جواب خواجہ حسن نظامی نے دیا اور تین بار ڈاکٹر صاحب نے جواب لکھا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مجھے اپنے وطن سوات جانے کی ضرورت پڑی چنانچہ ماہ اگست ۱۹۱۷ء میں لاہور پہنچا اور جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے جو خط در بارۂ تنقیدی اشعار بابت خواجہ حافظ شیراز لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس قسم کے متعدد خطوط ہند اور بیرون ہند سے آئے ہیں۔ ایک خط جو لندن سے

مشیر حسین قدوائی نے انہیں لکھا تھا اور اسی دن انہیں ملا تھا نکال کر سنایا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "مثنوی اسرارِ خودی" کو میں نے پڑھا، کتاب بہت بہتر ہے لیکن خواجہ حافظ شیراز پر جو تنقید ہے وہ درست نہیں ہے۔ پھر جناب ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب لوگ پسند نہیں کرتے تو آئندہ ایڈیشن سے ان اشعار کو خارج کر دوں گا۔ لوگوں کی خاطر مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ ورنہ حافظ شیراز کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جس کا اظہار میں نے تنقیدی اشعار میں کیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ حافظ نے اپنی ہستی کا ستیاناس کر دیا ہے۔ معشوق کے سامنے اپنے آپ کو کتا ثابت کر دیا ہے، چنانچہ انہوں نے یہ شعر سنایا۔

؎ شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بگردنِ حافظ نمی نہی رسنے

میں نے کہا کہ یہ شعر مجاز نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا میں نے سنا ہے کہ تم فساق و فجار کو اپنی آغوش رحمت میں لیتے ہو، حافظ جو فاسق و فاجر ہے اُسے کیوں اپنی رحمتِ آغوش میں نہیں لیتے ہو۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ تو خاص آدمی ہیں مگر معاملہ تو عوام سے ہے۔ میں نے کہا کہ دیوانِ حافظ بھی تو عوام کی چیز نہیں بلکہ خواص کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اطمینان رکھیے، میں ضرور ان تنقیدی اشعار کو حذف کر دوں گا چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ تنقیدی اشعار یہی ہیں، غور سے ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار　　جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیز او　　مے علاجِ ہولِ رستاخیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او　　از دو جام آشفتہ شد دستار او
چوں خراب از بادہ گلگوں شود　　پایہ دارِ حشمتِ قاروں شود
مفتیٔ تعلیم او مینا بدوش　　محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش
طوف ساغر کرد مثلِ رنگِ مے　　خواست فتویٰ از ربابِ چنگ و نے
در رموزِ عیش و مستی کاملے　　از خمِ خوں در دلے پا در گلے
رخت شغلِ ساغر و ساقی گذاشت　　بزمِ رندان و مے باقی گذاشت
چوں جرس صد نالہ رسوا کشید　　عیش ہم در منزلِ جاناں شدید
در محبت پیرو فرہاد بُود　　بر لبِ رو شعلۂ فریاد بُود
تخمِ نخلِ آہ در کہسار کاشت　　طاقتِ پیکار با خسرو نداشت
مسلم ایمان او زنار دار　　رخنہ اندر دینش از مژگانِ یار
آنچنان مستِ شراب بندگیست　　خواجۂ محروم ذوقِ خواجگیست

دعویِ او نیست غیر از قال و قیل / دست او کوتاہ و خرما بر نخیل

آں فقیہِ ملتِ مے خوارگاں / آں امامِ امتِ بے چارگاں

گوسفند است و نوا آموخت است / عشوہ و ناز و ادا آموخت است

دل ربائی ہائے او زہر است و بس / چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس

ضعف را نام توانائی دہد / سازِ او اقوام را رسوا کند

از بریشاں زمیں زیرک تر است / پردۂ عودش حجابِ اکبر است

نغمۂ چنگش دلیلِ انحطاط / ہاتفِ او جبرئیلِ انحطاط

بگذر از جامش کہ در مینائے خویش / چوں مریدانِ حسن دارد حشیش

از تخیل جنتے پیدا کند / مر ترا بر نیستی شیدا کند

ناوک اندازے کہ تا بند دل برد / ناوکِ او مرگ را شیریں کند

مارِ گلزارے کہ دارد زہرِ ناب / صید را اول ہمے آرد بخواب

عشقِ ابجرِ نگاہش خودکشی ست / کشتنش مشکل کہ مارِ خانگی ست

حافظ جادو بیاں شیرازی است / عرفی آتش بیاں شیرازی است

ایں سوی ملکِ خرد مرکب جہاند / آں کنارِ آبِ رکنا باد ماند

ایں قتیلِ ہمتِ مردانۂ / آں ز رمزِ زندگی بیگانۂ

دست ایں گیرد ز آنچہ خوشۂ / چشمِ آں از اشک دارد توشۂ

روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر / عرفیا فردوس و حور او حریر

غیرتِ او خندہ بر حور ازند / پشت پا بر جنت الما زند

بادہ زن با عرفیِ ہنگامہ خیز / زندہ از صحبتِ حافظ گریز

ایں فسوں خواں زندگی از ما ربود / جامِ او شانِ جمی از ما ربود

محفلِ او درخورِ ابرار نیست / ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر / الحذر از گوسفنداں الحذر

دیکھا آپ نے کس قدر سخت تنقید ہے، جسے میری طرح معتقدین حافظؒ برداشت نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے متذکرہ بالا تنقیدی اشعار کو "مثنوی اسرارِ خودی" سے خارج تو کر دیا مگر حافظؒ کے متعلق اُن کا جو نظریہ ہے اسمیں کوئی فرق نہ آیا، اگرچہ حافظؒ کو انہوں نے تنقیدی بیان میں جادو بیان کہا ہے لیکن دونوں کے نظریے کے اختلاف کی وجہ

سے ان کا دل حافظ کے متعلق صاف نہیں ہوا ہے۔ کئی بار انھوں نے حافظؒ کے اشعار پر تضمینیں کی ہیں، مگر حافظؒ کا نام نہیں لیا ہے۔ "کلیات" میں "نصیحت" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس میں اخیر کا شعر حافظؒ کا ہے ؎

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشانیست
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

"خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" میں یہ مصرع حافظؒ کا ہے۔

ع آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

"قربِ سلطان" کی نظم میں یہ فقرہ یہ مصرعہ حافظؒ کا ہے۔

ع گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اور یہ شعر بھی حافظؒ کا ہے۔

؎ محلِ نورِ تجلّیست رائے انور شاہ
چو قربِ او طلبی در صفائے نیت کوش

"ارتقاء" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا دوسرا مصرعہ با دنیٰ تصرف حافظ کا ہے۔

ع چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ایک خط کے جواب میں جو نظم ہے اُس میں اخیر کا شعر حافظؒ کا ہے۔

؎ گرت ہواست کہ با خضر ہم نشیں باشی
نہاں ز چشمِ سکندر چوں آبِ حیواں باش

"اسیری" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کا آخری شعر حافظ کا ہے۔

؎ شہپرِ زاغ و زغن زیبائے قید و صید نیست
کیں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

"طلوعِ اسلام" کے عنوان سے جو نظم ہے اُس کا اخیر شعر حافظ کا ہے۔

؎ بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

"ظریفانہ" نظم کے عنوان سے جو نظم ہے اسکا اخیر شعر حافظ کا ہے۔

؎ دلقِ حافظ بچہ ارزد بہ میش رنگین کن
وانگہش مست و خراب از رہِ بازار بیار

میرے حافظہ میں جو نظمیں تھیں اور جن میں حافظ کے اشعار پر تضمینیں تھیں انھیں میں نے لکھا، ممکن ہے کہ اور تضمینیں بھی ہوں لیکن مجھے ان کا علم نہیں ہے اور شعراء کے اشعار پر بھی ڈاکٹر اقبال نے تضمینیں لکھی ہیں۔ ان شعراء کا نام صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:۔

تضمین بر شعر انیسی شاملو۔

؎ وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی　　　ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

تضمین بر شعر صائب۔

؎ ہماں بہتر کہ لیلےٰ در بیاباں جلوہ گر باشد　　　ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی

تضمین بر شعر مرزا بیدل۔

؎ باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است　　　ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

تضمین بر شعر ملک قمی۔

؎ رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر　　　یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

فردوس میں مکالمہ کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں شیخ سعدی شیرازی کا نام ہے اور دوسرا شعر تو سعدی ہی کا ہے۔

؎ اے آنکہ زنور گوہر نظم فلک تاب　　　دامن بچراغ مہ و اختر زدہ باز

اخیر کا شعر بھی سعدی شیرازی کا ہے۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم

ڈاکٹر اقبال نے خواجہ حافظ شیراز کو کما حقہ پہچانا نہیں ہے، اس لئے وہ ان کو شرابی کہتے ہیں حالانکہ کسی نے حافظ کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، نہ گھر کے لوگوں نے انہیں شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے نہ باہر کے لوگوں نے۔ خواجہ حافظ لسان الغیب کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک دفعہ اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی مہر غائب ہوگئی تھی، چونکہ وہ بہت قیمتی تھی، جواہرات اس میں لگے ہوئے تھے، اس کے علاوہ ان کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اگر اس کو کوئی غلط طریقہ پر استعمال کرے تو حکومت کا بہت زبردست نقصان ہوگا، اسی فکر میں غلطاں و پریشان تھے، چونکہ ان کو خواجہ صاحب سے کمال عقیدت مندی تھی اس لئے فال دیکھنے کی غرض سے دیوانِ حافظ اٹھایا اور کنیز کو پکارا کہ چراغ لیکر آؤ، وہ چراغ لیکر آئی، انھوں نے دیوان کھول کر دیکھا تو یہ شعر نکلا:۔

بفروغِ چہرہ زلفت ہمہ شب زند رہِ دل
چہ دلاور ست دُزدے کہ بکف چراغ دارد

انھوں نے فوراً کنیز کی تلاشی لی تو اس کی کمر سے مہر برآمد ہوئی۔

دُور کیوں جائیے، میری ہی حالت سنیئے ۱۹۳۶ء میں میں اپنے وطن سوات میں تھا، یہاں سے میں ۱۹۳۳ء میں گیا تھا، میرے چار بچے یہاں آمبور میں اپنے نانا محمد ہاشم صاحب کے پاس تھے اور میں سوات میں تھا۔ سوات کے خویش واقارب نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں واپس آمبور نہ جاؤں، میں بڑی کشمکش میں مُبتلا تھا کہ واپس جاؤں یا سوات میں رہوں، آخر دیوانِ غالب کھول کر فال نکالا تو یہ شعر نکلا۔

من از دیارِ حبیبم نہ از دیارِ رقیب　　مہینا بہ رفیقان خُود رساں بازم

میرے بڑے لڑکے کا نام حبیب الرحمٰن ہے، یہ دیکھتے ہی جانے پر آمادہ ہوا لیکن ہاتھ میں رقم نہیں تھی حیران نقطہ وار دائرہ پرکار میں رہا۔ گھر سے جب باہر نکلا تو ایک شخص باہر کھڑا میرے انتظار میں تھا اس نے ایک سو روپیہ لو اور وہ نُسخہ لکھ کر دیدو، چنانچہ کھڑے کھڑے وہ نسخہ لکھ کر میں نے دیدیا اور دوسرے دن مدارس جانے لگا۔ اسوقت سے اب تک یہاں آمبور میں ہوں، کوئی صورت اپنے ملک کو جانے کی نہیں نکلتی۔ اچھا اَب دوسری تنقید اور ترجیع ملاحظہ فرمائیے۔

(۲) دسمبر ۱۹۲۰ء کے اخیر ہفتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں زیرِ صدارت وجے رگھوا چاریہ منعقد ہوا تھا جس میں مہاتما گاندھی کا نان کوآپریشن والا ریزولیشن پاس ہو گیا تھا جس کی مخالفت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کی۔ لوگوں نے ان پر شیم شیم کی آوازیں کسی تھیں، میں نے بھی زور زور سے شرم شرم کی آوازیں بلند کی تھیں۔ جناح صاحب اُسی وقت کانگریس سے نکل گئے۔ ہندوستان میں اَب کوئی ادارہ ان کے لئے نہیں رہا مسلم لیگ تو مر چکی تھی اُس کی جگہ خلافت کانفرنس کام کر رہی تھی، مجبور ہو کر آپ لندن تشریف لے گئے، سات آٹھ مہینہ کے بعد لندن سے واپس آکر اکتوبر ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں اعلان کر دیا کہ لیگ کو پھر زندہ کر دینا چاہیئے۔ اس اعلان سے ڈاکٹر اقبال بہت برہم ہوئے اور فوراً تنقیدی قطعہ ارشاد فرمایا جو صدائے لیگ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار مورخہ ۹ نومبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اسوقت کے تمام اُردو اخبارات نے نہایت شاندار طریقے سے شائع کیا اور بہت سے لوگوں کے وردِ زبان تھا وہ قطعہ یہ ہے جو اس وقت میری نوکِ زبان ہے، صدائے لیگ

(از ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال)

لندن کے چرخِ نادرہ فن سے پہاڑ پر　　اُترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تُو کہ رہے گی بتا ہمیں　　اے جانِ برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح

دل سے خیال وحشت و بیاباں نکال دے　　مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب　　اس دین میں ہے ترک سوادِ حرم مباح
بشریٰ تکم کہ منتظر بار رسیدہ ہست　　یعنی حجاب غیرتِ کبریٰ سے دریدہ ہست
(روزنامہ "زمیندار" مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۲۱ء)

میں نے علامہ اقبال کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ قطعہ تو بہت اچھا ہے لیکن جناح صاحب پر اس قدر سخت تنقید غیر مناسب ہے۔ تمام لوگ قطعہ کو بہت پسند کر رہے ہیں مگر میں اس بارے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی آپ کی طرح جناح صاحب کا مخالف ہوں۔ ناگ پور میں کانگریس کے اجلاس میں جب ان پر شیم شیم کی آوازیں کسی گئیں تو میں نے بھی زور سے شرم شرم کی صدا بلند کی، میں پکا خلافتی اور کانگرسی ہوں اور وہ ان دونوں کے سخت خلاف ہیں لیکن انھوں نے ۱۹۱۸ء میں جو بہت اہم کام انجام دیا ہے اس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہے ۱۹۱۸ء میں وزیر ہند لارڈ مانٹیگو جب ہندوستان آئے تھے اور پورے ملک کا انھوں نے دورہ کیا تو ایک رپورٹ لارڈ چیمسفورڈ اور مانٹیگو کے نام سے مرتب کی گئی جس میں سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں کافی صلاحیت ہے اس لئے اُسے اصلاحات ملنے چاہئیں۔ اس رپورٹ کی تائید صوبہ جات کے گورنروں نے کی لیکن بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن نے اس کی مخالفت کی کہ ہندوستان میں اصلاحات کی قابلیت نہیں ہے ولنگڈن کے اس رویہ کی کسی نے مخالفت نہیں کی صرف مسٹر محمد علی جناح ہی تھے جنھوں نے مشرح اور غیر مبہم الفاظ میں مخالفت کی اور لارڈ ولنگڈن کو دشمن ہند کہا کہ ایسے دشمن ہند گورنری کے لائق نہیں ہیں حکومت برطانیہ کو چاہئے کہ وہ انھیں واپس بلائے، جب لارڈ ولنگڈن کی میعادِ گورنری ختم ہوئی اور وہ لندن جانے لگے تو بمبئی کی کارپوریشن کی جانب سے لارڈ موصوف کے اعزاز میں جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر محمد علی جناح اور ان کی بیوی نے کالی جھنڈیوں سے لارڈ ولنگڈن کا استقبال کیا، غیر تو غیر قوم میں سے کسی کی یہ جرأت نہ ہوسکی لہٰذا میں آپ کی خدمت میں باادب التماس کرتا ہوں کہ ازراہِ کرم اس قطعہ کو اپنے مجموعہ اشعار سے خارج کر دیجئے گا۔

خط لکھ کر دو ہفتے بعد جناب ڈاکٹر اقبال کا نوازش نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ واقعی جوش میں آکر چند تنقیدی اشعار لکھ دیئے ہیں لیکن آپ کے خط نے میرے جوش کو فرو کر دیا، میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے بروقت متنبہ کر دیا آپ کے سوا مجھے اور کسی نے نہ لکھا ہے اور نہ کسی نے زبانی ہی کچھ کہا ہے۔ اس بارے میں لکھنے والے آپ فردِ واحد ہیں، اطمینان رکھیے کہ میں نے ان اشعار کو آپ ہی کے کہنے سے اپنے مجموعہ اشعار سے ختم کر دیا ہے۔

۱۹۲۵ء میں جناب ڈاکٹر اقبال صاحب مدراس تشریف لائے تھے تو میں اُن سے ملنے کی غرض سے

مدراس گیا، اور جناب یعقوب حسن سیٹھ صاحب کی معیت میں اُن سے ملا۔ سیٹھ صاحب نے میرا تعارف اُن سے کرانا چاہا۔ آپ نے فرمایا "میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں، یہ اہلِ ایمان میں سے ہیں"۔

؎ جہاں میں اہلِ ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر نکلے اُدھر ڈوبے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اور پھر فرمانے لگے ۱۹۱۷ء میں آپ لاہور آکر مجھ سے ملے ہیں۔ میں نے اسرارِ خودی میں جو تنقید خواجہ حافظ پر کی تھی اس کے بارے میں آپ نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان تنقیدی اشعار کو مثنوی اسرار خودی سے خارج کر دوں چنانچہ ان کے کہنے سے میں نے ان اشعار کو خارج کر دیا، پھر ۱۹۲۱ء میں مسٹر محمد علی جناح صاحب پر چند اشعار بطور تنقید کہے تھے جن کو تمام اخبارات نے شائع کیا تھا۔ اس بارے میں آپ کا ایک خط آیا تھا کہ ان اشعار کو اپنے مجموعہ سے خارج کرو۔ میں نے ان کے لکھنے سے ان اشعار کو اپنے کلیات سے خارج کر دیا، میں جانتا ہوں یہ افغان ہیں جب کسی بات کے پیچھے لگ جاتے ہیں جب تک اسے حاصل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے"!

اَب ایک تیسری تنقید ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پُل بنگش کے پاس رات کے وقت جلسہ میں تقریر کی تھی جس میں فرمایا تھا کہ آجکل اقوام وطن سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں، جلسہ میں "الامان" کا نامہ نگار بھی تھا۔ اس نے پوری رپورٹ مولوی ظہیر الدین شیر کوٹی کو سنائی۔ چونکہ مولوی ظہیر الدین مولانا مدنیؒ کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے الامان میں یہ لکھا۔

"رات کے جلسہ میں مولانا مدنیؒ نے کہا کہ ملتیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں، چونکہ یہ بات ڈاکٹر اقبال کے نظریئے کے سخت خلاف تھی اس لئے جوش میں آکر مولانا مدنیؒ پر سخت تنقید کی جس کا اظہار مشہور قطعے میں کیا ہے۔

جب حضرت مولانا مدنیؒ کی نظر سے یہ قطعہ گزرا تو آپ نے اخبارات میں بیان شائع کر دیا کہ میں نے ملت کا لفظ نہیں بلکہ قوم کا لفظ استعمال کیا ہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے ملا نا مدنیؒ کا بیان جب اخبارات میں شائع ہوا تو جناب اقبال احمد صاحب سہیل نے جناب ڈاکٹر اقبال کے جواب میں ایک سخت نظم تحریر فرمائی اور ڈاکٹر صاحب پر سخت تنقید کی نظم سولہ اشعار پر مشتمل تھی ان میں سے دس شعر جو میری نوک زبان ہیں ملاحظہ ہوں۔

○

کسے کہ خردہ گرفتست بر حسین احمد　　زبان او عجمی و کلام او عربی ست
کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن ست　　در دروغ گوئی و ایراد، این چہ بوالعجبی ست
درست گفت محدث کہ قوم از وطن ست　　کہ ہست تا دو فرمودۂ خدا و نبی ست
زبان طعن کشودی و این ندانستی　　کہ فرق ملت و قوم از لطائف ادبی ست
تفاوتے ست فراواں میان ملت و قوم　　یکے ز کیش دگر کشوری ست یا نسبی ست
خدائے گفت بہ قرآں بکل قوم ھاد　　مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی ست
بقوم خویش خطاب پیمبراں بنگر　　پر از حکایت "یا قوم" مصحف ازلی ست
رموز حکمت و ایماں ز فلسفی جستن　　تلاش لذت عرفاں ز بادۂ عنبی ست
بہ دیوبند درآ گر نجات می طلبی　　کہ دیو نفس مسخر و دانش عربی ست

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبی را و ہم ز آلِ نبی ست

حضرت مولانا مدنی کا اخبارات میں بیان اور اقبال احمد صاحب سہیل کی متذکرہ بالا نظم جب ڈاکٹر اقبال صاحب کی نظر سے گذری تو فوراً اخبار "مدینہ" بجنور مورخہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء میں مضمون شائع کرا دیا کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے، مجھے غلط خبر پہنچی تھی جس کی وجہ سے میں نے برافروختہ ہو کر ان پر سخت تنقید کی۔ اب اصل حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے اس سلسلے میں مولانا مدنی سے خواستگار معافی ہوں، امید ہے کہ مولانا صاحب مجھے معاف فرمائیں گے۔

ڈاکٹر اقبال صاحب نے تو معافی مانگ لی، لیکن لوگوں نے ان کے کلیات سے قطعہ خارج نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا معافی نامہ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا تھا اور ان کا انتقال ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوا، اگر زیادہ دن تک زندہ رہتے تو یقین ہے کہ وہ خود قطعہ کو کلیات سے خارج کر دیتے۔

(مطبوعہ "برہان" دہلی اگست ۱۹۶۴ء)

نوٹ:- اقبال احمد سہیل صاحب کی متذکرہ بالا نظم کے کل بیس اشعار تھے جو مجلہ علیگڑھ المنی گزٹ میں شائع ہوئے تھے باقی اشعار میں سے چند یہ ہیں:-

بملت ارچہ براہیمی است سرورِ ما　　ولے بقوم حجازی و نسلِ مطلبی ست
ز قوم خویش شمرد اہلِ کفر را بہ احد　　رسولِ پاک کہ نامش محمد عربی ست
بلند تر بود از قوم مرتبۂ ملت　　کہ حبلِ دین، قوی تر ز رشتۂ نسبی ست

مگر بہ ہم وطنان در جہاد استخلاص　　　مجاہدانہ تعاون زروئے حق طلبی ست
سلوک رفق و مدارا بہ جار ذالقربیٰ　　　عمل بحکم الٰہی و اتباع نبیؐ ست
محبت وطن است از شعائرِ ایمان　　　ہمیں حدیث پیمبرؐ فقیہ ثُمَّ یا اَبِی ست

؏ دِل بَدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا حامل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اسکی خالص فرنگی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوف تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دُنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے لیکن ہاں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے مغربی تہذیب کے مشاہیر سے استحساناً اور استبداداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی اور ادراکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح التزام خودداری کے عنصر سے خالی ہے جو اپنی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ گوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہے کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر الٰہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اُٹھتے ہیں :-

؎ شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے سطیٹھ اسلامی تہذیب کے اس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارے میں سرسید احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر بڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے مجھے اُمید ہے کہ ان کی کڑوی کسیلی باتوں کو سُننے والے مجھے معاف فرما دیں گے۔ آج کل کی طالبعلمانہ زندگی سے

چونکہ گذشتہ دس بارہ سالہ مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں اپنے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے لہٰذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ زندگی دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر بہ منزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورتِ حالات اور بیس سال قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی اور وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل اصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔"

(اقتباس "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" ترجمہ: ظفر علی خان۔)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اسیرِ مالٹا

پیکرِ زہد و تقدس، جانشینِ انبیاءؑ
شانِ تقدیسِ اُمم ناموسِ دینِ مصطفےٰؐ

راہنمائے عالمِ اسلام، فخرِ اتقیاء
یعنی مولانا حسین احمدؒ اسیرِ مالٹا

جن کے اُٹھتے ہی جبینِ حادثہ خود جھک گئی
ایک ساعت کیلئے نبضِ دو عالم رُک گئی

مشرف تھانوی

مجاہد ملت آغا شورش کاشمیری مرحوم

مولانا حسینؒ احمد مدنی اور علامہ اقبال مرحوم

عادی مجرموں کی زبان درازیاں

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک پاکستان کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ ان دنوں دہلی میں مسلم لیگ کا ایک جلسۂ عام تھا کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ کے مقامی رہنما۔ مولانا محمد الیاسؒ بانی تبلیغی جماعت کو جلسہ میں لے آئے۔ خوب دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ تقریباً تمام یا وہ گو مقرروں نے مولانا حسین احمد مدنی رہ کے خلاف انتہائی گندہ زبان استعمال کی اور اس طرح اپنا نقطہ نگاہ پیش کیا۔ یہی ان کا سرمایہ تھا۔ اور شاید وہ اس کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ ان کا خلاصۂ بیان اس پر ختم ہوتا کہ شیخ الاسلام حسین احمدؒ نہیں مولانا محمد الیاسؒ ہیں اور ان کی تعریف میں دو چار زور دار کلمات کہہ کر اپنی تقریر ختم کر دیتے۔ آخر میں مولانا محمد الیاس رہ نے خطاب کیا اور صرف چند کلمات کہہ کر اپنی تقریر ختم فرما دی۔ مولانا نے فرمایا کہ۔

> "مولانا کی سیاسی رائے میری سمجھ سے بالا ہے۔ اگر میں ان سے اتفاق کرتا تو ان کی کفش برداری کرتا۔ لیکن میں ان کی ذات کے خلاف کوئی کلمہ اپنی زبان پر لا کر جہنم کی آگ خریدنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے مرتبہ سے آگاہ ہوں۔ اس قسم کا حوصلہ وہی نوجوان کر سکتے ہیں جو حسین احمدؒ کے درجہ و مقام سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ قرآنی اخلاق کی اسلامی حدود سے بہرہ ور ہیں"

مولانا عبد الماجد دریا آبادی رہ مولانا حسین احمد مدنی رہ سے بیعت ہونا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا مدنی رہ نے ان کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے انہیں مولانا اشرف علی تھانوی رہ سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا۔ اور وہ ان کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رہ مسلم لیگ کے حلقۂ سیاست میں شیخ الاسلام تھے۔ ان کا مرتبہ و مقام بھی

ڈھکا چھپا نہیں۔ جب کبھی ان سے مولانا مدنی رہ کے متعلق سوال کیا گیا۔ انہوں نے عموماً یہی کہا کہ "مدنی صداقت اسلام کی دلیل ہیں"!

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ زمانۂ دیوبند سے مسلم لیگ کے طرف دار ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان کی خدمت کی ہے۔ ان سے پوچھئے کہ "مدنی رہ غیرت اسلام کی دلیل تھے۔ اور فقر اسلام کا نمونہ یا ملت اسلامیہ کے غدار تھے! اور ہندوؤں کے اجیر؟

ہم مولانا احتشام الحق تھانوی کو دین کی بجائے دنیا کا انسان سمجھتے ہیں۔ ان میں واعظانہ خوبیوں کے باوجود کسی حکومت سے ٹکراؤ کا حوصلہ نہیں۔ وہ سیاسی اقتدار کے انسان ہیں۔ ان سے دریافت کر لیجئے کہ مولانا حسین احمد مدنی رہ آیات الٰہی میں سے تھے یا ہندوؤں کے ایجنٹ تھے؟

جن دوستوں نے چٹان کو لگاتار اپنے مطالعہ میں رکھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ ہم نے دس پندرہ سال، پہلے جالندھر کے ایک راسخ العقیدہ لیگی نوجوان ڈاکٹر مولوی اکرام الحق مرحوم کی زندگی میں ان کی اس روایت کو لکھا تھا کہ۔ مولانا مدنی رہ جالندھر اسٹیشن سے ٹرین میں جا رہے تھے تو لیگ کے دو نوجوان ان کے ڈبے میں گھس گئے۔ ایک نے مولانا مدنی رہ کی داڑھی پکڑ لی۔ دوسرے نے ان پر تھوکا۔ مولانا مدنی رہ نے آہ تک نہ کی۔ جب یہ روایت ان نوجوانوں نے جالندھر مسلم لیگ کے صدر مولانا عظامی کو سنائی تو مولانا عظامی نے ان نوجوانوں سے کہا کہ بڑھک ہانک رہے ہو یا واقعی تم نے ایسا کیا اور اس پر فخر کر رہے ہو:

جب دونوں نوجوانوں نے تصدیق کی کہ فی الواقعہ وہ یہ کر آئے ہیں تو مولانا عظامی نے کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو۔ مدنی رہ اہل اللہ میں سے ہے۔ اس نے مدتوں روضۂ رسول کی پلکوں سے جاروب کشی کی۔ اور آستانۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر حدیث پڑھائی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے مدنی رہ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ پانی میں ڈوب جائیں گے یا انہیں آگ جاٹ لے گی۔

ڈاکٹر اکرام الحق راوی ہیں کہ ان دو نوجوانوں میں سے ایک تقسیم کے وقت دریائے بیاس کی نذر ہوگیا۔ اور دوسرا پاکستان میں آکر پولیس کی معرفت ایک لیگی لیڈر ہی کے ہاتھوں آگ کی بھٹی میں پھینک دیا گیا۔ اور وہ بھسم ہوگیا۔

یہ اتنی واضح اور بین شہادتیں ہیں کہ اس کے بعد اگر کوئی بدکردار اور بدمعاش قلم کار مولانا مدنی رہ کی شان میں گستاخی کرتا اور قائد اعظم کی آڑ لے کر انہیں یا ان کے ساتھیوں کو اجیر علماء لکھتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بدبخت انسان ہے اور اسے اپنے نفس کی غلاظتوں پر ساری دنیا کا قیاس ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے دنیا کبھی خالی نہیں رہی۔ چراغ مصطفوی پر شرار بولہبی نے ہمیشہ رکیک حملے کئے ہیں۔

جو لوگ اپنے دل میں خدا کا خوف رکھتے ہیں وہ اس قسم کی باتیں نہیں کرتے۔ اس نزاع خائی کا حوصلہ صرف انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جنہیں اپنے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ کس ٹہنی کا پتا ہیں؟

آج دنیا میں نہ قائد اعظم ہے۔ نہ علامہ اقبال رح۔ نہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح۔ اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد رح۔ وہ پرانی بساط تمام ترلپیٹ چکی ہے۔ اب ان سب کا معاملہ اللہ تعالٰی کے سپرد ہے۔ لیکن ان اکابر کی موت کو سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جو لوگ ایک کی آڑ میں دوسرے کو برا کہتے ہیں وہ بہر حال انسان نہیں ہیں۔ گو اس قسم کے افراد گنے چنے ہی ہیں۔ مثلاً صحافیوں میں قادیانی امت کے دسترخوان کا زلہ ربا تن تنہا اس طرز کا ہذیان بکنے میں پیش پیش ہے۔ اور اکثر و بیشتر آڑ یہ لی جاتی ہے کہ علامہ اقبال رح نے مولانا حسین احمد مدنی رح کے متعلق درج ذیل قطعہ لکھا تھا۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ	ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

○

اشعار بالا ارمغان حجاز کے آخر میں درج ہیں۔ علامہ اقبال رح نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال فرمایا۔ ارمغان حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبال رح زندہ ہوتے اور ارمغان حجاز ان کی ترتیب و تدوین سے شائع ہوتی تو یہ اشعار اس میں کبھی نہ ہوتے۔ علامہ اقبال مرحوم شخصیات کی مدح و قدح سے بالا و بلند تھے۔ اور عمر کے آخری دور میں یہ چیزیں ان کے تصور ہی سے عنقا ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اس طرز کے تمام اشعار اپنے کلام سے ہمیشہ خارج کر دیئے۔ اگر مرتبین اتنے ہی دیانت دار تھے تو انہیں کم سے کم مولانا محمد علی جوہر رح کا مرثیہ ارمغان میں ضرور شامل کرنا چاہیئے تھا۔ جو ایک روز نامے ہی کے صفحہ اول پر شائع ہوا۔ اور ملک کے تمام اخباروں نے نقل کیا۔ اور شاید کوئی دوسرا مرثیہ اس پائے کا نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو وقتی سیاست کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اور علامہ اقبال رح ہی کے قلم سے نکلی ہیں۔

مثلاً حضرت علامہ رح نے علی برادران کی رہائی پر جو اشعار لکھے وہ مسلم لیگ کے اجلاس عام منعقدہ امرتسر میں پڑھ کر سنائے لیکن بانگ درا میں جب کہ ان کا ابتدائی دور بھی شائع کئے تو علی برادران کا ذکر دکیا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کی تعریف میں چھ اشعار لکھے جس میں انہیں سرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا سے مخاطب کیا۔ وہ اشعار ۱۳ ۔۔ ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں چھپ چکے ہیں۔

علامہ اقبال رح اپنی عمر کے آخری ایام میں قائد اعظم کے ساتھ تھے۔ لیکن نومبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار

میں محمد علی جناح سے بھی پانچ شعروں میں چٹکی لی۔ اسی طرح پہلی جنگ عظیم میں علامہ رہ نے دہلی کی وار کانفرنس میں نو بند کی ایک مسدس لکھ کر سنائی جس میں شہنشاہ انگلستان سے متعلق دو بند قصیدے کا انتہائی نمونہ کہتے ہیں۔ جب یہ تمام نظمیں شاعرانہ محاسن کے باوجود علامہ رہ نے اپنے کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیں تو مولانا حسین احمد مدنی سے متعلق تین اشعار کا ارمغان حجاز میں شامل کئے جانا فی الواقع سیاسی بدمذاقی اور مذہبی حادثہ ہے۔ ماس میں یہ اشعار اور بھی افسوسناک معلوم ہوتے ہیں کہ علامہ اقبال رہ نے جس خبر سے متاثر ہو کر یہ اشعار لکھے تھے۔ اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی "روزنامہ احسان" میں اس مطلب کا ایک خط چھپوا دیا کہ مجھ کو اس صراحت کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں[1]۔

علامہ اقبال رہ نے جناب طالوت کو ایک خط میں لکھا کہ وہ مولانا حسین احمد مدنی رہ کی تصریح کے بعد اپنے اشعار کی تلخی کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

اس حقیقت کشائی کے بعد اگر کوئی قلم درلز یا زبان دراز مولانا مدنی رہ اور ان کے رفقاء پر نشتر زنی کرتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان کی فضاء سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ قائد اعظم اور علامہ اقبال رہ کی روحوں کو بھی صدمہ پہنچانے کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس قسم کے غلط کار لوگ پاکستان میں غالباً یہ تصور کئے بیٹھے ہیں کہ وہ کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی کالک اپنے چہرے پر مل رہے ہیں۔

(بشکریہ ہفت روزہ چٹان ۲۴ مارچ ۱۹۷۵ء)

◯

حضرت شیخ مدنیؒ

عالم و عابد ولی تھے شیخ		واقعی نائب نبی تھے شیخ
اہل دنیا کی راہ نمائی کو		نورِ عرفاں کی روشنی تھے شیخ

(از محترمہ عابدہ خاتون)

◎

---

[1] ملاحظہ ہو " انوار اقبال " مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ پیش لفظ جناب ممتاز حسن۔ سابق فنانس سیکرٹری حکومت پاکستان۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی کراچی۔

اقبال — بنام — اقبال

ڈاکٹر اقبال سہیل ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

❁

کسے کہ خردہ گرفت است بر حسین احمدؒ
زبانِ او عجمی و کلام در عربی است

کہ گفت بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
دروغ گوئی و ایراد این چہ بوالعجبی است

درست گفت محدث کہ قوم از وطن است
کہ مستفاد ز فرمودہ خدا و نبی است

زبانِ طعن کشودی و این نہ دانستی
کہ فرق ملت و قوم از لطائف ادبی است

تفاوت است فراوان میان ملت و قوم
یکے ز کیش و دگر کشوری است یا نسبی است

بہ ملت ار چہ براہیمی ست سرورِ ما
ولے بقومِ حجازی بہ نسلِ مطلبی است

ز قومِ خویش شمرد اہلِ کفر را باحد
رسولِ پاک کہ نامش محمدِ عربی است

ندائے گفت بکفران بکلِّ قومٍ ہاد
مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است

بقومِ خویش خطابِ پیغمبران بنگر
پر از حکایت یا قوم مصحفِ عربی است

بلند تر بود ز قوم رتبہ ملت
کہ حبلِ دیں قوی تر ز رشتہ نسبی است

کسے کہ ملتِ اسلام نورِ سینۂ اوست
برادر است اگر زنگی است و حلبی است

مگر ہم وطنان در جہاد استخلاص
مجاہدانہ تعاون ز روئے حق طلبی است

سلوکِ رفق و مدارا بہ جار و ذی القربیٰ
عمل بحکمِ الٰہی و اتباعِ نبی است

محبتِ وطن است از شعائرِ ایماں
ہمیں حدیثِ پیغمبر فدیتہٗ بابی است

نظر نہ بودن و با دیدہ در درافتادن
دو گونہ شیوۂ بوجہلی و بولہبی است

رموزِ حکمتِ ایماں ز فلسفی جستن
تلاشِ لذتِ عرفاں ز بادہ عنبی است

خموش از سخنِ ناسزا گزیدہ تر است
کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بے ادبی است

بہ دیوبند درآ گر نجاتِ مے طلبی
کہ دیو نفس سلحشور و دانشِ توصبی است

بگیر راہِ حسین احمد ار خدا خواہی
کہ نائب است نبی را و ہم ز آلِ نبی است

❁

ترتیب : محمد دین شوق

مکتوبات مدنیہ

حضرت شیخ مدنی رح کے غیر مطبوعہ مکتوبات

محترم المقام زیدت عنایاتکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ مزاج شریف ۔

آپ کا والا نامہ محررہ ۱۲ رمضان المبارک ۔ ۲۰ ذلیقعدہ کو جب کہ میں تعطیل سے واپس ہوا ، ملا ۔ نہایت خوشی ہوئی ۔ خوف تھا کہ غالباً آپ تاخیر جوابات کی وجہ سے خفا ہو گئے ہوں گے اس لئے کوئی والا نامہ نہیں بھیجا مگر معلوم ہوا کہ یہ مانع نہ تھا ۔

محترما ! مضامین ضروریہ بہت ہیں جن کی اشاعت کرنا ضروری ہے ۔ نیز ملک میں دورہ کرنا ۔ قوم کی تنظیم کرنا ۔ ان کو بیدار کرنا نہایت ضروری ہے ۔ مگر کیا کیا جائے قحط الرجال ہے ۔ قوم مسلم ہر طرح کی کمزوری ۔ مادی و روحانی اخلاقی و جسمانی میں مبتلا ہے ۔ اگر ملازمت نہ کی جائے تو پیٹ کس طرح پالا جائے ۔ اور اگر ملازمت میں وقت صرف کیا جائے تو قومی کام کس طرح ہو ۔ غرضیکہ عجب مخمصہ ہے ۔ خداوند کریم ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر رحم فرمائے ۔ انشاء اللہ حسب ارشاد ایک جوڑا کھدر کے کپڑوں کا ڈاک میں ارسال کرتا ہوں ۔

آپ میری زندگی کی داستان پوچھتے ہیں ۔ مہربان من ! میں ایک معمولی طالب علم ہوں ۔ میری حالت معلوم کرنے سے کیا فائدہ ؛ لائف ان لوگوں کی دیکھی جاتی ہے جن کو زمانہ نے کوئی خاص وقعت دی ہو ۔ ان سے مذہب اور قوم کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہوا ہو ۔ ہمارے جیسے ہزاروں آئے اور چلے گئے ۔ ع

کہ بسیار کس چوں تو پرورد و کشت

نہ شگوفہ نہ برگ نہ ثمر نہ سایہ دارم　　　در حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

محض امتثال حکم کی غرض سے کچھ مختصراً عرض کرتا ہوں ۔

جہاں تک مجھ کو والدین سے معلوم ہوا ہے ۔ نسبی حیثیت سے ہمارے بزرگوں کا تعلق حضرت امام حسین

شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے۔ ضلع فیض آباد کے پاس موضع الہداد پور میں ہمارے اسلاف میں سے شاہ نور الحق رح آباد ہوئے اور کفار کے قلعہ کو جس کے نشانات اب تک موجود ہیں فتح کر کے وہیں بود و باش کی۔ ہمارے اسلاف اس زمانہ سے لے کر اب تک اسی قلعہ میں مدفون ہوتے رہے ہیں۔ یہ قلعہ کوئی بڑی عمارت نہ تھی بہت چھوٹا قلعہ تھا جس کو گڑھی کہا کرتے تھے۔ ہمارے والد مرحوم سید حبیب اللہ شاہ صاحب تحصیل سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور ۱۲۹۶ھ ہجری میں بماہ شوال ۱۹ تاریخ شب سہ شنبہ گیارہ بجے میری پیدائش ہوئی۔ لڑکپن کا وہ زمانہ جس کو میں یاد نہیں رکھتا مجھ پر مکمل رہا تھا کہ والد محترم تبدیل ہو کر گھر ہی میں آ گئے۔ جب مجھ کو ہوش و حواس آیا تو میں نے اپنے آپ کو آبائی وطن مالوف موضع الہداد پور۔ ضلع فیض آباد ہی میں پایا۔ چار برس کی عمر میں مجھ کو احاطۂ تعلیم میں داخل کر دیا گیا۔ والدہ ماجدہ مرحومہ گھر میں قاعدہ بغدادی۔ اور اس کے بعد پارہ عم وغیرہ پڑھاتی تھیں۔ اور اسی وقت سے اردو سکول میں جس میں والد صاحب ہیڈ ماسٹر تھے اردو کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس طرح قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم گھر میں حاصل کرتا تھا اور اردو لکھنا پڑھنا۔ حساب۔ مساحت۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ اقلیدس وغیرہ سکول میں پڑھتا تھا۔

میری عمر کا بارہواں سال تھا جب کہ میں سکول میں پڑھ رہا تھا۔ وہ زمانہ ماہ صفر ۱۳۰۹ھ کا تھا کہ یکایک والد صاحب مرحوم کو خیال ہوا کہ اس کو عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دار العلوم دیوبند بھیج دینا چاہئے۔ وہاں پر پہلے سے میرے دو بڑے بھائی تعلیم پا رہے تھے۔ الغرض انہوں نے مجھے وہاں بھیج دیا۔ اور میں نے وہاں پر عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔ ۱۳۰۹ ہجری سے شعبان ۱۳۱۶ ہجری تک میں وہاں ہی مقیم رہا۔ ایام تعطیل میں سالانہ یا دو سال کے بعد والدین مرحوم کی زیارت کو وطن آ جاتا تھا۔ باقی مکمل قیام "دار العلوم دیوبند" ہی میں رہا۔ ساڑھے سات برس کی تعلیم میں عربی علوم کی درسی کتابیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں کہ والد صاحب مرحوم کو شوق زیارت مدینہ منورہ پیدا ہوا۔ آبائی زمین کو فروخت کر کے مصارف راہ حرمین شریفین مہیا کیا۔ اور ارادہ کر لیا کہ شعبان ۱۳۱۶ھ کے آخری ایام میں روانہ ہو جائیں۔ ہم پانچ بھائی تھے جن میں تین متاہل تھے۔ والدین مرحومین۔ اور ایک بہن اور ایک بھتیجہ۔ یہ بارہ آدمیوں کا خاندان یہاں سے روانہ ہوا۔ پلیگ کی وجہ سے بمبئی کی بندرگاہ بند تھی۔ اس لئے فقط چاٹگام روانگی کی اجازت تھی چونکہ ہم اودھ کے رہنے والے تھے۔

اور ہم کو چاٹگام میں بانتظار اگبوٹ حاجی ریزرویشن کیمپ میں تقریباً ایک ماہ رہنا پڑا۔ شوال ۱۳۱۶ھ میں جہاز روانہ ہو کر ایک ماہ سے کچھ زائد میں جدہ پہنچا۔

دیوبند سے روانگی سے پہلے حضرت قطب العالم عارف باللہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر طریقۂ چشتیہ۔ نقشبندیہ۔ قادریہ۔ سہروردیہ میں بیعت ہوا۔ مگر مولانا نے کچھ تلقین نہ فرمائی۔ بلکہ ارشاد کیا کہ چونکہ تو مکہ مکرمہ میں جا رہا ہے۔ وہاں حضرت مرشد العالم مولانا الحاج امداد اللہ مہاجر مکی صاحب

(جو کہ مولانا صاحب کے پیر و مرشد تھے) موجود ہیں ان سے تعلیم حاصل کر لینا ۔ مولانا نے یہی فرمایا کہ ہجرت کی نیت نہ کرنا۔ تم کو وہاں سے واپس ہونا پڑے تو گنہ گاری کی نوبت نہ آنے ۔ اور اسی قسم کی تاکید حضرت حاجی صاحب رہ موصوف نے مکہ معظمہ میں فرمائی تھی ۔ چنانچہ ہم لوگوں میں سے سوائے والد صاحب مرحوم کے کسی نے نیت ہجرت نہیں کی ۔ آپ اس سے بخوبی معلوم کر سکیں گے کہ جو لوگ میرے نام پر "مہاجر مدنی" لکھتے اور پڑھتے ہیں وہ غلط لکھتے ہیں ۔ میں نے بارہا اس پر تنبیہ کی مگر لوگ نہیں مانتے ۔ مکہ معظمہ میں ذیقعدہ کے وسط میں پہنچ کر بعد از طواف و سعی حضرت مرشد عالم حاجی صاحب رہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا ۔ اور پھر ہمیشہ خدمت اقدس میں حاضری کی نوبت آتی رہی ۔ نہایت شفقت اور عنایت سے بندہ نوازی فرماتے رہے اور تعلیم سلوک بھی فرمائی ۔ اور آخر ذوالحجہ میں ادائے حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کو روانگی ہوئی ۔ اور اوائل ۱۳۱۷ھ میں وہاں پہنچ گئے ۔ سال بھر کے لئے مکان کرایہ پر کر لیا گیا اور والد صاحب نے جو کچھ نقد بعد مصارف سفر بچ گیا تھا حسب حصص شرعیت ہم سبھوں میں تقسیم کر دیا اور فرمایا کہ میں تو یہاں رہنے اور یہیں مرنے کی نیت سے آیا ہوں ۔

تم لوگوں کو اختیار ہے خواہ یہاں رہو خواہ ہندوستان چلے جاؤ ۔ واپسی کے لئے یہ خرچ تمہارے لئے موجود ہے ۔ ہم سبھوں نے وہاں کی اقامت کو ترجیح دی وہاں پر ہم نے موجودہ سرمایہ سے دوکان کی اور مختلف وجوہ سے ناکام رہے ۔ بالآخر میں نے اجرت پر کتابت شروع کی ۔ اور درس و تدریس کی بھی بنیاد ڈالی ۔ چند ماہ کے بعد مکہ معظمہ میں حضرت مرشد عالم حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کا وصال ہو گیا ۔ اس کے بعد ان کی تعلیم کے متعلق سلوک بھی شروع کیا ۔ اور عرض داشتیں مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کی خدمت میں ارسال کرتا رہا ۔ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ میں حسب ارشاد مولانا رحمۃ اللہ علیہ تکمیل سلوک کی غرض سے بہمراہی بڑے بھائی صاحب ہندوستان روانہ ہوا ۔ اور حج سے فارغ ہو کر بادبانی جہازوں کے ذریعہ سے مکلا اور مسقط ہوتے ہوئے ماہ ربیع اول ۱۳۱۹ھ میں براہ کراچی گنگوہ شریف پہنچا اور وہاں سلوک طریقت کرتا رہا ۔ حسب اجازت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز کچھ عرصہ قیام کر کے رمضان ۱۳۱۹ھ میں براہ پوربندر ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۹ھ میں مکہ معظمہ پہنچا اور حج سے فارغ ہو کر محرم ۱۳۲۰ھ میں مدینہ منورہ پہنچا ۔ وہاں اولاً سات سال متواتر مقیم رہا ۔ علمی مشاغل کے سوا اور کوئی شغل مناسب معلوم نہ ہوا ۔ حرم محترم نبوی میں علوم عربیہ (حدیث، تفسیر وغیرہ) کی تدریس دیتا رہا ۔ ۱۳۲۶ھ میں میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا ۔ والد صاحب مرحوم کی یہ رائے ہوئی کہ چونکہ ہماری آمدنی بہت کم ہے اور یہاں کی عورتوں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں ۔ اس لئے تجھ کو ہندوستان جا کر اپنے رشتہ داروں میں نکاح ثانی کرنا چاہئے ۔ حسب ارشاد ماہ ذی قعدہ ۱۳۲۶ ہجری کی آخری تاریخوں میں وہاں سے روانہ ہو کر حج کرتا ہوا ۱۳۲۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند پہنچا ۔ اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے یہاں دوبارہ حدیث شریف پڑھنا شروع کیا جس کی

مدتوں سے آرزو تھی۔ اسی سال میری شادی بھی ہوئی اور پھر تین سال دیوبند میں مقیم رہا۔ حدیث شریف کی وہ کتابیں جو کہ مولانا مرحوم کے یہاں ہوئی تھیں ختم کرنے کے بعد مدرسہ میں تدریس حدیث و تفسیر کے لئے ملازم ہو گیا۔ حضرت والد صاحب مرحوم کے تقاضہ کی بنا پر شوال ۱۳۲۹ھ میں مدینہ منورہ کو براہ پورٹ سعید، حیفہ حجاز ریلوے کے ذریعے سے روانہ ہوا۔ اور ذی قعدہ سنہ مذکورہ میں وہاں پہنچا۔ اور دو سال یعنی ۱۳۳۰ھ اور ۱۳۳۱ھ وہاں مقیم رہا۔ (چونکہ یہاں شادی میں شرط یہ تھی کہ دو برس کے بعد اہل و عیال کو ہندوستان ایک مرتبہ لانا ہوگا) ۱۳۳۲ھ ماہ صفر میں براہ حجاز ریلوے حیفہ اور پورٹ سعید ہوتا ہوا، معہ اہلیہ بمبئی پہنچا۔ اور دیوبند وغیرہ میں چند دن قیام کر کے اسی سال ماہ ذی قعدہ یا شوال میں معہ اہلیہ حجاز روانہ ہو گیا۔ اور ابتداء ۱۳۳۳ھ میں مدینہ منورہ پہنچا۔ رمضان ۱۳۳۲ھ میں جنگ عمومی کا آغاز ہو گیا تھا مگر ٹرکی ذوالحجہ ۱۳۳۲ھ میں شامل ہوا۔ مدینہ منورہ میں حسب معمول مشاغل تدریسیہ میں شامل رہا۔

حضرت استاذ علامہ مولانا شیخ الہند ۳۳ھ میں بقصد حج و زیارت مکہ معظمہ تشریف لائے اور وہاں سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے اور غریب خانہ پر فروکش ہوئے۔ اور چند ماہ کے بعد ماہ جمادی الاولےٰ یا جمادی الثانیہ سنہ مذکورہ میں مکہ معظمہ میں اور پھر طائف تشریف فرما ہوئے۔ میرا اس سفر میں مولانا مذکورہ کی خدمت میں حاضر رہنا ضروری تھا اس لئے حاضرہ کر وظیفہ خدمت گزاری ادا کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس سفر کی حالت اور جو کچھ طائف۔ مکہ معظمہ۔ جدہ۔ مصر۔ مالٹا وغیرہ میں گزرا مفصلاً "سفرنامہ اسیر مالٹا" میں مذکور ہے د مدینہ اخبار میں اس کا اشتہار طبع ہوا کرتا ہے اگر یہ رسالہ نظر سے نہ گزرا ہو تو منگا کر دیکھ لیجئے۔ مالٹا سے واپسی پر تحریکات حاضرہ میں حصہ لیتے ہوئے کچھ دنوں مدرسہ عربیہ اسلامیہ امروہہ میں بوظیفہ صدر مدرسی کار تدریس انجام دینا پڑا۔ اور پھر حسب ارشاد حضرت شیخ الہندؒ کلکتہ کے مدرسہ واقعہ ناخدا مسجد میں جو کہ ان دنوں قائم کیا گیا تھا۔ چند دنوں بعہدہ پرنسپل کام کرتا رہا اور حسب شروط ملازمت چند ماہ وہاں کار تدریس سرانجام دے کر پھر تحریک میں سرگرمی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اسی عرصہ میں کراچی کا مقدمہ پیش آیا۔ دو برس کراچی اور سابرمتی جیل میں رہ کر پھر تقریباً ایک سال تحریک حاضرہ میں حصہ لیتا رہا۔ مگر ہندو مسلم اختلاف کی وجہ سے کامیابی کی کوئی صورت مفید نہ دیکھ کر سلہٹ میں دو سال کے لئے تدریس حدیث کی غرض سے ملازمت اختیار کر لی۔ بظاہر یہاں شعبان تک قیام ضروری ہے۔ آئندہ خدا جانے۔

یہ ہے ایک ناکارہ اور نالائق کی مختصر سی سرگزشت۔ جس سے کوئی فائدہ اور نتیجہ نہیں۔ اب اپنے سوالات کے جوابات سنئے۔

ابن سعود اور اس کی جماعت کا دعوےٰ یہ ہے کہ ہم حنبلی مذہب ہیں۔ مثل شوافع اور احناف کے ہم

ہم عقائد میں اسلاف اور ائمہ اہل سنت کے تابع ہیں۔ اور فروع میں امام احمد بن حنبل رہ کے تابع ہیں۔ وہاں کوئی خاص مذہب نہیں ہے۔ میری نظر سے چند رسالے میاں گزرے ہیں جن میں بہت سی بحثیں میں نے دیکھی ہیں مگر تمام رسالوں کو اور ان کے تمام حصوں کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری طرف جو جو باتیں خلاف عقیدۂ اہل سنت والجماعت نسبت کی جاتی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ ہم جملہ امور میں طریق اہل سنت والجماعت کے پابند ہیں۔ البتہ بعض جزئیات میں ہم مخالفت کرتے ہیں۔ جن کے لئے ہمارے پاس کتاب وسنت اور اقوال فقہاء سے دلیلیں موجود ہیں۔ پوری تفصیل ان کے احوال کی وفد خلافت اور وفد جمعیۃ علماء کی واپسی پر معلوم ہوگی۔ اس لئے ہم کو انتظار کرنا ضروری ہے۔ ہمارے علم میں ابھی تک کوئی بات ایسی نہیں آئی جس کی وجہ سے ابن سعود اور اس کے متبعین کی تکفیر کی جا سکے۔ اور نہ ہم کو کسی طریقہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت اور آپ کے نبی آخرالزمان ہونے کے منکر ہیں۔ بلکہ ان کے رسائل سے اس کا اقرار معلوم ہوتا ہے۔ تکفیر کرنا نہایت سخت امر ہے۔ مذہب اسلام میں لعن اور تکفیر کے برابر کوئی اور گناہ بعد از شرک وقتل نہیں۔ تکفیر اور لعنت کرنے والا خود کافر اور ملعون ہو جاتا ہے اگر وہ شخص مکفر واقع میں مستحق تکفیر ولعن نہ ہو۔ اس لئے اس پر جرأت کرنا نہایت بے عقلی کی بات ہے۔ جب تک ابن سعود خلاف شریعت حکم نہیں کرتا اہل عرب کو اس کی اعانت کرنا ضروری ہے۔ اور اگر خلاف شریعت کوئی حکم کرے تو، ایسے وقت میں کسی کی بھی اطاعت ضروری نہیں۔

ساؤتھ افریقہ گورنمنٹ کی چیرہ دستیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ مگر یہ سب ہندوستان کی غلامی کا نتیجہ ہے۔ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو جائے ہر جگہ ہندوستانی حقارت اور ذلت ہی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ افسوس کہ ہندو قوم اور اس کے لیڈروں کو ذرا بھی احساس نہیں۔ انہوں نے اپنی دل تنگی اور بے عقلی سے تحریک آزادئ ہند میں وہ رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں کہ اب عرصہ تک کے لئے آزادئ ہند کا مسئلہ متاخر ہو گیا اور اگر یہی لیل ونہار رہے تو تمام ہندوستان روز انہ برباد ہوتا رہے گا۔ اور کوئی صورت خلاصی کی میسر نہیں ہوگی۔ مسلمانوں نے ہندو قوم کی چیرہ دستیوں اور بے انصافانہ کارروائیوں پر برابر تین برس صبر کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ مگر اب مجبور ہیں کہ مدافعت کے لئے قدم اٹھائیں اور ترکی بترکی جواب دیں۔ گورنمنٹ خوشیاں منا رہی ہے۔ دونوں فریقوں کو کم وبیش جیل خانہ اور پھانسی پر لٹکا رہی ہے۔ مگر یہ ناعاقبت اندیش فرقہ وارانہ اختلاف اور غیر مفید جھگڑوں میں روزانہ قدم بڑھاتے جا رہے ہیں۔ اور ارادہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے بالکل ناپید کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا خدا ان کا محافظ ہے۔ دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت چکی کے پاٹ میں ہیں۔ ادھر گورنمنٹ ان کو ہر طرح پیس رہی ہے۔ ادھر ابنائے وطن۔

ہندو قوم ان کی جان و عزت، مال و مذہب سبھی کے دشمن بنے ہوئے جتھا بندی اور اجتماعی قوت کے ساتھ ہر قسم کی کاروائی کر رہے ہیں۔ اور گوریلا وارز کے طریقہ پر قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ عہدوں، مال، قانون کے ذریعہ سے کورٹ میں بھی نقصان پہنچا رکھا ہے۔ سنگٹھن اور شدھی کے ذریعہ سے ہر قسم کا حملہ ہو رہا ہے۔ دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی دستگیری فرمائے۔ والسلام۔ واقفین پرسان حال سے سلام مسنونہ، عرض کر دیجئے۔

حسین احمد غفرلہٗ

از سلہٹ خلافت آفس دار الحدیث۔ ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ

◎

محترم المقام زید عنایتکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج مبارک۔

کل آپ کا دوسرا کارڈ باعث سرفرازی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پہلے سے اس ارادہ میں تھا کہ جن مضامین کا جناب مطالعہ فرما رہے ہیں ان کی نسبت کچھ لکھوں، مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فرصت بالکل نہیں ملتی۔ اس وقت میرے سامنے میز پر تقریباً سو سے زائد خطوط، کارڈ اور لفافے پڑے ہوئے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے۔ کئی کئی مہینے گزر گئے جواب نہ دے سکا۔ روزانہ پانچ سات خطوط آتے رہتے ہیں۔ مضامین کے لکھنے کے مطالبے علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ میں بصیغۂ تدریس قومی ملازم ہوں اس لئے تقریباً چار گھنٹہ روزانہ تدریس میں صرف کرنا ضروری ہے۔ پھر عربی اور خصوصاً علم حدیث کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں، دوسرے فنون و علوم کی طرح نہیں کہ پروفیسر کو مطالعہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں تو کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹہ مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے طلبہ کے بھی خارجی اسباق ہیں۔ لوگ ملاقات کے لئے آکر روزانہ کچھ نہ کچھ وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے شخصی اشغال ضروریہ ہیں جن کی وجہ سے دو چار خطوط کا روزانہ لکھنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔

آپ کا پارسل نامعلوم کس وجہ سے بیرنگ ہو گیا تھا۔ ڈاک والوں نے کہا کہ ممالک خارجہ سے آیا ہے اس پر اس قدر ڈیوٹی زائد ہے۔ اس لئے انہوں نے اس پر گیارہ آنے یا اس سے کچھ کم یا زیادہ لئے تھے۔ معنوی حیثیت سے تو وہ بہت بیش قیمت تھا کہ اس میں خاک شفا اور دوسرے تبرکات تھے۔ مگر ظاہری حیثیت سے وہ اتنی قیمت نہ رکھتا تھا جتنی آپ نے ٹکٹوں پر اور میں نے ٹیکس پر خرچ کیا۔ میں نے انہیں دنوں ایک عریضہ، آپ کی خدمت میں پارسل پہنچنے، اور یہ کہ میں ان شاء اللہ بوقت فرصت مضمون لکھنے کا قصد کروں گا۔ اس کی اطلاع

کرلے کے لئے لکھا تھا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ ان لفافوں میں چند لفافہ انگریزی پتہ لکھے ہوئے موجود تھے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ میں نے سمجھا کہ یہ پتے آپ کے یہاں کے لکھے ہوئے ہیں۔ کسی دوسرے سے پڑھوایا بھی نہیں۔ اس میں سے ایک لفافہ لے کر اس میں خط رکھ کر بھیج دیا۔ اور تین مہینوں کے بعد وہ واپس آیا کہ مکتوب الیہ نہیں ملتا۔ مزید اطمینان کے لئے وہ بھی منسلک ہے۔

میں نے کتابوں سے احادیث متعلقہ ارض عرب کہ " وہاں یہود و نصاریٰ وغیر مسلم اقوام کو رہنے نہ دیا جائے " نکالیں اور ان کا ترجمہ کرکے فقط آپ کے لئے رکھا تھا۔ اور خیال قوی تھا کہ آیات وغیرہ لیتے ہوئے متعلقہ جزیرۃ العرب ایک مفصل مضمون لکھوں گا۔ افسوس اور صد افسوس کہ باوجود کثرت اشتیاق او مضمون آج تک اتنی فرصت نہ مل سکی کہ اس کو قلم بند کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریر و تقریر کے ساتھ تدریس نہیں ہوسکتی۔ گر ہم اگر تدریس نہ کریں تو پھر دفع احتیاج و ضروریات کی کیا صورت ہو۔ اگر تدریس کے لئے قلیل وقت خرچ کیا جائے تو وہ اپنی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوسکتا۔ آج میں اس امر سے مایوس ہوکر کہ مجھ کو مضمون لکھنے کی فرصت مل سکے گی۔ آپ کو احادیث متعلقہ جزیرۃ العرب بھیج رہا ہوں۔ اگر زندگی باقی ہوئی۔ اور خدا کو منظور ہوا اور آپ کو ضرورت بھی محسوس ہوئی تو مضمون بھی لکھوں گا۔ ورنہ میری مجبوری ظاہر ہے۔ مجھ کو آپ کے سامنے شرمندگی بھی زیادہ ہے۔ مگر خداوند کریم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ میں بصد ادب آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر آئندہ کسی پارسل وغیرہ کے ارسال کا قصد نہ فرمائیں۔ میں حتی الوسع غیر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ البتہ جو چیزیں ہندوستان میں تیار نہ ہوسکتی ہوں اور ان کی ضرورت بھی ہو۔ ان کو بحسب حاجت استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس سوائے گھڑی، عینک اور فاؤنٹین پن کے اور کوئی چیز غیر وطنی نہیں۔ فونٹین پن بھی سوائے سفر، دوسرے اوقات میں استعمال نہیں کرتا۔

آپ کے مرسل کا غذلت وغیرہ غیر وطنی تھے۔ مجھ کو اسلامیت اور وطنیت کا سودا سخت ہے۔ میں زیادہ ضروری سمجھ رہا ہوں کہ مسلمان اور اہل ہند کھدر کا استعمال کریں اور ولائتی چیزوں سے حتی الوسع گریز کریں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی خصوصاً مسلمان اس امر میں نہایت بزدل واقع ہوئے ہیں۔ آپ ایک دور دراز ملک میں ہیں آپ کی اور ہماری حالت میں فرق ہے۔ خداوند کریم جلد وہ دن لائے کہ " وطن آزاد ہو۔ اسلام کا علم چاروں طرف لہراتا ہو اور صلیب سرنگوں ہو۔ خداوند کریم آپ کے اور ہمارے مقاصد بر لائے۔ آمین۔ والسلام

حسین احمد غفرلہ

از سلہٹ خلافت آفس دار الحدیث　۵ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ

احادیث
جزیرۃ العرب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

◎

۱:- لاخرجن الیھود و النصارٰے من جزیرۃ العرب حتی لاادع الا مسلم۔

رواہ مسلم و ابو داؤد و ترمذی عن عمرؓ

ترجمہ:- میں یہودیوں اور نصرانیوں کو ضرور بالضرور جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا۔ یہاں تک کہ سوائے مسلمانوں کے یہاں کسی کو نہ چھوڑوں گا۔ اس کو مسلم۔ ابوداؤد اور ترمذی نے بواسطہ عمر رضی اللہ عنہ روایت کیا۔

۲:- لئن عشت ان شاء اللہ لاخرجن الیھود و النصارٰے من جزیرۃ العرب

رواہ ترمذی و الحاکم فی المستدرک عن عمرؓ۔

ترجمہ:- اگر میں زندہ رہا تو انشاءاللہ ضرور بالضرور یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرہ عرب سے نکال دوں گا۔ اس کو ترمذی اور حاکم نے حضرت عمرؓ کے ذریعہ سے روایت کیا ہے۔

۳:- اخرجوا الیھود من جزیرۃ العرب رواہ ابوداؤد۔ و الدارمی و الحاکم عن ابی عبیدۃؓ و الطبرانی فی الکبیر عن ام سلمۃؓ۔

ترجمہ:- یہودیوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔

۴:- اخرجوا یھود نجران من الحجاز رواہ ابونعیم فی المعرفۃ عن ابی عبیدۃؓ۔

ترجمہ:- یہود نجران کو حجاز سے نکال دو۔

۵:- اخرجوا یھود الحجاز و اھل نجران من جزیرۃ العرب و اعلموا أنّ شر الناس الذین اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد رواہ امام احمد فی مسندہ و ابو یعلی و الحاکم فی الکنٰی و ابونعیم فی الحلیۃ و ابن عساکر و ایضا المقدسی فی المختار عن ابی عبیدۃ بن جراح قال اخر

ماتکلم به رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فذکرہ ۔

ترجمہ:۔ حجاز اور اہل نجران کے یہودیوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ اور جان لو کہ سب سے برے ہیں جنہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبریں مسجدیں بنالیں۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری بات یہ تھی۔

۶ ا۔ ان عشت لاخرجن الیهود والنصارٰی من جزیرة العرب حتی لا اترك فیها الا مسلم (رواه الامام احمد ومسلم وابوداؤد والترمذی و النسائی وابن الجارود وابو عوانه وابن حبان والحاکم فی المستدرك عن عمر رض ۔

ترجمہ:۔ اگر میں زندہ رہا تو جزیرہ عرب سے ضرور بالضرور یہود و نصارٰی کو نکال دوں گا۔ تاکہ سوائے مسلمانوں کے اس میں کسی کو نہ چھوڑوں ۔

۷ ا۔ لئن بقیت لا ادع بجزیرة العرب دینین ۔ (رواه ابن سعد عن عبید الله ابن عبد الله بن عتبة مرسلا)

ترجمہ:۔ اگر میں باقی رہا تو جزیرۃ العرب میں دو دین نہ چھوڑوں گا۔

۸ ا۔ لیس علی مؤمن جزیة ولا یجتمع قبلتان فی جزیرة العرب (رواه البیهقی عن ابن عباس رض ۔

ترجمہ:۔ مسلمانوں پر جزیہ نہیں ہے اور دو قبلے جزیرۃ العرب میں جمع ہونے چاہئیں۔

۹ ا۔ قاتل الله الیهود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیاء هم مساجد لا یبقیان دینان بارض العرب ۔ (رواه البیهقی عن ابی عبیدة رض) ۔

ترجمہ:۔ خداوند کریم یہود و نصارٰی کو قتل کرے کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بنا ڈالا ۔ عرب میں دو دین باقی نہ رکھے جائیں۔

۱۰ ا۔ لا یبقی فی جزیرة العرب دینان ۔ (رواه الامام احمد عن عائشة رض) ۔

ترجمہ:۔ دو دین جزیرۃ العرب میں باقی نہ رکھے جائیں ۔

۱۱ ا۔ لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب (رواه البیهقی عن ابن عمر رض) ۔

ترجمہ:۔ دو دین جزیرۃ العرب میں جمع نہ ہوں ۔

۱۲ ا۔ یا علی ان ولیت الامر بعدی فاخرج اهل نجران من جزیرة العرب ،

(رواہ الامام احمد عن عمرؓ)۔

ترجمہ :- اے علی ! اگر تم میرے بعد مسلمانوں کے حاکم بنائے گئے تو اہل نجران کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔

۱۳ :- عن ابن عمرؓ قال قال عمر لا تترکوا الیھود والنصاریٰ بالمدینۃ فوق ثلاثۃ قدرما یبیعون سلعتہ وقال لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب

(ابوداؤد وابن شیبۃ)۔

ترجمہ :- حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کو مدینہ منورہ میں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرنے دو۔ یعنی جس مقدار میں کہ وہ اپنی پونجیوں (سامان تجارت) کو فروخت کرسکیں۔ اور فرمایا کہ دو دین جزیرہ عرب میں جمع نہ ہونے چاہئیں۔

۱۴ :- عن ابن شہاب قال فحص عمر بن الخطاب رضؓ حتی اتاہ الثلج والیقین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب فاجلی عمر یہود خیبر (رواہ مالک والبیہقی)۔

ترجمہ :- ابن شہاب زہری فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بہت تفتیش کی۔ یہاں تک کہ ان کو یقین اور اطمینان حاصل ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ۲ دو دین جزیرۃ العرب میں نہ جمع ہونے چاہئیں۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے خیبر کے یہودیوں کو خیبر سے شہر بدر کر دیا۔

۱۵ :- عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال قبل وفاۃ لا یبقی فی جزیرۃ العرب دینان (ابن نجار)

ترجمہ :- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں ۲ دو دین باقی نہ رہنے چاہئیں۔

۱۶ :- عن علیؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یترک بارض العرب دینان دین مع الاسلام (رواہ ابن جریر فی تھذیبہ)

ترجمہ :- حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عرب کی زمین میں ۲ دو دین نہ چھوڑے جائیں۔ دوسرا کوئی دین اسلام کے ساتھ۔

۱۷ :- عن ابی عبیدۃ رضؓ اخر ما تکلم بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اخرجوا الیھود اھل الحجاز واھل نجران من جزیرۃ العرب واعلموا ان شر الناس الذین اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد (رواہ الامام احمد و

و ابو یعلیٰ)۔

ترجمہ :۔ حضرت ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ آخری گفتگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تھی کہ یہود اہل حجاز اور اہل نجران کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ اور جان لو کہ سب سے برے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بنالیا ۔

محترم المقام ۔ زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ مزاج شریف ۔

عرصہ کے بعد والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اہل بہار کی امداد کی طرف توجہ فرمانا بہت خوب اور بہتر ہے۔ اس میدان میں قابل اطمینان کام کرنے والی صرف دو جماعتیں ہیں۔ مونگیر مسلم ریلیف کمیٹی۔ اور امارت شرعیہ پھلواری شریف بہار۔

میں ایک نالائق اور ناکارہ خادم قوم ہوں۔ آپ کو اس طرف توجہ کرنی کہ اخباروں کے پرچے محفوظ رکھیں اور ان کے شائع کرنے کا خیال کریں بے موقع ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالےٰ اپنی مرضیات کی مکمل توفیق عطا فرمائے اور مسلم قوم کو احساس اور ظفر و کامیابی عطا کرے۔ آمین۔

دارالعلوم دیوبند علوم دینیہ کا مرکز ہوگیا ہے۔ اس وقت میں تقریباً گیارہ سو چھیاسٹھ ۱۱۶۶ طالب علم اس میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم پاتے ہیں۔ جن میں نوسو ۹ سے زیادہ باہر کے طالب علم ہیں۔ ان میں ترکستان چینی۔ بخارا افغانستان۔ بلوچستان وغیرہ کے طلباء کی بہت بڑی تعداد ہے۔ افسوس کہ ان دنوں ملک سے امداد و اعانت میں بہت کمی ہو رہی ہے۔ اس لئے اس پر مصارف کا بار بہت زیادہ ہے۔ عمارات دارالطلبہ میں بہت کمی ہے عمارات کی بہت حاجت ہے۔ اہل ڈربن اور ساؤتھ افریقہ کے باہمت مسلمانوں کو اس طرف خصوصیت سے متوجہ ہونا چاہئے۔ یہ بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے اور نہایت ضروری کام ہے۔ امید وار ہوں کہ اس کا ہمیشہ اور فوق العادت خیال رکھا جائے گا۔ جو تہذیب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تہذیب سے علیحدہ ہوگی خواہ وہ فرنچ کی ہو یا امریکن یا اور کسی مخالف اسلام کی، وہ مردود ہے۔ ہمارا مطمح نظر صرف نبی عربی (روحی فداہ) علیہ السلام کی تہذیب اور ان کا طریق تمدن ہونا چاہئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک گنجان تھی۔ طول و عرض رکھتی تھی۔ اس میں کنگھی کی جاتی تھی۔ بوقت وضو اس میں خلال انگلیوں سے کیا جاتا تھا۔ صحابہ کرام رضہ بالخصوص حضرت عبداللہ بن عمر رضہ اپنی داڑھی ایک مٹھی ناپ کر زائد کاٹ دیا کرتے تھے۔

چونکہ وہ اتباع سنت میں بہت زیادہ سخت ہیں۔ اس لئے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک ایک مٹھی ہوتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشابہت اور آپ کی تابعداری میں ہر قسم کی فلاح و بہبودی ہے۔ اور دشمنانِ خدا و رسول ؐ کی مشابہت اور ان کی تہذیب کی تابعداری میں ہر قسم کی ہلاکت کا خوف ہے اس لئے کوئی فیشن ہو لپسندیدہ نہیں جب تک کہ وہ خدا اور اس کے مقرب بندوں کے فیشن میں سے نہ ہو۔ یہ اغیار کے فیشن سب ناجائز اور مبغوض ہیں۔

حضرت امام مہدی ؑ قیامت سے پہلے بلکہ نزول عیسیٰ علیہ السلام۔ اور خروج دجال وفتنہ یاجوج وماجوج و دابۃ الارض وطلوع شمس من المغرب وغیرہ سے پہلے ظاہر ہوں گے۔ قیامت میں تو تمام انبیاء اور اولیاء کا اجتماع ہوگا۔ حضرت امام مہدی ؑ دنیا میں مذہب اسلام کی زندگی اور اس کی تقویت کے باعث ہوں گے وہ اس وقت میں ظہور فرمائیں گے جب کہ دنیا ظلم وستم سے بھر گئی ہوگی۔ ان کی وجہ سے دنیا میں عدل وانصاف، دین وایمان سے بھر جائے گی۔ ان کا اور ان کے باپ کا نام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپ کی والدہ ماجدہ کے نام کے مطابق ہوگا۔ صورت بھی آپ کی صورت کے مشابہ ہوگی۔ آپ ہی کی اولاد سے ہوں گے۔ یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی نسل میں سے۔

مکہ معظمہ میں ظاہر ہوں گے۔ اول جو جماعت ان کے ہاتھ پر بیعت کرے گی۔ وہ تین سو تیرہ (۳۱۳) آدمی ہونگے حسب وعدہ اصحاب بدر اور اصحاب طالوت۔ لوگوں میں یکبارگی انقلاب پیدا ہوگا۔ حجاز کی اصلاح کے بعد سیریہ اور فلسطین وغیرہ کی اصلاح کریں گے۔ ان کا دار السلطنت بیت المقدس ہوگا۔ ان کی حکومت پانچ (۵) یا سات (۷)، یا نو برس (۹) ہوگی۔ اس بارہ میں صحیح روائتیں تقریباً چالیس میری نظر سے گزری ہیں۔ اور حسن اور ضعیف بہت زیادہ ہیں۔ ترمذی شریف۔ مستدرک حاکم۔ ابو داؤد۔ مسلم شریف وغیرہ میں یہ روایات موجود ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ۔ اگر قیامت آنے میں صرف ایک دن باقی رہ جائے جب بھی اللہ تعالےٰ مہدی ؑ کو ضرور ظاہر کرے گا اور قیامت ان کے بعد لائے گا۔ لہٰذا اس میں بجز تسلیم کوئی چارہ نہیں۔ بہت سے جھوٹوں نے اب تک مہدی ؑ ہونے کا دعوےٰ کیا مگر کسی میں یہ علامتیں نہیں پائی گئیں۔ جو مہدی موعود ؑ کے متعلق ذکر کی گئی ہیں۔

میں نے مالٹا جانے سے پہلے مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں تلاش کر کے صحیح صحیح روائتیں جمع کی تھیں۔ مگر افسوس کہ وہ رسالہ "روسی انقلاب" میں جاتا رہا۔ اب میرے پاس وہ نہیں رہا۔ اور جن لوگوں نے اس کو نقل کیا تھا وہ بھی وفات پا گئے اور رسالہ پھر نہ مل سکا۔ والسلام۔

دعواتِ صالحہ اور خدمات سے یاد فرماتے رہیں۔ فتوحات مکیہ میں بھی شیخ اکبر صاحب رح نے ان کے احوال اپنے کشف سے بہت ذکر فرمائے ہیں۔

میں آپ کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کی امداد و اعانت بہت مفید اور ضروری ہے۔ جس قدر ممکن ہو اس کو زمانہ میں ترقی دینا ازبس ضروری ہے۔ والسلام۔

ننگ اسلاف
حسین احمد غفرلہ
۲۲ صفر المظفر ۵۳ ۱۳ ھ

◎

محترم المقام زید عنایاتکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف۔

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ اس سے پہلے بھی والا نامے پہنچے۔ لیکن عدیم الفرصتی اس قدر رہتی ہے کہ جس کی حد و نہایت نہیں۔ اور اس وجہ سے اکثر احباب اور بزرگوں کے خطوط پڑے رہتے ہیں جواب کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس عدیم الفرصتی پر آپ کا ارشاد ہے کہ مولانا شیخ الہند رح کے کچھ احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

میرے محترم یہ مقصد تو بحر ناپیدا کنار ہے۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب نے مختصر طور پر حضرت شیخ الہند رح کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اس سے کچھ احوال معلوم ہو جائیں گے۔ میں نے احمد آباد جیل میں ارادہ کیا تھا۔ کہ اپنی معلومات کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق قلم بند کروں۔ کچھ مصالحہ بھی جمع کیا گیا مگر حکام ایک جھگڑا پیش آگیا۔ جس کی بنا پر کاغذ۔ قلم۔ دوات وغیرہ چھین لگئے۔ پھر اس کے بعد کوئی فرصت ہی نہ ملی۔ حضرت شیخ الہند مرحوم و مغفور نے دس پارے ترجمہ کے ہندوستان میں لکھے تھے۔ باقی دس پاروں کے تراجم حضرت رح نے مالٹا میں تحریر فرمائے۔ اس وقت عبارت قرآن شریف کی میں لکھتا تھا۔ اور حضرت رح اردو میں ترجمہ قلم بند کر دیا کرتے تھے۔ میرا کوئی علاقہ نفس ترجمہ میں نہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مدینہ منورہ میں وفات کر گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ جن کی آج کوئی اولاد زندہ نہیں ہے۔ معاپنے بھائی حاجی مقبول احمد صاحب مدینہ منورہ میں موجود ہیں۔ البتہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی بڑی صاحب زادی جو کہ پہلی اہلیہ سے ہے سہارنپور میں موجود ہے۔ آپ اگر تعزیت کا خط تحریر فرمائیں تو مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے نام تحریر فرمائیں۔ موصوف مولانا مرحوم کے داماد ہیں نگران کی اہلیہ وفات کر چکی ہیں۔

کچھ طلبہ خارج شدہ اور کچھ ملازمین۔ مدرسین و اہل شہر موجودہ دائرۂ اہتمام کے دعوکہ کامیابی کیساتھ

تیس برس سے مدرسہ کی خدمتیں انجام دے رہا ہے) مخالف ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے ہر طرح شور و شغب، فساد و شرارت بپا کر رکھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یا تو موجودہ اسٹاف بالکل علیحدہ ہو کہ مدرسہ ہمارے قبضہ میں کلیتہً آجا دے یا مدرسہ بالکل فنا ہو جائے۔ اور چونکہ بیرونی ہاتھ اس میں خفیہ طور سے کام کر رہا ہے۔ اس لئے دشمنوں کی غرض یہ ہے کہ جس طرح ہو علمائے دیوبند کی اجتماعی قوت زائل ہو جائے، یہ مدرسہ برباد ہو جائے علمائے دیوبند کا اثر عام مسلمانوں سے اٹھ جائے۔ اس لئے وہ بیرونی ہاتھ خفیہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اور یہاں کے ناعاقبت اندیش لوگ ان کے اشاروں پر کود رہے ہیں۔ خدا انجام بخیر کرے یہ لوگ ہر طرح کے فساد برپا کر رہے ہیں۔ اور مدرسہ کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ انہوں نے باقی نہیں رکھا ہے۔ طلبہ کو ورغلائے ہیں ان سے اسٹرائک کراتے ہوئے مدرسہ کی بنیادیں کھودتے ہیں۔ اسلام کا ستارہ چونکہ گہن میں آرہا ہے اس لئے ہر طرف سے اسی قسم کی متوحشانہ خبریں آرہی ہیں۔ امید ہے کہ دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام۔

ننگ اسلاف
حسین احمد غفرلہ
از دیوبند آستانہ حضرت شیخ الہند مرحوم و مغفور
۱۶ رجب المرجب ۱۳۴۶ھ

◎

محترم المقام زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج مبارک۔

جناب کا والا نامہ محررہ ۲۱ دسمبر یہاں ۱۱ جنوری کو پہنچا۔ میں ۱۳ دسمبر سے یہاں سے روانہ ہو گیا تھا کیونکہ بلگام میں خلافت کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا۔ اس میں شرکت کے لئے مرکز ہی سے دعوت آئی تھی۔ اور ضروری قرار دیا گیا تھا۔ راستے میں چند مقامات پر ضروری کاروبار تھے۔ غرضیکہ ۲۳ دسمبر کو بمبئی ہوتا ہوا بلگام پہنچا وہاں پر اجلاس ختم ہونے سے پہلے سالانہ اجلاس جمعیت علماء منعقدہ مراد آباد کی شرکت کے لئے مجبور کیا گیا۔ جو کہ ۱۱ جنوری کو شروع ہونے والا تھا۔ اس لئے پیارم پلیٹ۔ مدراس بمبئی۔ سوات وغیرہ ہوتا ہوا مراد آباد پہنچا۔ وہاں سے فارغ ہو کر نواکھالی کے جلسوں میں شرکت کرتا ہوا ۲۵ جنوری کو سلہٹ آیا تو جناب کا والا نامہ ملا۔ علاوہ اس کے ستو یا اس سے زائد اور خطوط تھے جو کہ اس ڈیڑھ ماہ کی مدت میں جمع ہو گئے تھے۔ ان سبھوں کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ادھر تعلیمی سلسلہ جس کے لئے یہاں قیام ہے اس کو بھی انجام دینا ضروری ہے۔ بقیہ اوقات

ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امر پادریوں یا آریوں کے اسالیب میں سے ہے ۔ اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے ۔ کہ بعض اہل حرمین اس قسم کے اشتہارات شائع کر کے بذریعہ مکر و خدع اپنے مطالب نفسانیہ کو حاصل کرتے ہوں گے ۔ بہرحال کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے ۔ ان اشتہاروں میں قبر شریف کے پاس سے کسی چیز کا حاصل کرنا بھی ذکر کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ قبر شریف اور لوگوں کے درمیان میں دو دیواریں ایسی حائل ہیں کہ وہاں تک جانا ممکن ہی نہیں ۔ کوئی دروازہ ہی نہیں رکھا گیا ۔ تیسری جالی ہے ۔ جس میں خاص خاص اوقات میں خاص لوگ جا سکتے ہیں ۔ پھر قبر شریف تک کس طرح رسائی ہوئی ۔ جس قدر تعداد مسلمان مرنے کی ذکر کی گئی ہے وہ بھی غلط ہے ۔ فقط ہندوستان میں ہی سالانہ تقریباً بیس لاکھ آدمیوں سے زیادہ مسلمان مرتے ہیں ۔ اور تمام دنیا سے تو کوئی حد نہیں ۔ پھر اس میں جس قدر ایمان والے ذکر کئے جاتے ہیں ۔ اس سے زیادہ تو محض اولیاء اللہ اصحاب خدمت باطنیہ ہوتے ہیں ۔ اقطاب و اوتار ۔ غوث وغیرہ وغیرہ ۔

حفظ قرآن کے لئے ترمذی شریف میں وہ صاحب وہ عمل دیکھ لیں جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض کو بتلایا تھا جب کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے قرآن کے حفظ نہ کر سکنے کی شکایت کی تھی ۔ اس عمل کو حافظ موصوف کریں انشاء اللہ نتیجہ جلد ظاہر ہوگا ۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں ۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

از دارالعلوم دیوبند ۔ آستانۂ عالیہ حضرت شیخ الہند مرحوم

۶، ذیلقعدہ ۱۳۴۵ ھ

◎

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ مزاج مبارک ۔

مدتوں کے بعد والا نامہ آیا ۔ احوال معلوم ہوئے ۔ میں نے دیوبند کا تعلق ملازمت وتدریس نہیں چھوڑا ۔ اور جب تک کوئی شخص صدر مدرسی کی خدمت انجام دینے والا نہیں آئے گا بظاہر میرا یہاں سے جدا ہونا غیر ممکن ہے ۔ والعلم عنداللہ ۔

میں سلہٹ میں محض تعطیل کے ایام میں وہاں کے لوگوں کے سخت تقاضوں پر چلا گیا تھا ۔ پھر تعلیمی اوقات پر یہاں پہنچ گیا ۔ جناب حضرت شاہصاحب ان دنوں دیوبند ہی میں ہیں ۔ مگر خبر ہے کہ عنقریب بصیغۂ صدر

مدرس ڈابھیل ضلع سورت میں چلے جائیں گے۔

کسی صحیح یا حسن بلکہ ضعیف قابل عمل روایت سے اذان کے وقت انگلیاں چومنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ثابت ہے اور نہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ جو روایتیں اس باب میں ذکر کی جاتی ہیں۔ وہ یا تو موضوع ہیں یا حد درجہ کی ضعیف ہیں۔ اس لئے اس کو عبادت اور دینی امر سمجھ کر کرنا سخت نادانی اور غلطی ہے۔ ہاں بعض مشائخ سے ثابت ہے کہ یہ عمل آنکھوں کی بینائی کے لئے مفید ہے اس لئے دواءً اس کو کرنا جائز ہوگا۔ بہرحال لوگوں کو نرمی سے سمجھا دینا چاہیئے۔ اور ان کے تخیلات کو درست کر دینا اچھا ہے۔ مگر لڑنا، جھگڑنا، گالی گلوچ کرنا، فتنہ و فساد خصوصاً جہلاء کے ساتھ اٹھانا، نازیبا بات ہے۔ اور چونکہ خود کرنے سے عوام الناس اس کو دینی اور مذہبی امر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے اعراض اولیٰ ہے۔

کافروں کے لئے تعویذ میں آیت کا لکھنا جائز ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط کسریٰ و قیصر و قیصونس وغیرہ کفار ملوک کو لکھے ہیں۔ ان میں قرآنی آیتیں لکھی ہیں۔ حالانکہ احتمال توہین دونوں جگہ برابر ہے۔ بلکہ خط میں زیادہ تھا۔ خصوصاً جس مضمون کا خط آپ نے تحریر فرمایا تھا۔ اس لئے کہ کسریٰ نے اس کو چاک کر ڈالا۔ تعویذ تو کفار بھی احترام سے رکھتے ہیں۔

تاریخ میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیصر روم کو آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر دی تھی تاکہ اس کے سر کا درد جاتا رہے۔ چنانچہ جب وہ تاج جس میں حضرت عمرؓ کا لکھا ہوا تعویذ تھا۔ سر پر رکھتا تھا۔ درد موقوف ہو جاتا تھا۔ اور جب تاج اتارتا تھا درد پھر ہونے لگتا تھا۔ تاہم اولیٰ یہی ہے کہ آیت لکھ کر ان کو نہ دی جائے۔

عید کی تبریک اور کارڈ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔　　والسلام۔

ننگ اسلاف
حسین احمد غفرلہٗ

از دارالعلوم دیوبند آستانہ عالیہ حضرت شیخ الہند مرحوم

۲۱ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ

◎

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔　　مزاج شریف۔

آپ کا والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ میں ایک معمولی طالب علم ہوں۔ جو کچھ آپ پوچھیں گے اپنی لیاقت

کے مطابق عرض کر دوں گا۔ مگر کیا کروں فرصت نہیں ہوتی۔ مشاغل بہت زیادہ ہیں۔ اور پھر طبعی کسل اور اسفار اور بھی زیادہ ترسد راہ ہوتے ہیں۔ آپ کے اجوبہ معہ اسکے عرض کرتا ہوں۔

سوال ۱؎:۔ اگرچہ بعض اخبارات نجدیوں کے مظالم ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی امن عام کی خبر بالاتفاق نزد مخالف و موافق مسلّم امر ہے۔ لہٰذا کسی طرح فریضۂ حج سے تقاعد کرنا جائز نہیں۔ جو حضرات سفر حج مفروض سے منع کرتے ہیں وہ بہت زیادہ خطا وار ہیں۔ جبکہ امن عامہ حجاج کے لئے نہ ہو۔ یعنی عدم سلامتی غالب ہو۔ یا کوئی شخص اپنے مذہب اور قول امام کے موافق ادائے نسک نہ کر سکتا ہو۔ اس وقت میں فریضۂ حج کو ادا کرنے میں تاخیر کرنی چاہیئے۔ اس وقت تک کہ امن عامہ قائم ہو جائے۔

سوال ۲؎:۔ اس جہاد میں جو کہ حسب قاعدہ شریعت قائم کیا گیا ہے یا بامر امام المسلمین منفرداً کسی حربی متحارب کے قتل کرنے سے مسلمان قاتل جنتی ہو سکتا ہے اور ہوگا۔ مگر ذمی (رعیت اسلام) یا حربی مصالح اور مسالم (وہ کافر حربی جس کے ساتھ امام سلام یا دوسرے مسلمانوں نے صلح کر رکھی ہے) کے قتل کرنے سے سخت گنہگار ہوگا۔ اور بہت زیادہ عذاب کا مستحق ہوگا۔ اگر کسی حربی محارب کو غیر جہاد میں (اور بغیر تعزیر و سزا) کا مستحق ہے۔ اگر وہ حربی کسی وجہ سے مستحق قتل ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر کافر حربی حملہ کر دے اور پھر قتل کرنے والا مسلمان مدافعت ہی میں قتل کر ڈالے تو کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔

سوال ۳؎:۔ اس بوڑھی ماں کی وصیت باطل اور گناہ ہے۔ اس کے لڑکوں کو اس پر عمل نہ کرنا چاہیئے ماں۔ باپ۔ بادشاہ۔ استاد وغیرہ کی اطاعت اس چیز میں ضروری ہے کہ جس میں خدا وندی نافرمانی نہ ہو۔ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔

اس گنبد وغیرہ کو توڑ ڈالنا چاہیئے۔ بشرطیکہ کوئی ایسا محذور لازم نہ آئے جو کہ اس سے بھی بڑا گناہ ہو۔ عورت کا خیال بالکل باطل ہے۔

سوال ۴؎:۔ جبل پور کے علاوہ مختلف مقامات پر اسم مبارک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوا۔ بکثرت لوگوں نے دیکھا۔ واللہ اعلم۔

جناب مولانا خلیل احمد صاحب کے تشریف لانے کی کوئی خبر نہیں۔ احباب و واقفین سے سلام مسنون عرض کر دیں۔ اور دعوات صالحہ اور خدمات لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام۔

ننگ اکابر حسین احمد غفرلہ

از دیوبند آستانۂ عالیہ حضرت شیخ الہند مرحوم۔ ۲۸ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ

مولانا الحاج الحافظ ریاض احمد اشرفی قاسمی

حضرۃ مدنی قدس سرہٗ اور حضرۃ تھانوی قدس سرہٗ

انبیاء علیہم السلام کے سوا باقی تمام انسانی طبقات میں اختلاف رائے رہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ اختلاف آراء جس طرح انسانی ذہن اور فہم کے تنوع کی نشانی ہے اسی طرح صلحاء امت کا کسی فروعی مسئلہ میں اختلاف امام الانبیاء سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں "رحمت" ہے۔ مفسرین کرام کی تاویلات کا تنوع۔ محدثین کی تشریحات اور ائمہ مجتہدین کے استنباط میں اختلاف کوئی نئی بات نہیں اور نہ ہی کوئی شرعی عیب ہے۔ البتہ جب متعلقین اختلاف کو خلاف اور ضد کی شکل دے دیتے ہیں تو وہ بجائے رحمت کے زحمت بن جاتا ہے۔

برصغیر کے مسلمان جانتے ہیں کہ شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہما کے درمیان کس قدر شدید سیاسی اختلاف تھا مگر ان دونوں کے درمیان اخلاص اور مودت۔ عقیدت اور احترام کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

"مولانا عثمانی رح کے برادر بزرگ مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رح کی مجلس میں کسی نے تحریک پاکستان کے عہد شباب میں حضرت مدنی رح کے متعلق نامناسب بات کہہ ڈالی تو آپ نے سخت طیش میں آکر فرمایا کہ تم یا کوئی اور کیا جان سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد کیا ہیں اور ان کا کیا مقام ہے؟ میرا خود یہ حال ہے کہ میں محض مولانا کی تکلیف کے خیال سے کھدر پہنتا ہوں ورنہ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا۔ مولانا حسین احمد کا دل جتنا روشن ہے آج کسی کا نہیں ہے"

(ماہنامہ برہان دہلی۔ بابت اگست ۱۹۶۰ء)

اسی طرح حضرت مدنی اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہما کے درمیان سیاسی اختلاف تھا مگر یہ سیاسی اختلاف رحماء بینھم کے منظر پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ ذیل میں ان دونوں صلحائے امت کی ملاقات کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ جو کہ حضرت مولانا الحاج حافظ ریاض احمد صاحب اشرفی قاسمی خطیب مسجد عثمانیہ سول لائنز راولپنڈی۔ کا چشم دید ہے۔ ادارہ جناب حافظ صاحب کا صدق دل سے شکر گزار ہے کہ انہوں نے یہ گراں قدر روداد عنایت فرمائی۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء فی الدین۔ (ادارہ)

○

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ بندہ آغاز جوانی میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوا تھا۔ اچانک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے برادر زادہ (جو خانقاہ کے حضرت کی طرف سے منصرم و مہتمم ہونے کے ساتھ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اکثر امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں مختار عام کا درجہ رکھتے تھے) حاضر ہوئے اور یوں عرض کیا "حضرت وہ آ گئے، حضرت وہ مولوی حسین احمد" (حسین احمد مدنی رح) ٹانڈوی یا فیض آبادی کہا یہ صحیح یاد نہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے ٹھہراؤ اور اطمینان سے فرمایا۔ کیا تم اپنے مولانا حسین احمد دیو بند (دیوبند) والوں کی بات کر رہے ہو؟ اس پر مولوی شبیر علی صاحب نے اثبات میں جواب عرض کیا۔ تو حضرت تھانوی رح نے بڑے اور سراپا محبت و شفقت کے انداز کے حامل گھبراہٹ آمیز لہجہ میں فرمایا۔ "کہاں! کدھر؟" اتنے میں حضرت مدنی رح تشریف لے آئے۔ حضرت تھانوی اٹھ کر بڑے تپاک اور مجسم اخلاص بنے حضرت مدنی رح کے استقبال کے لئے بڑھے اور بغلگیر ہوئے۔ بندہ نے اپنی آنکھوں سے جو منظر دیکھا وہ آج چالیس بھیانک سال بیت جانے کے بعد بھی یوں ہے جیسے یہ ابھی ابھی ان سطور کے رقم کرتے میرے سامنے ہی پیش آیا ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دست بوسی فرمائی۔ اور حضرت تھانوی رح اشتیاق و شفقت بھری آنکھوں سے حضرت مدنی رح کی طرف دیکھتے رہے۔ جب حضرت مدنی رح کا یہ عمل ختم ہوا تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دوبارہ گلے لگایا اور حضرت مدنی رح کا کندھا، پیشانی چوم کر ان کا ہاتھ اپنے سینے پر لگایا۔ اور پھر واپس اپنی نشست پر تشریف لاکے اور حضرت مدنی رح کو اپنے ساتھ سجادہ پر بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ حضرت مدنی رح سجادہ سے ہٹ کر بیٹھنا چاہتے تھے لیکن حضرت رح نے اپنی مبارک زبان سے فرمایا کہ میرا حکم ہے کہ آپ میرے ساتھ ہی سجادہ پر بیٹھیں۔ حضرت مدنی رح نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شکایتاً فرمایا کہ آپ نے بہت زیادتی کی کہ آمد کی پہلے سے اطلاع نہیں کی۔ بندہ شرمندہ ہے کہ آپ کی آمد کے لئے سواری کا بندوبست کرنے سے قاصر رہا۔ یا جیسے بھی حالات ہوتے۔ کم از کم کچھ عزیزوں کو استقبال کے لئے بھیج دیتا۔ اس پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ,, حضرت اپنے گھر میں بھی کوئی اطلاع کرتا ہے۔ اپنے گھر میں تو ہمیشہ بغیر اجازت اور بغیر اطلاع ہی کے آنا ہوتا ہے،، اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چہرہ کی سرخی۔ آنکھوں کی چمک اور شفقت آمیز لہجہ میں یہ کہنے کی لذت حقیقی طور پہ صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو وہاں موجود تھا اور یا وہ جو ان دونوں مسلم مشائخ کا گرویدہ اور دل دادہ ہو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔" بلاشک وشبہ آپ کی بات درست ہے۔ اور بندہ تو ہمیشہ سے آپ کو اپنے استاد حضرت مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) قدس سرہٗ کا قائم مقام اور جانشین سمجھتا ہے " یہ منظر قلم۔ اور گفتگو میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس منظر کشی بندہ سے ممکن ہی نہیں۔ البتہ آج تک اس کی حلاوت آمیز لذت اپنے دل و دماغ میں اسی طرح محسوس کرتا ہوں جس طرح چالیس سال قبل کی تھی۔

اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنی رہ سے کھانے کے متعلق دریافت فرمایا۔ تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل بے تکلفی اور اپنائیت کے لہجہ میں شلجم کے اچار (اچار شلجم) اور روٹی کی فرمائش کی۔ حضرت تھانوی رہ نے مولانا شبیر علی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا (ان الفاظ کی تقدیم تاخیر یاد نہیں رہی غالباً اسی طرح فرمایا تھا کہ بڑے گھر سے اچار، روٹی۔ اور چھوٹے گھر سے لسی لے آؤ۔

چنانچہ کچھ دیر کے بعد غالباً ایک گھنٹہ بعد یہ سب کچھ آگیا۔ میرے اور دوسرے خدام کے دل اس پر للچا رہے تھے کہ شیخین کا پس خوردہ ہمیں بھی اگر مل جائے تو ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ ہو گا۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نظام اور ضوابط کے تحت کسی کو لب کشائی اور اس قسم کی کیا۔ بلکہ ہر قسم کی درخواست بلا اجازت قبل از وقت جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن قربان جایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس مسجد کے عاکف اور جانشین شیخ الہند رہ کے اخلاق عالیہ کے۔ انہوں نے خود ہی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ اگر، اجازت ہو تو یہ روٹی اور اچار اپنے ان دو تین "طفیلیوں" کو دے دیا جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں اجازت کی ضرورت ہے ؟ آپ نے جب اسے اپنا گھر فرمایا ہے تو یہ سب آپ کا ہے میری جانب سے کوئی اعتراض نہیں۔ تو اس پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے صرف اس بنا پر اجازت کے لئے عرض کیا ہے کہ" مہمان کھانے کا مالک نہیں ہوتا اسے اس میں تصرف کا اختیار نہیں، اسے صرف کھانے کا اختیار ہے اور بقایا میزبان کی ملکیت ہے "

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس پر مسکرائے اور خوشدلی سے اجازت بھی مرحمت فرما دی۔ چنانچہ بندہ کو مع،

دوسرے دو خدام کے بلوایا گیا اور یہ تبرک ہمیں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمایا۔ اور پھر یہ بھی ہمیں بتایا ہوا عرض کیا گیا۔

جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے رخصت چاہی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے گھر سے بڑی عمدہ ململ کی دستار منگوائی اور حضرت مدنی رہ کو عطا فرمائی۔ حضرت مدنی رہ نے وہ دستار اپنے سر پر رکھ کر اس درخواست کے ساتھ واپس فرما دی کہ حضرت! آپ کے علم میں ہے کہ بندہ نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر رکھا ہے اس لئے بندہ استعمال کرنے سے مجبور ہے۔ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح معذرت فرمائی کہ دیہ بھی شرف دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق ہے۔ کہنے اور لکھنے میں وہ تاثرات نہیں دیئے جا سکتے)۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔" بھائی معاف کرنا! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ مجھے یہ بات مطلقاً دھیان میں نہیں رہی مجھ سے سہو ہو گیا"۔

چنانچہ وہ پگڑی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر مولانا شبیر علی رحمۃ اللہ علیہ کو واپس کر دی گئی۔ اور حضرت تھانوی رہ نے فرمایا کہ" بڑے گھر سے کھدر کی پگڑی لے آؤ"۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کھدر کی پگڑی عنایت فرمائی۔ تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا سر مبارک آگے کر کے عرض کیا حضرت آپ خود ہی باندھ دیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دست مبارک سے ہی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سر پر پگڑی لپیٹ دی۔ اور دو روپے ہدیہ بھی دیئے جو حضرت مدنی رہ نے بڑے ادب کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے لئے اور انہیں اپنی پگڑی کے ایک حصے میں باندھ کر سر میں دبا لیا۔ اس کے بعد حضرت تھانوی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے باہر تک تشریف لائے۔ اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بار بار اصرار پر واپس تشریف لے آئے۔

اس کے بعد پاکستان بن گیا اور نیشنلسٹ مسلمانوں اور لیگی مسلمانوں کے مابین چپقلش نے خود دیوبندی مسلک کے پیروکار مسلمانوں میں دو دھڑے کر دیئے اور سرزمین پنجاب میں بالخصوص انتہا پسندی کا جذبہ عام ہے۔ الا ماشاء اللہ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت میرے بعض دوستوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں مسلم لیگ سے اپنے اختلاف کے سبب نہایت نازیبا اور مکروہ کلمات کہنے شروع کئے۔ جن کا مجھے بے حد صدمہ ہوتا تھا۔ بندہ نے اسی صدمہ کے سبب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ جس کے جواب میں حضرت اقدس نے جو جواب ارشاد فرمایا اس کے کچھ اقتباسات بھی پیش خدمت ہیں۔ یہ مکتوب گرامی مکتوبات شیخ الاسلام حصہ دوم کے صفحہ ۲۹۷ پر بھی درج ہے۔

"حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو میں .... بہت عالم باعمل اور صوفیٔ کامل جانتا ہوں"

"حضرت تھانوی مرحوم کی شان میں نہ میں گستاخی کرتا ہوں۔ اور نہ کسی کی گستاخی کو روا رکھتا ہوں"

"مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ .... بہت بڑے موحد۔ خدا پرست تھے۔ تصوف میں ان کا قدم بہت راسخ تھا"

یہ خط ربیع الاول ۱۳۷۰ھ میں تحریر فرمایا گیا ہے یعنی اس خط کو بھی آج تقریباً اٹھائیس سال ہونے کو ہیں۔
یہ تھا وہ تعلق اور للہیت جس نے بندہ کو حضرت تھانوی اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہما کا حلقہ بگوش بنا دیا۔

اللّٰھم اغفر لھما وارحمھما وارفع درجتھما واحشرنا معھما تحت لواء نبینا وحبیبنا علیہ الف الف التحیۃ والثناء"

◎◎

سید مدنیؒ مدرستہ النبیؐ کے مدرس کی حیثیت سے

اسلام میں سب سے پہلا دینی مدرسہ وہ صفہ ہے جس میں سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو قرآن و حدیث کا درس دیا۔ برصغیر کے علماء کرام میں سے حضرت مدنی قدس سرہ العزیز ہی وہ سعادت مند مدرس ہیں جنہوں نے تقریباً پندرہ سال گنبد خضریٰ کی پر نور فضاؤں میں بیٹھ کر علوم دینیہ کا درس دیا جس کا چشم دید حال حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا۔

"مولانا حسین احمد صاحب کا درس حرم نبویؐ میں بحمد اللہ بہت عروج پر ہے اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علماء کو کیا معنی یمنی و شامی بلکہ مدنی علماء کو بھی وہ بات حاصل نہیں ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ آپ سراپا خلق۔ مہمان نواز۔ غیور۔ باحیاء اور بعض اُن صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے" (تذکرۃ الرشید ج ۲۔ ص ۱۵۱)

اسی درس کی مختصر سی کیفیت حضرت مدنی کے شاگرد رشید مولانا محمد مدنی کے قلم سے درج کی جاتی ہے۔ مولانا نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حرم نبویؐ میں اکتساب فیض کیا ہے۔ مولانا کا مضمون عربی میں ہے۔ جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"حضرت مدنیؒ روزانہ بعد از نماز ظہر تا عشا درس دیتے تھے جبکہ نماز عشاء کے بعد بھی ایک جماعت کو پڑھایا کرتے تھے ہر درس میں ایک گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ کا ہوتا تھا ہر درس کے حلقہ میں کم از کم بیس اور زیادہ سے زیادہ چالیس طلباء ہوتے تھے اہل مدینہ کے دلوں میں آپکی محبت اور احترام بہت زیادہ تھا اہل بدعت میں کچھ لوگ آپکی مخالفت حسد و بغض کی وجہ سے کرتے تھے جسکا دفاع اہل مدینہ خود ہی فرماتے تھے آپ حاضر جواب تھے ہر سوال کا جواب پوری شرح و بسط کیساتھ دیا کرتے تھے اور کلام کرتے ہوئے ہاتھ بلند نہ فرمایا کرتے تھے کیونکہ یہ عادت اسکی ہوتی ہے جو جواب سے عاجز ہو اور آپ بلا کسی تنخواہ کے درس دیا کرتے تھے۔ حق بات کہنے میں کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے اور کمزوروں۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد فرمایا کرتے تھے"

چنانچہ آپکی مقدس یادگار آج بھی گنبدِ خضریٰ کے سایہ میں بنام "مدرستہ العلوم الشرعیہ" موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ قائم دائم رکھے۔ آمین۔

تقدیم

ڈاکٹر اسرار احمد

جہاں تک مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی موقف و مسلک کا تعلق ہے اُس سے اختلاف نہ پہلے گناہ تھا نہ اب ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے دینی و علمی مقام اور اخلاقی و رُوحانی مرتبے سے انکار اور اُن کے خلوص و اخلاص اور بے نفسی و بے غرضی کے بارے میں شکوک و شبہ کا تعلق ہے وہ یقیناً ایک بہت بڑی جہالت تھی ــــــ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر جہاں تک ان کی شان میں گستاخانہ اور توہین آمیز روش اور تمسخر و استہزاء کے عملی ارتکاب کا تعلق ہے وہ یقیناً بہت گناہ اور "یعملون السوء بجھالۃ" کا کامل مصداق تھا۔ اور یہ خطا جس سے بھی سرزد ہوئی اُس پر لازم ہے کہ بابگِ دہل اعتراف تقصیر اور علی الاعلان اظہار ندامت کرے اور علیٰ رؤس الاشہاد اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو ــــــ مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہوا کہ انہیں اس مشکل کام کی توفیق بارگاہِ خداوندی سے حاصل ہو گئی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔
پروفیسر صاحب کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ قافلۂ مسلم لیگ کے حدی خوانوں اور تحریک پاکستان کے پُرجوش اور انتھک کارکنوں میں سے ہیں اور ابھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے کانوں میں تا حال ان کی تحریک پاکستان کے دوران "ارشاد و تابرا" کی ولولہ انگیز تقریروں کی گھن گرج موجود ہے لہٰذا ان کی اس تحریر میں اگر کچھ تلخی نظر آئے تو اُسے ان کے شدتِ احساس ہی پر محمول کرنا چاہیئے اس لئے کہ تحریک پاکستان کے تمام مخلص کارکنوں کو پاکستان میں پیش آمدہ حالات و واقعات سے جس مایوسی اور دل شکستگی (FRUSTRATION) کا سامنا رہا، مختلف افراد میں اس کے احساس کی شدت فطری طور پر ہر شخص کے ذاتی خلوص اور اس کی اُمیدوں اور توقعات کی نسبت ہی سے پیدا ہوئی۔ اور آئندہ صفحات میں در اصل ایک ایسے شخص کا خلوص و اخلاص تلخی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جس نے اپنی عمر کے بہترین دور میں اپنی جملہ صلاحیتیں اور تمام توانائیاں حصول پاکستان کے مقصد میں کھپا دی تھیں ــــــ پروفیسر صاحب کی اس تحریر میں ایک مقالے کی سی ترتیب کی توقع تو غلط ہے اس لئے کہ اس کا منشاء عقل نہیں دل ہے اور یہ قلبی واردات کے رقم کرنے کا معاملہ ہے جس کا اصل حسن بے ربطی و تکرار ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی

ع　ربط محکم اسی بے ربطیٔ تحریر میں ہے

ــــــ ڈاکٹر اسرار احمد، ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی ــــــ مدیر میثاق و بانی انجمن خدام القرآن لاہور

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مسئلہ قومیت

مولانا سید حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرحوم کے اختلاف رائے کی حقیقی نوعیت

تمہید | چونکہ موجودہ زمانے کے اکثر مداحانِ اقبال نہ تو ارمغانِ حجاز میں مندرجہ اشعار بعنوانِ "حسین احمد" کے پسِ منظر سے آگاہ ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ جب علامہ اقبال پر حقیقت حال منکشف ہو گئی تو انہوں نے اس امر کا اعتراف کر لیا تھا کہ "اب مجھے مولانا حسین احمد مدنی پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہا"

اس لئے موجودہ اور آئندہ نسل کی آگاہی کے لئے اس داستان کو مفصل طور پر سپردِ قلم کر رہا ہوں تاکہ عوام اور خواص دونوں حضرت اقدس مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں گستاخی کے جرم سے محفوظ رہیں۔

مثلاً اپریل ۱۹۶۸ء کے ریویو میں علامہ عبدالرشید طالوت نے جو مضمون "اقبال اور نیشنلزم" کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا ہے اس میں انہیں اشعار کو مستدل بنا کر حضرت اقدس کی شان میں وہی گستاخی کی ہے جس کا ارتکاب ۱۹۵۳ء میں میں خود کر چکا ہوں۔ محض اس لئے کہ علامہ اقبال کا اعتراف میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ علامہ طالوت نے اس مضمون میں جو معارف بیان فرمائے ہیں ان پر بشرط زندگی ایک مفصل مقالہ لکھوں گا۔

علامہ اقبال کی خدمت میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے مجھے بھی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء قریباً ۱۳ سال تک حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ایک آدمی کی ذہنیت اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ مدت کافی سے زیادہ ہے، میرا دل نہیں مانتا کہ علامہ اقبال مرحوم اخلاقی اعتبار سے اتنے پست ہو (نعوذ باللہ) تھے کہ ایک مشہور و معروف عالم دین شیخ الہند کے جانشین، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، لاکھوں مسلمانوں کے روحانی پیشوا، اور لاکھوں سرفروشوں کے سیاسی رہنما، جس کے قدموں کو ۱۹۲۱ء میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جنت آشیانی نے بھری عدالت میں بوسہ دیا تھا، جس نے ساری عمر کلمۂ حق کہا، جس نے ساری عمر ملاعنہ فرنگ کے خلاف جہاد کیا، جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں، جس کی عظمت پر آج بھی مالٹا گواہی دے رہا ہے، کراچی، نینی، بریلی، فیض آباد

مُراد آباد اور خدا معلوم کتنے شہروں کی جیلیں آج بھی اس کی آہِ سحر گاہی اور قرآن المجید کی برکات سے مالا مال ہیں جس نے ایک دو نہیں پورے چودہ سال تک حرم نبوی میں حدیث نبوی کا درس دیا۔

؎ گردن نہ جھکی جس کی کسی شاہ کے آگے　　جس کے نفس گرم سے مُردوں میں پڑی جان

جس کی علو ہمّت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ملاعنہ فرنگ کے خطابات در کنار، خود حکومتِ ھند کے خطاب (پدم بھوشن) اور طلائی تمغے دونوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں نے اپنے وطن کو کسی خطاب یا جاگیر حاصل کرنے کی نیت سے آزاد نہیں کرایا بلکہ اپنا فرض ادا کیا۔ انگریز میرا دشمن تھا، میرے وطن کا دشمن تھا اور سب سے بڑھ کر میرے دین کا دشمن تھا اس لئے اسے ختم کرنا میرا دینی فرض تھا۔

ایسے شخص کے لئے اقبال ایسا ناروا لفظ استعمال کرتے؟ اقبال فارسی دان تھے اس لئے اس لفظ کے مفہوم سے واقف تھے (CONNOTATION) اور وہ خود بڑے شریف آدمی تھے اور شریف کی پہچان یہ ہے کہ وہ دوسروں کی توہین نہیں کیا کرتے، دشنام طرازی شریفوں کا شیوہ نہیں رہا۔

رہا خود را مدنی خواند والا فقرہ تو یہ بھی اقبال کے قلم سے نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ حضرت اقدس ساری عمر اپنے نام سے پہلے "ننگِ اسلاف" لکھتے رہے۔ ان کے ہزاروں خطوط آج بھی اُن کے شاگردوں، مریدوں، عقیدت مندوں اور مداحوں کے پاس موجود ہیں۔ کسی خط میں حضرت نے اپنے اِسم گرامی کے ساتھ لفظ "مدنی" کا اضافہ فرمایا۔ لہٰذا "خود را مدنی خواند" خلاف حقیقت ہے یعنی دروغ بے فروغ ہے۔ اور اقبال اس جرم کے مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت اقدس کے عشاق اور تلامذہ محض اظہارِ حقیقت کے طور پر اس جنابؒ کو مدنی کے لقب سے یاد کرتے تھے اور آج بھی یاد کرتے ہیں، اور بجا طور پر، کیونکہ حضرت اقدسؒ کی زندگی کا بڑا حصہ مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر ہوا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ

؎ یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یہ تو حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی عظمت کی دلیل ہے کہ آپ خود ساری عمر اپنے آپ کو "ننگِ اسلاف" لکھتے اور دُنیا آپ کو مدنی کہتی رہی اور انشاء اللہ کہتی رہے گی۔

؎ ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام شیخ[1]

---

[1] اشارہ بجانب شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز۔

قارئین سے اس اعراض عن الموضوع کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ سطور بے اختیار نوکِ قلم پر آگئیں۔ بعض اوقات ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں کہ دل پر اختیار باقی نہیں رہتا۔ اب میں اس واقعہ کی تفصیل سپردِ قلم کرتا ہوں، یعنی

ع وگر از سرِ بگیرم قصۂ زلفِ پریشاں را

۸ جنوری ۱۹۳۸ء کی شب میں حضرت اقدس مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ نے صدر بازار دہلی متصل پل بنگش ایک جلسے میں تقریر فرمائی جس کا بڑا حصہ ۹ جنوری کے تیج اور انصاری دہلی میں شائع ہوا۔ چند روز کے بعد الامان اور وحدت دہلی نے اس تقریر کو قطع و برید کے بعد اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ان پرچوں سے زمیندار اور انقلاب لاہور نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرت اقدسؒ کی طرف منسوب کر دیئے کہ حسین احمد مدنیؒ دیوبندی نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ (اوکما قال)

جب یہ اخباری اطلاع علامہ اقبال کے کان میں پڑی تو انہوں نے حضرت اقدس قدس سرہٗ العزیز سے استفسار یا تحقیق کئے بغیر تین اشعار سپردِ قلم کر دیئے۔

○

ان اشعار کی بنا پر ہندوستان کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا جس کی تفصیل اس زمانے کے روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے ایک دردمند مسلمان نے جنھوں نے مصلحتاً "طالوت" کا نام اختیار کر لیا تھا حقیقتِ حال دریافت کرنے کے لئے حضرت مدنی کی خدمت میں ایک خط لکھا۔ جس کے جواب میں حضرت موصوفؒ نے یہ خط انہیں لکھا۔

محترم المقام زید مجدکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاج مبارک۔

والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا۔ میں آپ کی محبت کا شکر گزار ہوں، بالخصوص اس بناء پر کہ باوجودِ عدمِ ملاقات اس قدر التفات فرماتے ہیں۔ میرے پاس بہت سے خطوط اس کے متعلق آئے مگر میں انتہائی درجے میں عدیم الفرصت ہوں اور اس قسم کے افترآت اور سبّ وشتم کا سیلاب کم و بیش اس زمانے سے جب کہ میں نے تحریکاتِ وطنیہ اور ملیہ میں قدم اٹھایا ہے، برابر جاری ہے۔ اس لئے ایسی باتوں میں وقت صرف کرنا اضاعتِ وقت سمجھتا ہوں اور واذا خاطبھم

الجاھلون (الآیہ) پر عمل پیرا رہتا ہوں، میں اسوقت بھی چپ تھا، مگر آپ کے والا نامے نے مجبور کیا کہ حقیقت واضح کی جائے۔ اس لئے باوجود عدیم الفرصتی مختلف اوقات میں لکھ کر مندرجہ ذیل مضمون پیش کرتا ہوں۔

"اصل واقعہ یہ ہے کہ صدر بازار دہلی متصل پل بنگش زیر صدارت مولانا نورالدین جلسہ کیا گیا تھا۔ اس میں اہل محلہ کی طرف سے ایڈریس پیش کیا گیا اور اس میں میری ملی اور وطنی خدمات کو سراہا گیا۔ جلسہ نہ تو وعظ و نصیحت کا تھا اور نہ اسلامی تعلیمات کے بیان کرنے کا۔ ایک روز صبح کو ایک مذہبی جلسہ ہو چکا تھا، شب کے جلسے کے اعلان میں یہ طبع کیا جا چکا تھا کہ حسین احمد کو ایڈریس پیش کیا جائیگا۔ ایڈریس کے اس جلسے میں لیگیوں اور بالخصوص مولوی مظہرالدین صاحب اور ان کے ہمنواؤں میں انتہائی غصہ پھیلا ہوا تھا۔ کوشش کی جا رہی تھی کہ جلسہ کو درہم برہم کیا جائے جس کا احساس کر کے جناب صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہدیا تھا کہ جلسہ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق کوئی تقریر نہ ہوگی۔ اس کے بعد میں ایڈریس کا جواب دینے کے لئے کھڑا ہوا۔ میں نے بعض ضروری مضامین کے بعد ملک کی بیرونی ممالک اور غیر اقوام نیز اندرون ملک میں آزادی کا تمہیدی مضمون شروع کیا تو کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں۔ دیکھو انگلستان کے بسنے والے سب ایک قوم شمار کئے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی ہیں، پروٹسٹنٹ بھی ہیں کیتھولک بھی۔ یہی حال امریکہ، جاپان، اور فرانس وغیرہ کا ہے۔ جو لوگ جلسے کو درہم برہم کرنے آئے تھے انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ میں اسوقت یہ نہ سمجھ سکا کہ شور کی وجہ کیا ہے۔ جلسہ جاری رکھنے والے لوگ اور وہ چند آدمی جو شور و غوغا چاہتے تھے سوال و جواب دیتے رہے اور چپ رہو کے الفاظ سنائی دیئے۔ اگلے روز "الامان" میں چھپا کہ حسین احمد نے تقریر میں یہ کہا کہ قومیت وطن سے ہوتی ہے مذہب سے نہیں ہوتی اور اس پر شور و غوغا ہوا۔ اس کے بعد "الامان" میں اور دیگر اخبارات میں سب و شتم چھاپا گیا۔ کلام کی ابتداء اور انتہاء کو حذف کر دیا گیا اور کوشش کی گئی کہ عام مسلمانوں کو ورغلایا جائے۔ میں اس تحریف و اتہام کو دیکھ کر چپکا ہو گیا۔ تقریر کا بڑا حصہ "انصاری" اور "تیج" میں بھی چھپا، مگر اسکو کسی نے نہیں لیا۔ "الامان" اور "وحدت" سے "انقلاب" اور "زمیندار" نے لیا۔ اور اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالی۔

۹ جنوری کے "انصاری" اور "تیج" کو ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب و ملت کا دارومدار وطنیت پر ہے۔ یہ بالکل افتراء اور دجل ہے۔ "احسان" مورخہ ۳۱ جنوری کے صفحہ ۷ پر

بھی میرا قول یہ نہیں بتایا گیا۔ جگہ جگہ یہ کہا گیا ہے کہ قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی غلط ہے مگر یہ ضرور تسلیم کیا گیا ہے کہ مذہب و ملت کا مدار وطنیت پر ہو، میں نے نہیں کہا تھا۔

شملے کی چوٹیوں اور نئی دہلی سے تعلق رکھنے والے ایسے افترا و کرتے ہی رہتے ہیں؛ اس قسم کی تحریفیں اور سب و شتم ان کے فرائض میں سے ہے۔ مگر سر اقبال جیسے مہذب اور متین شخص کا ان کی صف میں آجانا ضرور تعجب خیز امر ہے، ان سے میری خط و کتابت نہیں، مجھ جیسے ادنیٰ ہندوستانی کا ان کی بارگاہ عالی تک پہنچنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اگر غیر مناسب نہ ہو تو ان کی بارگاہِ عالی میں یہ شعر ضرور پہنچا دیجئے۔

هنيأ مريأ غير داء مخامر

اعزة من اعراضنا ما استحلت

افسوس کہ سمجھدار اشخاص اور آپ جیسے عالی خیال تو یہ جانتے ہیں کہ مخالفت کی بناء پر یہ اخبار ہر قسم کی ناجائز اور ناسزا کاروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان پر ہرگز اعتماد ایسے امور پر نہ کرنا چاہیئے۔ اور سر اقبال جیسے عالی خیال اور حوصلہ مند، مذہب میں ڈوبے ہوئے تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا، نہ تحقیق کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ ان جاءكم فاسقٌ بنباءٍ فتبينوا (الآیہ) گویا ان کی نظر سے نہیں گزری۔ سر اقبال فرماتے ہیں۔

ے سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملت اور قوم کو سر اقبال ایک قرار دیکر ملت کو وطنیت کی بناء پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیّت کو بھی اس سے منزہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے؟ زبانِ عربی اور مقام محمد عربی (علیہ السلام) سے کون بے خبر ہے؟ ذرا غور فرمائیے۔ میں نے اپنی تقریر میں لفظ قومیّت کا کہا ہے، ملت کا نہیں کہا۔ دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ملّت کے معنی شریعت اور دین کے ہیں اور قوم کے معنی مردوں اور عورتوں کی جماعت کے ہیں۔ قاموس میں ہے "وبالكسر شريعة او الدين" یہ ملت کی بحث میں ہے۔ نیز قاموس میں ہے

القوم الجماعة من الرجال والنساء معاً او الرجال خاصة او تدخله النساء تبعية.

(بحث قوم)

مجمع البحار میں ملت کے معنی ان الفاظ کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔

"ما شرع اللہ لعبادہ علی سنۃ الانبیاء و یستعمل فی جملۃ الشرائع لا فی احادھا ثم اتسعت فاستعملت فی الملۃ الباطلۃ فقیل الکفر ملۃ واحدۃ"۔

میں نہیں سمجھ سکتا یہ منطق کون سی ہے؟ الفاظ قوم، ملت اور دین تینوں عربی ہیں۔ ان کے معنی کو لغت عربی سے پوچھیے اور دیکھیے کہ کس لغت عربی میں قوم اور علیٰ ہٰذا القیاس قوم اور دین کو مرادف اور ہم معنی قرار دیا ہے یا نہیں۔ آیات اور روایات کو ٹٹولیے اور سر صاحب کی بوالعجبی کی داد دیجئے۔

اگر میری تقریر کے سیاق و سباق کو بھی حذف کر دیا جائے اور عبارت میں حسب اعلان جریدۂ "احسان قوم یا قومیت کی اساس وطن پر ہوتی ہے" بتائی جائے تب بھی میں نے کب کہا کہ ملت یا دین کی اساس وطن پر ہے؟ پھر سر موصوف کی یہ نسبت "سرود بر سر منبر"، "او افترا محض نہیں تو اور کیا ہے اور ان کا ان تینوں لفظوں کو ایک قرار دینا عجمیت اور زبان عربی سے ناواقفیت نہیں تو اور کیا ہے!

آپ مجھ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ تو اپنے خیالات سے مجھ کو مطلع کر۔ جواباً عرض ہے کہ قوم کا لفظ ایسی جماعت پر اطلاق کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو خواہ وہ مذہبیت ہو یا نسل یا زبان یا پیشہ یا رنگت یا کوئی اور صنفِ مادی یا معنوی، کہا جاتا ہے۔ عربی قوم، عجمی قوم، ایرانی قوم، مصری قوم، پختون قوم، سیدوں کی قوم، شیخوں کی قوم، کنجروں کی قوم، موچیوں کی قوم، کالوں کی قوم، گوروں کی قوم، صوفیوں کی قوم وغیرہ وغیرہ۔ یہ محاورات تمام دنیا میں شائع ہیں اور زبان عربی بلکہ آیات و احادیث میں بکثرت وجوہ پر اطلاق لفظ قوم کا پایا جاتا ہے۔ انہیں میں ہندوستانی قوم بھی ہے موجودہ زمانے میں ہندوستانی قوم سے بیرونی ممالک میں تمام باشندگان ہندوستان سمجھے جاتے ہیں خواہ اردو بولنے والے ہوں یا بنگلہ، خواہ کالے ہوں یا گورے، ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا سکھ۔ انڈین کا لفظ ہر ہندوستانی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ میں ہندوستان سے باہر تقریباً سترہ برس رہا ہوں۔ عرب، شام، فلسطین، افریقہ، مصر، مالٹا وغیرہ میں رہنا ہوا۔ ہر ملک کے باشندوں سے ملنا جلنا، اٹھنا، بیٹھنا ہوا۔ جرمن، آسٹرین، بلگیرین، انگریزی، فرانسیسی، آسٹریلین، امریکی، چینی، روسی، جاپانی، ترکی، عربی وغیرہ مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ سولہ سال ملنا جلنا اور نشست و برخاست کی نوبت آئی۔ اگر یہ لوگ عربی یا ترکی یا فارسی یا اردو سے واقف ہوتے تھے تو بلا ترجمان ورنہ بذریعہ ترجمان گفتگو ہوتی تھی۔ سیاسی مسائل یا مذہبی امور زیر بحث رہتے تھے۔ میں نے بیرونی ممالک کے عام لوگوں کو اسی خیال اور عقیدے پر پایا کہ وہ ہندوستانی لوگوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور سب کو باوجود مختلف المذاہب و مختلف اللسان والالوان ہونے کے ایک ہی لڑی میں پروتے ہیں لغوی

معنی اس سے انکاری نہیں عرف اس کا متقاضی ہے۔ پھر اس کے انکار کے کیا معنی ہیں۔ یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کی بجائے شرف انسانی یا اخوت بشری پر رکھتی ہے (جیسا کہ مدیر احسان کا دعویٰ ہے) مجھے نہیں معلوم کہ نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے جس کی بناء پر اختلاف اوطان وغیرہ پر اطلاق لفظ قوم ممنوع ہو۔ لوگوں میں مساویانہ برتاؤ اور برادرانہ معاملات دوسری چیز ہیں۔ حالانکہ ان میں امتیاز عرفاً و شرعاً معتبر ہے اس کے علاوہ تقریر میں تو اسلامی تعلیم اور نظریہ کا کوئی ذکر بھی نہیں تھا۔

میرے محترم اس اجنبی اور خودغرض حکومت اور خون چوسنے والی قوم نے جس قعر مذلت اور ہلاکت اور قحط و افلاس کے تیرہ و تار گڑھے میں تمام ہندوستانیوں کو روزافزوں فنا کے گھاٹ اتار رہی جا رہی ہے۔ وہ اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔ نیز اس سے آزاد ہونا اور ملک و ملت کی زندگی اور بہبود کی فکر اور سعی کرنا ہر حیثیت سے سبھوں کا فریضہ ہونا بھی اظہر من الشمس ہے (ان دونوں چیزوں سے بجز غبی یا مکابر کوئی شخص بھی منکر نہیں ہو سکتا) اگرچہ اس پردیسی خونخوار قوم سے نجات کے اور ذرائع بھی عقلاً ممکن ہیں مگر جس قدر قوی اور مؤثر ذریعہ تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے۔ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے آگے اس حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بیکار ہیں اور بغیر نقصان عظیم ہندوستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لئے کوئی رشتہ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں جس کی اساس وطنیت ہی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے ابتداء ہی سے اس امر کو اپنے اغراض و مقاصد میں داخل کیا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا تو سب سے پہلا مقصد مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق اور متحد کر کے ایک پلیٹ فارم بنایا جائے گا۔"

یہی متحدہ قومیت انگلستان کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتی رہی ہے اور ہر انگریز اس سے خائف اور اس کے زائل کرنے کے لئے ہر طرح سے ساعی ہے۔ پروفیسر سیلے نے (EXPANSION OF ENGLAND) میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے۔

"اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کز در جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح بھی نہ ہو بلکہ اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے تعاون عمل ہندوستانیوں کیلئے شرمناک ہے تو اسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائیگا کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور نہ اس پر فاتحانہ حکمرانی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اسطرح کی حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔"

اسی بنا پر ہمیشہ سے یہی کوشش مدبران برطانیہ کی جاری رہی ہے کہ یہ جذبہ ہندوستانیوں میں پیدا نہ ہونے دیا جائے اور اگر کبھی کوئی صورت اس کی پیش آبھی جائے تو اسکو جلد از جلد ہر ممکن صورت سے تفرقہ ڈلوا کر فنا کر دیا جائے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی انگریزی پالیسی مشہور اور مشاہد ہے بالخصوص کانگریس کے پیدا ہونے کے بعد تو اس راہ میں انتہائی جدوجہد جاری ہے مسٹر بیک اور مسٹر مارلین اور سر آکلینڈ کالون کی انتہائی انفرادی مساعی اور پھر ۱۸۸۸ء میں اجتماعی مساعی اس کی شاہد عدل ہیں جس کے ماتحت اولاً اس سنہ میں "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کرائی گئی جس کا دوسرا نام "اینٹی کانگریس کانگریس ایسوسی ایشن" تھا۔ پھر ۱۸۹۲ء میں "محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" تشکیل کی گئی جس کے مقاصد حسب ذیل قرار دیئے گئے تھے۔

(۱) مسلمانوں کی رائیں انگریزوں اور گورنمنٹ ہند کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(۲) عام سیاسی شورش کو مسلمانوں میں پھیلنے سے روکنا۔

(۳) ان تدابیر میں امداد دینا جو سلطنت برطانیہ کے استحکام اور اس کی حفاظت میں معاون ہوں ہندوستان میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔

مسٹر بیک اور مسٹر کالون وغیرہ کی انفرادی مساعی کا یہ نتیجہ تھا کہ سرسید جیسے تیز اور سخت سیاسی آدمی کے خیالات پر نہایت زہریلا اثر ڈالا گیا۔ "اسباب بغاوت ہند" کے لکھنے والے شخص کے عقائد اور ارادوں کو پیہم مساعی سے بالکل ہی جامد اور انگریز پرست اور ڈرپوک بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کو ہمیشہ دھوکا دیا گیا اور آج بھی نہایت قوت اور چالاکی سے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ ان کو چاہیئے کہ گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کریں اور اپنے تحفظ و زندگی کا سامان کریں۔ اہل مطالعہ سے میری پُرزور درخواست ہے کہ وہ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" یہ کتاب جو ابھی مطبع

نظامی بدایونی سے چھپا ہے اس کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

والسلام
ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۸ رذالحجہ ۵۶ھ

حضرت اقدسؒ کا دوسرا خط طالوت کے نام

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم مزاج شریف

والا نامہ مجھ کو کلکتہ میں ۲۴ ر ذی الحجہ کو ملا۔ میرے محترم اسر موصوف کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں ہے، اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلافِ دیانت ہے اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ الفاظ پر پھر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے سابق ولاحق پر نظر ڈالی جائے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے میں جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ تم کو ایسا کرنا چاہیئے (یعنی) خبر ہے، انشا نہیں ہے کسی ناقل نے مشورے کا ذکر نہیں کیا، نہ امر و انشا کا لفظ ذکر کیا ہے۔ پھر اسکو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے!

واقعہ اصل یہ تھا کہ میں تقریر میں ان اُمور کو گنوا رہا تھا جو ہندوستانیوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص انگریزوں سے ہندوستان میں پہنچے ہیں۔ ان کی کیلیہ چیز ذکر میں ذلت آئی تھی کہ اس وقت ہم تمام دُنیا میں ذلیل شمار کئے جاتے ہیں کیونکہ ساری دُنیا کا خیال ہے کہ ہندوستان کے باشندے ایک قوم ہیں اور وہ سب کے سب غلام ہیں اور غلام ذلیل وخوار ہوتا ہے اس لئے ہم بیرونی ممالک میں نہایت ذلیل دیکھے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ہندو، سکھ، پارسی، یہودی وغیرہ کا مذہبی یا نسلی یا صنعتی فرق نہیں۔ دیکھئے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے متعلق نٹال، ٹرانسوال، زنجبار، کیپ کالونی، ماریشس، نیروبی، کینیا، فجی آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکہ وغیرہ نہایت شرمناک اور ذلیل ترین قوانین اپنے یہاں بناتے ہیں اور ہندوستانی باشندوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیا وہ یہ سلوک جاپان یا چین یا اطالین یا انگلینڈ یا ڈچ وغیرہ آزاد قوموں کے ساتھ کر سکتے ہیں؟ اسی طرح ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق جو فلسطین، مصر، سیریا، عراق، طرابلس، الجیریا میں موجود ہیں آوازیں اٹھاتے ہیں مگر کوئی یورپین قوت

ہماری آواز کی طرف رُخ نہیں کرتی۔ اور نہ متاثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بھی ذلت ہے۔ خود برطانیہ کے مقابل پر ہم اس کے کھلے ہوئے مظالم پر جو ہندوستان اور سرحد میں ہو رہے ہیں پروٹسٹ کرتے ہیں مگر وہ کان بھی نہیں دھرتی۔

دوسری چیزیں سے نے ذکر کی تھی، بزدلی اور جبن، تیسری چیز نفاق، چوتھی چیز فقر و فاقہ پانچویں چیز جہالت، چھٹی چیز کسل اور سستی، ساتویں چیز بدخلقی، آٹھویں چیز بیکاری وغیرہ مسلمانوں کیلئے خصوصی دارالاسلام کا دارالحرب ہو جانا۔ عالم اسلام کا اس غلامی کی وجہ سے برباد ہونا، مذہبی امور کا غارت ہونا وغیرہ یہاں کوئی مشورہ بجز اس کے ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ اشد ضروری ہے کہ جلد از جلد کوشش کر کے ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ اگر اس مشورے کو خلاف دین و امانت شمار کیا جاتا ہے تو علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں اسکو فرض سمجھتا ہوں۔

"ذلك ذنب لست منه اتوب"

"یہ ایسا گناہ ہے جس سے میں توبہ نہیں کر سکتا۔"

دُنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے یہ مشورہ دوں گا اور میرا اعتقاد ہے کہ اس میں تقصیر کرنا مسلمانوں کیلئے حرام ہے اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لینا ضروری ہے۔

باقی رہا ملت اسلامی کا بلا انساب، بلا اوطان، بلا الوان، بلا صنائع وغیرہ متحد ہونا اور کرنا تو یہ دوسرا امر ہے۔ اس کو بھی ہم جانتے ہیں، ہماری گھٹی میں پڑا ہے، اس کی بناء پر ہم مالٹا میں قید رہے، ہم نے کراچی کا جیل کاٹا اور سینکڑوں مصائب اٹھائے اور بچپن سے اسکی تعلیم پائی اور قرآن کی آیات، احادیث صحیحہ اور روایات آج سطور میں بلکہ صدور میں موجود ہیں۔ جنکو بارہا منابر پر مجامع میں ہم پڑھتے ہیں اور اس کا وعظ سناتے ہیں۔ کوئی تو صرف اس کا قول ہی ہو گا۔ ہم اقوال اور افعال دونوں ہیں۔ قوم کی بے حسی اور کمزوری کی وجہ سے اس حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر کس قدر تعجب خیز امر ہے کہ قوم اور ملت اور دین کو قرار دیا گیا۔ میں فرق کو پہلے خط میں نقل کر چکا ہوں۔ اگر خلافِ لغت سر صاحب موصوف کا نظریہ دونوں کے اتحاد کا ہے تو ان کو اپنے نظریئے کے مخالف کو ایسے ناشائستہ الفاظ کہنے کا کیا حق تھا۔ بہر حال،

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

میرے محترم! ہم تو ایسے سب و شتم کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے سُن کر کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

؎ رنج کا خوگر ہُوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مُسلم لیگ کی شرمناک کاروائیاں مشاہدہ کرنے کے بعد جب سے علیحدہ ہوا ہوں، ہر قسم کے سب و شتم کا بہ نسبت سابق زیادہ نشانہ بنا ہوا ہوں۔ وہ کون سے الفاظ اور معاملات ہیں جو نہیں کئے گئے، سر موصوف صاحب تو بہرحال غیر ہیں۔ یہاں اپنے ہی کیا کمی کر رہے ہیں۔

والسلام ——— ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۱۵ ذی الحجہ ۵۶ھ

جنابؒ طالوت کا خط علامہ اقبالؒ کے نام

متاعِ محترم اسلامیان　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اگرچہ میرا یہ درجہ نہیں کہ آپ سے شرف مخاطبت حاصل کر سکوں مگر "الضرورات یبیح المحظورات" کی بنا و پر باوجود اس علم کے کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز رہتی ہے تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں۔

مولانا حسین احمد صاحب قبلہ کے متعلق آپ کی نظم "عجم ہنوز نداند" الخ روز نامہ "احسان" میں چھپی۔ اور اس سے پہلے "احسان" "زمیندار" اور "انقلاب" میں ان کے خلاف متواتر پروپیگنڈہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں انھوں نے ازراہِ شفقت ایک مفصل تحریر بھی بھیجی ہے جس کے اہم اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

نوٹ :- "طالوت صاحب نے مذکورہ بالا خطوط کے جو اہم اقتباسات درج کئے ہیں انہیں بخوف طوالت و تکرار حذف کرتا ہوں۔"

یہ مولانا کی تقریر کے وہ اقتباسات ہیں جو میرے نزدیک ضروری تھے کہ آپ کی نظر سے گزر جائیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا کی پوزیشن صاف ہے۔ آپ کی نظم کی اساس غلط پروپیگنڈے پر ہے اس لئے آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے قصور ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی عالی ظرفی کی بنا پر اخبارات میں ان کی پوزیشن صاف فرمائیے بصورت دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمائیے تاکہ مولانا سے مزید تسلی کر لی جائے۔ ہمارے جیسے نیازمند جو دونوں حضرات کے عقیدت کیش ہیں دوگنا رنج و عذاب میں مبتلا ہیں۔ اُمید ہے کہ عدیم الفرصتی

کے باوجود آپ ہمیں اس ورطۂ حیرانی سے نکالنے میں آیہ رحمت ثابت ہوں گے۔

"طالوت"

علامہ اقبالؒ کا خط جنابؒ طالوت کے نام

۱۶ر فروری ۱۹۳۸ء

جناب من۔ مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین اور احباب کے بہت سے خطوط میرے پاس آئے ہیں۔ ان میں بعض میں تو اصل معاملہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے مگر بعض نے ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور مولوی صاحب کو بھی اس ضمن میں خطوط لکھے ہیں۔ چنانچہ آپ کے خط میں مولوی صاحب کے خط کے اقتباسات درج ہیں۔ اس لئے میں نے آپ ہی کے خط کو جواب کیلئے انتخاب کیا ہے جواب انشاءاللہ اخبار "احسان" میں شائع ہو گا۔ میں فرداً فرداً علالت کی وجہ سے خط لکھنے سے قاصر ہوں۔

"مخلص محمد اقبال"

علامہ اقبالؒ کا دوسرا خط جنابؒ طالوت کے نام

۱۸ر فروری ۱۹۳۸ء

جناب من، سلام مسنون۔ میں حسب وعدہ آپ کے خط کا جواب "احسان" میں چھپوانے کو تھا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی جس کا گزارش گذار کرنا ضروری ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھ کر اس بات کو صاف کر دیں گے جو اقتباسات آپ نے ان کے خط سے درج کئے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ۔

"آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اگر ان کا مقصد ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ کو بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایشیاء میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ البتہ اگر ان کا یہ مقصد تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریے کو قبول کریں تو پھر بحث کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ کسی نظریے کو اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام کے مطابق ہے یا منافی؟ اس خیال سے بحث تلخ اور طویل نہ ہونے پائے۔ اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقصد ان الفاظ سے کیا تھا! مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلائیے کہ میں ان کے احترام میں کسی مسلمان سے

پیچھے نہیں ہوں [1]

"مخلص محمد اقبال"

علامہ اقبال مرحوم کا تردیدی بیان"

جو روزنامہ "احسان" مورخہ ۲۸ر مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ "میں نے مسلمانوں کو وطنی قومیت اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا" ———— حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا بیان۔

"مجھے اس اعتراف کے بعد ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

———— علامہ اقبال کا مکتوب

قوم و وطنیت کے سلسلے میں ایک علمی بحث کا خوشگوار خاتمہ

جناب ایڈیٹر صاحب "احسان" لاہور۔ السلام علیکم۔

میں نے جو تبصرہ مولانا حسین احمد صاحب کے بیان پر شائع کیا ہے اور جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکا ہے اس میں میں نے اس امر کی تصریح کر دی تھی کہ اگر مولانا کا یہ ارشاد" زمانہ حال میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں" محض برسبیل تذکرہ ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اگر مولانا نے مسلمانان ہند کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جدید نظریہ قومیت کو اختیار کرلیں تو دینی پہلو سے مجھے اس پر اعتراض ہے۔ مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار "انصاری" میں شائع ہوا ہے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں :۔

" لہٰذا ضروری ہے کہ تمام باشندگان ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے، ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کیلئے کوئی رشتہ اتحاد بجز قومیت اور کوئی رشتہ نہیں جس کی اساس محض یہی ہو سکتی ہے۔"

ان الفاظ سے تو میں نے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانان ہند کو مشورہ دیا ہے۔ اسی بناء پر میں نے وہ مضمون لکھا جو اخبار "احسان" میں شائع ہوا ہے۔ لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا

---

[1] علامہ مرحوم کے اس فقرے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شعر جسے طالوت صاحب نے ان سے منسوب کیا ہے ان کا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص کسی کا احترام کرتا ہے وہ اسے "فرمایہ" نہیں کہہ سکتا۔

جس کی ایک نقل انہوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے۔ اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں۔

"میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقعہ مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اور اگر مشورہ مقصود ہے تو وہ خلاف دیانت ہے اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سابق پر نظر ڈال جائے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ خبر ہے انشاء نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا۔ پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے ان عقیدتمندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے سلسلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدا تعالیٰ اُن کو مولانا کی صحبت سے اور زیادہ مستفید فرمائے۔ نیز ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں "میں ان کے کسی عقیدتمند سے پیچھے نہیں ہوں۔" ———— محمد اقبال

حرفِ آخر

الحمد للہ کہ میں نے اس زمانے کے عقیدت مندان اقبال کی آگاہی کیلئے اس صداقت کو دوبارہ واضح کر دیا کہ حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد علامہ اقبال نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا۔ اور وہ اشعار محض اس لئے ارمغان حجاز میں راہ پا گئے کہ اس اعتراف کے صرف تین ہفتوں کے بعد علامہ وفات پا گئے۔ اور انہیں یہ ہدایت دینے کا موقع نہ مل سکا کہ ان اشعار کو ارمغان حجاز میں شامل نہ کیا جائے۔ اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ ارمغانِ حجاز میں اس نظم کے ساتھ یہ صراحت کر دی جائے کہ حقیقتِ حال سے آگاہ ہونے کے بعد علامہ مرحوم نے ان اشعار کو کالعدم قرار دیا تھا تو بہت اچھا ہو۔ کیونکہ اس تصریح کی بدولت قارئین حضرتِ اقدسؒ کے خلاف سوئے ظن سے محفوظ ہو جائیں گے۔

اِس سلسلے میں قارئین کی توجہ اس خطبۂ صدارت کے حسبِ ذیل فقرے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جو بانیٔ پاکستان محمد علی جناح نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلسِ دستور ساز کے سامنے دیا تھا۔ یعنی:۔

"تمہارا خواہ کسی بھی مذہب عقیدے یا ذات سے تعلق ہو، اس کا ملک سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جوں جوں وقت گذرے گا آپ خود یہ دیکھ لیں گے۔ مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ قومیت کے اعتبار سے، ہندو نہ اپنے آپ کو ہندو سمجھیں گے اور نہ مسلمان اپنے آپ کو مسلمان، کیونکہ مذہب ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے لیکن سیاسی معنوں میں سب بلا امتیاز نسل و مذہب ملک کے افراد ہوتے ہیں"

______ قائداعظم کی کراچی میں ایک تقریر

ہم بشرطِ انصاف قارئین سے سوال کرتے ہیں کہ کیا تحریک مسلم لیگ کے قائداعظم اور بانیٔ پاکستان کے مندرجہ بالا الفاظ جو انھوں نے انتہائی ذمہ دارانہ حیثیت میں ارشاد فرمائے تھے مجاہدِ حریت حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ وقدس سرہٗ کے نظریات سے کسی درجے میں بھی مختلف ہیں؟ (بینوا و توجروا)

ایک خوش بخت خاتون

شیخ الاسلام سید مدنیؒ نے کئی غیر مسلموں کو سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے مشرف فرمایا جس کا مفصل تذکرہ پھر کبھی کیا جائیگا۔ سطور ذیل میں ایڈورڈ ہشتم کے خاندان کی اس سعادت مند خاتون کے بیان سے چند جملے درج کئے جاتے ہیں جس نے حضرت مدنیؒ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا اور پھر مجاہدِ جلیل اسیرِ مالٹا مولانا عزیز گل زید مجدہم سے نکاح کی سعادت حاصل کی اور شرعی پردہ اور چار دیواری میں زندگی بسر کرنے کے بعد وفات پا گئیں۔ اسلام سے مشرف ہونے کے بعد اُمّتِ مسلمہ کو انگریزی زبان میں ترجمۂ قرآن کا عظیم ہدیہ عطا کیا جو عنقریب طبع ہونے والا ہے۔ آپ فرماتی ہیں ______

"دارالعلوم دیوبند کے بارے میں کافی سُن چکی تھی، اس لئے میں اپنی لڑکی کے ہمراہ بغیر کسی اطلاع کے وہاں پہنچ گئی۔ ہم لوگوں کو مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ پہلی ہی نگاہ میں ہم لوگوں نے ان کی قابلیت کا اعتراف کرلیا، میں نے بحث شروع کردی...... انہوں نے مجھے مسلمان تسلیم کرلیا۔ اب میں واقعی ایک مسلمان عورت تھی، حسین احمد صاحب اُس دن ایک خوش فکر اور خوش مزاج میزبان ثابت ہوئے۔ ہم لوگ روانگی کے وقت بہت زیادہ خوش تھے اور ہمیں اس بات کا اعتراف تھا کہ ہم لوگوں نے ایک خدا رسیدہ متقی بزرگ سے ملاقات کی ہے"

"میں نے اپنے الکے مارس برناڈ لگ (جو امریکہ کا ایک شہری ہے) اور اپنی لڑکی مس جوزلین مکلیاڈ کی بھی بہت ممنون ہوں جس نے میری اتباع کی اور اسلام قبول کرلیا" ______ تذکرۂ دیوبند

تا دلِ صاحبدلے نامد بدرد
ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

ان حضرات[1] پر "کانگریس مولوی" کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے اس لئے کہ اس کی لپیٹ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایسے اکابر ملت، مجاہدین حریت اور زعماء دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدین، خلوص و بے نفسی، عزم و ہمت، جانفشانی و تندہی، قربانی و ایثار اور علم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہندکی ماضی قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ مولانا مدنیؒ کی زیارت کا شرف ہماری گنہگار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی کرامت کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا کہ کتنے ہی مخلص اور متدین لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے اور حلقۂ دیوبند کے مدارس کی زیر تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور ذاتی طور پر ہمارے لئے تو سب سے بڑی شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے جن کے الفاظ میں "مولانا مدنیؒ صرف اپنی سیاسی رائے کے سوا ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے۔"

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ "جن دنوں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش عروج پر تھی اور مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء تنقید و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا۔ ان دنوں دارالاسلام سرنا، پٹھانکوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کیلئے نہر پر جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی) وہاں مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا ——— میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے ———!" اس پر پوری مجلس پر خاموشی چھا گئی، تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ "مولانا آخر جو لوگ قوم کے احساسات و جذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کون سی بڑی بات ہے؟" اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے اس فقرے کو دہرا دیا۔ "میں اور تو کچھ نہیں جانتا، صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی آفت آنے والی ہے!"

——— اسرار احمد

---

[1] ذکر چل رہا تھا قائدین جمعیت علماء اسلام کا ———!

حضرت سید مدنی
اور
ڈاکٹر اقبال

از سید محمد اظہار الحق سہیل شاہ صاحب عباسی امروہوی رح

علوم آں مدنی ما ورائے مکتسبی است　　یگانہ ہست بدہر و مکارمش وہبی است

نگفت حضرت ایشاں کہ "ملت از وطن است"　　پس اتہام بشیخ الحدیث بے ادبی است

بہر شنیدہ مدہ گوش پرس پرسان نیز　　بہر شنیدہ زدن چانہ شان بولہبی است

میان شیخ و خود مت داوری بکن اقبال　　کہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

ہنوز او عربی ہست و کاشمیری تو　　مدینہ مسکن او ہست و سید نسبی است

رموز دین و بداند سخن در ہندی؟　　حسین احمد تحریر نے؟ چہ بوالعجبی است

بگفت حافظ شیراز "گوسفندے ہست"　　ضمیر شاعر ہندی اسارت ادبی است

سہیل ست حسین احمد است حسب بالا

دشعر ہائے اقبال ایں چہ بوالعجبی است

شریف احمد طاہر

مَعذِرَۃٌ بِرُوحِ اِقبالؒ

ثلاثی رُباعی کا تجزیہ

عجم ہنوز نداند رموز دین ؟

قال علیہ الصلوۃ والسلام فی حجۃ الوداع فی حدیث طویل ....

لا فضل لعربی علی عجمی　الخ

عرب، عجم کی تقسیم و تفریق و تفضیل ہی حضور علیہ السلام نے ایسے انداز سے روک دیا کہ آج عجمی سازش کی اصطلاح ہی غلط تصور ہے۔

عرب اور اہل عرب کا "رموز دین" کے دانا ہونے سے کسی کو مجال انکار نہیں۔ لیکن کیا چودہ سو سال سے عرب کے علاوہ کسی غیر عربی یا عجمی نے "رموز دین" کو آج تک سمجھا ہی نہیں !

یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ جس کا جواب اقبالی مجرموں کے ذمہ ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو بخاری و مسلم ترمذی و رازی۔ غزالی و رومی کون اور کیا تھے۔ ع

وائے گر داپس امروز بود فردائے

اگر تا ہنوز۔ کسی نے دین یا رموز دین کو سمجھا ہی نہیں تو چودہ سو سال سے دین کا کام کیسے چلتا رہا۔ اور دین کیسے سمجھا اور سمجھایا جاتا رہا۔ یہ ایک بہت بڑی جسارت ہے کہ ایک شاعر پوری دنیا کو دین و رموز دین سے ناواقف قرار دے ؛ اور کمال کی بات یہ کہ حضرت شاعر خود عجمی ہیں۔ عرب و عربیت اور اہل عرب سے تعلق نہ دارد !

اور دوسرا مصرعہ بجائے خود محل نظر ہے ....

عدل و انصاف کو آواز دو۔ اور عرب و عجم سے پوچھو کہ دیوبند اور علمائے دیوبند نے رموز دین کی تعلیمات کے لئے کچھ کام کیا یا نہیں ؛ سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں است۔

دیو بند اور علمائے دیو بند نے عرب و عجم کو رموز دین کی تعلیمات کے لئے دعوت دی۔ چنانچہ عرب ممالک اور سلامی دنیا نے لبیک کہتے ہوئے اور پوری دینی دنیا نے علوم القرآن والاحادیث۔ فقہ سلامی اور رموز دین حاصل کرنے کے لئے دیو بند کا سفر کیا۔ اور حرمین شریفین کے علاوہ کسی دیو بند جیسے خطے اور قصبے میں طالبانِ علوم دین اس طرح کشاں کشاں نہیں آتے۔ جیسے دار العلوم دیو بند میں جمع ہوتے ہیں۔ اب بھی آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔ اور تا قیامت رموز دین کی تعلیمات کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ ع

عجم میں ان کی تابانی حرب میں ان کی تنویریں۔

دنیا کی کوئی طاقت دیو بند کو ختم نہ کر سکی۔ حتی کہ انگریز بھی دیوبند کی آواز حق کو نہ دبا سکا۔ اور نہ ختم کر سکا۔۔۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔ اور ع

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

اس میں دو خلاف واقعات باتوں کو مصرعہ بنا دیا گیا۔ یہ مسجد و محراب و منبر کا کوئی وعظ و خطبہ یا خطاب نہیں۔ اور منبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ دلّی کے ایک جلسہ عام میں تقریر و بیان تھا۔ اور ملت از وطن است کا نظریہ حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہرگز نہیں ہے جیسا کہ ان کے بیانات سے ظاہر ہے۔ اس میں شاعر کا قصور کم ہے اور راویانِ انگریزی ٹوڈیان کا دخل عمل زیادہ ہے۔ جنہوں نے مبالغہ آرائی سے کام لے کر شاعر کو اشتعال دلایا۔ ورنہ شاعر مشرق ایسی جرأت ہرگز نہ کرتا۔ ع

چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است۔

چہ دلاورست دزدیکہ بکف چراغ دارد۔ ع

کیا مقام محمد عربیؐ سے بے خبر۔ حافظ القرآن والاحادیث ہو سکتا ہے؟ اور اگر صحیحین کا محدث بھی مقام محمدؐ سے بے خبر رہتا ہے تو باخبر کون ہوتا ہے؟ اگر قال اللہ وقال الرسولؐ کا درس دہندہ مقام محمد عربیؐ سے ناواقف ہے تو ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ ؎

آپ ہی ذرا اپنے طرزِ عمل کو دیکھیں!
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

جس محدث نے مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اٹھارہ برس گزارے ہوں۔ اور جس حافظ الحدیث نے چودہ[۱۴] سال روضۂ اطہر کے سامنے صفۃ النبیؐ پر بیٹھ کر عرب و عجم کو درسِ حدیث دیا ہو۔ جس کے حلقۂ تلامذہ

میں عربی و عجمی بیٹھ کر رموز دین سیکھتے تھے۔ جس نے اپنی داڑھی سے روضۃ النبی صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کی صفائی کی ہو۔ ایسے مرد مجاہد اور شیخ الحدیث کے متعلق محض سیاسی اختلافات کی بنا پر ایسی افتراء پردازی کرنا گناہ عظیم ہے۔ قرآن کریم ایسے ہی لوگوں کے متعلق اعلان کرتا ہے۔ والشعراء یتبعھم الغاوون ....

البتہ آخری شعر ایک پیام ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کی حدیث کو دین میں حجت نہیں مانتے۔ جو حدیث رسول ﷺ کے خلاف مضامین لکھتے ہوئے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتے ہیں۔ اور پاکستان کے مسلمانوں کو گمراہ و ملحد بناتے رہتے ہیں۔ ایسے پرویزانِ عصر کو یہ شعر پڑھ کر اپنے خیالات سے رجوع کرنا چاہئے!

آخر میں ہم شاعرِ مشرق۔ کی روح کو سلام کرتے ہیں۔ اقبالی مجرموں سے یہ رموز دین پوچھنا چاہتے ہیں کہ اقبال مرحوم کی وفات کے بعد "ارمغان حجاز" میں یہ رباعی کیوں چسپاں کر دی گئی۔ جب کہ ڈاکٹر صاحب رجوع کر کے اس مسئلہ کو ختم کر گئے تھے۔

اور نادانانِ اقبال سے سوال کرتے ہیں کہ یہ رباعی فارسی میں ہے یا کہ، اردو میں؟

جاہلو! تم نے سالِ اقبال سے پہلے اس فارسی کلام کو شاعر کے اردو کلام کا جزء کیسے بنا دیا؟ یعنی فارسی میں اردو کا ٹانکا لگا دیا۔ یہ صرف اقبالی مجرموں کا قصور ہے۔ اور ان ہی کی بدبختی یا خبث باطن ہے۔

ہم آخر میں پھر شاعرِ مشرق کی روح سے معذرت کرتے ہوئے اس بحث کو ہمیشہ کے لئے دفن کرتے ہیں۔ اب کوئی صاحب اقبال کے نام پر ایسی جرأت نہ کرے ورنہ ؎ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں" فقط۔

عبدالمجید سالک

ڈاکٹر اقبالؒ پر بریلوی علماء کا تکفیری فتویٰ

استفتاء بابت علامہ اقبال

یہ وہ زمانہ تھا جب ترک موالات کے بعد ہندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن کا جوش و خروش برپا تھا اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کے ادارے منظم کر رہے تھے، پھر سلطان ابنِ سعود کے تطہیر حجاز کے غلغلے نے ہندوستان میں مسلمانوں کو دو مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سلطان ابنِ سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان سخت کش مکش ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کے علماء نے تکفیر کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ علامہ اقبال سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے چکے تھے اور بدعتی علماء ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے استنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی، اس نے ایک استفتاء مرتب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ (بریلوی) خطیب مسجد وزیر خاں لاہور کو بھیج دیا۔ یہ صاحب اپنے شوق تکفیر کے لئے بے حد مشہور تھے۔ چنانچہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے۔ اس خوش طبع مسلمان نے اپنا نام "پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری" تجویز کیا اور یہ استفتاء لکھا:

"کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اور حامیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزاء کرے، علماءِ کرام اور پیرانِ عظام پر آوازے کسے اور انہیں بُرے خطابات سے یاد کرے۔ ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں "امام" اور "چراغِ ہدایت" کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست و برخاست اور ہر طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

بینوا و توجروا ۔

اشعار حسب ذیل ہیں !

(۱)

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے — چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو — یزدان ساکنان نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تیری — آزاد قید اول و آخر ضیا تیری

(ترجمہ گایتری منتر)

(۲)

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، ہمارا کوئی وطن نہیں ہے

(۳)

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تیری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

(۴)

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تیری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

رام کی تعریف میں فرماتے ہیں :

(۵)

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

(المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری)

فتوے

اسم پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے، اور اوتار ہنود کے نز دیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ اندریں صورت یزداں اور پروردگا آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگان دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے، اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔

ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خان مرحوم

بحوالہ (زمیندار ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا، مولوی دیدار علی (بریلوی) پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے "زمیندار" میں اس جاہلانہ فتوے کی چتھاڑ کر دی خود "زمیندار" نے فتوے پر تبصرہ کیا، ایک گمنام مقالہ نگار (غالباً چوہدری محمد حسین ایم۔ اے) نے ایک مدلل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا۔ یعنی اشعار منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی دیدار علی (بریلوی) کی اس حرکت سے علماءِ اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ کیونکہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم درد مند ملت حامی دین اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟

ذکرِ اقبال ــــ از ــــ عبدالمجید سالک

مطبوعہ بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ

ــــ لاہور ــــ

عبدالمجید سالک

ذکرِ اقبال اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۳۸ء کے آغاز میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تحریر میں کہہ دیا تھا کہ "اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس کی تفصیل جو یو۔پی کے بعض اخباروں میں شائع ہوئی اس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریۂ وطنیت کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ علامہ اقبال عمر بھر وطنیت کے اس تصور کے خلاف جہاد کرتے رہے ہیں اس لئے انہیں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے فقرے سے بے حد صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے وہ تین اشعار لکھ دیئے جو زبان زدِ عام ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک اخباری مضمون میں اپنا موقف واضح کر دیا تو علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس ضرر کی تلافی کر دی، جو اُن کے طنز سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔

۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو آپ نے لکھا:۔

"مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریہ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔

میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔ خدا تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید فرمائے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں"۔ ؎

"ذکرِ اقبال"، از عبدالمجید سالک، مطبوعہ بزمِ اقبال لاہور"

؎ روزنامہ "احسان" ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء

اولین تقریب "اِقبال"

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی وفات پر راقم و مرتب و ناظم کی دعوت پر حضرت علامہ "انور صابری"
دیو بند سے چنیوٹ تشریف لائے۔ بزم اقبال چنیوٹ اسلامیہ ہائی سکول کے زیر نظام ایک عظیم مشاعرہ
ہوا۔ جس کی صدارت حضرت علامہ طالوت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔
علامہ انور صابری نے فی البدیہہ یہ رباعی اپنے مخصوص انداز میں پیش فرمائی۔ ؎

دور ماضی کے پرستار غم حال کو رو   اپنے اعمال کے پس منظر اعمال کو رو
آج بھی مرقد اقبال سے آتی ہے صدا   تو کبھی صاحب اقبال تھا اقبال کو رو

اقبال - بنام - اقبال (کلام اقبال)

ہے عجب مجموعہ اضداد اے اقبال تو   رونق ہنگامہ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں   کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے   گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا
چپ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال   کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

آغا شورش مرحوم

مرزائیت کی طرح بدعتی طبقہ بھی برطانوی استعمار کا خود کاشتہ پودا ہے۔ جس طرح مرزائیوں نے مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے کٹ کر ظلی اور بروزی نبوت کا ڈھونگ رچایا۔ اور برطانوی مفاد کی خاطر ملت اسلامیہ کی صفوں میں تشتت و افتراق کی تخم ریزی کی۔ اسی طرح بدعتیوں نے مردانِ حق آگاہ اور سرفروشانِ ملت اسلامیہ کے خلاف دار التکفیر وا کر کے برطانوی استعمار کی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں بدعتیوں کے اس گروہ نے جو برطانوی استعماریت کا پروردہ ہے۔ ہر اس مسلمان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ جس نے برطانوی ملوکیت کے چنگل سے برصغیر اور مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو آزاد کرانے کے سلسلے میں آواز بلند کی اور برطانوی استعمار کے خلاف مسلمانوں کو متحدہ محاذ قائم کرنے کی دعوت دی۔

پہلی جنگ عالمگیر میں بدعتیوں کے اس گروہ نے نہ صرف برطانوی فوج کے لئے رنگروٹ اور سپاہی ہی مہیا کئے بلکہ محبوب سبحانی، غوث صمدانی سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں دینے والے اس گروہ نے اس وقت انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا جب ہندوستانی فوجوں نے انگریز کمانڈروں کے زیر قیادت اور یونین جیک کے زیر سایہ دین کو زندگی بخشنے والی اس عظیم شخصیت کے روضۂ اطہر پر گولیاں چلائیں۔ اور بغداد میں مسلمانوں کو بھیڑ، بکریوں کی طرح ذبح کیا۔ بدعتیوں کا یہی وہ فرقہ تھا جس نے کرنل لارنس کی درایت شریف حسین، امیر فیصل اور امیر عبد اللہ کی ترکوں سے غداری پر خوشی کے ڈونگرے برسائے اور ارضِ حجاز اور مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ترکوں کے اخراج پر گھی کے چراغ جلائے۔ ترکانِ احرار کی اس تباہی و بربادی پر جب مسلمانانِ برصغیر خون کے آنسو رو رہے تھے تو بریلی کے نور باف، اور بدایوں کے بڑھائی برطانوی فتح کی خوشی میں بغلیں بجا رہے تھے اور انگریزوں کو مبارک باد کے تار روانہ کر رہے تھے۔ بات اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی، لیکن بریلی کے نور بافوں اور بدایوں کے بڑھائیوں کے

متحدہ محاذ نے مسلمانوں کے رہنماؤں کے خلاف برطانوی ملوکیت کے اشارہ پر کفر کی توپوں سے گولہ باری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور ہر اس مجاہد کو کافر اور گردن زنی قرار دینا شروع کر دیا۔ جو برطانوی استعمار سے برصغیر اور مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کو آزاد دیکھنے کا متمنی تھا۔ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ سے لے کر معمولی سے معمولی حریت پسند رضا کار بھی ان کی کفر اندازی سے محفوظ نہ رہ سکا۔

سرزمین پنجاب میں ان دنوں حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی شاعری، ظفر علی خاں کی شعلہ بیانی معروف تھی۔ تحریک خلافت ختم ہو چکی تھی اور مالوی جی نے ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریک پورے زور و شور سے جاری کر رکھی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو جیل کی صعوبتیں جھیل کر رہا ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے مالوی جی کی تحریک شدھی کے مقابلہ میں ان دنوں تنظیم کی تحریک کو جنم دے رکھا تھا۔ اور مولانا ظفر علی خاںؒ "زمیندار" کے ذریعہ ان تحریکوں کے بخئے ادھیڑ رہے تھے۔ ان دنوں ہی عرب کے مرد مجاہد سلطان ابن سعودؒ نے نجد کے ریگزار سے پیش قدمی کر کے حجاز سے شریف حسینی اقتدار کا ٹاٹ الٹ دیا۔ اور حجاز مقدس پر سعودی مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔

مسلمان حریت پسند اور احرار جو ارض حجاز میں برطانیہ کی کٹھ پتلی حکومت کے قیام کے سخت خلاف تھے اور مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ معظمہ کو انگریزی اثر و نفوذ سے آزاد اور پاک دیکھنے کے متمنی تھے سلطان ابن سعود کی کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے شکرانے کے نفل ادا کئے کہ اللہ تعالےٰ نے شریف حسین کو ترکوں سے غداری کرنے کی سزا اس صورت میں دی ہے کہ سلطان ابن سعود کی غیر منظم اور تہی دست فوجوں کے سامنے برطانوی رسد و تعاون کے باوجود وہ چند دن بھی ٹھہر نہ سکا۔ نجدی مجاہدین نے کرنل لارنس کی اس ذریت کو ارض حجاز سے اس طرح نکال باہر کیا جیسے دودھ سے مکھی کو نکال باہر کیا جاتا ہے۔ انگریز کب یہ برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے لگائے ہوئے پودے کو اس طرح بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکا جائے۔ چنانچہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے کارپردازوں نے بریلی کے نور بافوں اور بدایوں کے بڑھائیوں کو اپنے اعتماد میں لے کر سلطان ابن سعود کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک زبردست محاذ قائم کر دیا۔ اور شریف حسین کی حمایت اور سلطان ابن سعودؒ کی مخالفت میں زور و شور سے پروپیگنڈا ہونے لگا۔

انگریزوں کے پیدا کردہ اس شور و شغب کے دوران حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمہ نے سلطان ابن سعودؒ کی تائید و حمایت میں ایک بیان دیا جس کی اشاعت پر بریلی اور بدایوں کے کفر ساز ملاؤں نے زخم خوردہ افعی کی طرح بے حد پیچ و تاب کھائے۔ علامہ اقبال پر دانت پیسے، انہیں مسجد وزیر خاں کے جلسوں میں ننگی اور فحش گالیاں دی گئیں۔ یہ سب کچھ انگریز کے اشارہ پر ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب

کونسل کے انتخابات ہونے والے تھے اور حضرت علامہ اقبال بھی مسلمانان لاہور کے اصرار پر لاہور کے حلقہ سے امیدوار تھے ۔ عین اس وقت برسر اقتدار حکومت نے علامہ اقبال رح کو انتخاب میں ناکام بنانے کے لئے ایک گہری چال چلی ۔ اور وہ چال یہ تھی کہ ایک شخص نے علامہ اقبال رح کے چند اشعار کی آڑ میں مولوی سید دیدار علی شاہ الوری ثم لاہوری سے علامہ اقبال رح کے متعلق استفتار کیا جس کی تفصیل مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے اپنی تصنیف " ذکر اقبال " میں بالفاظ ذیل بیان کی ہے ۔

استفتار بابت علامہ اقبال

" یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ترک موالات کے بعد ہندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن کا جوش و خروش برپا تھا اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کے ادارات منظم کر رہے تھے ۔ پھر سلطان ابن سعود کی تطہیر حجاز کے قلقلے نے ہندوستان کو دو مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا ۔ سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان سخت کش مکش ہو رہی تھی ۔ دونوں طرف کے علمار نے تکفیر کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا ۔ علامہ اقبال رح سلطان ابن سعود کی حمایت میں ایک بیان دے چکے تھے اور بدعتی علمار ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے ۔ استنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی ۔ اس نے ایک استفتار مرتب کر کے مولانا ابومحمد سید دیدار علی شاہ خطیب مسجد وزیر خاں لاہور کو بھیج دیا ۔ یہ صاحب اپنے شوق تکفیر کے لئے بے حد مشہور تھے ۔ چنانچہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے ۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور دیگر اکابر احرار شامل تھے ۔ اس خوش طبع مسلمان نے اپنا نام پیرزادہ محمد صدیق تجویز کیا ۔ اور یہ استفتار لکھا ۔

" کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور حامیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے آخرت پر یقین نہ رکھے ، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزار کرے ۔ علمائے کرام اور پیران عظام پر آوازے کسے اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے ، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں ۔ امام اور چراغ ہدایت کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو کیا ایسا آدمی مسلمان رہ سکتا ہے یا کفر پر ؟ اس کے ساتھ لین دین ، نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز ۔ اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے ؟

بیّنوا و توجروا۔ اشعار حسب ذیل ہیں۔

آفتاب

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے — چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ہے محفل وجود کا ساماں طراز تو — یزداں ساکنان نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائدگان نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری — آزاد قید اول و آخر ضیا تری

(ترجمہ گائتری منتر)

۲

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شیٔ میں ہے ہماری، کوئی ہمارا وطن نہیں

○

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری — شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

○

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں!

○

رام کی تعریف میں۔

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز — اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

(المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

فتویٰ | اسم پروردگار اور یزداں عرفاً خصوصاً ذات جناب باری تعالےٰ ہے۔ اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح

کفر ہے۔ علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر، اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر۔ اور توہین بزرگانِ دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکورہ توبہ نہ کرے اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے"

(ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خاں)

اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا۔ مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے لعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی رہ نے زمیندار (مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء) میں اس جاہلانہ فتوے کی چھتاڑ کی۔ خود زمیندار اخبار نے فتوے پر ایک مدلل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا۔ یعنی اشعار منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا کیوں کہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی۔ قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال رہ کو سخت مخلص مسلمان، عاشق رسولؐ، دردمند ملت، حامیٔ دین اسلام تسلیم کرتے تھے، اور کہتے تھے اگر ہمارے علماء کے نزدیک "اقبال" جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟ علامہ اقبال کے خلاف یہ فتوئے کفر ابھی فضاء میں گونج رہا تھا۔ اور بدعتی گروہ پر لعن طعن کا سلسلہ جاری تھا کہ دہلی دروازہ لاہور کے باغ میں بدعتی ملاؤں کی جماعت حزب الاحناف کا ایک زبردست اجتماع ہوا جس میں کفرساز ملاؤں کے امام مولوی حامد رضا خاں نے بھی شرکت کی۔ اس اجتماع کے انعقاد کے اخراجات کس نے برداشت کئے ہم اس جگہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے اور نہ اس کی پردہ کشائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس اجتماع کے انعقاد کی غرض و غایت اگر ایک طرف سلطان ابن سعود کی انگریز دشمنی پر گندگی اچھالنا تھی؛ تو دوسری طرف ان مردانِ حق آگاہ کو ہدف کفر و ملامت بنانا تھا۔ جو ارض مقدس حجاز سے انگریز کی ذریات کے اخراج پر اظہار مسرت و شادمانی کر رہے تھے۔ ان میں مولانا ظفر علی خاں کا نام سرفہرست تھا۔ مولانا ظفر علی خاں زبان و قلم دونوں سے بدعتی گروہ اور ان کے سرپرست برسراقتدار رجعت پسند طبقہ کے خلاف نبرد آزما تھے۔ چنانچہ اس جلسہ میں جس کا اہتمام خاص کر سرکارِ ولایت کی طرف سے کیا گیا تھا مولانا ظفر علی خاں کے کفر کا فتوئے دیا گیا۔ اور اعلان کیا گیا کہ جو مسلمان ظفر علی خاں سے ملے گا یا اس کا اخبار "زمیندار" پڑھے گا۔ اس کی بیوی پر طلاق ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو، اور ڈاکٹر اقبال کے بعد مولانا ظفر علی خاں کے خلاف علمائے بریلی و الور کے اس فتوے نے سارے شہر میں بلکہ صوبہ بھر میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ ڈاکٹر کچلو اور علامہ اقبال تو کفر کی سند حاصل

کرنے کے بعد خاموش رہے۔ لیکن ظفر علی خاں کو خاموش کون کر سکتا تھا۔ وہ مرد مجاہد تنہا بدعتی محاذ سے ٹکرا گیا۔ اور نظم و نثر، اور تقریر و تحریر سے بدعتیوں کا ایسا ناطقہ بند کیا کہ بریلوی کفر سازوں نے ظفر علی خاں کے مقابلہ میں آنے کے بجائے خفیہ طریقوں سے خطوط کے ذریعہ انہیں قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ لیکن ظفر علی خاں ان گیدڑ بھبکیوں سے بھلا کب دبنے والا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بریلوی بدعتیوں کے دم خم ٹوٹ رہے ہیں، ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ تو اس نے ان کے جلسوں میں جا کر اعلاء کلمۃ الحق کرنا شروع کر دیا۔ اس جگہ ہم ایک واقعہ قارئین کی معلومات میں اضافہ کے لئے درج کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ۔

"جن بدعتی ملاؤں نے یہ فتوےٰ دیا تھا کہ جو مسلمان "زمیندار" پڑھے گا اس کی بیوی پر طلاق ہو جائے گی۔ فتوےٰ کے دوسرے روز ہی ان کے حجروں میں "زمیندار" کا تازہ شمارہ دیکھا گیا"۔ صرف اس ایک واقعہ سے ہر شخص بریلوی بدعتی علماء کے اخلاق و کردار کا اندازہ کر سکتا ہے۔

ہم یہ تو نہیں جانتے کہ بقول ان کے اپنے فتوےٰ کے ان کی بیویوں کو طلاق ہوئی یا نہیں۔ اور انہوں نے اپنے نکاحوں کی تجدید کی یا نہیں۔ لیکن اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بریلوی بدعتی علماء میں جرأت و حق گوئی کا فقدان ہی نہیں تھا بلکہ وہ ذہنی اعتبار سے بھی بالکل تہی دامن تھے۔

ہاں تو ہم نے پچھلی سطور میں یہ لکھا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے بریلویوں کے جلسوں پر چھاپے مارنے اور ان کے جلسوں میں جا کر حق و صداقت کا علم بلند کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ٹیکسالی دروازہ میں "انجمن نعمانیہ ہند" کے زیر اہتمام ایک درس گاہ قائم تھی۔ جہاں دن رات تکفیر کی توپیں ڈھلا کرتیں اور کفر سازی کا سامان، تیار ہوا کرتا تھا۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ہر سال جلسہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء کے اوائل میں انجمن نعمانیہ کے زیر اہتمام سالانہ تبلیغی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں بریلوی مکتب فکر کے بڑے بڑے علماء نے شرکت کی ان میں وہ علماء بھی شامل تھے جنہوں نے علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے خلاف کفر کے فتوے پر دستخط کر رکھے تھے۔

چنانچہ کانفرس کے پہلے روز ہی نماز عشاء کے بعد پیر جماعت علی شاہ کی صدارت میں جلسہ ہو رہا تھا۔ کہ مولانا ظفر علی خاں جن کی جرأت و بے باکی شہرۂ آفاق تھی اپنے چند حواریوں کے ہمراہ جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ ساری فضاء اللہ اکبر اور ظفر علی خان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ مولانا ظفر علی خاں کو دیکھتے ہی بدعتی ملاؤں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ زبانیں گنگ ہو گئیں۔ اور وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ مولانا ظفر علی خان نعروں کی گونج میں اسٹیج پر پہنچ گئے۔ صدر جلسہ حضرت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری نے مولانا کا استقبال کیا۔ بغلگیر ہوئے۔ اور پھر فرمانے لگے کہ جس شخص نے دو شمع اجالا جس نے کیا

چالیس برس تک غاروں میں) اور۔

پھوٹا جو سینۂ شب تار الست سے
اس نور اولین کا اجالا تمہیں تو ہو

ایسی بلند پایہ نعتیں لکھی ہوں اس کے جنتی ہونے میں کوئی شبہ کر سکتا ہے ؟ ایسی نعتیں تو صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جو سچا اور باصفا عاشق رسول ہو"

حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری نے حقیقت میں اپنے کلمات سے ان لوگوں کے منہ پر ایک زور دار طمانچہ رسید کیا تھا جنہوں نے علامہ اقبال اور ظفر علی خاں ایسے عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفر کا فتوے دیا تھا۔

مولانا ظفر علی خان رح نے اس جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے بیانگ دہل اس امر کا اعلان کیا کہ۔

" میرا مشن اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی آزادی کی خاطر اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کرتا رہوں۔ اور اپنے جہاد کو اس وقت تک جاری رکھوں جب تک سارا عالم اسلام مغربی استعمار کی گرفت سے آزاد نہ ہو جائے میرا مسلک واضح ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ فروعی اختلافات کو وجہ نزاع بنا کر انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جو علماء حریت پسند عناصر کے خلاف تکفیر کی رٹ لگا رہے ہیں وہ اپنے اس منحوس اور قابل مذمت کاروبار سے باز آجائیں۔ کسی کلمہ گو کو کافر کہنا یا کافر گردانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور ہر مسلمان کو اس گناہ سے بچنا چاہیئے۔ اس وقت دنیائے اسلام کی سربلندی اور آزادی کے لئے ہم سب مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیئے۔ اور ان طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے جو اسلامی سطوت کی بیخ و بن اکھاڑ پھینکنے کے سلسلہ میں گزشتہ کئی صدیوں سے سازشوں میں مصروف ہیں۔ ہمارے علماء کو ان کا آلۂ کار بن کر اپنے ہی بھائیوں کو کافر نہیں بنانا چاہیئے۔ اور دشمنان اسلام کے استحکام کی خاطر مسلمانوں کی صفوں میں تشتت و افتراق اور انتشار و خلفشار برپا نہیں کرنا چاہیئے"

مولانا ظفر علی خاں کی اس تقریر نے لاہور میں بدعتی اور کفر ساز علماء کے جلتے ہوئے چراغ گل کر دیئے اور وہ جلسہ جس کی اسٹیج پر چند گھنٹے قبل بعض بدعتی ملاؤں نے کفر سازی کا ڈرامہ بڑی سج دھج سے کھیلنے کی کوشش کی تھی اتحاد بین المسلمین کا پیامبر بن گیا۔

○

دردِ دل سے اپیل

اے مسندِ رسول پر بیٹھ کر مسلمانوں کو راہِ ہدایت دکھانے والو! اپنے فرائض کا احساس کرو۔ مسندِ رسول کو اپنے بھائیوں کی تکفیر و تفسیق کے لئے استعمال نہ کرو۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین تھے۔ اس لئے تم بھی جو کہ ان کی مسند پر بیٹھ کر درس دیتے ہو، دنیا کے لئے رحمت بن جاؤ۔ مسلمانوں خاص کر ان علمائے حق کو جنہوں نے اسلام کی سربلندی اور حق کی فتح کی خاطر اپنی جانیں نچھاور اور قربان کر دیں۔ کافر کہہ کر اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ نہ کرو۔ اور زمین و آسمان کی لعنتوں کے مورد نہ ہو۔ (ہفت روزہ چٹان لاہور)

◎

شیخ العرب و العجمؒ

غنچۂ باغِ نبوت تھے حسین مدنی
داعیٔ امن و اخوت تھے حسین مدنیؒ
یوں تو عالم کیلئے باعثِ عزت تھے مگر
ایشیاء والوں کی عظمت تھے حسین مدنیؒ
حیف اب ایسا جہاندار کہاں پائیں گے
پاک دل پاک طبیعت تھے حسین مدنیؒ
حیف صد حیف اٹھے صفحۂ گیتی سے رضاؔ
پیکرِ رشد و ہدایت تھے حسین مدنیؒ

رضا امروہوی

از ماہر اقبالیات آغا شورش کاشمیری مرحوم

اِقبالیات

نظریاتِ اقبال

مطالعہ اقبال کے سلسلہ میں سیاست بھی کم قاتل ثابت ہوئی۔ بقول رومی

ہر کسے از ظن خود شد یار من

از درون من نجست اسرار من

رومی کا مشار الیہ نیک نیتی سے ایسا کرتا ہوگا مگر اقبال کے سیاسی یار من بے نصیب اکثر بدنیتی سے، اقبال کو اپنے ذاتی یا جماعتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے، اور اب بھی کر رہے ہیں۔ تقسیم ملک سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں نے اپنے سیاسی جلسوں کی رونق کلام اقبال سے بڑھائی جنہیں اقبال دل سے ناپسند کرتے تھے کبھی اقبال کو نازی بنایا گیا، کبھی اشتراکی کہا گیا کبھی دشمنِ وطن اور کبھی وطن کی مٹی کا پجاری۔ اور لاہور میں یہ بھی طلوع ہوا ہے کہ ایک شخص جو شخصیتِ رسول کی اہمیت گھٹانے پر مصر ہے اور دین کو کیچ روا میں مسلمانوں کے سہل اور غیر ذمے دار طرزِ زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک فرقے کی بنیاد رکھ چکا ہے۔ بدقسمتی سے اس مجلس کی رونق اشعار اقبال ہی سے بڑھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رسول ہی کو نہیں مانتا اور اپنے آپ کو قرآن کا عمرؓ و ابوبکرؓ سے بہتر مفسر سمجھتا ہے وہ اقبال کو کیا مانے گا۔ مگر رونق بڑھانے کے لئے اشعار اقبال کو یہ بھی گاتا ہے!

یہ بظاہر اقبال کی مقبولیت کی علامت ہے مگر اسی مقبولیت کے اندر مسخ اقبال کے نئے نئے بھی ہو رہے ہیں اور وہی پہلو ہے جس کی خاطر پیغام اقبال کی حفاظت کی بھی ضرورت ہے ——————— "ڈاکٹر سید عبداللہ"

شورش مرحوم تحریر فرماتے ہیں :-

"جس اساس پر فکر اقبال کی عمارت کھڑی ہے اس کا علم اور اس کی معرفت حاصل کرنا چاہیئے" پروفیسر آل احمد سرور کو ایک خط میں لکھا ہے "میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے"

جن لوگوں نے کلام اقبال پر "ناقدانہ" نگاہ ڈالی ہے ان میں سے اکثر حقائق اسلامیہ سے بے بہرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت سی بنیادی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ لوگ قرآن سے نابلد ہیں، حدیث کا فہم نہیں،

سیرت سے بیگانہ اور سُنّت سے معترض ہیں۔ تاریخِ اسلام کے نظری، فکری اور سیاسی مباحث کا انھیں شعور نہیں۔ اسلام کو جن داخلی فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ان کے مضرات سے انھیں شناسائی نہیں اور نہ اس بارے میں بصیرت رکھتے ہیں۔ مثلاً اقبال نے مروّجہ تصوف پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس کا تجزیہ کرنے اور تاریخ لکھنے کے آرزومند تھے، ایک حصہ لکھ بھی چکے تھے لیکن ان کی رحلت میں سال ہوتے ہیں، کسی نے اس پر غور نہیں کیا، کوئی سلیمان ندوی نہیں جو اس شبلی کا سچا جانشین ہو۔ ان لوگوں نے اقبال کے مشن کو آگے نہیں بڑھایا بلکہ رد کا ہے اور اس کی رُوح کو بدل رہے ہیں۔

بعض مباحث جو علامہ کی تمام زندگی کا حاصل تھے اور ان کی نظر پر عمر کے آخری دنوں میں انھیں مسائل پر لگی ہوئی تھیں ان لوگوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ بعض سیاسی پہلو ہیں جنھیں اپنی خاص مصلحتوں کا موضوع بنالیا ہے۔ مثلاً مولانا سید حسین احمد صاحبؒ مدنیؒ کے ساتھ قومیت کے مسئلہ پر علامہ کی جو بحث ہوئی اس کو ان سرکاری عالموں نے بہت ہوا دی۔ حتیٰ کہ ان کے قلم سے علماءِ اُمت کے کفن بھی محفوظ نہیں رہے۔ حضرت مدنیؒ کی وضاحت کے بعد علامہ نے شخصی بحث کا خاتمہ کر دیا تھا، موضوع علمی تھا لیکن ان لوگوں کی سیاسی زبان درازیاں ختم نہیں ہوتی ہیں۔ سب سے بڑا فتنہ جو ان لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے وہ کلامِ اقبال میں "مُلّا پر تنقید" اس خانزادۂ حکومت نے اس کو علماء کے خلاف استعمال کیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کا کتابچہ "مُلّا اور اقبال" اس سازش ہی کی شرمناک داستان ہے۔ اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی مقالہ یا کتاب اقبال کی روح کے خلاف ہو۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ جو پاکستان میں اقبال کی فکری روح کے شناساؤں میں ہیں اپنے ایک مقالہ میں "اقبال اور مُلّا" کی چھٹاڑ کر چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اقبال کے مُلّا اور خلیفہ عبدالحکیم کے مُلّا میں کوئی مناسبت نہیں۔ اقبال کا مُلّا اصلاً وہ شخص ہے جو علمِ دین نہیں رکھتا اور عالمِ دین بنتا ہے اس میں خود خلیفہ صاحب بھی آجاتے ہیں۔ مُلّا کے خلاف اس مہم کا نقصان اسلام کو پہنچ رہا ہے۔ مُلّا کشی کا عمل یوں ہی رہا تو اسلاف میں سے کوئی ایک بزرگ بھی نہ رہے گا جس کا نام عزت سے لیا جا سکے۔ مُلّا سے کہیں زیادہ اقبال نے مغربی تعلیم کے مشرقی مفلسوں پر تنقید کی، اور انہیں "بے دین دانشمند" کہا ہے۔ ان کے نزدیک مرگھٹ کا کوا ان سے بہتر ہے لیکن اقبال کے سرکاری شارحین نے کلامِ اقبال کا یہ حصہ ہی منسوخ کر دیا ہے۔ ان کے قلم گنگ ہیں کہ اقبال کے اہلِ مدرسہ کون تھے، کن لوگوں نے طلبہ کا گلا گھونٹا کہ ان کی آوازیں لا الٰہ الا اللّٰہ سے محروم ہو گئی ہیں، شاہینوں کو خاکبازی کی تعلیم کون دے رہا ہے اور وہ لوگ کون ہیں جن سے مکتب، مذبح ہو گئے ہیں۔ مُلّا کا ذہنی انحطاط بجا۔ اس سے انکار نہیں مگر کن لوگوں کے متعلق اقبال نے کہا ہے:

ع　اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است　　جبیں خود منہ جز بر درِ او
سرِیں راہم بہ چوبش دہ کہ آخر　　حقے دارد بہ خر پالاں گرِ او

اقبال نے مُلّا کے علاوہ ملوکیت کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے اعضاء و جوارح اور مقاصد و مطالب پر سخت تنقید کی ہے لیکن اقبال کے ان خوارج نے اس حصہ کو چھوا تک نہیں۔ قادیانیت کے متعلق اقبال نے جو لکھا وہ یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ اقبال کی انہی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام پر جو افتاد بھی آتی ہے اور جس کی تاریخ کئی صدیوں

تک چلی گئی ہے اپنے اندر کیا زہر رکھتی ہے۔ اقبال نے اسلام کی دینی تاریخ اور سیاسی سرگزشت کے اتنے پہلو بیان کئے ہیں کہ اسلام کے تاریخی لٹریچر میں اس موضوع پر غالباً جامع مقالہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ اس مقالے سے کئی مباحث پیدا ہوئے جن پر مستقل کتابیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اقبالئین کا بیشتر حصہ اس موضوع کو چھیڑنا رواداری کے خلاف سمجھتا ہے اور یہ رواداری اس انسان کی ہے جو اپنے اوضاع و اطوار کی حفاظت کرنے سے محروم ہو۔ اب ان کی سیاسی مصلحتیں، ذاتی منفعتیں اور علمی محرومیاں اس بے حسی کا باعث ہیں۔ یہ لوگ اقبال کے ان افکار کو ان کے وقتی اضطرار کا حصہ کہتے ہیں ان کے خیال میں اقبال بعض سیاسی تنظیموں کی ترغیب میں آگئے تھے گویا اقبال نے اپنا ذہن دوسروں کے سپرد کر رکھا تھا اور وہ دینی مطلب جو مسلمانوں کی وحدت کو برقرار رکھتے ہیں ان کے دماغ میں خارج سے آتے ہیں، اقبال نے ایک جگہ نہیں کئی جگہ اپنے خطبات و خطوط میں لکھا ہے کہ

"میں نے کبھی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی، میں اس آدمی کو اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے"

اقبال کے ان شارحین کو اصرار ہے کہ اقبال نے قادیانیت پر جو کچھ لکھا اور عمل کیا اس کا تعلق احرار قادیانی نزاع سے ہے۔ علامہ احرار کے چنگل میں آگئے تھے گویا قادیانیت کا مسئلہ اسلام کا مسئلہ نہیں احرار کا مسئلہ ہے اور علامہ اسلام سے نہیں احرار سے متاثر تھے، اس تاثر کو انہوں نے اسلام کا نام دیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک وہ کیا معیار ہے جس سے معلوم ہو کہ فلاں افکار پر اقبال نے سوچا اور فلاں افکار پر خارجی اثرات کی مہر لگی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن افکار کی ان لوگوں کو بوجہ ضرورت ہے وہ ان کے نزدیک اقبال کے ہیں اور جن کی انہیں ضرورت نہیں وہ اقبال کا منسوخ حصہ ہیں۔ اس بارے میں کوئی احتیاط کیے بغیر ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک مجرمانہ ذہنیت ہے۔

علم و آگہی

قرآن، حدیث، سیرت قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہے لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں، انہیں فی الحال اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دینی چاہیئے ——— تقریر میلاد النبی مطبوعہ سرفی اکتوبر ۱۹۲۹ء

علم کے چار ذریعے فرمایا علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن پاک نے واضح رہنمائی کی ہے۔ پہلا ذریعہ وحی وہ ختم ہوچکا ہے، دوسرا آثار قدما، و تاریخ۔ سیروا فی الارض اس آیت نے علم آثار کی بنیاد رکھی، ذکرہم بایام اللہ تاریخ کا ابتدائی نکتہ جس نے ابن خلدون جیسے باکمال مؤرخ و محققین پیدا کئے۔ تیسرا ذریعہ علم النفس ہے۔ جس کا آغاز و فی انفسکم افلا تبصرون سے ہوتا ہے۔ چوتھا ذریعہ صحیفہ فطرت ہے جس پر قرآن مجید کی بے شمار آیتیں دلالت کرتی ہیں مثلاً الی الارض کیف سطحت

——— عرشی ملفوظات

نظر | فرمایا نظر سے مراد صحبت ہے۔ ———— عرشی ملفوظات

دینوی تعلیم کی خرابی | کسی طریقہ تعلیم کو قطعی اور آخری نہیں کہا جاسکتا، ہر ملک کی تعلیمی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں اور مسلمان ممکتوں کا تعلق ہے خالص دینوی تعلیم سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ———— بیان ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء حرف اقبال۔

قرآن مجید کی تعلیم | وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔

———— جلسہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۱ مارچ ۱۹۳۱ء منعقدہ لاہور ص ۱۱۳

تعلیمی اساس | مسلمان نوجوانوں کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو اس میں سیرچشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصاف حسنہ نہیں پیدا ہو سکتے جو اسلامی سیرت کے لئے مابہ الامتیاز ہیں۔

———— انجمن حمایت الاسلام کے تعلیمی عزائم کیا ہونے چاہئیں، مقالات ص ۲۱۲

صحبت | کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔

———— تقریر میلاد النبی مطبوعہ صوفی اکتوبر ۱۹۲۶ء

جدید افکار قدیم حقائق | یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جارہا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں پیش کیا جارہا ہے۔ ———— ڈاکٹر نکلسن کے نام

فکر و نظر | قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

پردہ | عورت کا جنسی تقدس اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اجنبی نگاہوں سے بہر سو محفوظ رکھا جائے۔ عورت ایک بہت ہی عظیم ذریعہ تخلیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تخلیقی قوتیں مستور و محجوب ہیں ———— اخبار "پوسٹ" لندن

عورت | جس قوم نے عورت کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر ضرور پشیمان ہوئی ہے۔ عورت کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے۔ ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوسناک کوشش ہے۔ ———— روزگار فقیر جلد اول ص ۶۷

آرٹ | فرمایا بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لئے مُردہ بنا دیتا ہے۔

فرمایا:- ہندو قوم کی تباہی میں اس کے فن موسیقی کا بہت ساحصہ ہے ———— خواجہ عبدالوحید ملفوظات

آزاد خیالی | اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا ہی کرنا چاہئے کہ آزاد خیالی کی اس تحریک کو جو دنیائے اسلام میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے کم از کم یوں ہی روکنے کی کوشش کریں کہ قدیم نقطہ نظر کے ماتحت اس کی تنقید صحتمندی سے ہوتی رہے۔ ———— پانچواں خطبہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص ۲۳۶

آرزو | کاش! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں ———— سراج الدین پال کے نام

حزب کلیم میں | قرش سے مراد حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بخارسی سے اصل سونا ——— عرشی کے نام

تقلید کا زمانہ | زمانۂ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے۔ ——— بحوالہ مضمون رشید احمد صدیقی پروفیسر

اسوۂ رسول | فرمایا: اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شخصیت پرستی کی مخالفت کا بہترین مظہر ہے۔ ——— سید الطاف حسین ایم۔ اے مرتب

جدید و قدیم | میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید بلکہ میرا میلان قدیم کی طرف ہے۔ ——— سید سلیمان ندوی کے نام

"صحبتِ رفتگان"

دل ما بیدلاں بردند و رفتند

مجدد الف ثانیؒ | سہ تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

عرض کیا تین سو سال پہلے جہانگیر کی بادشاہت میں خم و ساغر کا دور تھا کیا آپ اس کا احیاء چاہتے ہیں؟ فرمایا نہیں یہ شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندیؒ کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے سب سے زبردست رہنما گزرے ہیں

——— میاں بشیر احمد ملفوظات

شاہ ولی اللہؒ | شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مغربی ہند کے ملاحدہ کے رد اور اصلاح کے لئے مامور کیا تھا یہ کام انہوں نے نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ماخوذ از مکاتیب اقبال صہ ۵

ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں۔ غالباً یہ شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی۔

——— خطبہ چہارم تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ صہ ۱۴۵۔

سید سلیمان ندویؒ | آپ علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کے فرہاد ہیں۔ آپ کا قلب قوی اور ذہن ہمہ گیر ہے آپ استاد الکل ہیں۔

——— سید سلیمان ندوی کے نام

عبدالوہابؒ اور جمال الدین افغانیؒ | میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا حق دار ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہیں۔ مصر، ایران، ترکی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ مؤخر الذکر ہی اصل میں مؤسس ہیں۔ زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے۔

——— چوہدری محمد احسن، ۷ اپریل ۱۹۳۲ء

علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ | سید انور شاہ دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین میں سے ہیں ——— انوار اقبال صہ ۲۵۵

اسلامی حکماء | میری ایک مدت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکماء و صوفیاء کے نقطہ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔

______ سید سلیمان ندوی کے نام

اکبرالہ آبادی | مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیاء میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا اور نہ اسلامی ادبیوں میں آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا ہوئی ہے۔

______ انوار اقبال ص ۱۹۰

"قرآن اور اسلام" الحکم للہ الملک للہ

قرآن مجید | قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہیے تاکہ قلب میں محمدی نسبت پیدا کرے۔

______ نیاز الدین خان کے نام

مطالعہ قرآن | فرمایا: قرآن کو اس زاویہ نگاہ سے مت پڑھو کہ تمہیں فلسفے کے مسائل سمجھائے گا۔ اسے اس زاویہ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے اور کائنات میں میرا کیا مقام ہے۔

______ روزگار فقیر ج ا ص ۱۰۱

معیار نبوت | فرمایا۔ معجزے یا پیش گوئیاں نہیں، بلکہ نبی کی تعلیم اور اس کی زندگی نبوت کے لئے حجت ہے۔

______ ڈاکٹر سعید اللہ، ملفوظات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم | میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے۔

______ نیاز الدین خاں کے نام

اسوۂ رسولؐ | مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسوۂ رسولؐ کو مدنظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔

______ تقریر میلاد النبی مطبوعہ صوفی، اکتوبر ۱۹۲۶ء

تفاسیر قرآن | کوئی آدمی عربی زبان کے محاورے کا مقابلہ نہیں کر سکتا، ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا۔ قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیا جاتا۔ نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کئے جا رہے ہیں۔

______ نیاز احمد خاں کے نام ۱۹۳۱ء

قرآن، حدیث، سیرت | قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہے لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں، انہیں فی الحال اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دینی چاہیئے۔

______ تقریر میلاد النبی مطبوعہ صوفی اکتوبر ۱۹۲۶ء

قحط الرجال | یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں ملتی۔

——— اکبر الہ آبادی کے نام ۵ دسمبر ۱۹۱۱

تصوف

گدی نشین | گدی نشینوں نے جب سے دین کو حصول دنیا کا ذریعہ بنا لیا اس وقت سے اخلاص رخصت ہو چکا ہے۔

——— صالح محمد کے نام

تقلید | میں مثنوی مولانا روم کی تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا مقلد ہوں۔

——— بہ ضمن اسرار خودی مقالات ص۱۵۱

حفاظتِ دین | فرمایا: ابن تیمیہ، ابن جوزی و زمخشری اور ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت عالمگیر غازی شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید نے حفاظت دین کا کام کیا ہے۔ ہمارا مقصد اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا اور کچھ نہیں۔

——— بہ ضمن اسرار خودی مقالات ص۱۵۱

علماء اور دین | دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے ہی سے کھلتی ہے۔

——— ماخوذ از مکاتیب اقبال ص۲

تاریخ وسیاست

؎ صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

صوفیاء اور علماء | مجدد الف ثانی اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی مگر صوفیاء کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ کئی صدیوں سے علماء اور صوفیاء میں طاقت کیلئے جنگ ہو رہی تھی جس میں آخر کار صوفیاء غالب آئے۔ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں جب تک کسی خانوادے سے بیعت نہ ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔

——— لسان العصر کے نام

مغرب زدہ طبقہ | مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے

——— سید سلیمان ندوی کے نام

غیر دینی تعلیم | تعلیم کا تمام تر غیر دینی ہونا مسلمانوں کے لئے مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے

______ نیاز احمد خاں کے نام

بزرگان سلف | زمانہ حال کے مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بزرگان سلف کے حیرت ناک تذکروں کو زندہ کیا جائے۔

______ فوق کے نام خط، انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحہ ۱۲۴

مُلّائیت | مُلّائیت۔ علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوت عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوال بغداد کے زمانہ سے وہ بے حد قدامت پسند بن گئے اور آزادی اجتہاد کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لئے حوصلہ افزا تھی درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اس جمود کے خلاف۔

______ افکار پریشان

قادیانیت

قادیانی اسلام کے غدار ہیں

اسلام کا غدار | دینیاتی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اسلام کی اجتماعی اور سیاسی تنظیم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔

______ مکتوب بجواب نہرو

قادیانیت کا مقابلہ | علماءِ ہند نے قادیانیت کو ایک دینی تحریک تصور کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ میرا خیال ہے اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ طریقہ موزوں نہیں۔ ۱۷۹۹ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء کا سال بے حد اہم ہے۔ اسی سال ٹیپو شہیدؒ کو شکست ہوئی، اسی سال جنگ نوریز ہوئی جس میں ترکی کا بیڑہ تباہ ہو گیا اور ایشیاء میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا۔

______ بجواب نہرو

قادیانی | فرمایا۔ قادیانی تحریک نے مسلمانوں کے ملی استحکام کو بے حد نقصان پہنچایا ہے اگر استیصال نہ کیا گیا تو آئندہ شدید نقصان پہنچے گا۔

______ عبدالرشید طارق، ملفوظات

احمدیت کے اداکار | تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، وہ زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

______ بجواب نہرو

سیاسی چال | ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے

جب قادیانی مذہبی اور معاشی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لئے کیوں مضطرب ہیں؟

علیحدگی کا مطالبہ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ ابھی (قادیانی) اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔

——— اسٹیٹسمین کے نام خط ۱۰ر جون ۱۹۳۵ء

ہندوستانی پیغمبر قادیانی جماعت کا مقصد پیغمبر عرب کی اُمت سے ہندوستانی پیغمبر کی جماعت تیار کرنا ہے۔

——— پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین مطبوعہ ماڈرن ریویو کا جواب

قادیانیت اور بہائیت بہائیت قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن مؤخر الذکر (قادیانیت) اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لئے مہلک ہے اس کے خمیر میں یہودیت کے عناصر ہیں۔ گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف راجع ہے۔

——— قادیانیت اور اسلام

قادیانیت قادیانیوں کے لئے صرف دو ہی راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور الگ ہو جائیں یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اصل اصول کو اس کے پورے مفہوم کیساتھ قبول کریں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔ ——— قادیانیت اور اسلام

مرزا غلام احمد قادیانی آخر عمر میں قریباً ہر صحبت میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آجاتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا:

"سلطان ٹیپو کے جہاد حریت سے انگریزوں نے اندازہ کیا کہ مسئلہ جہاد ان کی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ جب تک شریعت اسلام سے اس مسئلہ کو خارج نہ کیا جائے ان کا مستقبل محفوظ نہیں۔ چنانچہ مختلف ممالک کے علماء کو آلہ کار بنانا شروع کیا۔ اسی طرح ہندوستانی علماء سے بھی فتوے حاصل کئے لیکن تنسیخ جہاد کے لئے ان علماء کو ناکافی سمجھ کر ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا بنیادی موقف ہی یہ ہو کہ اقوام اسلامیہ میں تنسیخ جہاد کی تبلیغ کی جائے۔ احمدیت کا حقیقی سبب اسی ضرورت کا احساس تھا۔" ایک روز فرمایا:

"فتوں کی نقول تلاش کرو، ممکن ہے مولوی ثناء اللہ امرتسری سے ان کا سراغ مل جائے۔ مولوی صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے سرسید کے کتب خانہ علی گڑھ کی طرف راہنمائی کی۔ حضرت علامہ نے سید ریاست علی ندوی کو لکھا اور اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ فرمایا "قرآن کے بعد نبوت و وحی کا دعویٰ تمام انبیاء کرام کی توہین ہے۔ یہ ایک ایسا جرم جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا تمام نظام دیانت کو درہم برہم کر دینے کے مترادف ہے

قادیانی فرقہ کا وجود عالم اسلامی، عقائد اسلامی، شرافت انبیاء، خاتمیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کاملیت قرآن کیلئے قطعاً مضر و منافی ہے۔

_____ عرشی ملفوظات

علیحدہ جماعت | حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا۔ مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری برتیں گے جیسا باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتے ہیں۔

_____ قادیانیت اور اسلام

نام نہاد تعلیم یافتہ | نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے انہیں حفظ نفس کے جذبہ سے عاری کر دیا ہے لیکن عام مسلمان جو ان کے نزدیک مُلّا زدہ ہے اس تحریک کے مقابلہ میں حفظ نفس کا ثبوت دے رہا ہے۔

_____ قادیانیت اور اسلام

خطرہ | مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہیں جو ان کی وحدت کے لئے خطرناک ہوں، چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نئی نبوت پر رکھے اور اسکے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو بزعم خود کافر قرار دے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لئے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اسلامی وحدت، ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

_____ قادیانیت اور اسلام

محی الدین ابن عربی | اگر شیخ محی الدین ابن عربی کو اپنے کشف میں نظر آجاتا کہ صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں کوئی ہندوستانی ختم نبوت سے انکار کر دے گا تو یقیناً وہ علماءِ ہند سے پہلے مسلمانان عالم کو ایسے غدارِ اسلام سے متنبہ کر دیتے۔

_____ بجواب نہرو

قادیانی | علامہ موسیٰ جار اللہ نے اس مصرع کی وضاحت چاہی۔

ع ایں زجج بیگانہ کرد آں از جہاد

فرمایا، بہاء اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی۔ میرزا غلام احمد کے مخترع مذہب، اس کے اسباب و علل اور نتائج کی تفصیل بیان کی۔ اسی سال قادیانیت کے متعلق پہلا بیان دیا پیر کا دن تھا اور مئی کی چھ تاریخ۔

_____ عبدالرشید طارق ملفوظات

ختم نبوت | ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل، مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا

_____ علامہ اقبال کا خط بنام نیازی مطبوعہ طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۳۵ء ماخوذ از انوار اقبال

فرمایا: "الیوم اکملت لکم دینکم" کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ قادیانی اسلام کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں۔ ——— خطبہ تیس ملفوظات

قادیانیت | قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انہوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ قادیانی اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے (یعنی مسلمانوں سے انہیں الگ کر دے) اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں۔

——— اسٹیٹس مین کے نام خط مطبوعہ ۱۰ جون ۱۹۳۵ء

حضرت مدنیؒ کی شجاعت استقلال و بشارت

۱۹۲۱ء میں جبکہ سکولوں میں خدا سلامت رکھے جارج پنجم کے نغمے الاپے جا رہے تھے۔ حضرتِ مدنیؒ پر بغاوت کے الزام میں "خالق دینا ہال" کراچی میں مقدمہ چلایا گیا جس کا حکم سنائے جانے سے پہلے ایک گرامی نامہ میں یہ فرمایا۔

"میں اب تک بہت آرام میں ہوں، غالباً پرسوں حکم سنایا جائیگا، اگر مجھ پر یا دوسرے رفقاء پر کوئی سخت حکم ہو تو آپ لوگ ہرگز صدمہ نہ کریں اور نہ کوئی ایسی حرکت ظاہر ہو جس سے بے چینی یا قلق اور اضطراب ظاہر ہو بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ دشمنانِ اسلام یہ سمجھیں کہ ان لوگوں کو ذرا بھی پرواہ نہیں ہوئی اور نہ اپنے مطالبے سے ہٹے"۔

ہم ہر روز اپنے مقصد یعنی آزادی ہند اور دیگر مذہبی مقاصد کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ الحمد للہ! ملک اور قوم کا قدم نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، خداوند کریم مددگار ہے۔ ہم ضعیف ہیں مگر انشاء اللہ العزیز ہیکل کے کیڑے ہو کر گورنمنٹ کے موجودہ طریقہ اور جماعت کو وباء میں مبتلا کر کے ڈھائی گھڑی کی لگائیں گے بعون اللہ تعالیٰ۔

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں　　جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

بھائیو! گھبراؤ نہیں، مایوس مت ہو، ایک خدا پر بھروسہ کرو، وہ ہمارے ساتھ ہے کوشش کئے جاؤ، کامیابی دیکھو گے، خدا سے ڈرو، اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو اور نہ کسی سے جھگڑو، مجھکو خدا کے حوالے کرو۔ اگر اور کوئی عالم ہماری لیڈر پکڑا جائے تو کچھ پرواہ مت کرو، ہمارا خدا ہمارے اور تمہارے ساتھ ہے، وہ سب دیکھتا اور سنتا ہے۔ خداوندِ کریم آپ کی ہماری تمام امتِ محمدیہ کی مدد کرے گا۔ اللہم سب کو نیک عمل اور اخلاص کی توفیق دے آمین۔ میرا بہت بہت سلام سب حضرات واراکین وممبران اور دوستوں اور بزرگوں تک پہنچا دیں ——— والسلام ——— میں ہوں آپکا نیاز مند

حسین احمد غفرلہٗ ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء (کراچی)

قاضی افضل حق قریشی

ڈاکٹر اقبال اور علماء

علامہ اقبال دورِ حاضر کے نام نہاد دانشوروں کے برعکس علماء کا بے حد احترام کرتے تھے، علامہ کے نزدیک "علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں"۔ ——— حرفِ اقبال ص ۱۹۳

ایک بار سید نذیر نیازی کی اس بات پر کہ آپ نے اسلام کی عقلی تعبیر میں نفسِ انسانی یا کسی اور مابعد الطبیعی مسئلے حیات بعد الموت یا زمان و مکان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے علماء اسلام بظاہر ان سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا:

"یہ کہنا کہ علماء اسلام ان حقائق سے بے خبر تھے صحیح نہیں۔ وہ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں، ان کی نظر ہر بات پر تھی، وہ تہذیب و تمدن اور اجتماع و عمران کے مسائل سے غافل نہ تھے، نہ علم و حکمت اور مابعد الطبیعی افکار سے جس میں قرآن مجید نے ان کی رہنمائی کی۔ یہ انہیں کا کہنا تھا کہ قرآن مجید خلاصۂ کائنات ہے"۔ ——— اقبال کے حضور ص ۱۱۲

علامہ کے نزدیک "اسلام نام ہے علماءِ باعمل کی صحبت کا"۔

——— مکتوب بنام شبیر بخاری صحیفہ اکتوبر ۱۹۷۳ء ص ۲۴۰

تحریک خلافت اور ترک موالات میں علامہ جمعیۃ علمائے ہند کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا:

"ہم مذہب کو تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں اور علمائے کرام کو اپنا حَکَم سمجھتے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند جو فیصلہ کرے گی، وہی ہماری رائے ہے"۔ ——— اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۹۰

مدیر "زمیندار" کے نام ایک خط میں لکھا:

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالاتِ حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور بختہ کاران

سیاست ہی اس کے فیصلہ کے اہل ہیں اور مسندِ نشینانِ منبر کو ان معاملات سے کچھ سروکار نہیں وہ میری رائے ناقص میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر تعلیمات اسلام نے حیرت انگیز روشنی نہ ڈالی ہو۔" —————— اقبال اور انجمن حمایت اسلام صفحہ ۱۰۲

علامہ علماء کے انگریز دشمن کردار اور حریت پسندی سے خوش تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا:

"ارباب دیوبند ہوں یا علماء کی کوئی دوسری جماعت، میرے نزدیک ان کے جذبۂ آزادی ان کی انگریز دشمنی اور دین کے لئے غیرت و حمیت کی بڑی قدر ہے۔"

—————— اقبال کے حضور ص ۱۹۱

علامہ کے نزدیک برعظیم کے علماء دنیائے اسلام کی رہنمائی کے اہل تھے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو رہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے علماء اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوام عالم اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے، ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔" —————— اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۴۴، ۱۴۵

(۲)

برعظیم پاک و ہند میں علماء حق کا کردار ہمیشہ روشن اور مثالی رہا ہے ہماری ملی تاریخ میں مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمود حسنؒ کے نام دعوت و عزیمت کی علامت ہیں —— یہ سب برعظیم میں اسلامی سلطنت کے قیام اور اسلام کی سربلندی کے لئے کوشاں رہے۔ سر ولیم ہارٹن کے مطابق "مسلم ہندوستان میں جیسے مذہبی جذبات کام کرتے رہے جن میں برطانیہ اور ہندو کے خلاف برابر کی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ دوبارہ اسلامی حکومت قائم ہونے کا خواب دیکھتے رہے ان جذبات کو خفیہ انجمنیں مثلاً خدام کعبہ، دارالعلوم دیوبند ..... ہوا دیتی رہیں۔"

—————— انڈیا از نارتھ ولیرٹن ذنجبر ص ۱۵۵

دارالعلوم دیوبند کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تصنیف "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" میں لکھتے ہیں:

"دیوبند کا مدرسہ دارالعلوم اپنی تمام قدامت پسندی کے باوجود عملی سطح نظر رکھتا تھا اور اس نے اپنے کام سے کام رکھا۔ اس نے علی گڑھ پر سنگ باری نہیں کی۔ اگرچہ وہ سید احمد خان کی آراء اور ان کے افعال سے متفق نہیں ہو سکتا تھا۔ دیوبند میں علماء کا ایک گروہ ایسا تھا جو اتحاد اسلامی کا

شبلی یا ابوالکلام سے کم پُرجوش حامی نہیں تھا مگر اس گروہ نے اس خیال کو مقبول بنانے کے لئے تبلیغ و اشاعت کی مہم جاری نہیں کی، وہ مرتع کا منتظر رہا اور اس نے ترکی کے ارادے کے ذریعے باب عالی سے روابط پیدا کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔ دیوبند کے رہنماؤں اور باب عالی کے درمیان روابط کی تاریخ کے متعلق تفصیلات پوری طرح معلوم نہیں ہیں، کیونکہ ان کی نوعیت رازدارانہ تھی ان کے وجود کا انکشاف مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگرمیوں سے ہوا جو ہندوستان سے فرار ہو کر کابل چلے گئے اور وہاں سے پہلی عالمی جنگ کے دوران ترکوں کے لئے حمایت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے نتائج خواہ کچھ بھی ہوئے ہوں مگر ان علماء کے اس عقیدے کے مطابق کہ سلطان ترکی خلیفہ ہے اور جب وہ جنگ میں مشغول ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیئے یہ کم سے کم ایک جرأت مندانہ اقدام ضرور تھا انھوں نے ترکوں کے ساتھ روابط قائم کرنے کا فیصلہ اس کے بعد کیا تھا جبکہ ان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ برعظیم میں مسلمان دوبارہ اپنی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ جنگ سے قبل دس سال سے زیادہ کا عرصہ ایسا گزرا تھا جس میں انہیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ برطانیہ کی حکمت عملی دُنیائے اسلام کی آزادی کے خلاف ہے انہیں اس کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ حکمت عملی ہندوستان پر برطانوی تسلط کو تقویت پہنچانے کیلئے اختیار کی جا رہی ہے، یہ امران کے عقیدے کا جزو ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی سے دُنیائے اسلام پر یہ دباؤ ختم ہو جائیگا کیونکہ اس کے بعد اس کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی کہ برطانیہ اسلام کے ریگستانی علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس تجزیے میں کچھ سادگی تھی۔ یہ ایک حد تک ترکوں کی تبلیغ کا نظریہ تھا۔ تاہم تیل کی دریافت سے پہلے اس میں صداقت کا ایک عنصر موجود تھا، کیونکہ یہ ممالک برطانوی سلطنت کے مواصلات میں آڑے آتے تھے۔"

______ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" ص ۲۳۸ ۔ ۲۴۰

علامہ مرحوم دارالعلوم دیوبند اور اس کے کردار سے متاثر تھے۔ انہوں نے ایک بار کہا:

" دیوبند ایک ضرورت تھی، اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل۔ وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم ہے"

______ اقبال کے حضور ص ۲۹۳

صاحب زادہ آفتاب احمد خان کے نام "علوم اسلامیہ" کے متعلق ان کے نوٹ کے جواب میں لکھا:

" میری رائے ہے کہ دیوبند اور ندوہ کے لوگوں کی عربی علمیت ہماری دوسری یونیورسٹیوں

کے گروہ کو بیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے" ——— اقبال نامہ حصہ دوم ص۱۱۳

نیز " میں آپ کی اس تجویز سے پورے طور پر متفق ہوں کہ دیوبند اور لکھنؤ کے بہترین مواد کو بروئے کار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے" ——— اقبال نامہ حصہ دوم ص۱۰۱

اس پورے خط میں علوم اسلامیہ کا محور دیوبند اور لکھنؤ نظر آتے ہیں۔

مولانا قاری محمد طیب راوی ہیں کہ ایک بار کسی نے علامہ سے پوچھا کہ یہ دیوبندی کیا کوئی فرقہ ہے؟ کہا "نہیں، ہر معقول پسند دیندار کا نام دیوبندی ہے" ——— علماء دیوبند کا مسلک ص۵۵

(۳)

فی الحال قارئین کی توجہ میں چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ٹیپو کی شکست اور ایشیاء میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے بعد اسلامی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ مسلمانانِ ہند اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں، ترکی خلافت سے تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت "خدا، رسول اور تم میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو" میں الفاظ "تم میں سے" کا کیا مفہوم ہے۔ احادیث سے آمدِ مہدی کی جو پیشین گوئی کی جاتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف مسلمانانِ ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اس وقت اسلامی دنیا میں سرعت کے ساتھ تسلط حاصل کر رہی تھی ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔ مسلمان اربابِ سیاست جن کی آنکھیں واقعات پر جمی ہوئی تھیں علماء کے ایک طبقہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ دینیاتی استدلال کا ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو صورتحال کے مناسب ہو۔

——— حرف اقبال ص۱۴۲، ۱۴۰

مذکورہ بالا خیالات کا اظہار علامہ اقبال مرحوم نے اپنے مقالہ "اسلام اور احمدیت" میں فرمایا ہے۔

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ علماء کے اسی گروہ نے فقہی تعبیروں اور تاویلوں کے سہارے برعظیم میں برطانوی سلطنت کو استحکام بخشا۔ جب ان کے ہم وطن سکھوں اور انگریزوں کے خلاف سلطنتِ اسلامیہ کے احیاء کیلئے برسرِ پیکار تھے وہ ان کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ جذبۂ جہاد کو کچلنے کیلئے حکمرانوں کو دہائی دی گئی کہ یہ جہاد کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں اور "ہندوستان دار الاسلام" کے فتوے لکھے اور لکھوائے گئے۔ مولوی احمد رضا خان[۱] نے بھی ہندوستان کو دار الاسلام ثابت کرنے کے لئے مستقل ایک رسالہ بنام "اعلام الاعلام بان

[۱] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

ہندوستان دارالاسلام " لکھا۔

روحِ جہاد کو کچلنے کے بعد " خلافت " مسلمانانِ عالم کا ایک مقدس ادارہ رہا تھا ـــــ انگریزوں کو اس کے اثر اور اہمیت کا احساس تھا یہی وجہ تھی کہ ۱۷۹۹ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے سلطان ترکی کو درخواست کی گئی کہ وہ سلطان ٹیپو کو سمجھائیں کہ وہ نپولین کی امداد نہ کرے اور بعد میں ۱۸۵۷ء میں انھوں نے پھر سلطان ترکی سے استدعا کی کہ وہ مسلمانوں کو ہدایت کریں کہ " غدر " میں شرکت سے باز رہیں۔ یار لوگوں نے اس عمارت کو بھی ڈھانے کی ٹھان لی اور " الائمۃ من القریش " کی خود ساختہ تاویلیں شروع کر دیں۔ " دوام العیش فی الائمۃ من القریش " قسم کی کتابیں لکھیں اور جب مغربی شہنشاہیت نے خلافتِ عثمانیہ کو تباہ کر دیا تو اسی قبیل کے کچھ بزرگوں نے جلیانوالہ باغ امرتسر کے قتلِ عام کے ذمہ دار اور بدنام زمانہ جنرل اوڈوائر کو مبارکباد دی اور ایک تقریب میں اسے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے حکمرانوں کو یقین دلایا کہ :

" ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بیشمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جانثار رہیں گے " ـــــ (تکفیری افسانے ص ۱۴۲، کاروان احرار)

اسی پر بس نہیں۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلمانانِ ہند نے جب از سرِ نو برِ عظیم کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی جدوجہد کا آغاز کیا تو یہ گروہ پھر سرگرمِ عمل ہوا۔ ہماری ملی تاریخ کا وہ کون سا اہم نام جوان کے ناوکِ تکفیر سے محفوظ رہا ہو۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، سرسید، شبلی، حالی، ظفر علی خان، ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، محمد علی جوہر کے بعد اقبال اور قائدِ اعظم بھی ان کی دست درازیوں سے نہ بچ سکے۔

ع　ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ایسے کفریہ فتاویٰ سے ہزاروں صفحات سیاہ کئے گئے۔ تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل کتب و رسائل ملاحظہ کیجئے:

(۱) " قہر القادر علی الکفار اللیاڈر " ملقب بہ لیڈروں کی سیاہ کاریاں۔ مصنفہ مولوی محمد طیب قادری برکاتی۔ ناشل

لے مولوی احمد رضا خاں کے پردادا حافظ کاظم علی خان بریلوی نے انگریزی حکومت کی پولیٹیکل خدمات انجام دیں۔
ـــــ (بحوالہ حیات اعلیٰ حضرت مصنفہ ظفرالدین بہاری ص۲)

اور خود مولوی احمد رضا خاں کے متعلق فرانسس رابنسن لکھتا ہے :

" ان کا معمول کا طریقۂ کار حکومت کی حمایت تھی جنگِ عظیم اول اور تحریکِ خلافت میں انھوں نے مسلسل حکومت کی حمایت جاری رکھی اور ۱۹۲۱ء میں بریلی میں ترکِ موالات کے مخالف علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ ان کا عوام پر خاطر خواہ اثر تھا لیکن مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کی حمایت حاصل نہ تھی " ـــــ بحوالہ سیپریٹزم امنگ انڈین مسلمز ص۴۴۲ کیمبرج یونیورسٹی پریس ۱۹۷۴ء

مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور۔ مطبوعہ مطبع سلیمانی بمبئی۔ بار دوم ۱۳۵۹ھ۔

(۲) "مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری" مصنف مولوی اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی۔ شائع کردہ دفتر جماعت اہل سنت۔ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ۔ مطبوعہ ۱۳۲۹ھ

(۳) "احکام نوریہ شرعیہ بر مسلم لیگ" : مصنف مولوی حشمت علی خان۔ حسب ارشاد جماعت اہل سنت مارہرہ مطبوعہ مطبع سلیمانی بمبئی مطبوعہ ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء

(۴) "الجوابات السنیہ علی زہاء السوالات اللیگیہ" :

مجموعہ فتاویٰ ● مولوی اولاد رسول محمد میاں سجادہ نشین مارہرہ ● حکیم سید آل مصطفیٰ قادری برکاتی مارہروی

● مولوی حشمت علی خان ● مولوی ابوالبرکات سید احمد قادری ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور

(۵) "تجانب اہل سنت"

مصنف مولوی محمد طیب قادری برکاتی۔ فاضل مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور مطبوعہ بریلی ۱۹۰۰ء

(۶) الدلائل القاہرہ علی الکفرۃ النیاشرہ

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زعماء پر مولوی احمد رضا خاں کا فتویٰ تکفیر۔ جو بعد میں مسلم لیگ پر بھی چسپاں کر دیا گیا۔ اس فتوے کی تائید پر مولوی نعیم الدین مرادآبادی، مولوی دیدار علی، مولوی عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (والد مولانا شاہ احمد نورانی) سمیت اکثر بریلی علماء کے دستخط ثبت ہیں۔

(۷) القسورۃ علی ادوار الحمر الکفرۃ ملقب بلقب تاریخی ظفر علی رمۃ من کفر

مؤلفہ : مولوی محمد مصطفیٰ رضا خان　مرتبہ : مولوی ابوالبرکات سید احمد قادری۔

یہ چند نام مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں ورنہ

"سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے"

علامہ اقبال کے متعلق اُن کی گوہر افشانیوں کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں :

عبدالمجید سالک "ذکر اقبال" میں لکھتے ہیں :۔

"مولانا ابو محمد دیدار علی[1] خطیب مسجد وزیر خاں نے نہ صرف اقبال کی تکفیر کی بلکہ تمام مسلمانوں کو انتباہ کیا کہ وہ ان سے ملنا جلنا ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔" (ذکر اقبال ص ۱۲۹)

---

[1] مولوی دیدار علی الوَر کے رہنے والے تھے، اسی مناسبت سے حضرت علامہ نے الور پر یہ اشعار لکھے جو باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

اس فتوے کے ایک اور جز میں ابوالطاہر محمد طیب صدیقی قادری برکاتی قاسمی دانا پوری ناظم مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور ان کی تصنیف "نجات اہل السنۃ عن اہل الفتنۃ" میں بسلسلۂ اقبال مرحوم کا برکی تکفیر کی گئی ہے وہاں علامہ مرحوم پر یوں بھی دشنام طرازی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"بد تر زبان سنیت ہے یا زبان ابلیسیت" ص ۲۳۹

"ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ابلیس بول رہا ہے:" ص ۲۴۰

"مسلمانان اہل سنت خود ہی انصاف کریں کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دین اسلام سے کیا تعلق ہے:" ص ۲۴۱

فتاویٰ کے اس مجموعے پر بڑے بڑے نامور علمائے کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ ذرا ان کے اسماء گرامی اور القابات ملاحظہ ہوں:-

(۱) حضرت عظیم البرکت تاج العلماء سراج العرفاء وارث الاکابر الاسیاد بالاستحقاق والانفراد حامی السنن ماحی الفتن مولانا مولوی حافظ مفتی سید شاہ اولاد رسول محمد میاں صاحب قبلہ قادری برکاتی قاسمی مارہروی دامت برکاتہم القدسیہ مسند نشین سجادۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ سرکار کلاں۔ مارہرہ مطہرہ ضلع ایٹہ۔ ناظم اعلیٰ جماعت مرکزیہ عالیہ اہلسنت مارہرہ۔

(۲) حضرت سراپا برکت ناصر سنیت کاسر لامذہبیت طبیب امراض روحانی معالج اسقام جسمانی گل گلشن آل عبا گلبن گلستان اہل کسا سید العلماء سند الحکماء مولانا مولوی حافظ قاری حکیم سید شاہ آل مصطفےٰ قادری برکاتی قاسمی دامت فیوضہم المبارکہ سرکار کلاں مارہرہ مطہرہ ضلع ایٹہ۔

(۳) حضرت بابرکت ضیائے دین وملت حامئ اسلام وسنیت ماحئ بد مذہبی ولامذہبیت مولانا مولوی حاجی مفتی شاہ ابوالمساکین محمد ضیاء الدین صاحب قادری رضوی ضیائی دام ظلہم الاقدس مفتئ شہر پیلی بھیت۔

(۴) شیر بیشۂ سنت ناصر الاسلام مظہر اعلیحضرت مولانا مولوی حافظ قاری مفتی شاہ ابوالفتح عبیدالرضا محمد حشمت علی خاں قادری برکاتی رضوی مجددی لکھنوی دام ظلہم العالی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ | "روزگار فقیر" جلد دوم میں شامل ہیں۔

گر فلک در آور اندازد ترا ! | اے کہ می داری تمیز خوب وزشت
گویت در معرضۂ برجستۂ | آنکہ بر قرطاس دل باید نوشت
آدمیت در زمین او بجو ! | آسماں ایں دانہ در انور نکشت
گشت اگر ز آب وہوا خرم است | زانکہ خاکش را خرے آمد سرشت

ص ۲۳۲، ۲۳۰

(۵) اسد السنۃ سیف الملۃ وصاف الحبیب حضرت مولانا مولوی حافظ قاری مفتی شاہ ابوالظفر محب الرضا محبوب علی خاں صاحب قادری برکاتی رضوی لکھنوی زید مجدہم العالی (مفتی دارالافتاء عالیہ اسلامیہ خطیب جامع مسجد ریاست پٹیالہ پنجاب)۔
ایک اور صاحب مولوی بدرالدین احمد قادری رضوی (صدرالمدرسین دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف) نے مولوی احمد رضا خان کی سوانح میں ایک عنوان "امام نہاد مفکر اسلام" باندھا ہے اور علامہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

"ڈاکٹر سر اقبال نے بھی اپنی شاعری کے بل بوتے پر اسلام کو کچھ کم دھکا نہیں پہنچایا ہے۔۔۔۔
انہیں باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود ساختہ مفکر اسلام نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں الحاد، دہریت، بے دینی و نیچریت کا کتنا زہر بھر دیا ہوگا۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔۔۔
نیچریوں کا شور ہے کہ سر محمد اقبال ترجمان حقیقت اور مفکر اسلام ہیں۔ ایشیاء کے شعراء ان کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں۔ یورپ کے فلاسفران کا علمی لوہا تسلیم کر چکے ہیں لیکن میری طرف سے گذارش ہے کہ

ع "یہ سبھی کچھ ہیں بتاؤ کہ مسلمان بھی ہیں" (ص ۲ تا ص ۲۲)

علامہ علماء و مشائخ کے اسی گروہ سے بددل تھے اور بایں ہمہ اور اسے طبقے کے مفتیوں نے تکفیریوں کا روپ دھار کر اُمت مسلمہ میں تفرقہ اندازی کی جس پر علامہ مرحوم کو یہ لکھنا پڑا۔

ع دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

علامہ مرحوم کا یہ طنزیہ شعر بھی اسی گروہ کی نذر ہے ۔

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کیلئے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

سرکش پرشاد شاد کے نام حافظ جماعت علی شاہ صاحب کے متعلق لکھا۔

"حافظ جماعت علی شاہ صاحب کو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں، وہ ہمارے ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں، میں ان کو سلسلہ پیری مریدی کے آغاز سے پہلے بھی جانتا تھا اور اب بھی ان کے حالات سے ناواقف نہیں ہوں۔ ایک دفعہ بنگلور میں اُن کی وجہ سے بہت فساد ہونے کو تھا۔ ان کا وجود مسلمانوں میں اختلاف کا باعث ہوا۔ وہاں کے مسلمانوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں یہ تقاضا کیا گیا تھا کہ میں ان کے حالات بلا رُو رعایت لکھوں تاکہ فساد رفع ہوں۔ میں نے جو کچھ مجھے معلوم تھا لکھ دیا۔ الحمدللہ کہ وہ فساد ختم

ہو گیا اور حافظ صاحب مع اپنے مریدوں کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ بڑے
ہوشیار آدمی ہیں اور پیری مریدی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ سب استغنائی ان لوگوں کا تمام
مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں جس طرح وہ سرکار سے
پیش آتے ہیں اس طرزِ عمل کا مفہوم کوئی سمجھتا ہو۔ ان کے ہاں جانے کی ضرورت نہ تھی۔
آپ ان کی سمجھ اور گرفت سے بالاتر ہیں" "اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۷۹-۱۸۰"
ایسے ہی علماء کے متعلق علامہ مرحوم نے فرمایا تھا:

دینِ حق از کافری رسوا تر است — زانکہ مُلّا مومن کافر گر است
از شکر فیہائے آں قرآں فروش — دیدہ اُم روح الامین را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزدِ او اُمّ الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد!
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

جاوید نامہ، کلیاتِ اقبال فارسی ص ۲۹۴

"یہ وضاحت ضروری ہے کہ بریلوی مکتبِ فکر کے مولویوں کے سوا برِ عظیم پاک و ہند کے کسی
بھی عالم نے تکفیر نہیں کی۔"

مردِ مجاہد

ہر گام پہ طوفان ٹکرایا ہر گام پہ بجلی لہرائی
قدموں کے حسین احمدؒ کے مگر اک بار نہ جنبش تک آئی
یہ مردِ مجاہد کود گیا گرداب بلا کے سینے میں
لہروں کے سروں پر دوڑ گیا جب کشتئ ملت تھرائی

—— شمس صدیقی ——

زبان زدِ خاص وعوام تھے۔ اس علمی ودینی ادارہ کی کشش نے مولانا کو ۱۳۰۸ھ میں سولہ، سترہ برس کی عمر میں دیوبند کھینچ لیا۔
دیوبند میں مولانا انور شاہؒ ایک مفلوک الحال اور مفلس طالب علم کی حیثیت سے مولانا مشیت اللہ صاحبؒ بجنوری کے ساتھ رہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ہمت نہ ہاری اور نہایت صبر وتحمل سے تحصیل علم میں مصروف رہے، اور جب بقول مولانا محمد الدین فوقؔ اہل دیوبند کو گدڑی کے اس لعل کی بابت معلوم ہوا کہ یہ سنگریزہ نہیں بلکہ لعل بدخشاں ہے تو وہ ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھنے لگے۔ آپ نے چار برس کی باقاعدہ تعلیم اور مشاہیر مشائخ عصر کی بابرکت صحبتوں کے طفیل نمایاں عزت وشہرت کے ساتھ سندِ فراغ حاصل کی اسوقت آپ کی عمر صرف بیس یا اکیس سال تھی۔ دارالعلوم دیوبند میں جن علماء وفضلاء نے آپ کی دینی وعلمی اور عملی تربیت میں حصہ لیا ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہے۔

- شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی (اسیر مالٹا)
- مولانا حافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ
- مولانا محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی۔
- مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ ہزاروی الدیوبندی۔
- مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی
- مولانا عبد العلی صاحب محدث
- مولانا حکیم محمد حسین صاحب وغیرہم اکابر۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آپ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے شمع رشد وہدایت روشن کر رکھی تھی۔ یہاں سے آپ نے حدیث کی سند حاصل کی اور دہلی کے مدرسہ امینیہ میں جو ان کے دوست مولانا امین الدین صاحب نے قائم کیا تھا، مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے اور بارہ برس تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔
دہلی سے کشمیر واپس آئے سینکڑوں طالب علم آپ کی شاگردی میں رہے اور ہزاروں نے ہدایت پائی جس کے باعث آپ عوام الناس میں نہایت ہی عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ ویسے بھی آپ کی علمی ومذہبی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی مگر طبیعت میں درویشی اور قلندری بدستور تھی۔
۱۳۲۲ھ میں آپ بارہ مولا (کشمیر) کے مخیر رئیس خواجہ عبد الصمد ککرو مرحوم (والد محترم خواجہ حبیب اللہ ککرو وخواجہ عنایت اللہ ککرو) کی رفاقت میں بلاد اسلامیہ کی سیر کو گئے اور مصر، حجاز، طرابلس اور بصرہ کی سیاحت کی وہاں کے علماء وفضلاء آپکی ذہانت وفطانت اور علم ومطالعہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس سفر کے دوران میں آپ نے اسلامی ملکوں کے بعض مستند عالموں سے بھی دینی علوم پر سندات حاصل کیں۔
سید اسد اللہ شاہ دوارکی راوی ہیں کہ جب آپ مصر میں پہنچے تو آپ نے وہاں ایک نادر دینی کتاب دیکھی جس کا

دنیا بھر میں صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لائبریرین سے کتاب پڑھنے کی درخواست کی جو اس نے منظور کر لی۔ آپ نے کتاب کو بغور پڑھا اور پھر اپنی بے پناہ قوت حافظہ اور یاد داشت کی بنا پر تحریر کر لیا۔ اصل کتاب سے جب اس کا متن ملایا گیا تو اس میں ایک غلطی بھی نہ تھی۔

کشمیر واپس آکر آپ نے اپنے رفیق خواجہ عبدالصمد گرو مرحوم کی تحریک اور خواہش پر بارہمولہ میں "مدرسہ فیض عام" کی بنیاد رکھی اور تین سال وہاں درس دیا۔ مولانا مرحوم کی ہمیشہ یہ خواہش تھی اور کوشش رہی کہ کشمیری خواب غفلت سے بیدار ہوں۔ انھوں نے اہل وطن کو درس دین بھی دیا اور درس حریت بھی، مگر حالات بتاتے ہیں کہ انھیں اپنے ہم وطنوں سے مایوسی ہوئی اور پھر دیوبند واپس تشریف لے گئے۔ اس ضمن میں مولانا محمد دین فوق لکھتے ہیں:۔

"جب میں انھیں کشمیر میں رہنے اور دیوبند میں جانے سے روکا تو فرمایا۔ کوئی ایسا آدمی پیدا کیجئے جو ہماری باتیں سن سکے، ہمیں خدمت وطن سے تو کوئی انکار نہیں"۔[1]

اپنی قابلیت اور عبادت گذاری کے سبب مولانا نے جلد ہی اپنا مقام علماء کرام کی صف اول میں پیدا کر لیا۔ ان کے ہمعصران کی دینی فضیلت اور علمی صلاحیت کے اتنے قائل ہو گئے کہ کسی نے "بخاریٔ وقت" کے نام سے پکارا اور کسی نے "ابوحنیفۂ ثانی" کا لقب دیا۔ اس سلسلہ میں ان کے ایک ہم عصر نامور محدث علامہ زاہد بن الحسن کی شہادت یہ ہے:۔

"علامہ ابن الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد اس شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متن حدیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ شاہ صاحب اور ابن ہمام کے درمیان کوئی معمولی وقفہ نہیں"۔[2]

مولانا مرحوم نہایت ہی خوبرو اور وجیہہ تھے۔ قوت حافظہ بے پناہ تھی، شخصیت جاذب نظر تھی اور پرکشش بھی۔ جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظر ان کے چہرے سے نہ اٹھاتا۔ باتیں بہت کم کرتے تھے لیکن ہر بات سے وقار ٹپکتا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے، کھانے پینے کے معاملے میں جو چیز زیادہ پسند آتی اسے خوب سیر ہو کر کھاتے تھے۔ طبیعت شگفتہ تھی اور جان محفل تھے۔ اپنی کم گوئی کے باوجود بڑی پیاری اور پرلطف باتیں کرتے تھے۔ ایک بار سبق پڑھا رہے تھے کہ کہنے لگے "چلو اپنے گھر کا راستہ لو، بھائی شمس الدین ہی چلے گئے ہیں"۔ پڑھنے والوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کون شمس الدین؟ تو ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے کہا "جانتے نہیں، وہ بھائی شمس الدین رخصت ہو رہے ہیں۔ اندھیرے میں پڑھ کر کیا کرو گے، اس میں تو لطف نہیں آئے گا"۔

---

[1] مشاہیر کشمیر　[2] مقدمہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ——— از شیخ عبدالفتاح ص ۳۶

امام الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ آپ کی دینداری، علمی فضیلت اور صالح سیرت سے بخوبی آگاہ تھے اور اکثر آپ کے بارہ میں سوچا کرتے تھے۔ آپ کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ اگر کوئی عالم دین ان کے بعد ان کے منصب اعلیٰ کا اہل و مستحق ہو سکتا ہے تو وہ مولانا انور شاہؒ ہی ہیں اس لئے چاہتے تھے کہ مولانا انور شاہؒ مستقل طور پر ہی دیوبند میں بس جائیں۔ تحصیل علم اور تبلیغ دین میں مولانا مرحوم اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کر چکے تھے اور اس کام میں ایسے مستغرق تھے کہ ۴۴ برس تک شادی نہ کی۔ چنانچہ اس کارِ خیر کو حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے سر انجام دیا اور ان کی مساعی جمیلہ سے گنگوہ کے سادات خاندان میں شادی ہو گئی۔ اسوقت تک آپ بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ثناء الحق ایم۔ اے لکھتے ہیں:۔

"منتظمین نے بہت چاہا کہ آپ کم از کم اپنی بنیادی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے ہی کچھ مشاہرہ قبول فرمالیں مگر آپ کسی طرح راضی نہ ہوئے اور بلا معاوضہ ہی کام کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ البتہ مہتمم دارالعلوم دیوبند حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بے حد اصرار پر آپ نے دونوں وقت ان کے ساتھ طعام میں شرکت کرنا قبول کر لیا اور دارالعلوم کے احاطہ میں ایک مختصر سا حجرہ رہائش کے لئے مل گیا۔ اس میں یہ شیدائی علم ایک طویل عرصہ تک خود بھی علم کے اتھاہ سمندر میں غواصی کرتا رہا اور صدہا تشنگان کی پیاس بجھاتا رہا"۔

۱۳۲۲ھ میں جب حضرت مولانا محمود الحسن حجاز تشریف لے گئے تو صحیح بخاری کا درس آپ ہی کے سپرد ہوا اور آپ نے اس کام کو بہ طریق احسن سر انجام دیا۔ آخری عمر تک صرف ساٹھ روپیہ مہینہ تنخواہ لیتے رہے۔

"سرگزشت فوق" (غیر مطبوعہ) جو محمد عبداللہ قریشی کی تحویل میں ہے) میں لکھا ہے کہ ان کو "سید" نہ لکھا جائے فرمایا کرتے تھے کہ میں "سید" نہیں ہوں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ اردو زبان کے مشہور شاعر ادیب اور ڈرامہ نگار آغا محمد شاہ حشر بھی آپ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اسی طرح کشمیر کے مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد سعید مسعودی کا سلسلۂ نسب بھی مولانا انور شاہ کاشمیری کے بزرگوں سے ملتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے بھی اپنے آپ کو "سید" نہیں کہا۔ مولانا انور شاہ کو اہلِ جموں و کشمیر سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔ ایک بار آپ نے کشمیریوں کے ایک وفد کی قیادت بھی فرمائی تھی۔ جو نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ کے پاس گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے نواب مرحوم کی خدمت میں بزبانِ عربی جو سپاسنامہ بڑھا وہ تاریخ، سیاست اور زبان کا اعلیٰ اور نادر نمونہ مانا جاتا ہے۔

۱۳۴۱ھ بمطابق ۱۹۲۲ء آپ اپنے والد ماجد و دیگر اہلِ کنبہ سے ملاقات کی غرض سے کشمیر گئے اور مختلف مقامات میں اپنے مواعظ سے لوگوں کو مستفیض فرمایا۔ آپ کے دوسرے چاروں بھائی کشمیر میں دین اسلام کے مبلغ رہے اور انہوں نے بھی تازیست درس و تدریس کا پیشہ اختیار رکھا۔ آپ کے ایک فرزند دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں ان کا اسم گرامی ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر اور وہ دارالعلوم کے رسالہ کے مدیر ہیں۔

مولانا انور شاہؒ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کی علمی و دینی عظمت کا اعتراف ان کے ہم عصروں نے بھی کیا ہے اور غیر ملکی مشاہیر دین و ملت نے بھی۔ اس ضمن میں علامہ رشید رضا مدیرِ "المنار" مصر نے لکھا ہے کہ جب میں دارالعلوم دیوبند میں آیا تو مولانا انور شاہ کی "مسلک حنفیہ اور اصول اساسی" پر عربی زبان میں مدلّل اور جامع تقریر سن کر بے حد متاثر ہوا اور میری زبان سے بار بار یہ جملے نکلتے تھے کہ بخدا میں نے اس مرد کی مانند کسی کو نہیں دیکھا۔ علامہ رشید رضا جو شافعی المذہب تھے مولانا کی تقریر اور دارالعلوم کے نصاب سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور جاتی دفعہ یہ کہہ گئے کہ "اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس جاتا۔ اس دارالعلوم نے بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں بھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبیہ اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں۔"

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے فرمایا۔

"ایک انگریز کا قول تھا کہ اسلام کی حقانیت کا اس لئے قائل ہوا کہ غزالیؒ جیسا مدبر اسلام کو حق سمجھتا ہے میں کہتا ہوں جب انور شاہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے تو میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی ایک بڑی دلیل ہے۔"

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"اگر ہماری آنکھوں نے شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا تو ہمیں یقین ہے کہ شاہ صاحب کی آنکھوں نے بھی شاہ صاحب کا مثل نہیں دیکھا، وہ امام ابوالحسن کی زبان ترجمان ہیں اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور حافظ ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے تو میں کہدوں گا کہ میں نے انور شاہ کی ذات میں سب کو دیکھا ہے۔"[1]

ایک اور مقام پر علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں۔

"نہ تو دنیا کی آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود انھوں نے اپنے کسی ثانی اور مماثل کو دیکھا۔"

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:۔

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گرانقدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر، قوتِ حافظہ میں اس عہد میں بے مثال تھے علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس علوم و آداب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔ مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر

---

[1] فتح الملہم جلد اوّل صفحہ ۳۳۵

مثال تھے ان کو زمرہ کتاب خانہ کہا بجا ہے۔ شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے مطالعے سے بچی ہو۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:۔

آپ کے یہاں ردِّ قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے اس سلسلے میں کئی معرکہ آراء کتابیں بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لاکر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرماکر دعائیں دیتے تھے تقریباً ۱۳۲۷ھ میں آپ نے دارالعلوم میں درس کا آغاز فرمایا، ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔ اس دوران میں تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دَورِ صدر مدرسی میں ۸۰۹ طلبا نے درسِ حدیث لیا اور اس فنِ پاک کو تقریراً و تحریراً اور درساً و تدریساً دُور دُور تک پھیلایا[1]

علامہ اقبالؒ سے تعلقات

علامہ اقبال کو حضرت انور شاہ کشمیری سے بہت عقیدت و اِرادت تھی اور اکثر دینی اُمور میں آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے بلکہ کئی موقعوں پر علامہ اقبال نے مولانا انور شاہ کی علمی، دینی اور فقہی قابلیت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ ان سے رہبری اور رہنمائی بھی حاصل کی۔

مولانا عبدالصمد صارم لکھتے ہیں:۔

"ڈاکٹر اقبال مرحوم خود بڑے پائے کے فلسفی تھے، فلسفہ قدیم و جدید پر ان کی یکساں نظر تھی۔ علوم جدیدہ میں ان کو کمال حاصل تھا لیکن وہ بھی شاہ صاحب کی نگاہِ التفات کے خواستگاروں میں سے تھے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے شاہ صاحب سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور اس کا اعتراف انھوں نے خود بھی کیا ہے"[2]

مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی اپنے ایک مضمون "دیوبند کی عہد ساز شخصیتیں" میں لکھتے ہیں:۔

"انہی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا "اسوقت روئے زمین پر انور شاہ سے بڑا کوئی عالم نہیں"۔

علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ مرحوم کے تعلقات کا باقاعدہ آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر چغتائی لکھتے ہیں:۔

ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیۃ العلماءِ ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے اس کے روحِ رواں مولانا عبدالقادر قصوری تھے اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلا ہال میں منعقد ہوا۔ راقم نے اتنے علماءِ دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا اس جلسہ کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کا افتتاح مولانا قاری طاہر دیوبندی کی

---

[1] دارالعلوم دیوبند، فروری ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۱　　[2] سیرت انور شاہ کاشمیریؒ، صفحہ ۴۰

تلاوت سے ہوا تھا اور تحریک صدارت کی تائید میں کئی علماء نے تقریریں کی تھیں۔ مگر وہ تقریر جو مولانا مرحوم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا فاخر کانپوری نے کی تھی شاہکار تھیں۔ خطبہ صدارت کا کچھ حصہ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود، کچھ حصہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اور باقی مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا۔ اس جلسہ میں اول مرتبہ میں نے علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کا تعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد اقبال اور مولانا انور شاہ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تاکہ وہ خود اور اہل لاہور اس سے استفادہ کر سکیں۔

اقبال کے نزدیک لاہور میں ایک متنفس بھی ضروریات اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب علمی طور پر بانجھ تھا۔ اکبرالٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں، یہاں انجمن، کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی"

ایسے میں اقبالؒ کی نظر انتخاب برصغیر پاک و ہند میں دو شخصیتوں پر پڑی جنہیں لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی جا سکے۔ ایک سید سلیمان ندوی اور دوسری مولانا انور شاہ کاشمیریؒ لیکن بدقسمتی سے دونوں بزرگ لاہور نہ آسکے [1]

اس ضمن میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ لاہور تشریف لائے وہ راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں میں پیر عبدالغفار شاہ (م ۲ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ) کے ہاں مہمان تھے۔ ان کی آمد سے پہلے علامہ اقبالؒ نے انجمن اسلامیہ اور انجمن حمایت الاسلام سے معاملہ فہمی کر لی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علوم دینِ اسلام کے سربراہ ہوں گے"[2]

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ جب مارچ ۱۹۲۵ء میں "انجمن خدام الدین" کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے تو علامہ اقبال نے ۱۹۲۵ء ۱۳ مارچ کو انہیں حسب ذیل خط لکھا۔

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصوّر کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

---

[1] دارالعلوم، فروری ۱۹۷۶ء

[2] چٹان ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء

صاحب، قبلہ عثمانی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپکو قیامگاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیجدی جائے گی۔

"اقبال"

اس دعوت میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی شریک تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ نے ۱۹۲۶ء میں دار العلوم دیوبند سے استعفیٰ دیدیا۔ ان کے استعفیٰ کے پس منظر کو عبد الصمد صارم یوں بیان کرتے ہیں ۱۔

۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے قید ہو جانے کے بعد شاہ صاحب کو دار العلوم صدر مدرس مقرر کیا۔ دار العلوم کی انتظامیہ نے بہت سے اصلاحی کام کئے لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو مزید اصطلاحات کے خواہاں تھے ان لوگوں میں علامہ شبیر احمد عثمانی کے علاوہ خود شاہ صاحب بھی شامل تھے۔ یہ تحریک اصطلاحات انتظامیہ کو منظور نہ تھی چنانچہ جب شاہ صاحب نے انتظامیہ کی یہ ہٹ دھرمی دیکھی تو صدر مدرس کے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا جو انتظامیہ نے منظور کر لیا۔ اور اس کے بعد شاہ صاحبؒ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے۔

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ شاہ صاحب کا استعفیٰ دینا ٹھیک تھا یا انتظامیہ کا استعفیٰ منظور کرنا بحث اس سے ہے کہ جب شاہ صاحب نے انتظامیہ کی ہٹ دھرمی کو غلط سمجھا تو انہوں نے دار العلوم کی صدر مدرسی سے (جو ایک بہت بڑا قابلِ عزت عہدہ ہے) بھی استعفیٰ دینے سے دریغ نہ کیا۔ اس سے آپ کی خودداری کا بخوبی پتہ چلتا ہے

جہاں تک حضرت مولانا انور شاہؒ کے استعفیٰ" اور علامہ اقبال کے انہیں لاہور بلانے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں :-

دار العلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاذ نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دیا تو یہ خبر اخبارات میں چھپی۔ اس کے چند روز بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپکا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو، میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں! میں نے تعجب سے عرض کیا۔

● کیا آپ کو دار العلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا، کیوں نہیں، مگر دار العلوم کو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لئے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اسکو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی۔

---

۱ سیرت انور شاہ کشمیریؒ صفحہ ۲۰

کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو۔ جن کو دُنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی و معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کام کے لئے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اسوقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا مسائل کیا ہیں اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے۔ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا۔ اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے، یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اسطرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی۔"

مولانا حافظ عبدالرشید صاحب ارشد (مصنف بیس بڑے مسلمان) حضرت مولانا عبدالحنان ہزاروی کی زبانی لکھتے ہیں:۔

"جب علامہ انور شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دیدیا، میں ان دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب نہ آیا جس پر ڈاکٹر صاحبؒ نے مجھے دیوبند بھیجا کہ تم جاکر زبانی عرض کرو۔ میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کرکے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا۔ افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا۔ اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا ہوں[1]

علامہ اقبالؒ اور مولانا سید انور شاہ میں باقاعدہ خط و کتابت بھی ہوتی رہی ہے، ظاہر ہے کہ یہ خط و کتابت دینی امور کے بارے میں ہی ہوتی ہوگی۔ اس ضمن میں قاری محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:۔

"اقبالؒ کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پُر آتے تھے اور حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے تھے۔"

علامہ اقبالؒ شاہ صاحبؒ کی کتابوں کو نہایت دلچسپی سے اور غور و فکر سے پڑھتے تھے ادھر شاہ صاحبؒ کی جب کوئی نئی تصنیف چھپ کر آتی تو وہ بھی علامہ اقبال کے پاس بھیجتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:۔

"شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت استاذ کا ایک منظوم رسالہ "حدوث عالم" کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اس کا ایک نسخہ حضرت استاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفہ ارسال فرمایا۔ ایک صحبت

---

[1] چٹان لاہور، جنوری ۱۹۷۵ء ، الرشید دارالعلوم دیوبند نمبر۔

میں فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ قال الرسولؐ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو ایک درجہ درک اور بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے مولانا انور شاہ کی علمی اور دینی بصیرت کو بے حد سراہا اور ان سے کئی امور پر رہنمائی بھی حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اورنٹیل کانفرنس لاہور کے شعبہ عربی و فارسی کے صدارتی خطبہ میں لکھا۔

"لیکن جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ امکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لاتسبّوا الدھر لان اللہ ھو الدھر میں دہر (بمعنی TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جیّد ترین محدثین وقت میں سے ہیں۔ ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی۔

علامہ اقبالؒ اور مولانا انور شاہؒ کی آخری ملاقات اگست ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا انور شاہؒ "مقدمہ بہاولپور" کے سلسلہ میں بہاولپور جا رہے تھے اس سفر میں انھوں نے دو روز لاہور میں قیام کیا۔ ان ایام میں مولانا انور شاہؒ جامع مسجد آسٹریلیا میں صبح کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے تھے۔ علامہ اقبال اس موقع پر موجود ہوتے تھے۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ ڈابھیل میں بیمار ہو کر دیوبند چلے گئے۔ یہاں ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۱ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ اور اس طرح

دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے — فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

برکت علی اسلامیہ ہال لاہور کے تعزیتی جلسے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

"اسلام کی اِدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے"

آپ نے اپنی تقریر کا اختتام اس شعر پر کیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبالؒ اور مولانا انور شاہؒ کے دینی عقائد میں یگانگت تھی اور طبیعتیں بھی آپس میں ملتی تھیں۔ سیرت انور شاہؒ اور سوانح سید انور شاہؒ کے مطالعہ سے جو بات شاہ صاحب کی سیرت و کردار کے بارے میں اجاگر ہوتی ہیں وہ ان کے مطالعہ سے عشق، بے پناہ حافظہ، حُسنِ صورت، لطائف و مزاح، خودداری، رواداری، خدمتِ مذہب اور عشق رسولؐ ہے۔ یہ عجب بات ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی میں بھی یہ چیزیں بدرجہ اتم موجود ہیں البتہ ان شخصیتوں میں اگر

---

[1] چٹان لاہور۔

کوئی اختلاف تھا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں تھا۔

چونکہ دیوبند میں زیادہ اثر ورسوخ امام السند مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تھا اس لئے یہ دونوں بزرگ "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لئے بہتر سمجھتے تھے۔ مگر علامہ اقبالؒ متحدہ قومیت کے قائل نہ تھے یعنی ان کا نکتہ نظر "جداگانہ قومیت" کا تھا۔ بہرحال واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ دیوبند کے بیشتر علماء کرام نے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر قیادت تحریک پاکستان میں حصہ لیا اور اقبال کی ہم نوائی کی۔

علامہ اقبالؒ اور مولانا انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ مسئلہ ختم نبوت پر بھی کامل یقین رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے جو جدوجہد کی اس سے سب آگاہ ہیں اور مولانا انورشاہ صاحبؒ نے علمی اور دینی میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہاں پر ایک مسئلہ پر اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ انھوں نے اس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے کئی رسائل لکھے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلہ میں مولانا بدرالحسن دربھنگوی فاضل دیوبند لکھتے ہیں:۔

"علامہ سید انورشاہ کو اس فتنہ کی خطرناکی کا شدید احساس تھا اور اس وجہ سے مسلسل چھ ماہ تک انتہائی کرب اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے حتیٰ کہ نیند تک اچاٹ ہوگئی تھی جس کا صحت پر بھی ناخوشگوار اثر مرتب ہونے لگا تھا[1]"

کچھ ایسی ہی کیفیت علامہ اقبالؒ کی بھی تھی۔ مولانا انورشاہؒ نے صحیح بخاری کی چار جلدوں میں شرح لکھی اور سرور کائنات کی مدح میں عربی زبان میں کئی قصائد قلم بند کئے۔ آپ عربی اور فارسی زبانوں کے باکمال شاعر تھے اور ان دونوں میں یکساں روانی کے ساتھ شعر بھی کہتے تھے اور نثر میں یگانہ روزگار تھے آپ نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:۔

۱۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام　۲۔ اکفار الملحدین فی ضروریات دین　۳۔ فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب
۴۔ کشف الستر عن صلوۃ الوتر　۵۔ نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین　۶۔ بسط الیدین لنیل الفرقدین
۷۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم　۸۔ سہم الغیب فی کبد اہل الریب　۹۔ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح
۱۰۔ خاتم النبیین　۱۱۔ تحیۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام　۱۲۔ ازالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العین

آپ کے شاگردوں میں مولانا حفظ الرحمٰن، قاری محمد طیب، سید مناظر احسن گیلانی، مفتی محمد شفیع، مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ مولانا محمد یوسف بنوری، حامد الانصاری غازی، مولانا محمد میاں، محمد منظور نعمانی، قاضی زین العابدین میرٹھی، سید اختر حسین، میر واعظ مولوی یوسف شاہ مرحوم، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد انوری، علامہ طالوت مغفور معروف و ممتاز ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک نظم "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" میں لکھا ہے:۔

بیدار ہوں دل جس کی فغان سحری سے　اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب[2]

(المعارف)

---

[1] چٹان ۲۶ مئی ۱۹۶۵ء
[2] ارمغان حجاز

محمد حنیف شاہد ایم اے

اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام

۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات کی تحریک بہت زوروں پر تھی اسی زمانے میں علامہ اقبال نے انجمن کی سیکرٹری شپ کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ یہ بڑا نازک دور تھا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو نواب ذوالفقار علی خان صدر انجمن کی صدارت میں انہی کی کوٹھی پر جنرل کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں بقول مولانا ظفر علی خان بڑے بڑے جغادری خان بہادر، آنریبل اور سر جمع تھے۔ اجلاس میں ترک موالات پر بحث و تمحیص ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس امر کی تائید کی کہ:

"گزشتہ اجلاس میں الحاق برقرار رکھنے کے متعلق جس طریق سے رائیں لی گئیں وہ طریقہ قطعاً غیر آئینی تھا۔"

اسی اجلاس میں پروفیسر ہنری مارٹن، پرنسپل اسلامیہ کالج معزول کئے گئے اور پروفیسر حاکم علی موقوف کئے گئے۔ کیونکہ انہوں نے بعض بیہودہ تحریریں اور فتویٰ شائع کر کے انجمن کے قواعد کی خلاف ورزی کی تھی۔ چونکہ مسلمان ترک موالات کے حامی تھے اور علماء کرام اس کے متعلق فتویٰ دے چکے تھے کہ حکومت سے اشتراک عمل قطعاً حرام ہے اور جمعیۃ علماءِ ہند کی قرارداد یہ تھی کہ جن طلبہ نے ترک موالات کے تحت مدارس چھوڑے ہیں انہوں نے احکام اسلام کی پابندی کی ہے۔ ان حالات میں کالج کھولنا سخت غلطی ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود ۱۱ نومبر کو کالج کھولنے کی تجویز منظور کی گئی اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ بشرط ضرورت پولیس بھی بلائی جائے گی۔ ڈاکٹر کچلو کا خیال تھا کہ کالج بند رہنا چاہیئے کیونکہ مذہبی حکم ہے کہ مسلمانوں کو اپنے کالجوں کا الحاق سرکاری یونیورسٹیوں سے قطع کر لینا چاہیئے۔ اس لئے فی الحال کالج بند رکھا جائے۔ آپ دوسرے طلبہ کو اور کالج میں داخل کرا ہی چکے ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ جب تک الحاق کے متعلق فیصلہ نہ ہو جائے کالج

نہ کھولا جائے[1]

ترکِ موالات پر مزید غور کرنے کے لئے ۱۴ر نومبر کو انجمن کی جنرل کونسل کا اجلاس نواب ذوالفقار خان کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں بڑے بڑے اکابرِ قوم جمع ہوئے جن میں اکثر ایسے تھے جو اپنی سرکاری مصروفیات کی وجہ سے پہلے کبھی جنرل کونسل کے اجلاس میں شریک نہ ہوئے تھے لیکن اس روز جبکہ اسلامیہ کالج کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا سب جمع ہو کر آئے تھے کہ کس نہ کسی صورت اپنے کالج کو تباہی سے بچا لیں۔ کونسل کے اراکین[2] کے علاوہ ڈھائی تین سو دیگر مسلمان بھی جمع تھے۔ سب سے پہلے صاحب صدر نے افتتاحی تقریر کی اور ان کے بعد ڈاکٹر محمد اقبال، سیکرٹری نے گذشتہ رپورٹ پڑھی اور بتایا کہ اس عرصے میں ہمارے پاس متعدد فتوے موصول ہو چکے ہیں جن میں علماءِ ہند کا ایک فتویٰ ہے جس پر اُنتالیس[3] علماء کرام کے دستخط ہیں، علماءِ فرنگی محل، علماءِ دہلی، علماءِ مدرسہ الٰہیات کانپور کے فتوے بھی موصول ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا فتویٰ بھی پہنچا ہے۔ یہ تمام فتوے عدمِ تعاون کے حق میں ہیں۔ میں نے پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑہ کو لکھا تھا لیکن ان کی طرف سے اب تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ عدمِ تعاون کے خلاف جو فتوے میرے پاس موصول ہوئے ان میں ایک فتویٰ تو حاکم علی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج کا ہے دوسرا مولانا اصغر علی روحی کا۔ جس میں انہوں نے عدمِ تعاون کی تو تائید کی ہے لیکن سکولوں اور کالجوں کے متعلق لکھا ہے کہ جب تک کوئی اپنا انتظام نہ ہو جائے لڑکوں کو ان مدارس سے اٹھانا درست نہیں ہے۔

مولانا عبدالقادر صدر مجلسِ خلافت، خان بہادر، خواجہ غلام صادق، ڈاکٹر کچلو، شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین، احمد حسین خان، ڈاکٹر محمد دین ناظر وغیرہ نے بحث میں حصہ لیا۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے ایک پُرجوش اور مدلل تقریر میں فرمایا۔

"میں ہمیشہ ہر معاملہ کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک کسی امر پر پورا غور و خوض نہیں کر لیتا قطعی رائے قائم نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ آج شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں ان کی حیثیت اسلامی نقطۂ نگاہ

---

[1] روز نامہ زمیندار ۸ر دسمبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۲

[2] ایسے اراکین میں نواب سر رحیم بخش، نواب خدا بخش، شیخ اصغر علی، جسٹس عبدالرؤف، میاں فضل حسین، خان بہادر، خواجہ غلام صادق قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے اجلاس میں شرکت کی۔

[3] روز نامہ زمیندار ۱۶ر نومبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۳

سے بالکل تباہ ہو جائے گی [1]"

مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی نے تجویز پیش کی کہ انجمن علماءِ کرام اور جدید تعلیمیافتہ لوگوں کا ایک جلسہ منعقد کرے جس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے کہ علماء کرام اس کا جو فیصلہ کریں وہ منظور کیا جائے۔ بعدازاں نواب رحیم بخش اور ڈاکٹر کچلو نے بحث میں حصہ لیا۔ نیز میاں فضل حسین جسٹس عبدالرؤف، مولوی فضل الدین، چوہدری شہاب الدین، منشی دین محمد ایڈیٹر میونسپل گزٹ، نواب سر رحیم بخش، نواب خدا بخش۔ شیخ انعام علی، محمد رفیع، محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار، شیخ عبدالقادر، محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولوی انشاء اللہ خان ایڈیٹر وطن، خواجہ غلام صادق اور ان کے تمام حواریوں نے الحاق کے حق میں رائے دی۔ ڈاکٹر محمد اقبال، حاجی شمس الدین، مولوی غلام محی الدین نے کہہ دیا کہ:

"ہم مذہب کو تمام چیزوں سے بالاتر سمجھتے ہیں اور علماء کرام کو اپنا حکم سمجھتے ہیں، جمعیۃ علماء ہند جو فیصلہ کرے گی وہی ہماری رائے ہے، ہم اسلام پر سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

اس کے بعد جن لوگوں نے الحاق کے حق میں جو رائے دی تھی ان میں سے بعض نے اپنی رائیں واپس لینی چاہیں تو بہت شور و غوغا برپا ہو گیا۔ اور جلسہ بغیر کسی رائے کے برخاست ہو گیا۔

یہ ایک تاریخی خط جو علامہ اقبال نے روزنامہ "زمیندار" کے مدیر کے نام "ترک موالات" اور اسلامیہ کالج کے یونیورسٹی سے الحاق کے بارے میں تحریر فرمایا۔ اس کے ذریعے بعض گوشے بالکل پہلی بار بے نقاب ہو رہے ہیں۔ نیز علامہ اقبال کے مذہب اور سیاست کے بارے میں دو ٹوک نظریات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خط آج تک کسی مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔

مخدومی جناب ایڈیٹر صاحب "زمیندار" السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آج کے "زمیندار" میں جنرل کونسل انجمن حمایت الاسلام" لاہور کے جلسہ منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۰ کی کارروائی پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ایک آدھ فرو گذاشت ہو گئی ہے، جس کا ازالہ عام مسلمانوں کی آگاہی کیلئے ضروری ہے لہذا یہ چند سطور لکھتا ہوں۔ مہربانی کر کے اپنے اخبار میں درج کر کے مجھے ممنون فرمائیں۔

اراکین مجلس کے نام تین چیزیں تھیں۔

---

[1] روزنامہ "زمیندار" ۱۶ نومبر ۱۹۲۰ء

(۱)

اسلامیہ کالج لاہور کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے جاری رکھا جائے۔ محرک میاں فضل حسین صاحب سیکرٹری کالج مؤید مولوی فضل الدین صاحب وائس پریذیڈنٹ انجمن۔

(۲)

انجمن حمایت اسلام لاہور اپنے طور پر علماء پنجاب و ہندوستان کی ایک کانفرنس کرے۔ جس میں حالات حاضرہ سے واقف کار لوگ بطور مشیر کام کریں تاکہ حضرات علماء مسائل متنازعہ فیہ کے ہر پہلو پر پوری بحث و تمحیص کے بعد نتائج پر پہنچیں۔ علماء کی اس بحث میں مشیروں کو رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا اور فیصلہ کثرت آراء سے ہوگا۔ اختتام کانفرنس تک اسلامیہ کالج کا الحاق یونیورسٹی سے قائم رہے۔ ——— محرک مولوی ابراہیم صاحب سیالکوٹی

(۳)

جمعیت علماء کا اجلاس دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔ ان کے فتوے کا انتظار کیا جائے اور چند حضرات انجمن کی طرف سے بطور نمائندہ اس جلسے کی بحث و مباحثہ میں شریک ہوں ——— محرک ڈاکٹر کچلو

پہلی تجویز پر قطعاً کوئی مباحثہ نہیں ہوا۔ نہ مذہبی نقطہ خیال سے نہ تعلیمی نقطہ نگاہ سے۔ اس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اگر ارکان کونسل مذہبی نقطہ نگاہ سے اس تجویز پر بحث مباحثہ نہیں کرتے تو تعلیمی نقطہ نگاہ سے امر زیر بحث پر معقول و مدلل بحث ہو سکتی ہے۔ عدم تعاون یا ترک موالات سے قطع نظر کر کے بھی تعلیم کو "نیشنلائز" کرنے کے دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ مولوی غلام محی الدین صاحب نے بھی صدر جلسہ سے اجازت بحث چاہی، مگر افسوس کہ انہوں نے اجازت نہ دی۔ اصل بات یہ ہے کہ میاں صاحب کی تجویز کے فوراً بعد دوسری اور تیسری تجاویز پیش کر دی گئیں اور بحث انہی تجاویز پر ہوتی رہی۔ بہر حال تجویز اول پر ووٹ لئے گئے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ کثرت آراء میاں فضل حسین کی تجویز کے حق میں تھی۔ ۱۲ ممبروں نے جن میں مولوی عبد القادر قصوری، حاجی شمس الدین صاحب اور خاکسار شامل تھے ووٹ دینے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان ممبروں کی رائے میں معاملہ زیر بحث کا ایک نہایت اہم مذہبی پہلو ہے جس کا فیصلہ علماء سے استفتاء کئے بغیر ایسی انجمن کیلئے ناممکن ہے جو انجمن حمایت اسلام کے نام سے موسوم ہو۔ پہلی تجویز کے فیصلہ ہو جانے پر باقی دو تجاویز پر ووٹ لینا مناسب نہ سمجھا گیا۔ مذکورہ بالا ۱۲ ممبروں میں سے بعض ڈاکٹر کچلو صاحب کی تجویز کے مؤید تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کے مطابق انجمن خود علماء کی ایک کانفرنس مدعو کرے تاکہ اس نازک مسئلے کے ہر پہلو پر پوری بحث ہو سکے۔ جو فتوے دفتر انجمن میں موصول ہوئے ہیں ان کو حضرات علماء سے فرداً فرداً حاصل کیا گیا ہے اور نیز بعض ضروری سوالات ان سے پوچھے ہی نہیں گئے۔ مثلاً حضرت مولانا شیخ الہند مولانا

محمود حسن صاحب دیوبندی کے فتوے میں الحاق کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی خانقاہ کا فتویٰ با مضمون ترک موالات کے مسئلے پر ایک عام بحث ہے جس میں استفتاء بھی درج نہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس علمائے سندھ کے فتوے میں نہ امداد یا الحاق کے متعلق کوئی سوال حضرات علماء سے نہیں کیا گیا۔ کفار سے ترک موالات مسلمانوں کے لئے کوئی نیا حکم نہیں اور اس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کے مدارج اور جزئیات مختلف ہیں۔ کفار محارب ہوں تو ان کے لئے اور احکام ہیں، غیر محارب ہوں تو ان کے لئے اور احکام ہیں۔ اسی فرق کو کسی فتویٰ میں نمایاں نہیں کیا گیا جس سے میرے خیال میں سخت غلط فہمی ہو رہی ہے۔

مثلاً آج شام ہی میں نے ایک دوست سے سنا کہ پروفیسر حاکم علی صاحب اسلامیہ کالج نے اپنے فتوے کی تصدیق میں مولوی احمد رضا صاحب بریلوی سے ایک فتویٰ حاصل کیا ہے۔ پروفیسر صاحب خود بریلی تشریف لے گئے تھے۔ لاہور واپس آنے پر انہوں نے مولوی اصغر علی روحی سے استدعا کی کہ وہ بھی مولوی احمد رضا صاحب کے فتویٰ پر دستخط کر دیں، لیکن چونکہ حضرات دیوبند مولانا اشرف علی صاحب تھانوی پر اس فتوے میں سب وشتم کیا گیا تھا اس واسطے مولوی اصغر علی صاحب روحی نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

حاکم علی صاحب آنریبل میاں فضل حسین سے ایک دستی خط لیکر پھر مولوی احمد رضا صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے التماس کی کہ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ علماءِ دیوبند وغیرہ پر جو آپ نے سب و شتم اپنے فتویٰ میں کی ہے اُسے فتویٰ سے نکال دیجئے لیکن مولوی صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور میاں صاحب کے خط کے جواب میں کہا کہ وہ سب لوگ مرتد ہیں۔ میرے دوست نے یہ فتویٰ پڑھا ہے اور مولوی احمد رضا کا وہ خط بھی پڑھا ہے جو مولوی صاحب موصوف نے میاں صاحب کے جواب میں لکھا ہے۔ خیر یہ تو جزوی امور تھے۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ آیا اس فتویٰ میں محارب و غیر محارب کفار کا فرق کیا گیا تھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس امتیاز کے علاوہ بعض نہایت اہم اقتصادی سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا پوچھنا مفتی سے ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے لئے ایک پورا نظام عمل مرتب ہو اور ہر خیال کے مسلمان پر اتمام حجت ہو سکے۔ غرض یہ کہ جس طرح مفتی کیلئے علم و تقویٰ کی ضروری شرائط ہیں اسی طرح مفتی کے علم سے مستفیض ہونے کے لئے ضروری ہے کہ سائل نکتہ رس معاملہ فہم اور زیرک ہو۔ بالخصوص ایک ایسے معاملے میں جس کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر پڑتا ہو۔ پوری چھان بین، تحقیق و تدقیق ضروری ہے۔ اور اس تحقیق و تدقیق کیلئے بھی وہی راہ اختیار کرنی چاہیئے جو شریعت حقہ نے بتائی ہو۔ فرداً فرداً فتویٰ لینے سے کبھی کام نہیں چلے گا۔ اس وقت مسلمانوں کی بدنصیبی سے اس ملک میں یا دار اسلامی ممالک میں کوئی واجب الطاعۃ امام موجود نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا کہ واجب الطاعۃ امام نہ ہونے کی صورت میں خلافت کمیٹی کا فتویٰ واجب الطاعۃ ہے۔ میں نے ان کے دلائل نہیں سنے۔ اسوقت تک مجھے ان

کی اس رائے سے اتفاق نہیں، ممکن ہے ان کے دلائل سننے کے بعد میری رائے بدل جائے۔ فی الحال تو میرے نزدیک یہی راہ کھلی ہے اور یہی راہ شریعت کی رُو سے بھی انسب دکھائی دیتی ہے کہ حضرات علماء ایک جگہ جمع ہو کر ہر قسم کا اعتراض سننے اور پورے بحث و مباحثہ کے بعد مسلمانوں کے لئے ترکِ موالات کا پروگرام مرتب کریں۔ اس جمعیت میں حضراتِ مشائخ اور بڑے بڑے علماء حنفی اور اگر ضروری ہو تو شیعہ اور علماء اہلِ حدیث بھی جن کے علم و تقویٰ پر قوم کو اعتماد ہو طلب کئے جائیں۔ میرے خیال میں ایسے حضرات کا انتخاب کوئی مشکل امر نہیں۔ مسلمان وکلاء بھی اس بحث میں شریک ہو کر کم از کم مسائل کی حیثیت سے مدد دیں۔ حضرات علماء کیلئے بھی یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ آپس کے اختلافات کو رفع کر کے اُمتِ مرحومہ پر اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کریں۔ خدا تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ یہ بھٹکا ہوا آہو پھر خود بخود حرم کی طرف آرہا ہے۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز

ایسے حالات قوموں میں شاذ ہی پیدا ہوا کرتے ہیں اور اگر ان حالات سے حضرات مشائخ و علماء نے فائدہ نہ اُٹھایا اور مسلمانوں کی راہنمائی کر کے ان کو اپنے بچھڑے ہوئے محبوب یعنی شریعت حقہ اسلامیہ سے نہ ملا دیا تو اس ملک میں مسلمانوں کا بحیثیت ایک مذہبی جماعت کے خاتمہ تصور کرنا چاہیئے اور وہ مسلمانانِ ہند کی اس ہلاکت کے لئے قیامت کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اگر اس کانفرنس میں علماء کے انتخاب اور اس کے مجموعی عمل میں دیانت و امانت سے کام لیا گیا تو مسلمانان ہند کی زندگی میں وہ عظیم اخلاقی و روحانی انقلاب پیدا ہو گا جس کے لئے شاہ ولی اللہ محدّث کی روح تڑپتی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے وقت اور روپیہ کی ضرورت ہے لیکن ایسے اہم مسئلہ کے تصفیہ کے لئے وقت اور روپیہ کا سوال خارج از بحث ہے۔ اراکین جنرل کونسل نے تو یہ سلامتی کی راہ اختیار نہیں کی اور حمایتِ اسلام کہلا کر بے دردی سے اسلام کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن مسلمانانِ پنجاب سے میری التماس ہے کہ وہ اس کام کو توکل بخدا اپنے ذمہ لیں، اور لاہور یا باہر کے مسلمانوں میں سے کوئی اللہ کا بندہ اور نبی اُمّی کا عاشق ایسا نکلے کہ اس کانفرنس کا تمام خرچ اپنے ذمہ لے لے۔ اس کا یہ خرچ بیکار نہ جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دُنیا میں اس پر فلاح و برکت کے دروازے کھول دے گا اور آخرت میں وہ اس کی بارگاہ میں باریاب ہو گا جس کی آستان بوسی کو دُنیا کے عظیم ترین شہنشاہوں نے اپنا طرّہ امتیاز تصور کیا ہے۔

شاید آپ کے بعض ناظرین کے دل میں یہ خیال گذرے کہ جمعیت علماءِ ہند کا جلسہ دہلی میں عنقریب ہونے والا ہے تو ایسی کانفرنس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر کچلو صاحب کی تجویز میں

سر دست کسی خرچ اور وقت کی ضرورت نہیں لیکن جب جنرل کونسل میں اس تجاویز پر بحث ہو رہی تھی تو بعض صاحبان کی گفتگو سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ دہلی کانفرنس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس بناء پر کہ یہ کانفرنس ایک خاص خیال کے علماء کا مجموعہ ہوگی۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اس خیال کے اور بھی مسلمان ہیں اور میں مولوی ابراہیم صاحب کی تحریک کی تائید اس بناء پر کرتا ہوں کہ کوئی شائبہ بھی کسی قسم کی شک وظن کا نہ رہے اور ایک ایسی کانفرنس قائم کی جائے جس کا فتویٰ ہر خیال کے مسلمانوں کے لئے حجت ہو اور کسی کو بھی کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالات حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور پختہ کاران سیاست ہی اس کے فیصلہ کے اہل ہیں۔ اور مسند نشینان پیغمبر کو ان حالات سے سروکار نہیں۔ وہ میری رائے ناقص میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں ہے جس پر فقہائے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو۔ اگر مسلمان اس خدا کے دیئے ہوئے قانون سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی بدنصیبی ہے۔ شارع امی (ربانی انت وامی) نے تو وہ اصول بتائے ہیں کہ ان کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہاء کا تفقہ جس پر ہمارے وکیلوں اور بیرسٹروں کو ناز ہے ایک طفل مکتب کی ابجد خوانی نظر آتا ہے۔

رسالت محمدیہ کا مقصد صرف یہی نہیں کہ بندوں کو اپنے رب سے ملا دیئے بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بندوں کو اس چار عناصر کی دنیا میں رہنے اور انفرادی وملی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک مکمل آئین بھی عطا فرمائے اور یہ آئین خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے اسوقت تک مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے۔ اس سے مستفید ہونے کیلئے قوت اور استدلال اور پاکیزگی عمل کی ضرورت ہے اور ان اوصاف کی متاع گراں مایہ ابھی تک بکلی مفقود نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے لئے نہ مسٹر گاندھی کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے نہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہدایت نامہ ان کے لئے دلیل راہ ہو سکتا ہے ان کو اپنے ہر فعل کے لئے خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی ہو، کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں نظام کار تلاش کرنا چاہیئے اور جو نظام کار ان دو ماخذ سے ملے اسی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے اور اس بات کا خیال تک بھی نہ کرنا چاہیئے کہ ان کا نظام عمل مسٹر گاندھی کے پروگرام کے مطابق ہے یا اس سے مختلف ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس وقت جو معاملات زیر بحث ہیں محض سیاسی ہیں وہ جمعیت اسلامیہ کی ہیئت اور اس کے مقاصد سے بالکل بے خبر ہیں۔ اسلام کے نزدیک مسلمان کا کوئی فعل انفرادی ہو یا اجتماعی، مذہب کی ہمہ گیری سے آزاد نہیں اور برخلاف دیگر مذاہب کے اسلام نے زندگی کے ہر پہلو کیلئے احکام وضع کئے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے عقیدے کی رو سے انفرادی، ملی اور بین المللی قوانین کا اصل الاصول الہام الٰہی پر مبنی ہے اور اسلام کا ہر فعل اگر اس کا محرک اللہ اور رسول کی رضا جوئی ہے تو وہی فعل قرب الٰہی کا باعث ہے۔ خواہ اس کا اثر فاعل کی اپنی ذات پر پڑتا ہو، خواہ دیگر اقوام پر۔ وہ سیاست جو مذہب سے مبرا ہو ضلالت وگمراہی ہے اور وہ مذہب جو اپنے احکام میں تمام

ضروریات انسانی کو ملحوظ نہیں رکھتا ایک قسم کی ناقص رہبانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مغربی خیالات ایک ناسور زہر کی طرح ہمارے دماغوں میں سرایت کر گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ نوجوان بے تحاشا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں اور قوم کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ یہ خیال کم از کم اسلام کیلئے زہر قاتل ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود یورپ کے حکماء جو اس خیال کے بانی ہیں اور جن سے ہمارے نوجوانوں نے یہ سبق سیکھا ہے۔ اب اس ہیبت ناک جنگ کے بعد جو اس شیطانی اصول کا نتیجہ تھی اس خیال کی صحت میں متامل نظر آتے ہیں۔

افسوس ہے کہ انجمن حمایت الاسلام نے بھی معاملات زیر بحث کے فیصلہ میں اسی اصول پر عمل کیا ہے مجھے ان سے شکایت یہ ہے کہ انہوں نے کیوں فیصلہ کرنے سے پیشتر فقہائے اسلام سے استصواب نہیں کیا۔ اگر تمام حالات کو سننے کے بعد فقہائے اسلام کی یہی رائے ہو کہ الحاق قائم رکھا جائے تو میں بھی نہایت خوشی کے ساتھ اراکین انجمن کا ہم نوا ہوں، قطع نظر اس کے کہ انہوں نے اپنا ایک اہم مذہبی فرض ادا نہیں کیا۔ میری رائے ناقص میں اس سوال کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کر دینے سے اراکین کونسل نے خود انجمن کیلئے ایک زندگی و موت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔

میں نے آپ کے اخبار کی بہت سی جگہ لے لی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ فراخدلی سے مجھے معاف فرمائیں گے۔ اب میں اس طویل خط کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا حامی و ناصر ہو اور اپنے حبیب پاک کے صدقے میں ان کی تمام مشکلات کا خاتمہ کرے [1]

آپ کا مخلص : محمد اقبال   ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء

****

حسین احمدؒ

وہ فخرِ قوم وہ شانِ وطن حسین احمدؒ

وہ اک مجاہد صد صرف شکن حسین احمدؒ

وہ اک مجسمہ علم و فن حسین احمدؒ

وہ اک عقیدہ کشائے سخن حسین احمدؒ

(محشر اعظمی)

[1] روزنامہ "زمیندار" ۱۸ نومبر ۱۹۲۰ء ص ۱، ۲

ڈاکٹر معین الدین عقیل

اقبال مرحوم اور وہابی تحریک

اقبال موجودہ صدی میں ملتِ اسلامیہ کے ذہن کے اوّلین معمار ہیں۔ انھوں نے اپنے نظامِ فکر میں جن ماخذ سے فیض اُٹھایا ہے۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید اور وقت کے فکری اور جذباتی رجحان کو تبدیل کرنے میں ان کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے انحطاط کے حقیقی اسباب کا جائزہ لیا اور ان کی تشخیص کے بعد اسلام کے تصورِ حیات اور اس کی بنیادی اقدار کو ان کی اصلی شکل میں پیش کیا۔ اسلام کی جو تشریح و توضیح اقبال نے کی ہے اس کی امتیازی خصوصیت اس کا حرکی اور انقلابی پہلو ہے۔ اپنے مقصد کے تحت انہوں نے ایک تو اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی، مغربی افکار اور ان کے زیر اثر رونما ہونے والی تحریکوں پر سخت تنقید کی اور قوم کو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اسلام کی تعلیمات کو اختیار کرنے اپنے لئے ایک نئی اور مستقل راہ اختیار کرنے میں مدد دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال نے اپنی فکر کی بنیاد اسلام کے عقائد اور حکماءِ اسلام کی حکمت پر رکھی۔ اور اس ضمن میں وہ مختلف علماءِ اسلام اور ان کے افکار اور ان کی تحریکات سے بھی اثر پذیر ہوئے۔ اپنی تحریروں میں گاہے گاہے انہوں نے ان ماخذ کے حوالے دیئے ہیں جن سے ان کے ذہن نے اثرات قبول کئے اور ان شخصیات و تحریکات کی نشاندھی کی ہے جن سے ان کے فکر کی آبیاری ہوئی۔ جدید دُنیائے اسلام میں مسلمانوں کے زوال کو روکنے کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں ہیں اُن میں اپنے ہمہ گیر اور دُور رس اثرات کے لحاظ سے "وہابی تحریک" کو اوّلیت حاصل ہے باوجودیکہ اس تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی بحیثیت مجموعی اصلاح تھا اور یہ مسلمانوں کو اسلام کے قرونِ اولیٰ کی طرف واپس لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کا ایک اہم سبب بنی اور جو بیداری اس کی وجہ سے پیدا ہوئی " ...نے اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا۔

وہابی تحریک اپنے دَور کے زوال آمادہ حالات کا فطری تقاضا تھی۔ یہ محمد بن عبدالوہاب نجدی سے منسوب ہے جن کی ولادت ۱۷۰۳ء میں ہوئی[1] ان کی پیدائش کے وقت تک دُنیائے اسلام کا دینی و اخلاقی انحطاط اپنے

انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ تصوف کے غیر اسلامی شعائر اور فرسودہ توہمات کی کثرت نے اسلامی عقیدۂ توحید کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مسجدیں ویران اور جاہل عوام ان سے گریزاں تھے زیادہ تر تعویز گنڈے اور ٹونے ٹوٹکوں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ بزرگوں کے مزارات کی پرستش کی جاتی تھی، اسلام کی بنیادی اخلاقی تعلیمات کو نہ صرف نظر انداز کر دیا گیا تھا بلکہ ان کی خلاف ورزی[1] بھی کی جاتی تھی[2] کتاب و سنت کے مقابلے میں مذہبی عالموں، پیروں اور فقیروں کے اقوال کو ترجیح دی جاتی تھی۔ لوگ محض برائے نام مسلمان رہ گئے تھے۔ سیاسی شعور کسی طور پر بھی ظاہر نہیں تھا۔ جہاں کچھ طاقت تھی وہاں ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ نام نہاد خلیفہ کی ساکھ ختم ہو چکی تھی اور بعض صوبوں میں اطاعت بھی نہیں کی جاتی تھی۔

یمن ایک صدی سے پہلے خود مختار ہو چکا تھا، مکہ کے اشراف عیسائیوں کی نسبت اپنے سردار کی مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔ یکجہتی کا احساس مفقود تھا اور مکہ جو بہرحال روحانی مرکز تھا مادی عیاشیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ حالانکہ اسوقت دنیائے اسلام کی رو بہ زوال صورتحال ان سب کے سامنے تھی کہ ہندوستان عیسائیوں کے قبضۂ اختیار میں آ چکا تھا اور یورپ میں بھی غیر مسلم طاقتیں ترکوں پر ضربیں لگا رہی تھیں پھر بھی خانہ جنگی اور سیاسی بدحالی عام تھی۔ اس ابتری اور زوال کو رد کرنے کی کسی کوشش کو بھی متعدد مشکلات پیش آسکتی تھیں چنانچہ مولانا محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کو بھی متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

انہوں نے ابتدائی عمر ہی میں جبکہ وہ عرب کے ممتاز اور متبحر علماء میں شمار ہونے لگے تھے۔ اصلاح و تجدید کی دعوت دینا شروع کی۔ ان کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اصل اور خالص تعلیمات اختیار کریں[3] صدیوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح اس صورتحال میں کچھ آسان نہ تھی۔ وہ بدوؤں سے چوری، رہزنی اور مکاری چھڑا کر ان میں راست بازی اور ہمدردی کی صفات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جاہلوں کے غلط عقیدوں، بدعت و شرک کی اصلاح ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ انہوں نے اپنی دعوت کی بنیاد توحید کی پاکیزگی پر رکھی اور تمام عبادتوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ کرنے پر زور دیا۔ روزمرہ کی زندگی میں مسنون طریقے کے خلاف جو بدعتیں رائج تھیں ان کو ختم کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا۔ انہوں نے لوگوں میں اس بات کی تبلیغ کی کہ وہ مذہب کی اصل پاکیزگی اور سادگی کی طرف لوٹیں اور ان بدعتوں کو ترک کر دیں جو مذہب میں سرایت کر گئی ہیں اور امتداد زمانہ کے ساتھ اتنی جمع

---

[1] مسعود عالم ندوی: "ایک مظلوم اور بدنام مصلح" حیدرآباد دکن، ۱۹۴۷ء ص ۱۶

[2] ان حالات کا نقشہ ریل سٹوڈرڈ کی کتاب "دی نیو ورلڈ آف اسلام" نیویارک ۱۹۲۱ء ص ۲۵، ۲۶ میں عمدہ کھینچا گیا ہے۔

[3] حبیب اسکورانی: "دی انٹروڈکشن آف اسلامک اینڈ ویسٹرن تھاٹ ان عرب ورلڈ" مشمولہ "نیئر ایسٹرن کلچر اینڈ سوسائٹی" مرتبہ ٹی سی ینگ، پرنسٹن ۱۹۶۶ء، صفحہ ۷۷

ہو گئی ہیں کہ مذہب کی حقیقی شکل مسخ ہو گئی ہے۔ ان کی تعلیم کا مقصد مذہب کا تزکیہ اور ایمانداروں کی مذہبی زندگی کی تجدید تھا[۴]
ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر علاقے کے حکمران خاصے متردد تھے جس کے نتیجے میں وہ اپنے آبائی وطن عینیہ سے
نکلنے پر مجبور ہوئے اور چند برسوں کے ابتلاء کے بعد نجد کے امیر محمد بن سعود کے ہاں پناہ لی[۵] امیر اس کے متعلقین ہیں
اس دعوتِ توحید کے حامی بن گئے اور سرگرمی سے اس کے لئے کوشاں ہوئے۔ ان کے تعاون سے مولانا محمد بن
عبدالوہاب نے اب زیادہ سرگرمی اور مستعدی سے تبلیغ شروع کی۔ امیر کی وفات ۱۷۶۵ء کے بعد ان کے ایک فرزند
عبدالعزیز سربراہِ مملکت ہوئے۔ اُن کے زمانۂ اقتدار میں "دعوت" کی تبلیغ و ترسیع بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔
اطراف واکناف سے متعدد علماء اور طلباء مولانا محمد بن عبدالوہاب کے درس میں شریک ہوئے اور پھر لوٹ کر اپنے اپنے
علاقوں میں اس دعوت کو عام کرتے۔ خود مولانا محمد بن عبدالوہاب بہ نفسِ نفیس عام تبلیغی کاموں میں نگران کرتے تھے آپ نے نواسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرگرمی سے انجام دیتے رہے اور دوسری طرف
امیر عبدالعزیز اپنا دائرۂ حکومت وسیع کرتے رہے یہاں تک کہ نجد کا پورا علاقہ ان کے ماتحت آگیا۔ حجاز اور مکہ مکرمہ
بھی ان کے زیرِ حکومت آگئے اور سعودی حکومت خلیج فارس سے بحیرۂ احمر تک پھیل گئی۔ اس حکومت کے سیاسی
استحکام اور پھیلاؤ سے جزیرہ نمائے عرب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ مولانا محمد بن عبدالوہاب محض اسلام کی تعلیم و تبلیغ
پر ہی قانع نہ تھے بلکہ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے جس میں اسلام کی خالص اور پاکیزہ تعلیمات
کو زندگی کے عملی دستور کی صورت میں نافذ کیا جا سکے۔ سعودی حکومت کے زیرِ سایہ لوگوں کا طرزِ زندگی، عقائد اور کردار
یکسر بدل گئے، ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔ ناجائز محصولات ختم کر دیئے گئے، عیش و عشرت کا خاتمہ ہوا، شریعت
پر لوگوں کا عمل بڑھ گیا اور متعدد بدعتیں ترک کر دی گئیں[۶]

وہابی تحریکوں کو آغاز ہی سے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور مولانا محمد بن عبدالوہاب کی زندگی کا اکثر و بیشتر
حصہ ان کے تبرد آزما رہنے میں بسر ہوا۔ ان کے مخالفین نے یہ الزامات اس تحریک کے عقائد پر لگائے کہ مولانا
محمد بن عبدالوہاب ایک نئے مذہب کی تعلیم دیتے ہیں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، وہ ایک نیا فرقہ بنا رہے ہیں

---

[۴] نجلا عزالدین، "عرب دُنیا" ترجمہ: ڈاکٹر محمود حسین (لاہور) ۱۹۶۳ء ص ۷۷

[۵] مسعود عالم ندوی: "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" (حیدر آباد دکن طبع سوم) ص ۱۷
[۶] ۔ ۔ ۔ : ص ۱۷، ۱۸، نیز مصنف "محمد بن عبدالوہاب" ص ۴۰، بعدہٗ شیخ احمد عبدالغفور عطار "محمد بن عبدالوہاب"
ترجمہ محمد صادق خلیل (لائلپور بار اوّل) ص ۹۶، ۹۷، بعدہٗ مریم جمیلہ "اسلام ایک نظریہ ایک تحریک" آبادشاہ پوری
(لاہور ۱۹۶۹ء) ص ۱۶۵۔ ص بر، بی، ہسٹری آف اسلامک پیپلز، لندن ۱۹۵۹ء) ۳۵۲، ۳۵۳۔

اور جو لوگ ان کی سیادت تسلیم نہیں کرتے انہیں کافر قرار دیتے ہیں۔ ان الزامات میں کوئی صداقت نہ تھی لیکن مولانا محمد بن عبدالوہاب کے مخالفین اپنے متبعین کو اس جھوٹ کے باور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ لفظ "وہابی" عیب سمجھا جانے لگا۔ اس صورت حال سے برطانیہ نے اپنے مسلم مقبوضہ علاقوں میں خاطر خواہ سیاسی فائدے اٹھائے اور مسلمانوں کے درمیان افتراق کی خلیج وسیع کرنے کے لئے ہر اس شخص اور تحریک کو "وہابی" کے لفظ سے موسوم کیا جو اس کے سیاسی مفادات کی مملکتوں میں اس کے لئے رکاوٹ یا مضرت کا سبب بن سکتی تھی۔ جیسے ٹیپو سلطان کو اس کی مذہبی اصلاحات کے بہانے سے "وہابی" مشہور کر دیا۔ اور سیاسی فوائد حاصل کئے۔ "تحریک مجاہدین" جو ایک طویل عرصے تک برطانیہ کے لئے دردِ سر بنی رہی "وہابی تحریک" قرار دے دی گئی۔ مصر کے البانوی حکمران محمد علی نے جب وہابیوں کو شکست فاش دی تو برطانیہ نے اپنے "جذبات مسرت" ایک وفد بھیج کر ظاہر کئے۔[۵۵] اگرچہ وہابی تحریک خالص سیاسی معنوں میں تک جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہی تاہم روحانی اعتبار سے اس کے نمایاں اثرات عالم اسلام میں ہر جگہ کم یا زیادہ محسوس کئے گئے۔ اس تحریک کی قابل تقلید مثال سے ہندوستان میں "تحریک مجاہدین" اور افریقہ میں "سنوسی تحریک" اور لعبد میں مصر میں کچھ اور تحریکیں ابھریں۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی کوششوں میں فی الحقیقت اس تحریک کو اولیت حاصل ہے۔[۵۶]

مولانا محمد بن عبدالوہاب بلند پایہ عالم اور صحیح معنوں میں امام احمد بن حنبلؒ کے متبع اور امام ابن تیمیہ کے جانشین تھے۔ انہوں نے توحید، قرآن کی اصل تعلیمات اور خالص سنت رسول اختیار کرنے پر زور دیا۔ ہر طرح کے شرک سے بچنے اور قرآن کی متصوفانہ اور اعتزالی تفاسیر اور شرح پر توجہ دینے کی بجائے سیدھے سادے متن اور اس کے معنوں کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی۔ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ چونکہ تفاسیر اور حواشی انسان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے بے خطا نہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اگر قرآن کو مختلف تفسیروں کے ساتھ خلط ملط کر دیا جائے تو کلام اللہ کی اصل تعلیم تک مسلمانوں کی رسائی ناممکن ہو جائے گی۔ اسی طرح انہوں نے مسلک تصوف کی ان تمام کجرویوں کے خلاف جدوجہد کی جو اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید سے متصادم تھیں۔ اس لحاظ سے اولیاء پرستی، قبر پرستی، اہل قبور سے استعانت بدعات و منکرات اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور مقبرے تعمیر کرنے کا رواج ان کی تنقید کا نشانہ بنا۔ اس کے برعکس بعض عمدہ اخلاق و عادات پر انہوں نے خاصہ زور دیا جیسے انکساری، قناعت اور صبر و استقلال اور حرص و طمع

---

[۵۵] مریم جمیلہ: تصنیف مذکورہ ص ۱۶۸، ترکی میں بھی جو برطانیہ کی سیاسی وائنوں کے زیر اثر تھا اس تحریک کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا تھا۔
[۵۶] اس تحریک کے اثرات کا ایک جائزہ کنتھ کریگ "کرنسلز ان کونٹمپریری اسلام (دریڈ نبرا، ۱۹۶۵ء) ص ۱۶، ۵۰، ۶۴، ۹۴، ۱۱۱، ۱۸۸، ۱۱۹۔ معین الدین احمد خان۔ "فرائضی موومنٹ" (کراچی، ۱۹۶۵ء) ص ۱۲۳، ۱۷۱، x۔ ای آئی۔ جے روزنتھال "اسلام ان دی ماڈرن نیشنل سٹیٹ (کیمبرج ۱۹۶۵ء) ص ۱۳۔ ہورانی تصنیف مذکورہ ص ۱۵۵، ۲۲۲، ۲۲۵۔ وغیرہ میں ہے۔

اور حسد و غرور کی بیخ کنی وغیرہ۔ اسلام کے پانچ ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد پر سختی سے عمل کرنے کی تلقین بھی انکی تعلیمات کا بنیادی حصہ تھی۔ ان کے تمام تر نظریات حقیقتۃً خالص اسلام کی تکمیل میں تھے۔ ان کی مذہبی اصلاحات بنیادی طور پر تین پہلوؤں میں منقسم ہے۔

توحید | خدا موجود بالذات اور کل کائنات کا خالق ہے، وہ اپنی صفات میں وحدۂ لاشریک ہے، روحانی بلندی اور نجات قرآن حکیم اور شریعت کے احکام کی کامل بجاآوری میں مضمر ہے، نہ کہ خدا کے وجود میں مخلوط ہو جانے کے متصوفانہ مسلک میں۔

اجتہاد | حالات حاضرہ کے مطابق مسلمانوں کو جو حق تاویل دیا گیا ہے وہ اس کے قائل تھے اور اس حق پر عمل کرنے کی مصلحت پر اصرار کرتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ ائمہ اربعہ کے پیرو عملاً اس حق سے لاتعلق ہو گئے ہیں۔ مولانا محمد بن عبدالوہاب اندھی تقلید کے بالکل مخالف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے حامیوں پر تنقید کی (اور خود حنبلی تھے)

رَدِّ بدعات | مولانا محمد بن عبدالوہاب نے ان تمام مذہبی اور سماجی اعمال اور رسوم کی مذمت کی جن کی کوئی مثال یا جواز شریعت میں موجود نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قبر پرستی، پیروں کی حد درجہ تعظیم، بیوہ کے نکاح ثانی کا امتناع اور مختلف تقریبات میں فضول خرچی جیسے مفاسد شامل تھے [۹]

مولانا محمد بن عبدالوہاب نے خود کو اور اپنے پیروکاروں کو "موحدین" عقیدہ توحید کے حامل کے لقب سے موسوم کیا اور اپنی تحریک کا مقصد "سلف صالحین" کی طرف رجوع کرنا قرار دیا۔ اسلام مولانا محمد بن عبدالوہاب کے خیال میں محض الفاظ کا مجموعہ یا دوسروں کے اقوال کی تقلید کا نام نہیں ہے، حشر کے دن محض یہ دلیل کافی نہ ہوگی کہ "جو کچھ لوگوں نے کہا میں نے اسے تسلیم کیا اور دہرایا [۱۰]"

ہمیں لازماً علم ہونا چاہیئے کہ اسلام حقیقتاً کیا ہے۔ یہ شرک کو ترک کرنا اور ایک خُدا کو ماننا ہے "حقیقی اسلام مولانا محمد بن عبدالوہاب کے مطابق محض سلف صالحین کے دور تک رہا"

اپنے عقائد و نظریات کے اعتبار سے مولانا محمد بن عبدالوہاب نے کسی نئے عقیدے یا نظریے کو اسلام میں شامل نہیں کیا۔ وہ حنبلی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ان پر امام ابن تیمیہ کا اثر تھا [۱۱] وہ محض یہ چاہتے تھے کہ اسلام اپنی روح میں اور اصل صورت میں رائج ہو جائے اور مسلمان اپنے عقائد و کردار کے لحاظ سے قرون اولیٰ کی طرف

---

[۹] تفصیلات کیلئے "مسعود عالم ندوی" محمد بن عبدالوہاب۔ ص ۱۳۲ - ۱۴۸۔ عطار تصنیف مذکور ص ۴۹ ، ۱۸۲

[۱۰] مجموعات الرسائل والمسائل النجدیہ " (قاہرہ ۱۹۲۵ - ۱۹۳۱ء) ج ۱ ص ۳ بحوالہ البرٹ ہورانی تصنیف مذکورہ ص ۳۷۔

[۱۱] ؍؍ ؍؍ بحوالہ ایضاً

رجوع کریں۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے ان کی تحریک نے عصری زوال کی کمزوریوں اور بداعمالیوں کا انقطاع کیا اور ساتھ ہی اس نے قرون وسطیٰ کی شہنشاہیت کی پیدا کردہ تہذیبی قباحتوں اور مسلک تصوف کی بےعملیوں کا تدارک کیا اور اس کے علاوہ اس نے صرف غیر اسلامی فلسفے ہی کا نہیں بلکہ مذہبی فکر کا بھی رد کیا۔ اسی طرح اس نے تمام فرقوں، یہاں تک کہ شیعیت کی، جو اب بہت مستحکم ہو چکا تھا مخالفت کی [۱۲] وہ ان معنوں میں ایک مصلح تھے کہ انھوں نے دور از اسلام عقائد و اعمال کی مذمت کی اور ان کی تطہیر کی [۱۳]

اقبال نے مولانا محمد بن عبدالوہاب کے ان مقاصد سے صرف نظر نہیں کیا ان کی حکمت اور ان کی شاعری کا زیادہ تر رجحان ان ہی مقاصد کا حامل تھا جن پر وہابی تحریک کاربند رہی۔ اقبال نے مولانا محمد بن عبدالوہاب کی تجدیدی مساعی پر اپنی ستائش کا اظہار کیا ہے۔ مجددین اسلام کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ انھوں نے لکھا کہ :-

"زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے، مصر، ایران، ترکی اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اُسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہو گا [۱۴]"

اس اعتبار سے اقبال مولانا محمد بن عبدالوہاب کی تجدیدی مساعی کو دُنیائے اسلام میں اولیت کا درجہ دیتے تھے۔ ان کے خیال میں مولانا محمد بن عبدالوہاب نے

"..... اس آگ کو جوان کی بےچین روح میں دبی تھی سارے عالم اسلام میں پھیلا دیا۔۔۔۔ اور حق کی بدولت اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی [۱۵]"

ایک اور جگہ انھوں نے وہابی تحریک کو ــــــ "جدید دُنیائے اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ" سے تعبیر کیا ہے [۱۶] اور ان کے خیال میں یہ :-

"ایک چنگاری تھی جس سے عالم اسلام میں ہر کہیں تقلید اور استبداد کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی، صدیوں کا جمود ٹوٹا، قوائے علم و عمل شل ہو رہے تھے ان میں پھر حرکت پیدا ہوئی یہ بات سمجھ میں آئی کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی تغلب کے خلاف ایک محاذ قائم ہونا چاہئے [۱۷]

---

[۱۲] ڈبلیو سی۔ اسمتھ "اسلام ان ماڈرن ہسٹری" (نیویارک ۱۹۵۹ء) ص ۴۹ نیز تفصیلات کے لئے "ایضاً" ص ۴۰ - ۵۱
[۱۳] جارج انتونیس "عرب دی اویکننگ" (نیویارک ۱۹۶۵ء) ص ۲۲۔ [۱۴] اقبال نامہ حصہ دوم (لاہور ۱۹۵۱ء) ص ۲۳۱
[۱۵] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ "ترجمہ نذیر نیازی لاہور ۱۹۵۸ء) ص ۲۳۵۔ [۱۶] حرف اقبال: مرتبہ لطیف احمد شیروانی ۵۰ و ص ۲۲۵
[۱۷] بحوالہ سید نذیر نیازی "اقبال کے حضور" (جلد اول کراچی ۱۹۷۱ء) ص ۳۲۱، ۳۲۲

اقبال وہابی تحریک کے نظریات و مقاصد کے بیشتر حصے سے متفق تھے۔ مولانا محمد بن عبدالوہاب جن نظریات کے حامل تھے اور جن کی بنیاد پر انہیں مجدد عصر کا رتبہ حاصل ہوا۔ اقبال کی فکر میں انہیں قدرے ردو بدل کیساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا محمد بن عبدالوہاب کی کل مساعی کی بنیادی الحقیقت ان کے نظریۂ توحید اور اجتہاد کے ضمن میں ان کے نقطۂ نظر میں مضمر ہے۔ اس تعلق سے اقبال نے ان سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ توحید پر ان کا جز ایمان ہے وہ غیر متنازعہ اور مسلمہ ہے۔ اور اسکا اظہار انھوں نے متعدد تحریروں اور اپنے کلام میں کیا ہے۔ جیسے:-

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند　　بتان وہم و گماں، لاالہ الااللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند　　بہار ہو کہ خزاں، لا الہ الااللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں　　مجھے ہے حکم آذاں، لا الہ الااللہ

ان کا فلسفہ خودی خدا کے وجود میں ملحوظ ہو جانے کے متصوفانہ مسلک سے قطع نظر خلافت الٰہیہ کے کے حصول کے مقصد کا حامل ہے جس میں انسان شعور ذاتی کے انتہائی کمال تک پہنچتا ہے اور اس کی قوتیں سب سے اعلیٰ علم سے مل جاتی ہے اور اس کی زندگی میں خیال اور عمل اور عقل حیوانی اور عقل انسانی ایک ہو جاتے ہیں۔ اسرار خودی میں لکھتے ہیں:-

نائب حق ہمچو جان عالم است　　ہستیٔ او ظلِ اسم اعظم است
از رموزِ جزو کل آگاہ بود　　در جہاں قائم بہ امر اللہ بود
خیمہ چوں در وسعت عالم زند　　ایں بساط کہنہ را برہم زند
فطرش معمور و می خواہد نمود　　عالم دیگر بیارد در وجود
صد جہاں مثل جہاں جزو کل　　روید از کشت خیال او چو گل

چونکہ خدا ہی تمام کائنات اور زندگی کی روحانی بنیاد ہے اس لئے خدا سے وابستگی دراصل انسان کی اپنی بلند ترین خودی سے وابستگی کے مترادف ہے۔

اجتہاد کے ضمن میں ان کا خیال ہے کہ ایک قوم کی زندگی اور تازگی کا دارومدار افراد کی ذہنی و جسمانی نشوونما پر منحصر ہے۔ جب تک کسی قوم میں ایسے آزاد مرد اور جوان افراد پیدا نہ ہوں جو اپنے دل کی گہرائیوں اور دماغ کی صلاحیتوں سے قوم کو نئے تصورات سے روشناس کرائیں۔ جو معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ ہونیکا نیا طریقہ بتائیں اسوقت تک اس قوم کے ارتقائی منازل طے کرنے کے امکانات نہیں۔ اقبال اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ صدیوں کے فقہی جمود کے بعد امام ابن تیمیہ پہلے شخص تھے جنھوں نے تقلید کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے تمام فقہی مسائل میں کتاب و سنت کی بلا واسطہ رہنمائی کی طرف لوگوں کو مدعو کیا اور اپنے دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نقطۂ نظر

کی تشریح کی۔ اس مرد مومن نے تمام مخالفتوں اور مصیبتوں کے باوجود ائمہ سلف کے طریقوں کو صدیوں کے انبار سے نکالا اور قوم کو امید کی راہ دکھائی[۱۸] وہابی تحریک، اقبال کے خیال میں بھی فی الحقیقت ابن تیمیہؒ کے تجدیدی کارناموں ہی کی صدائے بازگشت تھی[۱۹] اپنے خطبات میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

پیغمبر اسلام زمانہ قدیم و جدید کے حد فاصل پر مبعوث ہوئے۔ جہاں تک اسلامی معاشرے کے قوانین کی بنیاد وحی و تنزیل پر ہے وہ زمانہ قدیم کی آخری یادگار ہیں لیکن جہاں تک ان قوانین کی روح کا تعلق ہے وہ زمانہ جدید کے نئے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ اسلام کا آغاز درحقیقت ذہن انسانی کا آغاز ہے۔ چند بنیادی ہدایات دینے کے بعد انسان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی فلاح و بہبود کے لئے وہ خود صحیح راستے کی نشاندھی کر سکے۔ اقبال کا خیال ہے کہ صدیوں کے اس جمود کے بعد اب مسلمانوں کو صرف چار مذاہب فقہ کی نہیں بلکہ اجتہاد مطلق مستقل کی طرف توجہ دینی چاہیئے، ورنہ قرآن حکیم کا زندگی آفریں پیغام ہمارے زمانے کے لئے بےکار ثابت ہوگا[۲۰]

اقبال مسلمانوں کی صدیوں کی ذہنی پستیوں کے تدارک کا اصل اصول اجتہاد ہی کو سمجھتے ہیں[۲۱] اور اسے ایک کسوٹی کی حیثیت دے کر اس کے تحت قاندین ملت کی مساعی کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی کوششوں کے حسن و قبح کا یقین کرتے ہیں چنانچہ بعض امتیازات کے سبب، جن کا ذکر راقم نے ایک علیحدہ مقالے میں کیا ہے، اقبال جمال الدین افغانی کو اجتہادی مساعی میں فوقیت دیتے ہیں لیکن اولیت کا درجہ بہرحال انہوں نے مولانا محمد بن عبدالوہاب کے لئے مختص کیا ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر کہ اقبال وہابی تحریک کے نظریے اور مقصد کے معترف تھے انھوں نے اس کے بعض پہلوؤں پر تنقید بھی کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ داخلی طور پر اس کا مزاج سرتاسر قدامت پسندانہ تھا۔ اس نے مذاہب اربعہ کی قطعیت سے تو انکار نہیں کیا اور اس لئے آزادئ اجتہاد کے حق پر بھی بڑی شدت سے زور دیا۔ لیکن ماضی کے بارے میں چونکہ اس کا نقطہ نظر یکسر غیر تنقیدی رہا۔ لہٰذا امور قانون میں اس نے اپنا دارو مدار صرف احادیث پر رکھا[۲۲] اِس

---

۱۸ اقبال: "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ص ۲۳۳ - ۲۳۴۔ ۱۹ ایضاً ص ۲۳۴۔ ۲۰ "اقبال کے حضور میں" ص ۳۱۹۔
۲۰ تفصیلات کیلئے "تشکیل الٰہیات اسلامیہ" باب نمبر ۶، بشیر احمد ڈار، "فکر اقبال۔ مسئلہ اجتہاد" مشمولہ "مطالعہ اقبال"، مرتبہ گوہر نوشاہی (لاہور ۱۹۷۱ء) ۲۱ اس ضمن میں ان کے خیالات اور ان کے نقطہ نظر کا اظہار بالخصوص ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کے نام تحریر کئے۔ مشمولہ "اقبال نامہ" حصہ اول ص ۱۲۵، ۱۲۶۔
۲۲ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۳۵۔ سید نذیر نیازی نے ان کا ایک خیال اس ضمن میں حاشیے میں نقل کیا ہے جس کے مطابق "وہابیت ان کے نزدیک وہ غلط فرقہ بندی تھی جس کے متشددانہ عقائد اور تنگ نظری نے ایک غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔۔۔۔" اقبال کے حضور، ص ۱۷۷۔

تحریک کے سیاسی پہلو کے ضمن میں ان کا خیال تھا کہ :-

"اس سے نجد و حجاز میں جنگ کی نوبت آئی، ۔۔۔۔ اس سے عالم اسلام کے اتحاد کو خاصہ ضعف پہنچا۔"

پھر مزید انہوں نے اس بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا کہ:

"میرے نزدیک وہابیت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا عقائد میں تشدد اور ظواہر پر اصرار ہے۔ بحیثیت ایک نظام مدنیت اس نے اسلام کے سیاسی اور اجتماعی نصب العین کا کوئی تصور قائم کیا نہ اس تصور کی رعایت سے اُمت کا کہ وہ کس طرح کی ہیئت اجتماعیہ ہے یعنی آج کل کی اصطلاح میں ہم یہ کہیں گے کہ قوم ہے تو کن معنوں میں۔ وہابیت کی یہی روش ہے جس سے برطانوی شہنشاہیت نے خوب فائدہ اٹھایا اور جیسی کہیں مصلحت تھی ویسا ہی رویہ اختیار کیا۔ مخالف بھی اور موافق بھی[23]"

اس تحریک کے دو اہم اصول، ردِ بدعات اور ردِ تقلید کے ضمن میں ان کا خیال تھا کہ

ردِ تقلید اور ردِ بدعات گو اپنی جگہ ضروری تھا لیکن اس کا دائرہ چونکہ بحث و نظر سے آگے نہیں بڑھا اور جو بھی گفتگو کی گئی عقائد کے رنگ میں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس کے سامنے حیات ملی کا صرف ایک پہلو تھا[24]"

اقبال کے خیال میں اس تحریک میں جو خامیاں موجود تھیں اُن کے باوجود اس کا ایک عام اور مثبت اثر عالم اسلام پر مرتسم ہوا اور اس تحریک میں کئی اور تحریکیں پیدا ہوئیں۔ کہیں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مغرب کے غلبہ اور استیلاء کو روکنے کی کیا تدبیر ہے، کہیں یہ کہ بلادِ اسلامیہ اپنی بچی کھچی آزادی کیسے برقرار رکھیں، کہیں یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمان علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں کیسے آگے بڑھیں، کہیں یہ کہ معاشرے کی اصلاح کیسے ہو۔ غرض اس کے زیر اثر ملت کی توجہ کئی ایک مسائل کی طرف منعطف ہو گئی[25] اور اس طرح دنیائے اسلام میں جو تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں ایک تعلق سا قائم ہو گیا۔ حالانکہ بجز سطحی مشابہت کے ان میں نظریے اور اصول کا باہم کوئی تعلق نہیں تھا[26] اس اعتبار سے یہ تحریک دور رس نتائج کی حامل تھی　　　　(المعارف)

---

[23] اقبال کے حضور" ص ۳۲۰　　[24] ایضاً　　[25] ایضاً

[26] ایضاً ۳۲۲۔ اس لحاظ سے اقبال نے ہندوستان کی تحریک مجاہدین کے لئے بعض مقامات پر "وہابی تحریک" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جبکہ ایسے مقامات پر اقبال نے اس تحریک کا ذکر عرف عام کے طور پر کیا ہے ورنہ وہ اسکو اپنے مقصد و منہاج کے اعتبار سے وہابی تحریک سے مختلف گردانتے تھے جیسے "ایضاً" ص ۳۲۱ - ۳۲۲۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

اقبال اور عصری نظام تعلیم

مغربی نظام تعلیم کی تنقید اقبال نے جب اپنی بصیرت سے جدید نظام کا جائزہ لیا تو انہیں چند بہت بڑی، کمزوریاں اور خامیاں نظر آئیں جنہیں انہوں نے اپنی تنقید اور صاف گوئی کا نشانہ بنایا۔ اور ماہرین تعلیم کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی۔ وہ جہاں مدرسہ اور طالب علم کے جرم کا ذکر کرتے ہیں وہاں اس سے مراد مغربی مدارس اور اس کے طلبہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس نظام دانش نے نئی نسل کے حق میں سب سے بڑا جرم کیا ہے۔ وہ مدرسہ و خانقاہ دونوں سے بیزار نظر آتے ہیں۔ جہاں نہ زندگی کی چہل پہل ہے نہ محبت کا جوش و خروش۔ نہ حکمت و بصیرت ہے، نہ فکر و نظر۔ ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک   نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

وہ دانش کدوں کی کور نگاہی و بے ذوقی۔ اور خانقاہوں کی کم طلبی و بے توفیقی دونوں سے نالاں اور دونوں سے گریزاں ہیں۔ ؎

جلوتیان مدرسہ کور نگاہ مردہ ذوق   خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو!

عصری دانش گاہوں کا ظلم عظیم اقبال کی یہ سنجیدہ رائے ہے کہ تعلیم جدید نے نئی نسل کی صرف عقلی اور ظاہری تربیت سے استغنا۔ اور قلب و روح کی نشو و نما، روحانی ارتقا۔ اخلاق کی پاکیزگی اور تزکیۂ نفس سے غفلت کر کے اس پر سب سے بڑا ظلم کیا ہے جس کے سبب اس کے قوئی غیر متوازن اور اس کی اٹھان غیر متناسب ہوئی ہے۔ اور اس کی زندگی ہم آہنگی کے بجائے بے اعتدالیوں کا نمونہ بن گئی ہے۔ نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح، علم و عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے۔

ؔ یہ مقالہ قاہرہ یونیورسٹی (سابق جامعہ فواد الاول) میں ۵ رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل 1951 کو پڑھا گیا۔

اس کی عقل باریک، مگر روح تاریک ہے۔ اور اس کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ اس کا روحانی زوال بھی اسی حساب سے ہو رہا ہے۔ وہ نئی نسل کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ اس لئے جب بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے یا کوئی بات کہتے ہیں تو وہ واقعہ کی تصویر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کا پیمانہ خالی۔ اس کی روح پیاسی اور تاریک ہے۔ مگر اس کا چہرہ بہت تازہ و بارونق۔ اور اس کا ظاہر بہت چاق و چوبند ہے۔ اس کی عقل روشن مگر بصیرت اندھی ہے۔ بے یقینی اور یاس و قنوط ان کی زندگی کا حاصل اور محرومی ان کی قسمت ہے۔ یہ نوجوان انسان نہیں انسانوں کی لاشیں ہیں۔ وہ اپنی ذات کے منکر ہیں، مگر دوسروں پر ایمان لاتے ہیں۔ اغیار و اجانب ان کے اسلامی خمیر سے دیر و کلیسا کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اور ان کی صلاحیتیں "صرف در میکدہ" ہو رہی ہیں۔ سخت کوشی اور جفاکشی کے بجائے، نرمی اور تن آسانی۔ لذت طلبی اور عیش کوشی ان کا مسلک بنتی جا رہی ہے۔

ان کی پست ہمتی کا یہ حال ہے کہ امیدیں اور آرزوئیں پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ یا پیدا ہوتے ہی گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ نئی دانشگاہوں نے ان کے دینی جذبات کو پوری طرح سلا دیا۔ اور ان کے وجود کو ہم نفس عدم بنا دیا ہے۔

اپنی ذات اور اپنی شخصیت سے ناواقفیت اور اپنی صلاحیتوں سے بے پروائی ان میں عام ہے۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر وہ اپنی روح کا سودا روٹی کے چند ٹکڑوں پر بھی کر سکتے۔ اور ضمیر فروشی کر سکتے ہیں۔ ان کے معلم بھی ان کی قیمت اور حیثیت عرفی سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے انہوں نے ان کو شرف و عظمت کے راز سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ مومن ہیں لیکن موت کی لذت سے بے خبر۔ اور توحید کی طاقت سے ناواقف۔ وہ فرنگ سے تہذیب کے لات و منات کی درآمد کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔ فرزند حرم ہو کر بھی ان کا دل "طواف کوئے ملامت" اور "سجدۂ پائے صنم" سے متنفر نہیں۔ فرنگ نے انہیں بغیر حرب و ضرب اور قتل و غارت کے بھی مار ڈالا ہے۔ ان کی عقلیں بے جھجھک ان کے دل بے تھر۔ اور نگاہ بے باک ہے۔ ان کے قلوب بڑے سے بڑے حوادث کی چوٹ سے بھی نہیں پگھلتے۔ ان کے علم و فن۔ دین و سیاست۔ عقل و دل سب کا مرکز مادہ ہے۔ ان کے دلوں میں افکار تازہ کی کوئی نمود نہیں۔ ان کے خیالات میں کوئی بلندی نہیں۔ ان کی زندگی پر جمود و تعطل کی برف جمی ہوئی ہے۔

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں　　　نہ ادائے کافرانہ، نہ تراش آذرانہ

○

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے　　　سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

○

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا　　　کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

○

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے		خانقاہوں میں کہیں لذت اسرار بھی ہے

○

سے یقیں سے ضمیر حیات ہے پرسوز		نصیب مدرسہ یارب یہ آب آتش ناک

○

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا		دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

○

آہ مکتب کا جوان گرم خوں!		ساحر افرنگ کا صید زبوں

○

نوجوانان تشنہ لب خالی ایاغ		شستہ رو تاریک جاں، روشن دماغ

○

کم نگاہ و بے یقین و ناامید		چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

○

ناکساں منکر زخود مومن بغیر		خشت بند از خاک شاں معمار دیر

○

اقبال رو نئی نسل کے نوجوانوں سے کیا توقعات اور ان کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے		ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ایک قطعہ میں کہتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے		پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے		مرا نور بصیرت عام کر دے

"خطاب بہ جوانان اسلام" اور دوسری نظموں میں ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے طلباء علی گڑھ کالج کے نام "عشق کے دردمند" نے اپنے پیغام میں صاف صاف کہا۔

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا		اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

ان کی نظم ایک جوان کے نام ہیں۔ ان کے احساسات بڑی وضاحت سے لکھے گئے ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالین ہیں ایرانی		لہو مجھکو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

○

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے، خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

○

وہ جب مسلم نوجوانوں کو اسلام کے بجائے دوسرے فلسفوں سے متاثر اور مرعوب دیکھتے ہیں تو فطری طور پر انہیں صدمہ ہوتا ہے۔ اپنی نظم "ایک فلسفہ زدہ سیدزادے کے نام" میں لکھتے ہیں۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا
انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و براہیم
دل در سخن محمدی بند
اے پورِ علیؓ ز بوعلی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قائد قرشیؐ بہ از بخاری

اقبال نئی نسل کی بے ہمتی اور اس کی اخلاقی پستی کا ذمہ دار موجودہ نظام تعلیم کو قرار دیتے ہیں۔ جس کے ہاں اخلاق پر کوئی زور نہیں۔ اور نہ تربیت کا کچھ خیال ہے وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کے دل سوز دروں سے خالی اور ان کی نظریں غیر عفیف ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زبان بہت تیز ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اشکِ ندامت اور دل میں خوف و خشیت ذرا بھی نہیں ہے

جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن،
پرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

وہ ان سب باتوں کے لئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے نوجوانوں کو اپنے جال میں جکڑ رکھا ہے۔ اور ان کی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ وہ دوسرا ذمہ دار حد سے بڑھی ہوئی "عقلیت" کو بھی سمجھتے ہیں۔ جو اولوالعزمیوں اور پُرخطر راہوں سے روکتی اور ہر قدم پر مصلحت بینی اور عاقبت بینی کا بہانہ تراشتی رہتی ہے۔

اقبال کی نگاہ میں اس ذہنی انحطاط کی ایک وجہ صحت بڑھتی ہوئی مادہ پرستی اور اسباب طلبی ماہ عہدہ دار ملازمتوں اور اونچی کرسیوں کو تعلیم کا مقصد سمجھنا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے مقصد افراد کے لئے علم دولتِ نافع نہیں سم قاتل و قاطع ہے۔ اور ایسے رزق سے موت بہتر ہے ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مغربی تعلیم پر معاد کے بجائے معاش کا تصور جس طرح چھایا رہتا ہے وہ اس کے لئے جان لیوا ہے۔ اس تعلیم کا یہ فیض ہے کہ مرغ چمن محروم نوا اور فطرت بے رنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ روٹی بھی ہاتھ میں نہیں تھماتی اور دوسرے ہاتھ سے روح بھی قبض کر لیتی ہے ؎

نوا از سینۂ مرغ چمن برد　　　زخوں لالہ آں سوز کہن برد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی　　　کہ ناں درکف نداد و جان زتن برد

جدید تعلیم کے مجرمانہ کردار کا اقبال نے بے باکی سے پردہ چاک کیا۔ اور اس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔ حد سے زائد فکرِ معاش، ناروا مصلحت بینی۔ اور عافیت گزینی اور مصنوعی تہذیب۔ نقلی زندگی اس تعلیم کی نمایاں پیداوار ہیں۔ اقبال نے اس کی نشاندہی کی ہے ؎

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　　قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بے گانہ کیا　　　جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا　　　جس میں رکھدی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو　　　خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

○

جدید تعلیم پر اقبالؒ کی کڑی نکتہ چینی

نئی تعلیم پر اقبال کے غم و غصہ اور سخت گیری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ یہ تعلیم بطالت و تعطل۔ جمود و جمد۔ آرام طلبی و لذت کوشی کی تعلیم دیتی ہے۔ اور زندگی کو بحرِ منجمد بنا دیتی ہے۔ وہ طالب علم کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اسی طرح یہ تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار۔ اور اس کے مستقبل کے لئے نو آبادیات کی زمین فراہم اور ہموار کرتی ہے اور نوجوانوں کو افرنگ زدہ بناتی ہے۔ اور بلند معیار

زندگی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتی ہے۔
مشرق کی روایات وخصوصیات کو ختم کر کے وہاں وہ مغربی معاشرہ برپا کر دینا چاہتی ہے جہاں بقول میکالے شکل وصورت کے لحاظ سے مشرقی لیکن ذہن وطبیعت کے اعتبار سے مغربی انسان پائے جانے لگیں۔

مغربی تعلیم پر اقبال کی تنقیدوں کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس طرح اس کی بنیاد کفر والحاد یا پھر ذہنی انتشار اور فکری انارکی پر ہے۔ اسی طرح وہ یہ تمام بیماریاں نئے دماغوں میں اتار دیتی ہے۔ فکر وفلسفہ، آزادئ رائے وحریت خیال۔ اور آزادانہ غور وخوض کے نام سے ذہنی بے ربطی اور پریشان خیالی کو جنم دیتی ہے۔ اقبال کے خیال میں غلط بینی سے کور چشمی اور عالمانہ بے دینی سے نادانی بہتر ہے۔ ؎

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے ز بینائے غلط بینے نکو تر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش ز دانش مند بے دینے نکو تر

اقبال کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ ان ذہنی جمناسٹکوں سے کیا حاصل جو انسان کو خلا باز اور ہوا پرواز بنا دیں لیکن اس کے جمے ہوئے قدم بھی اکھڑ جائیں۔ اور وہ اپنا مقام بھی کھو بیٹھے۔

از اں فکر فلک پیما چہ حاصل کہ گرد ثابت وسیار گردد
مثال پارۂ ابرے کہ از باد بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

یہ نظام تعلیم انسان کو مشینوں صنعتوں اور ترقیوں کے آگے بے قیمت وبے حیثیت بنا دیتا ہے حالانکہ انسان ہی بحر وجود کا گوہر مقصود اور مزرع ہستی کا حاصل ہے۔ دنیا کو انسان کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ انسان کو دنیا اور متاع دنیا کے۔

منہ از کف چراغ آرزو را بدست آور مقام ہائے وہو را
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم بخود بازا و بشکن چار سو را

○

دو گیتی را بخود باید کشیدن نباید از حضور خود رمیدن
بہ نور دوش بیں امروز خود را ز دوش امروز را نتواں ربودن (ارمغان حجاز)

○

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھکو تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحب آفاق
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرم اعماق (ضرب کلیم)

○

اقبال کی نظر میں فکر بشری ۔ وحی الٰہی اور فیضان سماوی کے بغیر خام اور ناتمام رہتی ہے ۔ اس لئے فکری ناپختگی کے باوجود اسے شروع سے آزاد اور بے قید کرنا پریشان خیالی اور ژولیدہ نگاہی کو دعوت دینا ہے آزادیٔ فکر کے عنوان سے انہوں نے ایک بڑا البصیرت افروز اور معنی خیز قطعہ کہا ہے ۔

آزادیٔ افکار سے ہے انکی تباہی　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(ضرب کلیم)

مشرق میں ناپختہ افکار و فلسفہ نے جو وبائی شکل اختیار کرلی ہے ۔ اور غیر منضبط شدہ خیالات نے جس طرح دنیا میں ذہنی بے اطمینانی پیدا کردی ہے وہ بھی کالج کا عطیہ ہے جو ہر نئی ذہنی اپج کو فلسفہ کا نام دے دیتا ہے

پر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر ۔ خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کسکو تمیز

"عصر حاضر" کے عنوان سے اقبال نے ایک قطعہ میں مشرق و مغرب کی بنیادی خرابیوں کو طشت از بام کیا ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ مشینی دور کی تیز روی اور عجلت پسندی نے ہر شے کی پختگی ختم کردی ہے اور فلسفہ کو بے ربط بنا دیا ہے ۔ دیار فرنگ میں عشق و محبت کو ان کا حقیقی مقام اسی لئے نہیں ملا کہ لادینیت نے اس کا کوئی گھر باقی نہیں چھوڑا ۔ اور مشرق میں عقل کو صحیح مقام اس لئے نہیں ملا کہ افکار میں کوئی تسلسل نہ تھا ۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی　　اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر　　چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق　　عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

(ضرب کلیم)

نظام تعلیم پر اقبال کی تنقید کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں مغرب کی اندھی تقلید اور خالص پیروی کا جذبہ پیدا کردیتا ہے اور ان میں جدت و اجتہاد کا کوئی جذبہ نہیں بیدار کرتا ۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو خود رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے ۔ لیکن یہ دانش گاہیں اس سے بھی تنگ دائروں میں بند ہیں ۔ ان میں جاکر عبقری دماغ بھی امامت عصر کے بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کرنے لگتے ہیں ۔

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں　　بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار　　کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کرسکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت　　وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

(اساتذہ)

اقبال کہتے ہیں کہ نئی نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں ۔ بلکہ وہ یورپ کی پرچھائیں ہے اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے ۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچہ ہے ۔ جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے ۔ لیکن اس میں روح نہیں پھونکی ہے ۔ اس کا وجود وہ مرصع نیام ہے جس میں کوئی تیغ قاطع نہیں ۔ اقبال بڑے مزے سے، کہتے ہیں کہ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے ۔ لیکن میری نظر میں خود اس نسل ہی کا بود و وجود ہم نفس عدم ہے

تیرا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارتگروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

○

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود — مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

افرنگ زدہ (ضرب کلیم)

اقبال کی رائے ہے کہ مغربی نظام تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچلنے کی پوری کوشش کی ہے اور انہیں مردان کار کے بجائے مرد بیمار بنا دیا ۔ اور بانکا ۔ سجیلا ۔ صباحت پسند بن کر رہنا سکھا دیا ہے ۔ ان میں نزاکت و ملاحت ۔ نرمی اور تخنث اور نسائیت پیدا کر کے جہد و جہاد کی سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ میری نظر میں اس علم کی کوئی قیمت نہیں ۔ جو مجاہد ہے اس کے مردانہ اوصاف چھین لے ۔ اور مصارف زندگی میں آئے سامان آرائش دے کر اس کے ہتھیار لے لے ۔

اقبال بڑی دردمندی اور جاں سوزی کے ساتھ پرخلوص انداز میں نئی نسل کے مربی سے درخواست کرتے ہیں ۔ وہ جب ایک شفیق استاد اور مہربان و غم خوار مربی کی زبان سے یہ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ، سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں ۔ اور پوری ملت کا غم ان کے وجود میں سمٹ آیا ہے ۔

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے ان کو سبق خود شکنی خودنگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشان نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں زور جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

(اے پیر حرم) (ضرب کلیم)

از جناب شاکر سیالکوٹی

مختصر ـــــ سوانح

حضرت علامہ طالوت مرحوم

حضرت مولانا الحاج علامہ عبد الرشید نسیمؒ عربی تخلص طالوت

مولود یکم فروری ۱۹۰۹ء ۔ وفات ۳ مارچ ۱۹۶۲ء ۔ مقام چوٹی زیریں جمال خاں ضلع ڈیرہ غازیخان ۔

○

خلف الرشید حضرت مولانا مفتی محمد بخش صاحبؒ جو اپنے علاقہ اور زمانہ کے زبردست عالم فاضل محقق تھے ۔ علامہ طالوت کے والد ماجد کے علمی علو مرتبت کی ایک بے نظیر اور اہم مثال یہ کافی ہے کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے مجدد ملت نے اپنے فتاویٰ و مسائل میں تقریباً ایک درجن مقامات پر علامہ طالوتؒ کے والد ماجد صاحبؒ کی تحقیق کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی تحقیقات و مسائل سے رجوع فرمایا ۔ اور یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کمال اور بہت بڑی خوبی اور تعریف کی بات ہے جیسا کہ حضرت کے فتاویٰ سے ظاہر ہے ۔ بہرحال ایسے علامہ فہامہ قابل والد کے لائق بیٹے علامہ عبد الرشید طالوتؒ فاضل دیوبند تھے ۔

علامہ طالوت نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور پھر چونکہ دار العلوم کا طوطی بولتا تھا ان کے والد ماجد نے حضرت خواجہ تونسویؒ ، نواب جمال خاں مرحوم اور سردار احمد خاں صاحبؒ پتافی جیسے اہل الرائے کے مشورہ سے اپنے ہونہار لڑکے کو دار العلوم دیوبند بھیجا ۔ دار العلوم میں حضرت مولانا علامہ سید انور شاہ صاحبؒ شیخ الحدیث تھے علامہ طالوت مرحوم اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب کے بہت قریب ہو گئے تھے ۔ اور ایسا ہوتا کہ حضرت شاہ صاحب کی اردو تقریر بخاری کو ساتھ ساتھ عربی میں لکھتے جاتے اور پھر اپنا عربی ، فارسی اور منظوم کلام بھی حضرت شاہ صاحب کو گاہے دکھاتے ۔

جب دار العلوم سے فارغ ہوئے تو طالوت نے عرض کیا کہ حضرت کوئی خاص نصیحت فرمایئے کہ ہر لحاظ سے ایک پسماندہ علاقہ میں جا رہا ہوں ، خصوصاً دینی لحاظ سے لوگ کم علم ہیں اس لئے کوئی نصیحت اور دعا فرما دیجئے ۔

حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب نے فرمایا ! " عبد الرشید صاحب ' دیکھو اللہ نے تمہیں قلم کا علم اور شعری

حکمت سے نوازا ہے، تم اپنے قلم و علم کا رخ فتنۂ مرزائیت کی طرف پھیر لو، میں تمہارے اندر کچھ جواہرات دیکھتا ہوں اس لئے
تم اپنی زندگی کاش اپنے شعروں کے ذریعے نبوت کاذبہ کے خلاف جہاد میں صرف کرو!

اس کے بعد علامہ طالوت مرحوم السنہ شرقیہ کے علاوہ سرائیکی زبان کے اندر بھی فی البدیہہ اشعار کہتے تھے
اور ساری شاعری تحفظ ختم نبوت کیلئے وقف کر دی۔ حضرت علامہ طالوتؒ فاضل دیوبند ہونے کے بعد فاضل عربی، فاضل فارسی،
فاضل اردو، او۔ ٹی، جامع کمالات علمی و عملی تھے۔ کئی دفعہ سرکاری ملازمت ترک کرنے کا ارادہ فرمایا مگر اکابر اور خصوصاً
حضرت امیر شریعتؒ اور بعض دیگر حضرات نے منع فرمایا کہ تم تعلیمی اداروں میں ہی یہ کام کرو۔ حضرت امیر شریعتؒ اور حضرت
قاضی احسان احمد صاحبؒ، آغا شورش کاشمیری مرحوم اور چوہدری افضل حق صاحب مرحوم ان کے کلام کی بہت قدر افزائی
کیا کرتے تھے۔ آپ نسیم، طالوت، حساس، صخرۃ الوادی وغیرہ القاب سے مختلف اخبارات و رسائل میں نظم و نثر
کلام لکھتے۔ چنانچہ زمیندار، احسان کے علاوہ آزاد اور احرار وغیرہ اخبارات میں آپ کا کلام مختلف ناموں سے چھپتا
تھا۔ عربی، فارسی، اردو میں فی البدیہہ اشعار لکھتے تھے۔ رنگ اشعار میں مولانا ظفر علی خاں کے مشابہ تھے، چونکہ گمنام رہتے
اور شہرت پسند نہ تھے اس لئے اکثر قارئین ان کے کلام کو مولانا ظفر علی خاں کا کلام ہی سمجھتے۔

یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ طالوت کی ایک نظم جو ردِ قادیانیت سے متعلق تھی وہ مولانا ظفر علی خاں
کے مجموعہ کلام بہارستان میں شائع ہوئی جس کا مطلع تھا۔

قسم ہے قادیاں کے گل رخوں کی گل عذاری کی
غلام احمد کی الماری پٹاری ہے مداری کی

اور مقطع یہ کہ،

یہ مانا بھول جائے قادیاں میرے تحائف کو
مگر کیا بھول سکتا ہے وہ سوغاتیں بخاری کی

لکھنے کا مقصد حاشیہ نہیں کہ سرقہ ہوا بلکہ طالوت کے کلام میں مولانا کا رنگ اسقدر غالب تھا کہ مرتب
بہارستان (جو مولانا کے علاوہ کوئی اور ہوں گے) اس کلام میں امتیاز نہ کر سکے اور سہواً یہ نظم مولانا سے منسوب کر گئے۔

حضرت علامہ طالوت بہت کم آمیز، کم گو تھے، سادہ مزاج کے مالک تھے ...... راقم چار پانچ سال
ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے باوجود یہ معلوم نہ کر سکا۔ آپ نے حج بھی کیا ہوگا کہ جوان کا عالم تھا بالآخر جوہلی زیرین ان کے
قصبہ سے یہ معلوم کر کے حیرت و استعجاب ہوا کہ آپ نے نہ صرف خود حج کیا تھا بلکہ اپنے والد بزرگوار کو کندھوں پر
طواف و سعی کے علاوہ حج بھی اپنے اوپر سوار کر کے حج اکبر کا ثواب حاصل کیا۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اور ـــــــ ؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

حضرت علامہ طالوتؒ، اردو نثر کرتے ہیں رُھلی ہوئی زبان اور نہائی ہوئی قلم سے لکھتے۔ بعض روزنامچے افسانچے بھی لکھتے تھے۔ اشعار میں ہر لفظ نگینہ پاتا اور اشعار ہیچ موتیوں کا ہار بن جاتے کیا مجال کہ کسی شعر یا مصرع سے کوئی لفظ تبدیل ہو سکے بمعلوم یوں ہوتا تھا کہ یہ لفظ بنا ہی اس جگہ کیلئے تھا۔ آپ کے کلام میں شعروں میں ہر لفظ پر تشبیہ اتنی چست اور برمحل ہوتی کہ طبیعت مسرور ہو جاتی اور ذوقِ سخن جھوم جاتا۔ بہرحال حضرت علامہ طالوت نے خواجہ غلام فرید کے دیوانِ فرید پر سو صفحات سے زائد مبسوط اور فاضلانہ مقالہ لکھا تھا اور ان کی کافیوں کے مترجم تھے اور مداح !

پشاور یونیورسٹی کی دعوت پر ایم۔ اے عربی نصاب کیلئے ایک کتاب ترتیب دی لیکن پیام اجل نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔ تاریخ عربی ادب، ان کی غیر مطبوعہ تصانیف میں شامل ہے۔ ردِّ قادیانیت پر ان کی بیاض بیاض قلمی ہمارے پاس محفوظ و موجود ہے جس کا نمونہ شاملِ اشاعت ہے۔

؎ قلم بشکن سیاہی ریز دم درکش
حسنِ ایں قصہ عشق ست در دفتر نمے گنجد

ـــــــ از بانس سیالکوٹی

○

محمود اور طالوت

از حضرت شاکر سیالکوٹی

ایک جانب میرزا کے پوت ہیں ــ دوسری جانب مگر طالوت ہیں
ایک ہی داؤد کافی سب کو ہے ــ کیا ہے گر لشکر میں سو جالوت ہیں
بھاگتے ہیں عبادول کے حکم سے ــ گھر کے اندر شاہ باجبروت ہیں
کھا کے عنبر اور پی کر ٹانکیں ! ــ خواب میں وہ سائر لاہوت ہیں
قتل و جور، اخراج، بدگوئی و سب ــ مرتسیو کی نت نئی کرتوت ہیں

تانا، بانا کفر اور تلبیس کا
جس سے ہو طیار یہ وہ سوت ہیں

○

بیادِ حضرت علامہ طالوت علیہ الرحمۃ۔ جنوری ۱۹۳۸ء

اسلام کے احرار

تھام لو بہرِ خدا تبلیغ کی تلوار کو!

ہم مٹانے والے ہیں سب فتنۂ اشرار کو　　اے خدا تو فتح دے اسلام کے احرار کو

قادیانی پائے آزادی میں ہیں خارِ مغیل　　نوکِ سوزن سے نکالو بھائیو اس خار کو

دشمنانِ ملک و ملت سے تمہاری جنگ ہے　　تھام لو بہرِ خدا تبلیغ کی تلوار کو

ہے نبوت کے لئے تہذیب شرطِ اولیں　　ہم نبی کیوں کر کہیں پھر شاتمِ ابرار کو

جب پلومر کی ہو ٹانک وائن ہی سر پہ سوار　　کیوں نہ ہوں الہام اک بدمست کو میخوار کو

خطۂ پنجاب میں بھیجا ہے افیونی نبی　　ربِّ لندن سے شکایت ہے یہی احرار کو

کہ پنجاب والے ہیں سب سے بلند

تفاخر ہوا گر گناہوں پہ واں　　تو روزِ قیامت یہ ہوگا عیاں

کہ پنجاب والے ہیں سب سے بلند　　کہ پنجاب ہی میں تو ہے قادیاں

از حضرت علامہ طالوت علیہ الرحمۃ ۱۹۴۱ء

مولانا محمد یوسف لدھیانوی
مدیر "بینات"

پرویزانِ ایں عصر

اور

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

پرویزی فتنہ انگریز کے عہد نحوست میں جو تحریکیں اسلام کو مسخ و محرف کرنے کیلئے اٹھیں ان میں سب سے پہلی تحریک نیچریت کی ہے۔ پھر ایک طرف "قادیانیت" نے نئی نبوت کے روپ میں جنم لیا۔ اور دوسری طرف "چکڑالویت" نے انکارِ حدیث کا فتنہ برپا کر دیا۔ اس کے بعد خاکسار تحریک نے سر اٹھایا، اور پھر ان سب تحریکوں کا سرا ہوا ملغوبہ مسٹر پرویز کے حصہ میں آیا۔ اور ان سب پر کمیونزم کا تعفن اور مستزاد ہوا۔ چنانچہ پرویزی لٹریچر میں کمیونزم کا پورا معاشی ڈھانچہ اور اس کی مذہب بیزاری، نیچریت کی مادہ پرستی، قادیانیت کا انکار جہاد، چکڑالویت کا انکار سنت خاکساروں کی تحریف و تاویل سب خرابیاں یکجا موجود ہیں۔ اور مسٹر پرویز کے قلم کی روانی نے ان غلاظتوں میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

"فزادتہم رجساً الیٰ رجسہم" [1]

مسٹر غلام احمد پرویز بدقسمتی سے مرزا غلام احمد قادیانی کا ہم نام بھی ہے، ہم وطن بھی، الحاد و زندقہ میں اس کا ہم مسلک بھی۔ وہ ایک زمانہ میں حدیث و سنت کا پرجوش حامی تھا۔ اس موضوع پر موصوف کا ایک مقالہ "جو الفرقان لکھنؤ" میں چھپا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے لیکن بدقسمتی سے انگریزی دورِ اقتدار نے دہلی کے سیکرٹریٹ میں پرویز کی ساخت پرداخت کی، موصوف نے اپنے پیشرو داعیانِ ضلال کے افکار و نظریات کو جذب کیا اور انہیں نئے انداز میں اگلنا شروع کیا۔ اس کے لئے "انجمن طلوعِ اسلام" کی بنیاد ڈالی گئی۔ موصوف کے ذہنی خیالات کا خاکہ ابھی غیر مرتب ہی تھا کہ ملک تقسیم ہوا اور پرویز صاحب کو دہلی سیکرٹریٹ کی بجائے کراچی سیکرٹریٹ میں پناہ ملی۔ یہاں لادین افسر شاہی کی آشیر باد سے موصوف نے قرآنی نظام ربوبیت کا خاکہ مرتب کیا جس کے دستور اساسی کی پہلی دفعہ یہ تھی:۔

"قرآن کریم میں جہاں اللہ اور رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد "مرکز نظام حکومت" ہے۔" [2]

معارف القرآن ج ۴ ص ۶۲۳ (از پرویز)

---

[1] مولانا عبدالرشید نعمانی، پیش لفظ، متفقہ فتویٰ پرویز کافر ہے۔ [2] پرویز صاحب کے تمام حوالے "متفقہ فتویٰ" سے لئے گئے ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو "رسول اللہ" بننے کے لئے وحی و الہام کا افسانہ تراشنا پڑا تھا مگر چوہدری غلام احمد پرویز کی "قرآنی بصیرت" نے غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان وغیرہ کو بیک جنبش قلم "خدا اور رسول" بنا دیا۔ اس قدر افزائی پر ارباب اقتدار کی باچھیں کھل گئیں۔ پرویز صاحب کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لئے سرکاری وسائل کے دھانے کھل گئے۔

پرویز صاحب نے خدا اور رسول تو نئے تلاش کر لئے۔ اب سوال ہوا کہ اس نئے خدا اور رسول کی اطاعت کیسے کی جائے! اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا کیا کیا جائے؟ پرویز صاحب کی بصیرت نے اس کا حل یہ نکالا کہ پورے دین کو ان کے "خدا اور رسول" یعنی ارباب اقتدار کے اپنے منشا کے مطابق بدل دیا جائے۔ وہ نماز کو بدلنا چاہیں تو بدل دیں، روزہ پر خط تنسیخ پھیرنا چاہیں تو پھیر دیں، نظام زکوٰۃ کو گڑبڑ کرنا چاہیں تو کر لیں۔ الغرض ارباب اقتدار یا پرویز صاحب کے خدا و رسول کا کام ہے۔ دین کو مسخ کرنا اور مسلمانوں کا کام ہوگا۔ اس نت نئے مسخ شدہ دین پر بغیر چوں و چرا کے عمل کرنا ——— پرویز صاحب لکھتے ہیں:-

"قرآن کے ساتھ انسان کو بصیرت عطا ہوئی ہے اس لئے جن امور کی تفصیل قرآن نے خود بیان نہیں کی ان کی تفصیل قرآنی اصولوں کی روشنی میں از روئے بصیرت متعین کی جائے۔ یہی رسول اللہ نے کیا اور ہمارے لئے بھی ایسا کرنا منشاءِ قرآنی اور سنتِ رسول اللہ کے عین مطابق ہے۔ اس بات میں اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی تخصیص نہیں۔ اگر تفریق مقصود ہوتی تو عبادت کی جزئیات قرآن خود ہی متعین کر دیتا ہے۔ ——— مقام حدیث ج ا ص ۴۲۴

جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ قانون اور عبادت دونوں پر منطبق ہوگا۔ یعنی اگر جانشین رسول اللہ (قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ رد و بدل ناگزیر سمجھے تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہے۔ ——— قرآنی فیصلے ص ۱۴۱

چلئے دونوں اصول طے ہو گئے، اول یہ کہ پاکستان میں "خدا اور رسول"، حکمران ٹولے کا نام ہے، دوسرے یہ کہ پرویز صاحب کے یہ "خدا اور رسول" اسلام کے عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات اور سیاست و معاشرت میں جو رد و بدل کرنا چاہیں اس کی انہیں کھلی چھٹی ہے۔ گویا مسٹر پرویز کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پورا دین تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس رد و بدل کا خاکہ خود پرویز صاحب کو مرتب کرنا تھا اور وہ جن خطوط پر اس خاکہ میں رنگ بھرنا چاہتے تھے اس کی صرف دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

◉ حلال و حرام کا قصہ یوں نمٹایا گیا کہ:۔

"سید محمد صبیح صاحب نے اس حلال و حرام کی تحقیق میں بتایا کہ قرآن کی رو سے صرف مردار، بہتا خون، لحم خنزیر اور غیر اللہ کے نام سے منسوب چیزیں حرام ہیں۔ ان کے علاوہ اور کچھ حرام نہیں (گویا پیشاب، پاخانہ بھی حلال۔ ناقل) یہ قرآن کا واضح فیصلہ ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہمارے مروجہ اسلام میں حلال و حرام کی جو طولانی فہرستیں ہیں

وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں اور کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی شے کو حرام قرار دے، یہ حق صرف اللہ کو ہے"
_______ طلوع اسلام مئی ۵۲ء صفحہ

اور پورے دین کے بارے میں یہ فلسفہ ارشاد ہوا کہ قرآنی احکام عبوری دور کے لئے ہیں۔ ورنہ اسلام اصل منشاء مارکس ازم قائم کرنا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لئے دیئے گئے ہیں؟ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے اس لئے وہ جہاں اس پروگرام کی آخری منزل سے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے عبوری دور کے لئے بھی ساتھ کے ساتھ رہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات سے _____ متعلق احکام اسی عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے معاشرہ گذر کر انتہائی منزل تک پہنچتا ہے اور وہ انتہائی منزل وہی مارکسزم۔ (ناقل)
_______ نظام ربوبیت ص ۲۵

انہی دو اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ پرویز صاحب نے اپنے مرکز ملت کو شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کے منسوخ کرنے کی سند مرحمت فرما دی تھی۔

مسٹر پرویز کو احساس تھا کہ علماء موصوف کے اس خود تراشیدہ "بُت" کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوں گے اور نہ پرویز کے "خدا و رسول" کو اسلام میں ترمیم و تنسیخ کی اجازت دیں گے۔ اسلئے پرویز صاحب نے اسلام کے تمام اصول و فروع کیساتھ ساتھ اسلام کی سیکورٹی فورس (علماءِ اُمت) کی طرف اپنی اکادمی توپوں کا رُخ موڑ دیا۔ کبھی نماز کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، کبھی زکوٰۃ کا، کبھی روزے کا اور کبھی حج کا۔ کبھی جنت اور کبھی دوزخ کا اور آخرت کا اور ان سب سے پہلے اس ملّا کو نشانہ بنایا گیا جو حریم اسلام کی پاسبانی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

پرویز صاحب لکھتے ہیں:۔

جب تک دین کی باگ ڈور مولوی کے ہاتھ میں ہے، صدقات نکلتے رہیں گے، زکوٰۃ دی جاتی رہے گی، قربانیاں ہوتی رہیں گی لوگ حج کرتے رہیں گے اور قوم بدستور بے گھر، بے در، بھوکی، ننگی اسلام کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کا موجب بنی رہے گی۔
_______ قرآنی فیصلے ص

پرویز صاحب "مرکز ملت" کی طاقت سے پورے دین کو نپٹ کرنا چاہتے تھے لیکن علماءِ اُمت ان کے خاکوں کے رنگ میں بھنگ ڈال دیتے تھے۔ پرویز صاحب کے "خدا و رسول" (جن کو وہ مرکزِ ملت سے بھی تعبیر کرتے تھے) نے[1] اوّل تو ملاؤں کو سمندر پار بھجوانے کی دھمکی دی مگر اس کی تعمیل ذرا مشکل نظر آئی تو دوسری تجویز سوجھی کہ باہر سے جید اہل علم کو بلوا کر ان کے سامنے پرویز صاحب اپنے سحر آفرین "نظام ربوبیت" کی توضیح فرمائیں تو شاید پاکستان کے علماء بھی مسحور ہو جائیں

[1] اس وقت سکندر مرزا تھا۔

اور ساتھ کے ساتھ پرویز صاحب نے دین میں ردّ و بدل کی جو سکیم تیار کر رکھی تھی اس کی پہلی قسط کی تصدیق ان بیرونی اہل علم سے ہو جائے چنانچہ ، ۱۹۵۷ء کے اواخر اور ۱۹۵۸ء کے اوائل میں لاہور میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی جس کا اہتمام بڑے طمطراق سے پرویز صاحب کے "خدا اور رسول" نے کیا تھا۔ اور اس بارات کے دولہا خود پرویز صاحب تھے۔

بحث کا موضوع بنک کے سود کی حلت اور بے پردگی کی اجازت تھا۔ جس میں ساری دنیا مبتلا ہے۔ مصر سے خاص طور پر اہل علم کو مدعو کیا گیا، کیونکہ مصر ایک مدت سے آزاد خیالی میں پیش رو مشہور کیا جاتا ہے۔ پاکستان سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو دعوت دی گئی۔ ہندوستان سے مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھنوی اور صدق جدید کے مدیر کو بلایا گیا۔

عرب ممالک سے جو مندوبین تشریف لائے حضرت بنوریؒ کا ان سے تعارف تھا۔ وہ کراچی مدرسہ نیو ٹاؤن تشریف لائے تو حضرت نے نوکر شاہی کی سازش، پرویز صاحب کی سکیم اور اس مجلس مذاکرہ کے اغراض و مقاصد ان کے سامنے تفصیل سے بیان کئے، دنیا بھر کے مسلمان خواہ کتنے ہی گئے گذرے کیوں نہ ہوں ان سے یہ توقع رکھنا کہ پرویز صاحب کے مرکزِ ملت کو "خدا اور رسول" ہونے کی سند عطا کر دیں گے، کھلا جنون ہے اور اس کی توقع سکندر مرزا کے سائے میں پرویز صاحب ہی سے کی جا سکتی ہے کسی عالم دین سے اس کی اُمید کب ہو سکتی ہے۔

چنانچہ مندوبین نے مجلس مذاکرہ میں پرویز صاحب کا مقالہ سُنا تو بیشتر کاروائی اس کی تنقید پر صرف ہوئی۔ اور پرویز صاحب اور ان کے "خدا اور رسول" کو وہ ذلت اٹھانا پڑی جس کا گھاؤ آج تک ان کے جگر میں ہو گا۔

اقتدار کے سائے میں پرویز صاحب کے نظریات کی نشر و اشاعت ہو رہی تھی علماءِ اُمت اور ارباب قلم اس کی تحریفات کا توڑ کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے بحث و جدال کا معرکہ برپا تھا۔ حضرت نے محسوس کیا کہ یہ نشار کی کھٹ کھٹ اس فتنہ کے قلع قمع کے لئے کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس شجرۂ خبیثہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے پرویزی لٹریچر جمع کرایا اور پرویزی کفریات کو ایک استفتا کی شکل میں مرتب کر کے جناب مفتی ولی حسن ٹونکی مفتی مدرسہ عربیہ اسلامیہ سے اس کا جواب لکھوایا اور پھر اس فتویٰ کو علماءِ پاک و ہند کے سامنے پیش کیا چنانچہ مشرقی و مغربی پاکستان کے تمام دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علماء نے متفقہ طور پر تصدیق کی کہ جو شخص ان کتابوں کا پرچارک ہو جو پرویز صاحب کی کتابوں سے مرتب کئے گئے ہیں اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس طرح چوہدری غلام احمد پرویز کو اس کے ہم نام، ہم وطن اور ہم مسلک مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ وادیٔ کفر میں دفن کر دیا گیا۔

اس فتویٰ کو تقریباً ایک ہزار علماء کی تصدیقات کے ساتھ ایک رسالہ کی شکل میں شائع فرمایا۔ اس کے بعد ایک سوالنامہ عربی میں خود مرتب فرمایا اور عرب ممالک کے اہل علم سے اس کی تصدیق چاہی۔ حرمین شریفین، شام اور مصر کے علماء نے بھی پرویز کے ملحد و زندیق ہونے کا فتویٰ دیا تو اسے پرویز کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ ہے "اضافات جدیدہ" کے نام سے دوبارہ شائع فرمایا۔۔۔ یہ تھا حضرت بنوریؒ کا پرویزی فتنہ کے خلاف اہم ترین کارنامہ جس سے اس فتنہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

مولانا مطیع اللہ استاذ جامعہ

کیا اقبال منکرِ حدیث تھے؟

۶۔ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ (شارح اقبال) فرماتے ہیں۔

"اور لاہور میں یہ بھی طلوع ہوا ہے کہ ایک شخص جو شخصیت رسول کی اہمیت گھٹانے پر مامور ہے۔ اور دین کو تجدد پسند اور امیر مسلمانوں کے سہل اور غیر ذمہ دارانہ طرز زندگی کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک فرقے کی بنیاد رکھ چکا ہے، بدقسمتی سے اپنی مجلس کی رونق اشعار اقبال ہی سے بڑھا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رسول ہی کو نہیں مانتا۔ اور اپنے آپ کو قرآن کا عمرؓ و ابوبکرؓ سے بہتر مفسر سمجھتا ہے وہ اقبال کو کیا مانے گا! مگر رونق بڑھانے کے لئے اشعار اقبال کو بھی گاتا ہے۔ یہ بظاہر اقبال کی مقبولیت کی علامت ہے۔ مگر اسی مقبولیت کے اندر مسخ اقبال کے تماشے بھی ہو رہے ہیں۔ اور وہی یہ پہلو ہے جس کی خاطر پیغام اقبال کی حفاظت کی بھی ضرورت ہے:"

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

شورش مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔

"جس اساس پر فکر اقبال کی عمارت کھڑی ہے اس کا علم اور اس کی معرفت حاصل کرنی چاہیئے۔ پروفیسر آل احمد سرور کو ایک خط میں لکھا ہے:" میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔

جن لوگوں نے کلام اقبال پر "ناقدانہ" نگاہ ڈالی ہے ان میں سے اکثر حقائق اسلامیہ سے بے بہرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت سی بنیادی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ یہ لوگ قرآن سے نابلد ہیں۔ حدیث کا فہم نہیں۔ سیرت سے بیگانہ۔ اور

سنت سے معری ہیں۔ تاریخ اسلام کے نظری، فکری اور سیاسی مباحث کا انہیں شعور نہیں۔ اسلام کو جن داخلی فتنوں سے دوچار ہونا پڑا، ان کے مضمرات سے انہیں شناسائی نہیں۔ اور نہ اس بارے میں بصیرت رکھتے ہیں"

فتنۂ کبریٰ غلام احمد اول سے غلام احمد پرویز دوم کا فتنہ کم نہیں۔ غلام احمد مرزا مقام نبوت کا منکر تھا۔ اور غلام احمد چوہدری کلام نبوت کا منکر ہے۔ اور بڑے تعجب اور ستم کی بات ہے کہ وہ اپنے جدید طلوع ہونے والے اسلام کو اقبال کی طرف منسوب کرتا ہے۔ "طلوع اسلام" پر " بیاد گار اقبال " لکھتے ہوئے یہ باور کرانے کی سعی نا پاک کرتا ہے کہ اقبال بھی پرویزی نظریہ کے حامل تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم قرآن وسنت اور حجیت حدیث کے قائل تھے۔ غلام ثانی پرویز دوم کو اپنے جدید طلوع اسلام " کے سرورق پر اقبال کا نام لکھتے ہوئے شرم آنی چاہیئے۔

اقبال فرماتے ہیں۔ ؎

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نداست ایں فقیرے — چہ گفت و با کہ گفت واز کجا بود

اقبال اور حجیت حدیث

اقبال ایک حدیث کی طرف اشارہ فرماتے ہیں ؎

جہاں تمام میراث ہے مرد مومن کی — میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

دوسری جگہ اس حدیث کی تشریح ہے۔ ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

ایک مقام پر سورۂ والنجم کی آیات معراج جسمانی پر یوں گویا ہیں ؎

امیٔ پاک از ہویٰ گفتار او — شرح رمز ما غویٰ گفتار او

ڈاکٹر اقبال نظام مصطفیٰ کو اس طرح لکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ؎

ہست دین مصطفیٰ دین حیات — شرع او تفسیر آئین حیات
تا شعار مصطفیٰ از دست رفت ! — قوم را رمز بقا از دست رفت

ختم الرسل ؐ کے حوالہ سے لکھتے ہیں ؎

مگسل از ختم الرسل ایام خویش — تکیہ کم کن بر فن و برگام خویش

اور حدیث وسنت کو راہ مصطفیٰ سے یوں تعبیر کرتے ہیں ؎

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر　　بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ گیر
گشودم پردہ را از روئے تقدیر　　مشو نومید و راہِ مصطفیٰ گیر

منکرین حدیث کے خلاف ڈاکٹر اقبال کی بانگ درا ملاحظہ ہو۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار　　مصلحت وقت ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار　　ہو گئی کس کی نگاہ طرزِ سلف سے بیزار

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں

قارئین کرام ذرا خط کشیدہ الفاظ پر غور و فکر فرمائیں۔

آئین رسول مختار، حدیث و سنت ہی کا نام ہے۔ جو لوگ حدیث و سنت کے تارک یعنی منکر ہیں وہی مصلحت وقت کا راگ الاپتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کی تبدیلی سے اسلام کے مسائل کو بدلنا چاہتے ہیں اقبال پوچھتا ہے کہ تمہاری آنکھوں میں غیروں کا شعار کیوں سمایا ہوا ہے۔ اور تم طرزِ سلف سے کیوں بیزار ہوتے جا رہے ہو۔ سلف صالحین اور اسلاف کا طرز اقبال کے نظریہ میں نہایت ضروری ہے۔

آخر میں اقبال صاف صاف لفظوں میں پرویزی فتنہ اور پرویزیت پر لعنت بھیجتا ہے۔

نالۂ آں رحمۃ للعالمین　　کرد چاک از کبر پرویز لعین!
در جہاں ہر آنکہ پرویزی کند　　نالۂ ہائے مصطفیٰ را سے درد

ڈاکٹر اقبال اس رباعی میں پرویز اول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "پرویز اول" نے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے نامۂ مبارکہ یعنی حدیث نبوت اور پیام رسالت کا انکار کیا۔ یہ دور اول کا پرویز تھا جو حدیث رسول، سنت نبوی کا انکار کر کے لعنتی ہوا۔

اقبال کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو حدیث و سنت کا انکار کرے وہ اپنے وقت کا پرویز ہے۔ اور نامۂ مبارکہ کو پھاڑنے والے پرویز سے کسی صورت میں کم نہیں۔ بلکہ حدیث کا منکر کافر ہے۔ ڈاکٹر اقبال اپنے کلام میں متعدد مقامات پر پرویزان این عصر لکھتے ہوئے ایسے غلام پرویز جیسے منکر الحدیث کی طرف تلمیحات فرماتے ہیں۔

ان دلائل و شواہد کے بعد یا تو غلام پرویز کو انکار حدیث سے توبہ کر کے حجیت حدیث کا قائل ہو جانا چاہیے۔ ورنہ اپنے نئے طلوع ہونے والے اسلام سے اقبال کے نام کا استعمال ترک کر دینا چاہیئے کہ اقبال حجیت حدیث اور دین میں سنت رسول کے قائل تھے ؛

مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا فتنہ

مسٹر پرویز کے خلاف حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ نے جو اقدام کیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ صدر ایوب خان "فیلڈ مارشل" بن جانے کے بعد "مسند اجتہاد پر بھی قابض ہو چکے تھے"۔ اور رفتہ رفتہ اسی راستے پر گامزن تھے جس پر مغل شہنشاہ اکبر اعظم چل نکلا تھا۔ چونکہ مسٹر پرویز نے انہیں "مرکز ملت" کی حیثیت سے نہ صرف دین میں تغیر و تبدل کے اختیارات سونپ دیئے، بلکہ دور جدید کے "خدا اور رسول" کا منصب بھی عطا کر دیا تھا۔ اس لئے صدر ایوب ان دنوں ایک "سرکاری دارالافتاء" قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ جس کا "مفتی اعظم" مسٹر پرویز کو بنایا جانا تجویز ہو چکا تھا۔ مولانا شبیر علی تھانوی مرحوم نے حضرت بنوری رح کے سامنے صورت حال کا سارا نقشہ رکھا۔ اور اس شر کے سدباب کے لئے کسی مؤثر اقدام کی اپیل کی۔ حضرت رح نے علمائے اسلام کا متفقہ فتوئے "پرویز کافر ہے" مرتب کر کے اس عظیم ترین سازش کو خاک میں ملا دیا۔ عام پبلک پر مسٹر پرویز کی حقیقت واضح ہوگئی۔ اور ارباب اقتدار اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے۔ اب انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ کراچی میں ایک "مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی" قائم کیا۔ اس میں اسلام پر تحقیقات کرنے کے لئے چن چن کر ایسے افراد بھرتی کئے گئے جن میں اکثریت تجدد اور کج فہم ملاحدہ کی تھی۔ اور پھر اس ادارہ کی سربراہی کے لئے میکگل یونیورسٹی کے ایک مستشرق کو امریکہ سے درآمد کیا گیا۔ یہ شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے ذریعہ کیا کام تفویض کیا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے۔ میں جناب حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ کے ایک مکتوب کا جو انہوں نے ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اقتباس نقل کرتا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"کئی سال ہوئے ایک بہت بڑے مسلمان سرکاری عہدے دار نے جو غالباً "سر" کا خطاب بھی رکھتے ہیں۔ مجھ سے دوران گفتگو کہا تھا کہ آپ لوگ اور آپ کے یہ مذہبی

حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اور باطنیت والحاد کا جو فتنہ ہزار برس پہلے ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ آج تمام عالم اسلام میں پھیل چکا ہے۔ ملاحدہ نے آج میدان کو خالی دیکھ کر اور فضاء کو ساز گار سمجھ کر وہ گل کھلانے شروع کر دیئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے "تحریف دین کا نام تحقیق اسلام" ہے۔ "الحاد فی الدین کا نام اظہار حقیقت" ہے۔ حقائق دین کو اس طرح پامال ہوتا دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کیا کیا جائے۔

" از ماست کہ بر ماست "

اسلام کی غیرت و بے چارگی کا یہ دور انتہائی حسرت ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔
انا للہ وانا الیہ راجعون "

اس تمہید کے بعد قرآن کریم کی آیات سے " وحی " کی تشریح فرماتے ہیں۔ وحی کے اوصاف وخصوصیات تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ اور آخر میں لکھتے ہیں۔

" سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ سب کچھ ایمانی بصیرت اور ایمانی نور سے محرومی کا نتیجہ ہے۔ یا پھر ان حقائق الٰہیہ سے جہل عظیم کا ثمرہ ہے۔ خدارا انصاف کیجئے۔ کہ تمام قرآن اور تمام وحی کو پیغمبر کا اخلاقی تجربہ اور توسیع ذلت بتلایا جائے کیا یہ صریح گمراہی نہیں ؟ حقائق بین نگاہیں محسوس کرتی ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے دین اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اور اپنے اسلاف مستشرقین کی دلی آرزوؤں کو پورا کر کے وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ان سے نہ ہو سکا "

یہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف حضرت رہ کا آخری اداریہ تھا۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ چھ سال تک مسلسل حضرت رہ اس فتنہ کے قلع قمع کے لئے سرگرم رہے۔ اور اس تندہی، تلخی، اور تیزی سے اس پر پے در پے ضربیں لگاتے رہے کہ پورے ملک میں اس کے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور " فیلڈ مارشل " کا مطلق العنان اقتدار اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا " جدت پسند اسلام " اس طوفان کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھانے لگے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب " اسلامی تحقیقات " کے منصب سے معزول ہو گئے۔ حضرت رہ اس آخری اداریے میں، جس کا اقتباس اوپر نقل کر چکا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

" یہ سطریں زیر قلم تھیں کہ معلوم ہوا " ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر جو ان لغویات کے علمبردار تھے عوام کے احتجاج پر اپنے منصب سے برطرف کر دیئے گئے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس وقت تو ان کی رہنمائی میں " ماہنامہ فکر ونظر " اور " اسلام " وغیرہ کتابوں

کے ذریعے جو بیج ڈالا گیا ہے اس کا کیا کیا جائے گا ؟

اب تک جتنا لٹریچر ظہور میں آچکا ہے ۔ وہ "غرق مے ناب اولیٰ" کا مصداق ہے جب تک اس کو دریا برد نہ کیا جائے اس وقت تک کیا اطمینان ہے کہ آئندہ پھر کچھ نہیں ہوگا ۔ اور ان تحریفات و الحاد پر اس وقت تک پاکستان کے خزانے کا جو لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا ، اس کا کیا تدارک کیا جائے گا ؟ اور جو ہم خیال اسٹاف اپنے ارد گرد جمع کیا تھا اس کا کیا حشر ہوگا ؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ "امین" ہاتھوں میں دیا جائے اور ان کی علمی و دینی معاونت کے لئے علمائے امت میں سے معتمد ترین افراد کا انتخاب کیا جائے ۔ جن کے علم و تقوے پر امت کو اعتماد ہے ۔ اور وہ شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔

اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان تحقیقات کے لئے دائرہ عمل متعین کیا جائے ۔ اور دین کے مسلمات کو زیر بحث لانے کی اجازت نہ دی جائے ۔ جب تک یہ روک تھام نہ ہوگی ۔ اس وقت تک قابل اطمینان صورت ملک میں پیدا نہ ہوگی "

لیکن افسوس ہے کہ اقتدار نے اس مخلصانہ نصیحت کو گوش ہوش سے سننا گوارا نہ کیا ۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے "مربی و محافظ" فیلڈ مارشل کی بساط اقتدار بھی الٹ گئی ۔ ع

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(از بینات اشاعت خاص حضرۃ بنوریؒ نمبر)

◎

مشعل دین

حضرت مولوی حسین احمدؒ	مشعل دین حق ولی اللہ
ان سے تھی بزم دین پر رونق	رضی اللہ عنہ ثم ارضاہ

محترمہ خورشید جہاں

◎

لیڈرِ اعظم

مذہبیت سے ہے لیڈر بے خبر　　　عشق ہے پتلون سے اور کوٹ سے

لیڈر آزادی سے قطعاً بے نیاز　　　اس کو الفت ہے تو بس ایک ووٹ سے

بھٹیاں ہیں امتحاں کی انتخاب　　　اب کھرے ہونگے الگ ہر کھوٹ سے

خبثِ تہذیب نو ہی سے آشکار　　　حملے گو کرتے ہیں ٹوڈی اوٹ سے

یہ سب بے چارے ہیں کرائے کے غلام　　　کام کیا کیا چل رہے ہیں نوٹ سے

ظالمو! یہ عالموں پر پھبتیاں

بچنا دستِ بے صدا کی چوٹ سے

حضرت شاکر سیالکوٹی

"تصحیح نامہ" "الرشید" "دارالعلوم دیوبند نمبر"

دارالعلوم دیوبند خاص شمارہ "الرشید" کے قارئین و ناظرین کی خدمت میں "اہم تصحیح نامہ" پیش کیا جا رہا ہے۔ بعض حضرات نے ناقدانہ انداز سے تنقیدی اغلاط پر خامہ فرسائی فرمائی۔ اور بعض اہل علم نے بعض صفحات پر کچھ سنین کی اہم اغلاط پر توجہ سامی فرمائی۔ قارئین "الرشید" خصوصاً "دارالعلوم دیوبند نمبر" کے مطالعہ کنندگان حضرات کی راہ نمائی کے لئے یہ تصحیح کنندہ حضرات کے شکریہ سے "خصوصی نمبر" میں شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

نمبر شمار	صفحہ نمبر	اغلاط	تصحیح
۱	۲۰۸	۱۳۵۶ھ	سن وفات غالباً ۱۲۶۶ھ ہوگا
۲	۲۱۰	۱۲۸۲ھ	۱۲۸۷ھ
۳	۲۷۲	حضرت گنگوہی رح کی شمولیت محل نظر ہے ؟	
۴	۲۸۴	۱۲۸۲ھ	۱۲۸۷ھ
۵	۳۳۹	۱۱۷۴ھ	۱۱۷۶ھ
۶	۳۳۹	محقق طوسی	نظام الملک طوسی
۷	۳۳۹	ابوالحق	ابواسحاق
۸	۴۳۲	۱۹۲۸ء	۱۹۱۸ء
۹	۵۲۸	۱۳۵۴ھ	۱۳۵۲ھ
۱۰	۵۳۹	۱۳۱۰ھ	۱۳۰۷ھ
۱۱	۵۴۳	۱۳۲۷ھ	۱۳۲۰ھ
۱۲	۵۷۹	۱۹۳۴ء	۱۹۳۲ء
۱۳	۶۵۳	۱۹۱۶ء	۱۹۱۵ء
۱۴	۶۵۵	۴۰ سال	۴۰ سال
۱۵	۷۲۰	۱۳۱۰ھ	۱۲۱۷ھ

بگرامی خدمت حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب داست فضائلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں آمین ۔

دار العلوم دیوبند نے گذشتہ صدی میں اسلام اور مسلمانوں کی جو بینظیر علمی اور اصلاحی خدمات انجام دی ہیں وہ جناب سے مخفی نہیں ۔ انہی عظیم خدمات کے تذکرے اور دنیا کو ان سے آگاہ کرنے کیلئے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے مارچ ۱۹۷۷ء میں "دار العلوم دیوبند کی صد سالہ تقریب" منانے کا ارادہ کیا ھے جسمیں اطراف عالم سے تمام فضلاء دار العلوم کو مدعو کیا جارہا ہے ، اس کے علاوہ عالم اسلام کے ممتاز اہل علم و فضل بھی انشاء اللہ اس مبارک اجتماع میں شرکت کرینگے ۔

دار العلوم دیوبند کے فضلاء کی بہت بڑی تعداد چونکہ پاکستان میں ہے، اسلئے اس تقریب کے بہت سے مسائل پاکستان سے وابستہ ہیں ۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند آجکل پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں ، اور ان کی خواہش پر ان مسائل کے سلسلے میں بعض مخصوص اہل علم کی ایک مجلس مشاورت ۳۱ مارچ ۷۶ء بروز چہارشنبہ صبح ساڑھے نو بجے دار العلوم کورنگی کے ایریا کراچی میں رکھی گئی ہے ، جسمیں خود حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم بھی تشریف فرما ہونگے ، دار العلوم دیوبند ہماری مادر علمی ہے ، اور ہم سب پر اس کے حقوق ہیں ۔ لہذا جناب سے گذارش ہے کہ مذکورہ تاریخ پر اس اجتماع میں ضرور تشریف لائیں ، تاکہ اس تقریب سے متعلق ضروری مسائل باہمی مشورے سے طے کئے جاسکیں ۔ قیام و طعام کا انتظام دار العلوم کورنگی میں تجویز کیا گیا ہے ۔ تشریف آوری کی تاریخ اور وقت سے پیشگی مطلع فرمادیں ۔ تاکہ استقبال کیلئے آدمی پہنچ سکیں

والسلام

محمد یوسف بنوری

محمد شفیع

[stamp: illegible]

ملطبعہ
المدرسۃ العربیۃ الاسلامیہ
نیو ٹاؤن کراچی نمبر ۵

مخدومی و محترمی حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب دامت برکاتہم
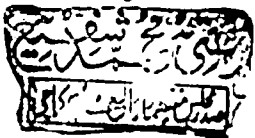
از احقر الانام احمد علی عفی عنہ - السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کی

یادگار منانے کی اطلاع موصول ہوئی - آپ کی اس مبارک تحریک کا خیر مقدم کرتا ہوں

اگر کوئی قوی مانع پیش نہ آیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ شریک ہو جاؤنگا - سرپرستی کے

متعلق یہ عرض ہے - کہ میں اس عہدہ جلیلہ کے لئے اپنے آپ کو اس کا اہل ہرگز نہیں

سمجھتا - کسی اور صاحب کو تجویز فرمالیں - حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت

سلام مسنون عرض کر دیں - فقط   ۱۴ر جنوری ۱۹۵۷ء

مکرمی و محترمی مولانا حبیب اللہ صاحب - دامت معالیکم

از احقر الانام احمد علی عفی عنہ - السلام علیکم ورحمۃ اللہ - اپنے جامعہ

رشیدیہ کے تمام شعبوں کے اساتذہ کرام اور تعداد طلبہ سے مطلع فرمائیں

- میں ان اعداد و شمار کو خطبہ جمعہ میں ذکر کرنا چاہتا ہوں - امید ہے

کہ جواب سے جلدی مطلع فرمایا جائیگا - فقط

۱۳۷۷ھ

۱۴ر رمضان المبارک

مکتوبات حضرۃ شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب

بنام ناظم اعلیٰ و مدیر جامعہ رشیدیہ

ساہیوال

ع فیاس کن زگلستان من بہار را

آئینہ مضامین

اور ان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور اکابر دیوبند پر علمی مقالات نثر و منظومات پر صد سالہ تاریخی مجموعہ و دستاویزات تاریخی و سیاسی معلومات حاصل کرنے کے لئے "دارالعلوم دیوبند نمبر" جامعہ رشیدیہ ساہیوال پاکستان سے حاصل فرمائیں۔

ماہنامہ الرشید ساہیوال —— رجسٹرڈ ایل نمبر ۸۰۵۴
ٹیلیفون نمبر ۲۳۵۶

دیوبند

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ملتِ بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند
حکمتِ بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دو چند

اسم تیرا با مسمّیٰ، ضرب تیری بے پناہ
دیوِ استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند

تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے نثار
قرنِ اول کی خبر لاتی تری اٹھی زقند

تو علمبردارِ حق ہے حق نگہباں ہے ترا
سیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
کر لیا اُن عالمانِ دینِ قیم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموسِ پیمبر پر فدا
حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ
جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قاسم ہوں کہ انور شاہ کہ محمود الحسن
سب کے دل تھے دردمند، سب کی فطرت ارجمند

گرمیِ ہنگامہ تیری ہے حسینؒ احمد سے آج
جن سے پرچم ہے ولایت علم کا سربلند

◎

برائے مشاورت کے لیے : فاضل حبیب اللہ رشیدی
مدیر الحاج مفتی ناظم اعلیٰ جامعہ رشیدیہ ساہیوال پاکستان